to ; Raj Kishan Nain

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

جنوری ۱۹۸۵ء | شمارہ ۱ | جلد ۱۳

مدیرِ اعلیٰ :
انل رازدان

مدیر :
ڈاکٹر راجندر وتس

نائب مدیران :
سلطان انجم ۔ مدن راہی

سرورق : اے ۔ پی ۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ : مدیر "تعمیر ہریانہ"
ایس ۔ سی ۔ او ۔ ۱۸۹ ۔ ۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ

روزمرّہ کی طرح چوپال میں محفل جمی ہوئی تھی۔ اس محفل میں حصہ لینے والے لوگوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ ایسا ہو بھی کیوں نہ؟ دادا بھرتو اور ماسٹر خوشی رام کے تابڑ توڑ بھاشن سبھی کو سننے کو ملتے تھے جن سے مفید جانکاری تو ملتی ہی تھی ساتھ ہی سبھی کا بھرپور منورنجن بھی ہو جاتا تھا۔ دھرما، کرما، فضلا، چنترو وغیرہ نوجوان دوست بہت پہلے آ کر چوپال میں بیٹھ جاتے اور حالاتِ حاضرہ کو لے کر چرچا چھیڑ دیتے۔

آج بھی ان جوان دوستوں نے دادا بھرتو اور ماسٹر خوشی رام کی آمد سے پہلے ہی "نوجوانوں کے سال" کے موضوع کو لے کر چرچا شروع کر رکھی تھی۔ چنترو کہہ رہا تھا، بھائی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ خصوصی سال کیوں منائے جاتے ہیں۔ کوئی ایک دہائی پہلے سُنا تھا "خواتین کا سال" منایا گیا۔ چھ سال پہلے ۱۹۷۹ء میں بچوں کے سال کی دھوم رہی اور پھر دو سال بعد ۱۹۸۱ء میں "اپاہجوں کے سال" کی خوب چرچا رہی۔ اب بھائی ہم "نوجوانوں کے سال" کو منانے کی بات سُن رہے ہیں۔ سُنا ہے ۱۲ جنوری کو وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نوجوانوں کے سال کے پروگراموں کا افتتاح کریں گے۔

کرتے کے سوالوں کا جواب دینے کے لئے نوجوان دھرما اٹھا ہی تھا کہ اُس نے دادا بھرتو اور ماسٹر خوشی رام کو چوپال میں داخل ہوتے دیکھ کر سبھی حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "کرتے بھائی کے سوالوں کا تھوڑا بہت جواب میں بھی دے سکتا تھا مگر اب جب دادا بھرتو جیسے بزرگ اور ماسٹر خوشی رام جیسے عالم محفل میں تشریف لا چکے ہوں تو ان سب کے بارے میں بتانا میرے لئے "چھوٹا منہ بڑی بات" ہوگی۔ ماسٹر جی خود آپ کو یہ بتائیں گے کہ "خواتین کا سال"، "بچوں کا سال"، "اپاہجوں کا سال"، اور "نوجوانوں کا سال"، وغیرہ خصوصی سال منانے کی کیا اہمیت ہے۔ اور ہمیں خصوصی سال منا کر کیا کچھ حاصل ہوتا ہے؟

سلام دعا کے بعد دادا بھرتو اور ماسٹر خوشی رام اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھے اور پھر ماسٹر خوشی رام
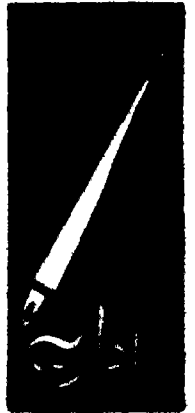
کی تقریر اس طرح شروع ہوتی، "دوستو ہم خصوصی سال مناکر مسئلوں پر غور وفکر اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور ان کے حل کی تلاش بھی۔ اب میں آپ لوگوں کی توجہ اس بات کی طرف مرکوز کرانا چاہتا ہوں کہ "خواتین کا سال" منانے کی ہمیں کیوں ضرورت محسوس ہوئی ؟ اس بات کا جواب یہ ہے کہ دنیا کے کئی معاشروں میں خواتین کو وہ درجہ حاصل نہیں جو مردوں کو ہے۔ کئی معاشروں میں عورت کو مرد کے مقابلے میں گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کو مردوں کی طرح پڑھنے لکھنے، نوکری کرنے اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں برابر کے حق نہیں دیئے جاتے۔ خواتین کا سال، منانے کا مقصد خواتین کو ان تمام باتوں کے بارے میں بیدار کرنا تھا، یا پھر عالمی برادری کی توجہ عورتوں سے متعلقہ تمام مسئلوں کی طرف مرکوز کرتے ہوئے اس بات پر زور دینا تھا کہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حق دیئے جائیں۔ اور ان کے تئیں کسی بھی طرح کی ناانصافی، خواہ وہ معاشرتی ہو یا اقتصادی نہ ہونے پائے اور ظلم نہ کئے جائیں۔ یہ بات ہے بھی ایک دم واجب کیونکہ عورتوں کو بھی ہر میدان میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملنا ہی چاہیئے، آپ سبھی لوگ ذرا غور کریں کہ کیا کوئی معاشرہ تب تک ترقی کی نئی منزلیں طے کر سکتا ہے جب تک عورتیں اس معاشرے میں سرگرم اور بھرپور تعاون نہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں ایسی بے مثال ترقی ممکن ہو سکی ہے کیونکہ ان ممالک میں عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں آگے آنے کے موقعے مل پاتے ہیں۔ بھارت میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد مختلف شعبوں میں عورتوں کو آگے آنے کے موقعے ملے ہیں۔ لیکن اب بھی بھارتی ناری کسی حد تک پچھڑی ہوئی ہے۔ اُس تک تعلیم اور نئی روشنی نہیں پہنچ پائی۔"

"کوئی چھ ساڑھے چھ سال پہلے 'بچوں کا عالمی سال' منایا گیا۔ اس کا مقصد تھا دنیا میں اور خاص طور پر پسماندہ ممالک میں بچوں کے مسئلوں پر عالمی رائے عامہ کو بیدار کرنا اور اُن کے حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔ بچے کسی بھی معاشرے کے ہونے والے معمار ہوتے ہیں۔ ان کی ہمہ پہلو نشوونما کے بغیر کوئی بھی معاشرہ یا ملک ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس سال کے دوران بچوں کی بیماریوں اور ان کے علاج، بچوں کے لئے اچھی خوراک، تعلیم و تربیت اور ان سے متعلق دوسرے مسئلوں پر توجہ دی گئی۔ بچوں کی نشوونما اور اُن سے متعلقہ مسئلوں سے نپٹنے کے لئے متعدد پروگرام چلائے گئے اور عوام میں ان کے بارے میں شعور لانے کے لئے نشرواشاعت کی گئی۔"

"بچوں کے عالمی سال" کے بعد ۱۹۸۱ء کے سال کو اپاہجوں کے عالمی سال کے طور پر منایا گیا در اصل اپاہجوں کا سال منانے کا بنیادی مقصد تھا؟ دنیا کے کروڑوں جسمانی معذور لوگوں کو معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح ہی معاشرے کا مفید اور کارگر انگ بنانا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ جسمانی معذور نفرت یا ہمارے رحم کے مرہونِ منت نہیں۔ ایسا کرکے ہم ان کے سرگرم تعاون سے محروم ہو جاتے تھے۔ اگر ہم ان کو احساس کمتری کا شکار نہ ہونے دیں۔ اور انھیں سرگرم شرکت کے لئے مدعو کریں تو وہ معاشرے کی بہبودی اور تعمیر میں اہم تعاون دے سکتے ہیں "اپاہجوں کے

عالمی سال، میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کی فلاح کے لئے متعدد منصوبے اور پروگرام بنائے گئے ہیں"

"آپ سب دیکھتے ہیں کہ اوپر بتائے گئے خصوصی سال منانے سے خواتین، بچوں اور جسمانی معذوروں کے کئی مسئلوں کا حل تلاش کیا گیا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ معاشرتی فلاح اور ترقی میں حصہ داری کر رہے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۸۵ء کے سال کو دنیا بھر میں نوجوانوں کے سال کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ دنیا میں ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر تک کے نوعمروں اور نوجوانوں کی تعداد تقریباً ۹۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے۔ بھارت کے عوام کی کُل آبادی کا ۷۰ فی صد حصہ ۳۵ سال تک کے نوجوان لوگوں کا ہے۔ "نوجوانوں کے عالمی سال" کے بنیادی مقاصد ہیں۔ اشتراک، ترقی اور بیداری اور امن۔ اگر ہم نوجوانوں کو ان مقاصد کے حصول کے لئے متحرک کریں تو نوجوان لوگ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے معاشرے کی تعمیر میں شاندار تعاون دے سکتے ہیں۔ دنیا کے مہاپُرشوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر ہم نوجوان طاقتوں کو صحیح سمت دیں تو اس سے اہم نتائج نکل سکتے ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے نوجوانی انسان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جب وہ سخت محنت کر سکتا ہے، مشکلات کا سامنا کر سکتا ہے اور دن رات محنت کر کے ٹھوس نتیجے حاصل کر سکتا ہے۔ ضرورت ہے نوجوان طاقتوں کو تعمیری کاموں میں لگانے کی۔ سوامی ویویکانند نوجوانوں کو محنتی اور جسمانی طور پر طاقتور ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ایک صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ مقیم ہوتا ہے یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء کے دوران نوجوان لوگوں سے متعلقہ موضوعات اور مسائل پر غور کیا جائے گا، ان کا حل تلاش کرنے کے لئے کئی پروگرام تیار کئے گئے ہیں۔ اور اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ نوجوان اپنے معاشرے اور ملک کی ترقی، فلاح، سربلندی اور تعمیر میں اپنا پورا پورا تعاون دیں"

"واہ، ماسٹر جی کمال کر دیا۔ اگلی بار ہمیں نوجوان لوگوں کے مسئلوں اور معاشرے میں ان کے دیئے جا سکنے والے تعاون کے بارے میں بالتفصیل بتایئے۔ اب کافی وقت ہو گیا ہے۔ اب نوجوان دوستوں سے رخصت لیں؟" ان الفاظ کے ساتھ دادا بھوز نے ایک طرح سے چوپال کی محفل کی اگلی بات چیت کے موضوع کے بارے میں قبل از وقت مطلع کر دیا تھا۔

یوم جمہوریہ پر خصوصی پیغام

ہمہ جہت ترقی کا آئینہ ہریانہ

سید مظفر حسین برنی ـــ گورنر ہریانہ

میرے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ آج میں یوم جمہوریہ کی چھتیسویں سالگرہ کے موقع پر ہریانہ کے عوام کو مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کر رہا ہوں۔ آج کے دن ہم اُن محبانِ وطن اور شہیدوں کو سلام پیش کرتے ہیں جنھوں نے غیر ملکی حکومت سے نجات دلا کر آزادی حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

آیئے! آج ہم اس ریاست میں ہوئی ترقی کا جائزہ لیں۔ ہمارے زیادہ تر لوگ دیہات میں آباد ہیں۔ جن کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں ہریانہ کے قیام کے وقت ریاست میں اناج کی پیداوار صرف ۲۶ لاکھ ٹن تھی۔ جو اب بڑھ کر ۷۰ لاکھ ٹن تک جا پہنچی ہے۔ ہماری ریاست ہر سال اناج کے مرکزی ذخیرے میں خاطر خواہ اناج دیتی ہے۔ یہ سب اعلیٰ بیجوں، کھاد اور جراثیم کش دواؤں کی لگاتار سپلائی اور ذرائع آبپاشی کے فروغ سے ممکن ہو سکا ہے۔ مہندر گڑھ، بھوانی اور روہتک کے خشک علاقوں کو لفٹ آبپاشی اسکیموں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعہ زرخیز بنا دیا گیا ہے۔ اُمید واثق ہے کہ ستلج یمنا لنک نہر کے مکمل ہو جانے پر ہریانہ کے یہ سبھی علاقے سبزہ زار بن جائیں گے۔

میری سرکار پشودھن کے فروغ کی مختلف اسکیموں پر عمل پیرا ہے۔ ریاست میں ماہرین کی قیادت میں مویشیوں کے فروغ کا ایک جامع پروگرام چلایا جا رہا ہے۔ جنید، بھوانی، انبالہ، روہتک اور بلب گڑھ میں ملک پلانٹ قائم کئے جا چکے ہیں۔ میری سرکار غریب کسانوں کو سنکر بچھڑے، مرغیاں، سؤر اور بھیڑیں فراہم کراتی ہے۔ دیہی علاقوں کے ۴۲۰۰۰ غریب کنبے ان اسکیموں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

میری سرکار نے سبھی گاؤں کو پکی سڑکوں سے جوڑ کر قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ ہریانہ کے وجود میں آنے کے وقت صرف ۱۷۰ گاؤں میں پینے کے صاف پانی کی سہولت میسر تھی۔ اب ۳۱۰۰ سے زیادہ گاؤں اس سہولت سے مستفید ہو چکے ہیں۔ میوات کے پسماندہ علاقے کی خوشحالی اور ترقی کے لئے میوات ڈیولپمنٹ بورڈ قائم کیا گیا ہے۔

ہریانہ نے صنعتی میدان میں بھی شاندار ترقی کی ہے۔ اب چھوٹے پیمانے کی صنعتی اکائیوں کی تعداد ۵۰۵۰۰ ہے۔ اٹھارہ سال قبل صرف ۴۱.۵ کروڑ روپے کی مالیت کا سامان باہر کے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اب ہم ہر سال ۲۰۰ کروڑ روپے کا سامان برآمد کرتے ہیں۔ ہماری ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں تیار ہونے والے ہر تین ٹریکٹروں میں سے دو ہریانہ میں

تیار ہوتے ہیں۔ اور ہر پانچ سائیکلوں میں سے ایک سائیکل ہریانہ میں بنتی ہے۔ ملک میں تیار ہونے والے سائنسی آلات میں ضلع انبالہ کا ۳۵ فی صد حصہ ہے۔ دفاعی افواج کے لئے ۶۰ فی صد بکس اکیلے یمنا نگر میں تیار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح انبالا پانی پت دفاعی افواج کے لئے اونی کمبلوں کی ۷۵ فی صد مانگ پوری کرتا ہے۔

ریاست میں پرائمری تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ یہاں ایک کلومیٹر کے دائرے میں پرائمری اسکول ہے۔ ہریجن ودیارتھیوں کو مفت وردی اور وظائف دیئے جاتے ہیں۔ اس وقت ریاست میں تعلیم بالغان کے چار ہزار سے زیادہ مراکز سرگرم کار ہیں۔

ہم اپنے کھلاڑیوں پر فخر کرسکتے ہیں جنھوں نے ملک میں اور بیرونِ ملک اعزازات حاصل کئے ہیں۔ ۱۹۸۵ء کو نوجوانوں کا بین الاقوامی سال کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ کھیلوں کے فروغ اور نوجوان کھلاڑیوں کی بہبود کے لئے ہم متعدد منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔

طبی سہولیات ہر پانچ کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ ریاست میں دسویں کلاس تک کے تمام اسکولی بچوں کی ڈاکٹری جانچ کی غرض سے کئی اسکیمیں شروع ہیں۔ ہریانہ کے جیالے سپاہیوں نے ملک کی حفاظت کیلئے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت ملک کی حفاظتی افواج میں ۱۱.۵ فیصد جوان ہریانہ سے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے ہاں دو لاکھ سے زائد سابق فوجی ہیں۔ ان کے مسائل سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ ہریانہ راجیہ سینک بورڈ ان کی بہتری کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

ہریانہ ٹورزم نے سیاحت کے میدان میں شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت ریاست کے مختلف مقامات پر ۳۲ سیاحتی مراکز ہیں جن میں ملک اور بیرونِ ملک سے سیاح سیر و تفریح کے لئے آتے ہیں۔

ہریانہ ہر ایک شعبے میں ترقی کر رہا ہے۔ جس کے لئے ہریانہ کے محنت کش عوام مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہم اس بات پر بھی فخر کرسکتے ہیں کہ یہاں نظم و نسق کی حالت ہمیشہ اطمینان بخش رہتی ہے۔ یہاں سبھی مذاہب اور طبقوں کے لوگ مل جل کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ امید کامل ہے کہ جوان اور ہونہار وزیر اعظم کی پُرجوش قیادت میں ہریانہ ترقی اور خوشحالی کی نئی منزلیں طے کرے گا۔

اس موقع پر ایک بار پھر میں ہریانہ کے عوام کو مبارکباد دیتا ہوں اور نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ترقی اور خوشحالی کے حصول کے لئے ریاستی سرکار کو اپنا بھرپور تعاون دیتے رہیں گے۔

یوم جمہوریہ پر خصوصی پیغام

ترقی کی راہ پر تیز گام

ہریانہ

بھجن لال — وزیر اعلیٰ ہریانہ

آج قوم چھتیسواں یوم جمہوریت منا رہی ہے۔ اس مقدس موقع پر ہم سب ان لاتعداد شہیدوں کو، جن کی قربانیوں کے طفیل ہمیں آزادی ملی، نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ انصاف، آزادی، مساوات واخوت پر مبنی ہمارا آئین اس ہی دن سے نافذ ہوا۔ یہی اصول مختلف ترقیاتی پروگراموں میں ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ آئین کے بانیوں کی طرف سے ہمیں عطا ہوئے رہنما اصولوں کی روشنی میں جمہوریہ ہند نے غریبی، ناخواندگی اور بے روزگاری جیسے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ترقی کی ہے۔ زراعت، صنعت، مواصلاتی نظام، سائنس اور ٹکنالوجی جیسے مختلف شعبوں میں ہم نے بے مثل کامیابی حاصل کی ہے۔ سماجی اور اقتصادی ترقی نے ہمارے عوام میں ایک نئی بیداری پیدا کی ہے۔ سماج کے مفلس اور دبے ہوئے طبقوں کی طرف خصوصی توجہ کے باعث ان میں امید کی نئی کرن جاگی ہے۔ اور وہ تعمیر نو میں شانہ بشانہ شامل ہیں۔ دنیا کی کئی معروف جمہوریتیں ہمارے جمہوری نظام پر رشک کرتی ہیں۔

۱۹۸۴ء ہمارے لئے نہایت صبر آزما رہا۔ ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بہیمانہ قتل سے ساری قوم سکتہ میں رہ گئی۔ مگر سال کے آخر میں ملک ایک بار پھر اس طرح متحد ہوا جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ ہم وطنوں نے شری راجیو گاندھی کی قیادت میں شریمتی اندرا گاندھی کے اتحاد، امن اور ترقی کے اعلیٰ اصولوں پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ قوم نے علیحدگی پسند، رخنہ انداز اور تنگ نظر طاقتوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ شری راجیو گاندھی میں قوم کو ایک مضبوط، خوشحال اور ترقی یافتہ ہندوستان کی جھلک نظر آئی۔

آٹھویں لوک سبھا کے انتخابات اور نئی سرکار کے قیام کے بعد وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے قوم کے نام اپنے پیغام میں تازہ ترین ترقی اور ٹکنالوجی کے سہارے دور اندیشی سے اپنی ماضی کی قدروں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کے عزم کا اعادہ کیا ہے۔ یہ عزم اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ قوم ۲۱ ویں صدی میں ایک عالمی رہنما کے طور پر ابھرے گی۔ ہر ذمہ دار شہری اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ وزیر اعظم میں لاثانی اعتماد ظاہر کرنے والے عوام کے بہتر مستقبل کے لئے انھیں کافی محنت کرنی پڑے گی۔ ہریانہ تو اسی اس چھوٹی سی ریاست کی کایا پلٹ جیسے اہم کام سے پوری طرح باخبر ہیں۔ آج ریاست میں حوصلہ، خود اعتمادی اور بھروسے کا ماحول ہے۔ زراعت کے جدید طریقوں، برق

رفتار صنعتی ترقی، ذرائع آبپاشی کے زیادہ سے زیادہ استعمال، صحت اور تعلیم سے متعلق سہولیات میں توسیع کے باعث ریاست ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اب ہریانہ دوسری ریاستوں کے لئے مثال بن گیا ہے۔

ہمارے ۸۰ فی صد لوگ ذریعۂ معاش کے لئے زراعت پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس لئے زراعت پر خاص توجّہ دی جاتی ہے۔ کاشتکاروں کو تمام سہولیات مہیا کرائی جاتی ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ فصل پیدا کر سکیں۔ سینچائی سہولیات کے فروغ، جدید سائنسی طریقوں، کیمیاوی کھادوں کی دستیابی اور قرضہ جات کی بآسانی فراہمی کے سبب زرعی پیداوار میں اضافہ ممکن ہوا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل تک اپنی ضرورت کے مطابق اناج پیدا نہ کر سکنے والی ریاست اب اناج کے مرکزی ذخیرے میں وافر مقدار میں اناج فراہم کرنے والوں میں سے ایک ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ آج ہریانہ ۷۰ لاکھ ٹن اجناس پیدا کر رہا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں صرف ۲۶ لاکھ ٹن اناج پیدا کرنے والی ریاست کی یہ کامیابی قابلِ ذکر ہے۔

رِسنے سے ضائع ہونے والے پانی کو بچانے کے لئے عالمی بینک کی مالی امداد سے کھالوں کو پختہ کرنے کا کام جاری ہے۔ اب تک ۳۳ کروڑ مربع فٹ کھالیں پکی کئے جانے سے ایک ہزار چار سو کیوسک پانی کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکا ہے۔

روہتک، مہندر گڑھ اور بھوانی کے خشک علاقوں میں زیادہ اونچائی پر واقع کھیتوں میں آبپاشی کے لئے لفٹ آبپاشی اسکیم سے اب سبھی واقف ہیں۔ جوئی، سوانی، لوہارو اور جواہر لال نہرو لفٹ آبپاشی اسکیموں سے ان کھیتوں میں بھی سینچائی کے لئے پانی پہنچ گیا ہے جہاں نہری پانی کا بہاؤ ناممکن تھا۔ سینچائی کے فوائد کے علاوہ یہ پانی خشک علاقوں میں پینے کے پانی کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ ان تمام اسکیموں کے مکمل ہونے پر مزید ۲ لاکھ ۸۵ ہزار ہیکٹر اراضی کو سیراب کیا جا سکے گا خشک علاقوں میں ہمارے کسان چھڑکاؤ آبپاشی اسکیموں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ان سبھی کوششوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں ۱۲ لاکھ ۹۳ ہزار ہیکٹر اراضی کی بہ نسبت اب ۲۷ لاکھ ہیکٹر اراضی کو سیراب کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۷ء میں بجلی کی نی کس کھپت صرف ۷۵ یونٹ تھی جو اب بڑھ کر ۲۴۷ یونٹ ہو گئی ہے۔ پانی پت تھرمل پراجیکٹ، جمنا نگر تھرمل پاور پراجیکٹ اور منی ہائیڈل پراجیکٹ دادو پور کے مکمل ہو جانے سے ہریانہ میں بجلی پیدا کرنے کی موجودہ صلاحیت میں جلد ہی مزید اضافہ ہو جائے گا۔ ۱۹۶۷ء میں ۳۴۳ میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی۔ اب یہ پیداواری صلاحیت ۱۴۲۳ میگاواٹ ہو گئی ہے۔

ہم نے سبھی ہریجن بستیوں میں بجلی لگا کر اور ۴۶۰۰۰ ہریجن گھروں کو رعایتی شرح پر ون پوائنٹ کنکشن دے کر سماجی ترقی کی جانب ایک انقلابی قدم اٹھایا ہے ۔ ۴۱۰۰ دیہات کی گلیوں کو بجلی کی روشنی سے منور کیا گیا ہے۔

آج کے دور میں صنعت کپاس کی روایتی اوٹائی، چینی، سیمنٹ اور کاغذ تک ہی محدود نہیں بلکہ الیکٹرانک سامان، کار بنانے اور تیل صاف کرنے کے میدان میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ نیم سرکاری مرکزی ادارے بھارت الیکٹرانکس لمیٹڈ کا پنچکولہ کے مقام پر مواصلاتی کل پرزے تیار کرنے والا ۲۱ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک الیکٹرانک پراجیکٹ زیرِ تعمیر ہے۔ مرکزی سرکار کی طرف سے کرنال کے نزدیک ۱۳۶۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک تیل صاف کرنے والا وسیع پراجیکٹ قائم کیا جا رہا ہے۔ پبلک سیکٹر میں ماروتی اُدیوگ گوڑگانوں کی تیار کردہ کاریں بھی بھارت کی سڑکوں پر نظر آنے لگی ہیں۔

ریاستی سرکار نے جدید زرعی اور صنعتی معلومات کے حصول کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کا محکمہ قائم کیا ہے۔ یہ محکمہ ترقیاتی پروگراموں کے لئے ریسرچ کی نئی تکنیک فراہم کرنے کے علاوہ توانائی کے ذرائع جیسے گیس اور شمسی توانائی وغیرہ پر خاص

دکھائی دے گا۔ انبالہ، کرنال، سونی پت، کوروکشیتر اور روہتک کے دیہات میں وسیع پیمانے پر گوبر گیس پلانٹ سے حاصل ایندھن سے ہمارے کسان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

دیہی علاقوں میں قائم اٹھارہ ہزار ۲۴۰ سے زائد صنعتی اکائیاں گاؤں کے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ان اکائیوں میں ۷۴۴،۵۰ سے زائد لوگ کام کرتے ہیں۔ جن میں ۵۰ فی صد کا تعلق کمزور طبقوں سے ہے۔ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لئے خود روزگار اسکیم کے تحت دس کروڑ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ تقریباً ۵۰ ہزار ۵۰ چھوٹے صنعتی یونٹوں میں قسم قسم کا سامان بنتا ہے۔ سرکار اور صنعت کاروں کی مشترکہ کوششوں سے ہماری صنعتی اشیاء کی برآمد جو کہ سنہ ۱۹۷۶ء میں صرف ۴ کروڑ ۵ لاکھ روپے تھی۔ سنہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں بڑھ کر ۲۰۰ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔

ہمارے تعلیمی ادارے آنے والی نسل کو باشعور شہری بنانے کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ ہریانہ میں پرائمری درجہ تک تعلیم مفت ہے۔ پرائمری، مڈل، ہائر سیکنڈری، اور کالج درجہ تک کی تعلیم بالترتیب ایک کلومیٹر، ۲۰۳،۷ کلومیٹر، ۲،۰۹۵ کلومیٹر اور ۴،۵۷، ۱۰ کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہے۔ لڑکیوں، پچھڑے طبقوں اور شیڈولڈ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں تعلیم کو مقبول بنانے کے لئے کئی طرح کی سہولتیں اور رعایتیں دی جا رہی ہیں۔

سماج میں ضرورت مندوں اور کمزور طبقوں کی طرف توجہ ایک فلاحی ریاست کا اولین فریضہ ہے۔ ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت کمزور طبقوں کی ترقی کے لئے متعدد تعلیمی، اقتصادی اور سماجی پروگرام شروع کئے گئے ہیں۔ کم آمدنی والے پریواروں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے خود روزگار اسکیم کے تحت مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ اب تک تقریباً ۴ لاکھ ۳ ہزار پریواروں کو یہ امداد دی جا چکی ہے۔ اور ایک لاکھ ۳۵ ہزار ایکڑ فاضل اراضی معاشی طور پر پسماندہ ۴۱ ہزار ۱۰۱ مستحق لوگوں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ تقریباً ۳ لاکھ بے گھروں کو مکان بنانے کے لئے فی کس ۱۰۰ مربع گز کے پلاٹ دیئے گئے ہیں۔

میوات ترقیاتی بورڈ میوات کے پسماندہ اور نظر انداز علاقوں میں ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتا ہے۔ اس پسماندہ علاقے میں مختلف ترقیاتی اسکیموں پر تقریباً ساڑھے سات کروڑ روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ اس علاقے میں صنعتی بستیوں کا قیام اور دیگر ترقیاتی اسکیمیں روبہ عمل ہیں۔

پانی انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ ہریانہ کے وسیع خطہ میں عرصۂ دراز سے پینے کے پانی کا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ ایسے دیہات جہاں یہ مسئلہ پیچیدہ ہے نلوں کے ذریعے پانی دستیاب کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسے ۴۶۹۰ گاؤں میں سے ۳۱۰۰ سے بھی زیادہ گاؤں کو پینے کے پانی کی سہولت میسر آ چکی ہے۔ سنہ ۱۹۸۷ء کے آخر تک باقی گاؤں میں پینے کے پانی کی سہولت مہیا کرادی جائے گی۔ آج کل اوسطاً روزانہ دو گاؤں اس سہولت سے مستفید ہو رہے ہیں۔

عوام کو ہسپتال، ڈسپنسری، پرائمری ہیلتھ سینٹر سے مناسب طبی امداد کی فراہمی ایک فلاحی ریاست کا سب سے پہلا کام ہے۔ اب ہر پانچ کلومیٹر کے دائرے میں علاج معالجہ کی سہولیات میسر ہیں۔ آج سرکار صحت سے متعلقہ ان سہولیات پر فی کس ۴۴ روپے ۵۰ پیسے صرف کر رہی ہے جبکہ سنہ ۱۹۶۶ء میں اس مد پر محض ایک روپیہ ۳۳ پیسے خرچ کئے جاتے تھے۔ برسوں کی تعلیم اور ترغیب کے طفیل خاندانی منصوبہ بندی اپنانے والوں کو متعدد سہولیات دی جا رہی ہیں۔ سنہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ہریانہ اس پروگرام میں دوسرے نمبر پر رہا۔ سنہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں بھی اس ضمن میں بہترین کارگزاری کے سلسلہ میں ایک اور اعزاز حاصل کیا۔

ایک ترقی پذیر ریاست میں آمدورفت کے بہترین ذرائع کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ ہریانہ ملک کی پہلی ریاست ہے جس نے اپنے سبھی دیہات کو پکی سڑکوں سے جوڑ دیا ہے۔ پکی سڑکوں نے دیہی عوام کی ترقی اور خوشحالی کے نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ نتیجتاً بسوں کی تعداد میں چھ گنا اور پکی سڑکوں کی لمبائی میں چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ نئے بس اڈوں، سڑک کے کنارے پر بنے بس شیڈوں، آرام دہ اور قابل اعتماد بسوں کی وجہ سے ہریانہ روڈویز ملک میں بے حد مقبول ہو چکی ہے۔

قدرتی وسائل مثلاً ہوا اور پانی کے بغیر انسانی زندگی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ شہروں کے پھیلاؤ اور درختوں کی بے دریغ کٹائی نے جنگلاتی دولت اور جنگلی جانوروں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ریاستی سرکار نے ہوا اور پانی کی کثافت روکنے اور ماحولیاتی سدھار کے فروغ کے اقدامات کرنے کے لئے ایک علیحدہ محکمۂ ماحولیات قائم کیا ہے۔

نباتات اور حیوانات مجموعی طور پر فضا کا توازن برقرار رکھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اپنی مخصوص جغرافیائی حالت کی وجہ سے ہریانہ میں جنگلات کی دولت کم ہے۔ لیکن ہم اس کمی کو دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ برق رفتاری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اراضی میں شجرکاری کے مقصد سے زرعی شجرکاری اور سماجی شجرکاری کو مقبول بنایا جا رہا ہے۔ گذشتہ تین چار برسوں میں شجر لگانے کی تعداد ہریانہ کے وجود میں آنے سے تادم تحریر لگائے گئے درختوں سے کہیں زیادہ ہے۔ گذشتہ سال ایک خاص مہم کے تحت دس کروڑ درخت لگائے گئے تھے۔ سالِ رواں میں اتنے ہی اور پودے لگانے کا عمل جاری ہے۔ امید ہے کہ چھٹے پانسالہ منصوبے کے آخر تک ہم ۳۵ کروڑ درخت لگا لیں گے۔ ۷۶ ہزار ہیکٹر اراضی میں جنگلات لگانے کے لئے ۳۳ کروڑ روپے کی لاگت سے سماجی شجرکاری مہم شروع کی جا رہی ہے۔ مہندر گڑھ، گوڑگاؤں، فرید آباد اور بھوانی اضلاع کے خشک علاقوں میں ۷۱ ہزار ہیکٹر اراضی پر شجرکاری کے لئے جلد ہی سویڈش انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایجنسی کے تعاون سے ۵۱ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے کی لاگت سے شجرکاری کا ایک پراجیکٹ شروع کیا جائے گا۔

اس مذکورہ ترقی کا سہرا بالخصوص یہاں کے محنت کش عوام کے سر ہے۔ جنھوں نے ہمیشہ ہریانہ کی ترقی اور خوشحالی میں بھرپور تعاون دیا ہے۔ ہریانہ میں یہاں کے باشعور اور امن پسند عوام اور مستعد انتظامیہ نے امن و آشتی اور بھائی چارہ کا ماحول بنائے رکھا۔ حال ہی میں ہوئے انتخابات کے نتائج ایسے عناصر کا منہ توڑ جواب ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ علیحدگی پسند اور فرقہ وارانہ عناصر کے زیر اثر ملک کی جمہوریت کو خطرہ درپیش ہے۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی زبردست کامیابی امن، استحکام اور قومی اتحاد کے عوامی رجحان کی عکاسی کرتی ہے —
ہریانہ نواسیوں نے بھی ذات اور مذہب کی تنگ دلی سے اٹھ کر شری راجیو گاندھی پر اپنا مکمل اعتماد ظاہر کیا ہے۔ عوام نے ترقی پسند اور سیکولر پالیسیوں پر اپنے اعتماد کا اظہار کر کے واضح کر دیا ہے کہ وہ اور زیادہ کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے پُرعزم ہیں ———
وزیر اعظم نے سماجی اور اقتصادی بہتری کی غرض سے انتظامیہ میں اصلاح پر زور دیا ہے۔ اس کے مطابق ہم نے موجودہ انتظامی قواعد اور طور طریقوں کا از سرِ نو جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ حال ہی میں میں نے قوانین و ضوابط کو ہموار کرنے کے لئے اپنے ساتھی وزراء اور اعلیٰ افسران کے ساتھ کئی میٹنگیں کی ہیں۔ عوام کو صاف ستھرا اور مستعد انتظامیہ دینے اور ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ہم ضوابط و قواعد کو مزید آسان بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آیئے! ہم اس مبارک موقع پر پُرعزم اور جرأت مند وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی رہنمائی میں دیش کی سالمیت اور یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کا عہد کریں تاکہ ہم ایک خوشحال مستقبل کی طرف بڑھتے چلیں۔

برہم دت سناتک

بھارت رتن
ڈاکٹر راجیندر پرشاد
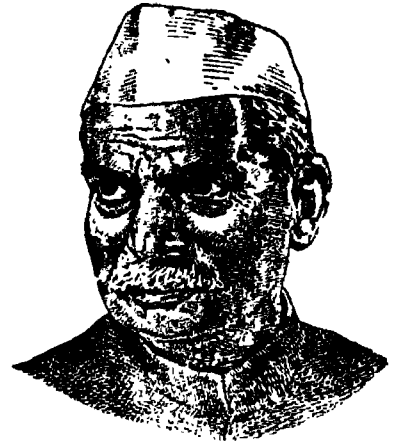
ہندوستان کے پہلے راشٹرپتی ڈاکٹر راجیندر پرشاد ہندوستانی خلوص اور رواداری کا مجسمہ تھے اور عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے کردار میں رحم دلی، عزم، فراخدلی اور ظلم کی سختی سے مخالفت کرنے کا انوکھا جذبہ تھا۔ راجیندر بابو کا جنگِ آزادی میں اور اس کے بعد ملک کی تعمیر میں بے مثال تعاون ہے۔ ۳ دسمبر کو پیدا ہوئی اس عظیم شخصیت کا سال ۱۹۸۴ء صد سالہ سالِ ولادت تھا۔

سنسکرت کے ایک شاعر نے سجّن اور دُرجن کے ساتھ دوستی کا بیان قبل از ظہر اور سہ پہر کے سورج کی کرنوں سے کیا ہے تو ایک انگریزی ادیب نے زندگی کے رنگ منچ پر آمد اور رخصت کے لمحات سے فنکار کا موازنہ کیا ہے۔ اسی ضمن میں ہمیں راجیندر بابو کے جیون کا درشن ہوتا ہے۔ بہار کے سارن ضلع میں جیرادیئی گاؤں میں ایک معمولی گھر میں پیدا ہوئے راجیندر بابو اس عظیم ہندوستانی جمہوریہ کے پہلے راشٹرپتی کے اعلیٰ مرتبے کو پہنچے۔ یہ اُن کی زندگی کے سفر یا رنگ منچ پر آمد اور رخصتی کا ایک اہم اور عام سا واقعہ ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ عظیم تھے۔ اور بھگوان بُدھ کی سادگی دوستی اور درد ان میں مظہر ہوئے۔ اور انھیں اجات شترو کہا جاتا تھا، تو دوسری طرف اپنی رشیوں جیسی زندگی کے کئی مواقع پر سخت قدم اٹھانے میں انگد کے پیر کی طرح انھوں نے مضبوطی کا ثبوت دیا۔ وہ سچ مچ دانشور اور کاملِ عمل تھے، اور اپنے سُکھ دکھ کے مشاہدے کو بروئے کار لاتے۔ اس تین دسمبر کو ان کی پیدائش کو پورے ایک سو سال ہو گئے۔

آزاد ہندوستان کے پہلے راشٹرپتی کے عہدے پر رونق افروز ہونے سے پہلے ہی وہ سچ مُچ راشٹرپتی بن چکے تھے۔ یہ بات آج عجیب سی لگے گی، لیکن سچ ہے کہ آزادی سے پہلے دوسری سیاسی جماعتوں کے سربراہ صدر کہلاتے تھے لیکن راشٹریہ مہا سبھا کہلانے والی کانگریس کا سبھاپتی راشٹرپتی کہلاتے لگا تھا۔ اس طرح راجیندر بابو ہی واحد شخص تھے جو دونوں جگہوں پر راشٹرپتی چُنے گئے۔ بھارت رتن کے لقب سے پہلے ہی پوری قوم نے ان کو 'دیش رتن' کا تاج

پہنا دیا تھا۔ عوامی زندگی میں آنے کے بعد سے چھ فٹ سے زیادہ لمبے راجیندر بابو کو ہمیشہ ادرنجی باڑ کی ٹیڑھی ٹوپی بند گلے کا نیچا کوٹ یا صدری اور گھٹنے سے نیچے آدھی ٹانگوں کو ڈھکتی دھوتی سے آسانی سے پہچانا جاتا تھا۔ اگرچہ گاندھی جی کا لباس ایک فقیری کا تھا تو راجیندر بابو ایک دیہاتی کسان کا مجسمہ تھے۔ راشٹرپتی بھون میں رہائش کے دنوں میں سرکاری تقریبات کے علاوہ ان کا لباس لگاتار یہی رہا۔ ان کی درویشی مزاجی کی ایک مثال ہمیں بہار صوبے کی ایک نصابی کتاب میں (۱۹۵۳ء) میں دیکھنے کو ملی۔ ان کے بڑے بھائی گوشت خور تھے جبکہ وہ خود شاکاہاری تھے۔ بڑے بھائی مہیندر پرشاد انھیں اپنے ساتھ تھالی میں کھانے کو بلاتے تو وہ اپنے اور ان کے بھوجن کے بیچ چاول کی حد لگا کر کھانا کھا کر اپنے باپ برابر بھائی کا حکم بجا لاتے۔

ٹریپوری کانگریس ۱۹۳۵ء میں اُس وقت کے سبھاش چندر بوس کے استعفیٰ دینے کے بعد جب انہیں وہ عہدہ سونپا گیا تو انھوں نے اپنی کارکردگی سے ناراض بنگالیوں کا دل جیت لیا۔ راجیندر بابو کی تعلیم وتربیت اور ابتدائی کام کاج کی جگہ کلکتہ رہی۔ وہ وہاں کے عوامی شعور سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لئے اس پچھڑے بہاری نوجوان کے کلکتہ یونیورسٹی کی میٹرک، بی۔ اے، ایم۔ اے، اور قانون کے امتحانات اعلیٰ ترین نمبروں سے پاس کرنے کے بعد کلکتہ کے دانشور شہر میں دھاک ہو گیا۔

چمپارن ستیہ گرہ میں ۱۹۱۷ء میں سب سے پہلے نوجوان راجیندر کا تعلق جنوبی افریقہ سے لوٹ کر وطن آئے موہن داس کرم چند گاندھی سے ہوا۔ (تب مہاتما نہیں کہلاتے تھے) راجیندر بابو کی آمدن قانونی پیشے سے ان دنوں آج کے لحاظ سے پانچ لاکھ روپے سے کم نہ تھی۔ اُسے چھوڑ کر وہ گاندھی جی کے ساتھ موجودہ مشرقی اور مغربی چمپارن اضلاع میں — گوروں کی زیادتیوں سے غریب کسانوں کو بچانے کے کام میں جٹ گئے۔ بیتیا راج اور دوسری کسی جگہ سے زمینوں کے ٹھیکے لے کر وہاں گورے لوگوں نے اپنی حکومت اور من مانی چلا رکھی تھی۔ بیگھے میں تین کٹھیا، ان کا اصول تھا یعنی ہر کسان کو ایک بیگھا زمین میں سے تین کٹھا زمین میں نیل کی کھیتی کر کے برائے نام قیمت پر اُس کی پیداوار ان گوروں کو دینا پڑتی تھی اور اُس میں کوتاہی کرنے پر کسانوں پر تشدد کئے جاتے تھے۔ گھر کھیتی لوٹ کر ان کو زمین سے بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ جسمانی سزائیں دی جاتی تھیں۔ قانون اور انتظامیہ گوروں کے حق میں تھا اور پیداوار پر انہی کا واحد حق تھا۔

ہندوستان میں آنے کے بعد گاندھی جی کا یہ ستیہ گرہ کا پہلا تجربہ تھا۔ مہینوں ان دیہات میں ڈیرہ ڈال کر مصیبت زدگان کے جگہ جگہ گواہی اور بیان لئے جاتے۔ افسران اور گوروں کے سامنے مانگیں رکھی جاتیں اور اس طرح عوامی بیداری کی اس شروعات کا زندہ پر تفصیلی بیان راجیندر بابو نے اپنی سوانح عمری (پٹنہ سے شائع) میں کیا۔ اس واقعے کو ان دونوں مہا پرشوں کی سنگم ستھلی، کہا جانا چاہیئے۔ یہ راجیندر بابو کی سرگرم عوامی زندگی کی شروعات تھی۔ اب وہ کمائی کے میدان کو چھوڑ چکے تھے۔

بہاریوں کی زلزلے اور سیلاب کا تانتا رہا تھا۔ راجیندر بابو نے ان سب مواقع پر مصیبت زدگان اور غریبوں کی خوب خدمت کی۔ ۱۹۱۳ء میں دامودر اور پن پن ندیوں میں اور ۱۹۲۳ء میں گنگا کے خوفناک سیلابوں نے جب صوبے کو تباہ کر دیا، راجیندر بابو نے اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ جس طرح فلاح کا کام کیا

اُس کی تعریف تمام دیش واسیوں اور انگریز سرکار تک نے کی۔ اِسی طرح ۱۹۳۴ء میں بہار میں زلزلے سے تباہی ہونے پر سرکار نے ان کو جیل سے چھوڑ کر امدادی کام کی اجازت دی۔ اپنی مجموعی طاقت کے حوصلے پر انھوں نے دھن۔ جن اکٹھا کر کے اس پر فتح حاصل کی۔ اُس زمانے میں اس کام کے لئے ملک کے ہر خاص و عام سے ۲۹ لاکھ روپے اکٹھا کرنا خدمت اور یقین کی یکتا مثال ہے۔ اِسی سال کانگریس نے ان کو اپنا صدر یعنی راشٹرپتی چُنا۔ اِسی طرح کے فلاحی اجتماع کوئٹہ کے زلزلے، بیمٹا کے خوفناک ریل حادثے اور ۱۹۳۱ء کے قحط کے موقع پر انھوں نے کئے تھے۔ بمبئی کانگریس کے موقعے پر راجیندر بابو نے اپنے دیش واسیوں کو جو پیغام دیا تھا، وہ زرّیں حروف میں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے کہا "کام کرو کام کرو۔ قوت ارادی سے کام کرو۔ یہ سمجھو کہ ہم آزاد ہیں اور تبھی تم آزاد ہو گے۔"

نوجوان راجیندر کی آرزوئیں

اپنی مالی خوشحالی کے عروج پر صرف ۲۸ سال کی عمر میں نوجوان راجیندر تمام آسائشوں کو خیرباد کہہ کر گوپال کرشن گوکھلے کی "سروینٹس آف انڈیا سوسائٹی" کی لائف ممبرشپ حاصل کر کے کس طرح دیش سیوا کے لئے بے چین تھے اس کا پتہ اِن دنوں اپنے بڑے بھائی کو بھیجے ایک خط کی سطور سے لگتا ہے۔ اِس میں انھوں نے لکھا تھا، "میں اپنے میں ایک بلند اور پاک جذبے کا احساس کر رہا ہوں آپ کو مشکل میں ڈالنا میرے لئے بجا نہیں، پھر بھی میں آپ سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ۳۰ کروڑ عوام (ہندوستانیوں کی آبادی تب یہی تھی) کے لئے کچھ تیاگ کریں۔ گوکھلے کی سوسائٹی کا رُکن ہونا میرے لئے کوئی تیاگ نہیں ہے میں اپنے کو کسی بھی حالت کے موافق بنا سکتا ہوں۔ مجھے کوئی خاص سُکھ، سہولت اور آرام نہیں چاہیئے۔ مجھے سوسائٹی سے جو کچھ ملے گا، کافی ہو گا۔ خوشی باہر سے نہیں اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں غریبی سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ ظلم اور نفرت کی مخالفت کرنے والوں کو لاکھوں لوگ یاد کرتے ہیں اور وہ ان کے دِلوں میں بس جاتے ہیں۔ میری اگر کچھ بھی آرزو ہے تو وہ یہی ہے کہ بھارت ماتا کی کچھ سیوا کر سکوں۔"

کیا آج کا نوجوان طبقہ اِس قسم کی اُمنگیں اپنے میں پال سکتا ہے؟

آزاد ہندوستان میں گن راجیہ سے پہلے وزیرِ خوراک کا عہدہ انھوں نے سنبھالا تھا۔ وہ ایک کسان اور دور اندیش دانشور تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی علمی گہرائی بالا تر تھی۔ ہندوستان کی آئین سبھا کے صدر کے عہدے کو انہوں نے بے حد قابلیت اور شائستگی سے نبھایا تھا۔ قانون میں ان کو کمال کا عبور حاصل تھا اس پر بھی وہ غرور سے کوسوں دور رہے۔ آئین کی ہندی ترجمہ سمتی کی انہوں نے خود راہنمائی کی تھی، ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جمہوریہ بننے کے بعد راجیندر بابو اِس کے پہلے راشٹرپتی کے عہدے پر فائز ہوئے اور لگاتار تین بار قوم نے ان کو یہ عزّت بخشی۔ اور اُس کے بعد ایک سنت کے روپ میں وہ عظیم الشان راشٹرپتی بھون کو چھوڑ کر پٹنہ میں اپنے پُرانے "صداقت آشرم" میں رِشی مُنیوں کی زندگی گزارنے اور راشٹر کی راہنمائی کرنے جا بیٹھے تھے۔ ۱۳ مئی کو انھوں نے دِلّی کو خیرباد کہہ کر راشٹر کی تخلیقی سرگرمیوں کو سمت دینے کا گنگا تٹ پر عہد کیا تھا۔ اُس وقت ان جیسا بالغ نظر اور بے لوث واحد مہا پُرش تھا۔ اُس وقت کی تیاد دت ان کے سائے میں پلی تھی۔ اور تبھی ۲۰ اکتوبر کو بھارت پر

چینیوں کے ذلّت آمیز حملے کے دوران یہ راشٹر سنت دیش کے حکمرانوں کو اپنا آشیرواد اور عوام کو دفاع شناس کرانے کے لیۓ نکلنے والا تھا بے رحم موت نے انھیں ہمارے درمیان سے اٹھا لیا۔

نسترین الفاظ

آج سے ۴۴ سال پہلے ۹ جنوری ۱۹۵۱ء کو ہمیں دلّی یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی تقریر سننے کا موقع ملا تھا۔ ان کے ۱۱ صفحات کے ایڈریس کا جو اختصار ہم نے 'پلینہ بھومی' کے اداریئے میں تب دیا تھا وہ سچ مچ آج بھی را ، دکھلانے والا ہے۔ ان کا کہنا تھا:

انگریزی زبان اعلیٰ ہونے پر بھی صرف بین الاقوامی اور ایک سے زیادہ زبانوں والے اضلاع میں ہی رہنے کے قابل ہے۔ انگریزی کی برتری فوراً ختم کر دینی چاہیئے اور راشٹر بھاشا ہندی کو اس کی جگہ دی جانی چاہیئے۔

بھارت دیش میں تین سنسکرتیوں کا سنگم ہوا ہے پہلے بھارت کی اپنی سنسکرتی ہے جو ویدک کال سے ہمارے دیش میں بہہ رہی ہے جس نے ہمیں ہریش چندر جیسے حق گو، ددھیچی جیسے آتم سمرپک شیوی جیسے دانی اور بھگوان کرشن جیسے کرم یوگی دیئے ہیں دوسری عرب کی سنسکرتی ہے جو اسلام کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہے اور تیسری مغربی سنسکرتی جو عیسائیت کی شکل میں در آئی ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ غیر ملکی سنسکرتیوں کو سنگم کے نام پر اپنانے کا صاف نتیجہ آج کی ذہنی تقسیم ہے اور یہی کی جڑ ہے۔

بھارت کے زیادہ تر عوام دیہات میں رہتے ہیں اور سچی بھارتیہ جیون دھارا ان میں ہی بہتی ہے، بن اور گاؤں بھارتیہ سنگم کا گھر رہے ہیں۔ ان سے کٹ کر ہم دیش کی کوئی خدمت نہیں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نریش

سنگ دل وہ صنم ہم سے کیا کھل گیا
ہم پہ گویا ہر اک معجزہ کھل گیا

خوش نصیبوں پہ وا تھا جو کعبے کا در
غم زدوں پہ درِ مے کدہ کھل گیا

طیش میں آ گئے تم یہ اچھا ہوا
دوستی کا بھرم سا جو تھا کھل گیا

کون دشمن تھا میرا، مگر تو نے جب
سنگ اٹھایا تو بس راستہ کھل گیا

خود فریبی نریش آخرش کب تلک
یہ بھرم بھی تو کھلنا ہی تھا کھل گیا

جوگندر پال

رَستے اور رِشتے

بُڈھا جب رات کے دس گیارہ بجے
ریلوے لائن کے پُل کے نیچے کی سڑک میں داخل ہوا تو اُس
نے دیکھا کہ فُٹ پاتھ کے عین اُس مقام پر کوئی پانچ چھ
مشٹنڈے جُوا کھیل رہے ہیں جہاں وہ سوتا ہے ۔
اچانک اُن مشٹنڈوں میں سے ایک نے بڈھے کی پُشت
پر دیکھتے ہوئے چلّا کر کہا، پولیس! ——— اور وہ سب
بھاگ کھڑے ہوئے ۔ بڈھا اگر اُسی دم اپنے آپ کو ایک
طرف نہ جھٹک لیتا تو وہ پولیس کی جیپ کے نیچے کچل کر
رہ جاتا۔ جیپ شاید اُنہی لوگوں کے پیچھے بڑی تیزی سے
آگے بڑھ گئی اور بڈھا اپنے بدن کو اکٹھا کرتے ہوئے
اپنی روز کے سونے کی جگہ پر آپہنچا۔ ———

——— بھگوڑے وہاں اپنے پیسے چھوڑ گئے تھے۔ سب
سے پہلے بڈھے نے اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ریزگاری پر
ہاتھ صاف کیا ——— چونی کی چائے اور اٹھنی کی ڈبل
روٹی ——— اُس نے خوشی سے کانپتے ہوئے کئی چونیوں
اور اٹھنیوں کو اپنی کسی پھٹی ہوئی جیب میں ڈال لیا اور
پھر نوٹوں کی طرف متوجہ ہو گیا ——— پانچ ———
سات ——— آٹھ ——— وہ ہر نوٹ کو پکڑتے ہوئے
با آواز بلند میزان کئے جا رہا تھا۔ ——— اٹھارہ ———
بیس ——— اور یہ دس دس کے دو اور نوٹ۔
پینتالیس ——— باپ رے! ——— پورے
پینتالیس! ——— اسے اپنے کارخانے سے روز کے
روز اجرت کے ساڑھے سات روپے وصول ہوتے
تھے جن میں سے وہ بڑی مشکل سے دوسرے دن کے
ناشتے کے لئے بارہ آنے بچا کر یہاں سونے کے لئے
آپہنچتا تھا۔ ایک دم اتنے پیسے پا کر وہ ڈرنے لگا کہ
پکڑا جائے گا، اور جب اپنے ڈر پر حاوی نہ ہو سکا تو
جیب سے پینتالیس روپے نکال کر کچھ اِس طرح
فُٹ پاتھ کی دیوار کے ساتھ ڈال دیئے جیسے واقعی
پکڑا گیا ہو ——— نہیں، میں نے تو انہیں چھُوا
بھی نہیں۔ جتنے بھی ہیں جُوں کے تُوں پڑے ہیں ———
دیکھ لو! ۔

اور وہ ریزگاری؟

——— بڈھے نے فوراً اپنی جیب پر دونوں ہاتھ
باندھ لئے ——— نہیں، یہ کچھ پیسے میرے اپنے
ہیں ——— ساڑھے تین روپے ایک اور بارہ
آنے ایک ——— اُسے ڈر تھا کہ پکڑنے والے
اُس کے بارہ آنے بھی لے اُڑیں گے ——— اچھا،

کم سے کم میرے یہ بارہ آنے تو میرے پاس رہنے دو۔
بڈھے کا گویا سب کچھ لٹ پٹ گیا اور وہ ہر روز کی طرح سر کے نیچے دو چار اینٹیں جوڑ کر اس طرح لیٹ گیا جیسے قبر میں مُردے کو۔ کیا پتہ کہ اُس کے سر پر سے کتنی ریل گاڑیاں دندناتی ہوئی گزر چکی ہیں۔ پورا آدھ گھنٹہ اُس کی آنکھ نہ کھلی، حالانکہ عام طور پر سوتے سوتے ہر پانچ منٹ کے بعد وہ ہڑبڑا کر جاگ نہ پڑتا تو یہی سمجھتا کہ اُس کا دم نکل چکا ہے۔
لیکن وہ سو کہاں رہا تھا؟ وہ اپنی اِس سوچ کی اونگھ میں بہہ نکلا تھا کہ کل کام پر نہیں جاؤں گا ——— نانو کی سوکھی اور باسی ڈبل روٹیاں کھا کھا کے پیٹ میں بل پڑتے رہتے ہیں، کل سیدھا انور کے ڈھابے میں جا پہنچوں گا ——— لاؤ بھائی! ——— مگر انور کا چھوکرا اُس کی طرف دیکھے بغیر آگے نکل گیا ہے ——— ارے بھائی، لاؤ نا! ——— ٹھنڈے پانی کا پچیس پیسہ لگیں گا ——— چھوکرے نے اُس کی طرف منہ اٹھائے بغیر پھر آگے بڑھنا چاہا ہے ——— سنتے کیوں نہیں؟ ——— اُس نے چھوکرے کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روک لیا ہے ——— بولیں گا نا ہیں تو کا ہے کو سنیں گا؟ ——— تو سنو، بکرے کا زبان، چار ٹوسٹ، ایک چھوٹا مکھن اور ایک کڑک چائے ——— چھوکرے نے رسوتیا کے لئے بہ آواز بلند دہرایا ہے اور اُس کی آواز بڈھے کے کانوں میں بج رہی ہے ——— بکرے کی جوبان ——— چور ٹوسٹ۔ ایک چوٹا مکھن اور ایک کڑک چائے بڈھے نے اپنی اونگھ میں بہتے بہتے اپنا ہاتھ فٹ پاتھ کی دیوار کی طرف بڑھایا ہے اور نوٹوں کو جھپٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیا ہے ——— نہیں، جمعدار صاب، یہ میرے اپنے پیسے ہیں ——— بکرے کی ——— کبھی تمہارے باپ نے بھی اتنے پیسے دیکھے ہیں؟ ——— بڈھے کی بائیں ران کا پھوڑا

یکبارگی دُکھا اور اُس کی آنکھ کُھل گئی اور اُس نے دیکھا کہ سڑک کے دوسرے کنارے کی لنگڑی بھکارن اُس کے ساتھ جُڑ کر بیٹھی ہے اور اُس کی ٹانگیں داب رہی ہے۔
بڈھا ابھی بڈھا تو نہیں ہوا تھا۔ اُس کی عمر ابھی پینتالیس سے اوپر نہ ہوگی، پھر بھی اپنے نام کے بغیر اُسے اپنا آپ کوئی اور ہی معلوم ہوتا۔ مگر اِس نام کے باوجود اُسے اپنا آپ کہاں معلوم ہوتا تھا؟ وہ تو گویا ہر دم اپنی تلاش میں نکلا ہوتا تھا۔ بعض اوقات اُسے کسی اور پہ اپنے آپ کا گمان ہونے لگتا تھا مگر پھر اُس میں اُسی کو پا کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا اور بڑی عاجزی سے اپنے وجود میں لوٹ آتا۔ اپنے وجود میں لوٹ کر بھی اُسے یہی لگتا کہ وہ یہاں رات کاٹنے کے لئے آن پڑا ہے ——— چلو، جیسے بھی ہے بڈھے کو سنبھالنے کے لئے بڈھا تو ہے۔ ایک یہ بڈھا زندہ رہے، پھر مجھے کیا فکر ہے؟ ——— مگر فکر کی بات تو تھی ——— بڈھے کا بطون بھی باہر ہی کا کوئی راستہ تھا۔ برستے پانی میں یہاں اُسے کبھی کوئی محافظ میسر نہ تھا جہاں وہ لمبی تان کر سویا پڑا ہے۔ وہ ہر پل یہاں سے وہاں اور وہاں سے وہاں جگہیں بدلتا رہتا، اور رات تھی کہ گزرنے میں نہ آ رہی تھی۔
بڈھے نے لنگڑی بھکارن سے بات کرنے کیلئے اپنا مکھن اور ٹوسٹ سے ٹھُنسا ہوا منہ تو کھولا تھا مگر ٹانگوں کی داب سے سکھ محسوس کر کر کے وہ کھلے منہ پھر اونگھنے لگا تھا۔ لنگڑی کئی بار رات کو سڑک پار کر کے اسی طرح اُس کے پاس گھسٹ آتی تھی اور آ کر چپ چاپ اُس کی ٹانگیں دابنے لگتی اور دابتے دابتے جی ہی جی میں کیا معلوم کون کون سی خواہشیں پوری کر لیتی۔
ایک بار بڈھے نے لنگڑی سے پوچھا۔
مجھ بڈھے کی ٹانگیں داب داب کر تمہیں کیا مل

جاتا ہے ری؟

بڈھا۔ لنگڑی نے جواب دے کر اپنا منہ گھونگھٹ میں ڈھانپ لیا۔

بڈھے کو اس پل کے نیچے بسیرا کئے کوئی مہینہ بھر ہو لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ پرانی بستی کے پیچھے ایک بیوہ مزدورنی دئی، کی جھونپڑی میں رات کاٹنے کو چلا جاتا تھا۔ اُن دنوں اُس کے کارخانے کی عمارت کو بڑا کیا جا رہا تھا اور دئی وہاں اینٹیں ڈھونے کا کام کرتی تھی۔ ایک دن اینٹوں کا لوٹ کرا دئی کے سر سے نیچے آگرا جس سے اُس کے دونوں پیر لہولہان ہو گئے۔ بڈھا دوا خانے سے جو اُس کی پٹی کروا کے اُسے اُس کی جھونپڑی میں چھوڑنے گیا تو اُس کی حالت دیکھ کر وہ رات وہیں رہ گیا۔ دوسرے دن دئی نے اُسے خالص مونگ پھلی کے پراٹھوں کے ساتھ بڑی کڑک چائے پلائی اور جب وہ سیر ہو کر کھا پی چکا تو وہ پوچھنے لگی، پرَہ تو رہت کدھر ہے بڈھے؟

رستوں میں، دئی، اور کہاں؟

دئی اپنے پیر کے زخموں کو سینکتے ہوئے بڑی چاہ سے اُس کے قریب سرک آئی۔

ارے مورکھ بڈھے، ہم دونوں کے ماں باپ تو ہوت نا ہیں، جو وہ ہمارے وِواہ کی بات چلاویں — تو بھاگ جلا بھی اکیلا، اور میں بھی، آج سے تو سیدھا اِدھر ہی آجایا کر — وہ اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں ہاتھ گھما کر اُسے بتانے لگی۔ اتنی بڑی جھونپڑی مُو جیسا اکیلی جان کو کاٹنے کو دوڑت ہے۔

بڈھے کی چند راتیں بڑے آرام سے گزریں، پھر ایک روز کام سے لوٹتے ہوئے اُس نے جھونپڑی سے کافی فاصلے پر دئی کو اپنے انتظار میں پایا۔

وہ لوٹ آئے ہے بڈھے۔

کون؟

مورا مردوا، اور کون؟

پر وہ تو مر چکا تھا دئی؟

اب جی پڑے ہے تو میں کا کروں؟ تُو اب کوئی اور ٹھکانہ کر لے۔

مگر راستوں کا کیا ٹھکانہ؟ جدھر نکل گئے وہیں پہنچ گئے۔ بڈھا وہاں سے یہاں ریل کے پُل کے نیچے آپہنچا۔ اُسے یہاں بھی ٹِکنے کی نہ سوجھتی مگر ایک شرابی بھی رات کی ویرانی میں اِدھر آنکلا تھا اور لنگڑی بھکارن کو تنگ کر رہا تھا۔

بڈھے کی مَری ہوئی غیرت اچانک اِس طرح جی پڑی جیسے دئی کا مردوا۔ اور اُس نے شرابی کو پیٹ پیٹ کر وہاں سے آگے دھکیل دیا

لنگڑی پہلے تو اُسے پیار سے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی اور پھر اُس کی طرف پانی کا گلاس بڑھا کر بولی، سونے کے لیے ایسی جگا کہیں بھی نا ہیں۔

بڈھے نے اُسے کوئی جواب نہ دیا تو وہ پوچھنے لگی، سوتے کہاں ہو؟

اپنے بدن میں، اور کہاں؟ — اُس نے پانی کا گلاس لنگڑی کو لوٹا دیا۔

کا نام ہے؟

بڈھا۔

لنگڑی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بڈھا؟ مو جیسے تو تم کھوب جوان دِکھتے ہو۔

اب اِس وکھت کہاں جاؤ گے؟

کہیں بھی نہیں۔

تو پھر اِدھر ہی پُل کے نیچے پڑ جاؤ۔

لنگڑی کے ہاتھوں میں طوطے کی اڑان تھی، جیسے اپنی ٹانگوں پر محسوس کرتے ہوئے تھکا ماندہ بڈھا اپنی اُونگھ کے اور اندر جا نکلا، مگر لنگڑی نے اُسے جگانے کے لئے جان بوجھ کر اُس کے پھوڑے پر ہاتھ مار دیا۔

اور بڈھا بکرے کی زبان کھاتے کھاتے اچھل کر
اپنی اُونگھ سے باہر آگیا اور سب سے پہلے اُسے لنگڑی کو
یہی بتانے کی سوجھی، جانتی ہو لنگڑی وہ پچھلے لوگ میرے لئے
پورے پینتالیس روپے چھوڑ گئے ہیں۔
بڈھا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اُسے دکھانے کے لئے
نوٹوں کو جیب سے نکال کر گننے لگا ـــــ پورے
پینتالیس ہیں ـــــ پھر لنگڑی کا پھٹا ہوا دوپٹہ
دیکھ کر اُس نے پچیس روپے اُس کی طرف بڑھا دیئے۔
یہ رکھ لو۔ سر ڈھانپنے کے لئے کوئی اچھا سا
دوپٹہ لے لینا۔
لنگڑی خوشی سے پھول کر بڈھے کو اپنی دو
ٹانگوں پر سیدھی کھڑی نظر آنے لگی۔ وہ اُسے بڑی
بھلی لگ رہی تھی ـــــ لو یہ باقی کے روپے بھی
رکھ لو۔ میں ان کا کیا کروں گا؟
لنگڑی نے خوشی سے تمتما کر بڈھے کو اُس کی
سہاگن کی طرح آنکھوں میں بھر لیا اور روپیوں کو پلّو میں
باندھ کر کہنے لگی۔
مان جاؤ بڈھے، تو کھُل کر ایک بات کہوں؟
کیوں نہیں مانوں گا لنگڑی؟ بولو۔
مورے پاس اُس تکسے میں ـــــ وہ
سڑک کے پار اپنے سامان کی طرف اشارہ کر کے اُسے
بتانے لگی ـــــ پورے بیس کم ڈھائی سو روپے
ہو گئے ہیں۔
باپ رے! تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے
آگئے؟
مانگنے والے کو کیا ناہیں ملتا، بڈھے؟
میں نے تمہیں بھی مانگ لیا ہے ـــــ لنگڑی
نے اپنے خالی ہاتھوں کا دودھ کا کٹورا بنا کے اُسے
بڈھے کے ہونٹوں سے جوڑ دیا ـــــ ایسی
صدا بھلا کونسی بھکارن نے لگائی ہوگی، اپنے آپ کو
بھی مورے پیالے میں ڈالتے جاؤ بابا ـــ اپنے
آپ کو بھی مورے ـــــ؟ ـــــ
دو بچھڑے راستے گلے ملنے کے لئے بے اختیار
ایک دوسرے کی طرف بڑھتے چلے آئے۔
آؤ بڈھے، کہیں کوئی چھوٹا سا جھونپڑا بنا لیں
اور اپنا گھر بسا لیں۔
راستے بے صبری سے دھول اڑاتے ہوئے
بغلگیر ہو گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک ٹھہری
ٹھہری شاہراہ کی تصویر کھنچ آئی۔ ـــــ
ـــــ اب تم لیٹ جاؤ بڈھے ـــــ لنگڑی
گویا گنگنا رہی تھی ـــــ میں تمہارے پاؤں دابتی
ہوں۔
اینٹوں پر سر رکھ کر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے
بڈھے کو لگا کہ وہ اپنے جھونپڑے کی چار دیواری میں کھاٹ
پر لیٹ گیا ہے۔
پچھلے کی سوجھ بوجھ نہ ہو جائے بڈھے ـــــ
لنگڑی نے اُس کی ٹانگ اپنے ہاتھوں میں لے لی ـــــ تو
آگے کا بھی اتنہ پتہ نہیں ملتا۔ موجھے اپنے پچھلے کی ساری
باتیں کھول کر بتا دو۔
میں کیا اور میری باتیں کیا لنگڑی؟ بار بار بس
ایک یہی بڈھا، بڈھا کہتی جاؤ اور میری ساری کہانی ختم۔
ـــــ بڈھا! ـــــ بڈھا! ـــــ بڈھا!
ارے ناہیں بڈھے! اس تراں تو تمہاری کہانی شرو ہو جاتی
ہے۔ چلو، سب سے پہلے بتاؤ، تمارا اسلی نام کیا ہے؟
میں کوئی ہوں ہی نہیں، تو میرا اصلی نام کیا؟
یا پھر کوئی نام ہے تو یہی ہے جو ہے، بڈھا۔
ہاں، موجھے مالوم ہے تم بڈھے کے بڈھے
ہو، پر اپنے جونم کے وکھت تو بڈھے نہ تھے۔
تمہیں کیسے معلوم ہے لنگڑی، کہ میں کبھی جنما تھا۔
لنگڑی کا ہاتھ پھر بڈھے کے پھوڑے کو چھو گیا

اور وہ اچھل کر بولا،

سپوٹرا کیوں چھوتی ہو رہی ہے؟ ———

اپنے من پسند مرد کے دُکھ کی ٹوہ پاکر لنگڑی کی آواز میں مرہم کی آنچ اور نرمی بھر آئی ——— ارے باؤلے، تمارے کوئی ماں تو ہوگی ہی۔

نہیں لنگڑی، مجھے، تو جو کچھ ہو تم ہی دِکھ رہی ہو، ماں بھی اور بیوی بھی۔

لنگڑی کی چھاتیاں ایک دم دودھ سے بھر گئیں۔

تمیں کا مالوم، بڈھے، تم کیا چیج ہو؟ مورا کھاؤند بننے پر تم راجی نہ ہوتے تو مَیں تمیں اپنا بیٹا ہی بنا لیتی۔ پھر بھی جاد کرو تماری اسلی میا کون تھی؟

بڈھے کو محسوس ہونے لگا کہ وہ ننھا منا سا وہ اپنے وجود کی مٹی میں گھٹنوں پر چل چل کے کھیلنے لگا ہے۔

میری اصلی میا میری اپنی ہی ماٹی کے سوا کون ہو سکتی ہے؟ مَیں اسی لئے گھوم پھر سکتا ہوں لنگڑی، کہ میری بچی کھچی ماٹی ابھی تک میری جڑیں سنبھالے ہوتے ہے۔

کیا سنبھالے ہوتے ہے رے؟

لنگڑی نے پوچھا ——— ؟

جرا اپنی سورت تو دیکھو، اُکھڑے ہوتے جھاڑ کی تراں سوکھے سوکھے ہی جئے جا رہے ہو

لاؤ، اب دوسری ٹانگ ادھر کرو۔

تم میری ٹانگ دابتی ہو لنگڑی تو مَیں ہرا بھرا ہو جاتا ہوں۔

ہمارا جھونپڑا بن لینے دو، پھر دیکھنا، تماری لنگڑی تمیں کتنا سکھ دیتی ہے ——— لنگڑی گویا بول نہ رہی تھی بلکہ جو بول رہی تھی اُسے کر رہی تھی ———

تم کام سے لوٹا کروگے تو پہلے تمیں نہلا دھلا کر کھانے کی چوکی پر بٹھاؤں گی اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی، پھر تمارا کھاٹ بچھاؤں گی اور پھر تماری پنڈلیوں پہ مٹھیاں بھر بھر کے تماری ساری تھکن نکال دوں گی، اور تم چین سے سو جایا کروگے۔

بڈھا لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اری لنگڑی، کہیں سچ مچ تم ہی نے تو مجھے جنم نہیں دیا؟

لنگڑی نے اُسے دھکا دے کر پھر لٹا دیا۔

اورتیں اپنے مردوں کی مائیں بھی نہ ہوں بڈھے تو اُن کے بچے کیسے جنیں؟ مَیں تماری جڑوں کو اپنے دل میں داب لوں گی، پھر دیکھنا کس تراں لہلہانے لگوگے۔

لنگڑی! ——— لنگڑی! ——— لنگڑی!

لنگڑی کے پیار کی شدت سے بڈھے پر رقت طاری ہو گئی۔

میں اب بے فکری سے اپنا سارا بیج آپ تمہاری مٹی میں بو دوں گا۔ تم تو سدا رہوگی لنگڑی، مرنا تو صرف مجھے ہے مگر میرے بیج سے جو پودا تمہاری مٹی سے پھوٹے گا، مَیں بھی اُس میں زندہ رہوں گا لنگڑی۔ ہم دونوں کبھی نہیں مریں گے۔

بڈھا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا ——— لو، میں تمہیں اپنے بھیتر کا ایک قصہ سناتا ہوں۔ دھیان سے سنو۔ مَیں بار بار یہ سپنا دیکھتا ہوں ——— نہیں سوتے میں ہی نہیں، چلتے چلتے بھی ——— بڈھے نے اپنی آنکھیں ہوا میں کھبو رکھی تھیں ——— ایک بڑا گھنا جنگل ہے۔ اتنا گھنا، لنگڑی کہ اُس میں صرف کیڑے مکوڑے، جانور اور پرندے رہتے ہیں۔ وہاں کبھی کسی انسان کا گزر نہیں ہوا۔ اور سنو۔ اس جنگل کے عین بیچ میں ایک بہت ہی بوڑھا برگد ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں لنگڑی کہ کتنا بوڑھا ———

کہیں تم آپ ہی وہ برگد تو نا ہیں بڈھے؟

ٹوکو نہیں لنگڑی۔ اُس برگد کی جڑیں اَن گنت

سیکڑوں مکوڑوں کے بلوں میں سے ہو کر گزرتی ہیں، اُس کی شاخوں پر بے حساب پنچھیوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں اور اُس کی اتنی بڑی چھتری کے نیچے نا معلوم کتنے جانور کھیلنے کو آ نکلتے ہیں اور وہ بوڑھا برگد اُنھیں دیکھ دیکھ کر اپنی بے شمار ڈاڑھیاں ہلانے لگتا ہے اور خوشی سے جھومنے لگتا ہے اور اُسے جھومتا ہوا پا کر مینڈکوں کے پیچھے لگے ہوئے سانپ اپنے شکار بھول جاتے ہیں اور اُس کی طرف پھن پھیلا کر اُسی کی طرح جھومنے لگتے ہیں۔

سن رہی ہو، لنگڑی؟

ہاں، بڈھے۔

پھر نا معلوم کب اور کیسے وہ ٹھہرا ٹھہرا جنگل ملیا میٹ ہو جاتا ہے اور اُس کی جگہ چاروں طرف راستے ہی راستے دوڑنے لگتے ہیں اور —— نہیں، لڈو کو نہیں —— اور تمہارا بڈھا اُن راستوں کی بھگدڑ میں کبھی یہاں دکھائی دینے لگتا ہے، کبھی وہاں اور کبھی کہیں بھی نہیں۔

بچارتیں بجھوانا چھوڑو، بڈھے، تمہاری ساری کہانی موری سمجھ میں آگئی ہے۔

تمہاری سمجھ میں کیا آیا ہے؟

سب کچھ آ گیا ہے۔ میں بھی تو بجار میں بیٹھ کر اپنی اکل کی کمائی کرتی ہوں۔

یہی تو مشکل ہے لنگڑی، کہ ہم سبھی عقل کی کمائی کرنے لگے ہیں۔ بڈھا اُسے سمجھانے لگا —— سبھی اپنی اپنی دس انگلیوں کی کمائی کریں تو سب کے جھونپڑے بن جائیں۔

تم بھی سیدھے سادے برگد سے اکل وند آدمی بن گئے، اسی لئے کھو گئے۔

کھو تو گیا لنگڑی۔

لنگڑی نے جواب دینے کے لئے منہ کھولنے سے پہلے اپنے پلو میں بندھے ہوئے پیسوں کو مٹھی میں لے لیا —— ہمارا جھونپڑا بن جائے گا تو تم آپ ہی آپ سیدھے گھر آ پہنچو گے۔

ہاں لنگڑی، اس وقت تو یہ حال ہے کہ بھٹک بھٹک کر اپنا بھوت بن کر رہ گیا ہوں۔

ہاں، مو جھے مالوم ہے، مگر مورے ہوتے ہوئے تمہیں کس بات کی پھکر ہے۔

بھوت کے ساتھ گھر بسانے سے تمہیں ڈر نہیں لگتا لنگڑی؟

تم پھکر مت کرو بڈھے۔ میں پھر سے تمہیں برگد بنا دوں گی اور تمہارے آس پاس ویسا ہی ایک بوہت گھنا جنگل بسا دوں گی۔

وہ دونوں تھوڑی دیر چپ چاپ اُس جنگل کے قیام کو اپنی آنکھوں میں آباد کرتے رہے، پھر لنگڑی بولی، اچھا، اب تم سو جاؤ۔ میں بھی جا کے سوتی ہوں۔

سڑک میں اتر کر وہ اپنا وجود سامنے کے فٹ پاتھ کی طرف گھسیٹنے لگی اور ابھی مشکل سے سڑک کے درمیان ہی پہنچی تھی کہ دفعتاً ایک نہایت تیز رفتار ٹرک نمودار ہوا اور اُسے روندتا ہوا گزر گیا۔ بڈھا بے اختیار ٹرک کے پیچھے دوڑا، مانو وہ لنگڑی کو لے اڑا ہو، اور پھر بے بسی سے رک کر وہ منہ سے جھاگ اور گالیاں چھوڑنے لگا اور پھر ہاتھ ملتے ہوئے لنگڑی کی طرف پلٹ آیا جس کے خون سے سڑک لت پت ہو گئی تھی۔ وہ لاش کے قریب آ کے اُسے گھور گھور کر دیکھتا رہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے چلے آئے اور پھر وہ یکلخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

رو رو کے بڈھا جب ٹھنڈا ہو گیا تو اُس کے ذہن کے کسی سوراخ سے یہ سوچ ناگ کی طرح رینگ آئی کہ تھوڑی دیر میں پولیس آئے گی۔ اگر وہ وہیں مرکا

رہا تو پولیس اُسے باندھ کرلے جائے گی۔ اسی دوران بجلی کی زرد روشنی میں اُس کی نظر لنگڑی کے دوپٹے پہ آجمی، جو اُس کی لاش کے پہلو میں خون سے لتھڑا پڑا تھا۔ چپکے سے دوپٹے پر جھک کر اُس نے پلو کی گانٹھ سے اپنے پینتالیس روپے اور لنگڑی کے بکسے کی چابی ہاتھ میں لے لی اور فٹ پاتھ کی طرف مڑ گیا۔

لنگڑی کے بکسے سے بڈھے کو پورے بیس کم ڈھائی سو روپے ملے، جنھیں اُس نے جیب میں ڈال لیا اور پھر اتنی بے خبری سے سڑک پر چل نکلا کہ چلتے ہوئے کہیں دکھائی ہی نہ دے رہا تھا، بس ایک خالی راستہ تھا جو نامعلوم کدھر جا رہا تھا۔

افضال ملک
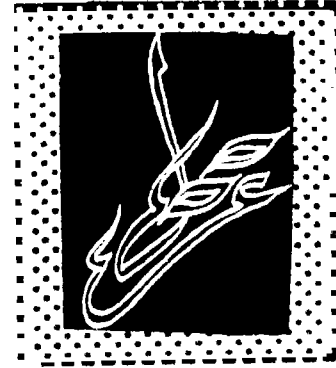
رازِ دل یونہی ہر اک شخص پہ افشا نہ کرو
تم ملو سب سے مگر سب پہ بھروسا نہ کرو
سوچتے رہنے کی عادت تو ہے اچھی لیکن
ہر گھڑی، ذہن میں الجھاؤ سا رکھا نہ کرو
قرب کا چاند نہیں، یادوں کے تارے بھی نہیں
میری راتوں میں اب اتنا بھی اندھیرا نہ کرو
سنگ دل لوگ تماشہ بھی بنا لیتے ہیں
اشک، پلکوں کی منڈیروں پہ سجایا نہ کرو
ریت کی آندھی جھلس جائے گی افضال ملک!
اونٹ کے پہلو سے، خود کو ابھی اونچا نہ کرو

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

ہستی کو جمال دے رہا ہوں
میں تیری مثال دے رہا ہوں

معنی پہ چڑھا کے غازۂ نو
لفظوں کو خیال دے رہا ہوں

ماضی پہ نگہ ہے اپنی گہری
فردا کو میں حال دے رہا ہوں

شیشہ گری ہے عجیب میری
آئینے کو بال دے رہا ہوں

ماحول میں ہے کچھ ایسی خنکی
جذبات کو شال دے رہا ہوں

پھنس کر یوں شکنجے میں گنہ کے
مکڑی کو میں جال دے رہا ہوں

دل لوٹ گیا تو کیا؟ کرامت
پیغام وصال دے رہا ہوں

آمنہ ابوالحسن

بڑی خالہ کی پوری اولاد میں چھوٹی آپی ازل سے بڑی گنوں والی تھیں۔ جب بچپن کی سرحد پھلانگ کر جوانی میں قدم رکھا تو شادی کا مسئلہ چھڑا۔ بڑی خالہ نے اپنی سی کوشش کی کہ یہ بچی خاندان سے باہر نہ جائے مگر خالو آبا اڑ گئے۔ حاجی صاحب کا گھرانہ معمولی نہ تھا۔ ذات پات اور تمام دنیوی خوبیوں سے مالا مال۔ مذہب کی پوری پابندی اور حاجی صاحب کی خالو آبا سے چھٹپن کی دوستی۔ چنانچہ ماں کی مرضی کے بالکل خلاف چھوٹی آپا حاجی صاحب کے اکلوتے بیٹے عزیز میاں سے بیاہ دی گئیں۔ چودھویں سال ہنستا ہمکتا لال ان کی گود میں آ گیا تو دلہنا پے کی سرخ اوڑھنی اپنے شانوں سے جھٹک کر وہ گھر گرہستی میں اس طرح مصروف ہوئیں کہ پھر تو اپنی بھی سدھ بدھ نہ رہی۔ ساس سسر نندوں کی خدمت اور میاں کی اطاعت ہی ان کی زندگی تھی۔ چاروں نندوں کی شادی انھوں نے اپنے ہاتھ پر کی اور اس طرح کہ کسی کو ڈھونڈنے پر بھی نکتہ چینی کا موقع نہ ملا۔ ساس نے بہو کو پہچان لیا تھا اس لئے گھر کی ساری چابیاں بہو کے حوالے کر کے وہ بالکل تخت نشین ہو گئیں خاصہ یکتا اور تنہا بیت سلیقے سے جُڑ کر وقت پر ان کے پاس پہنچ جاتا پھر بھلا وہ کاہے کی فکر کرتیں۔ جب ہر کام وقت پر ہو جائے تو پھر فکر بھی کاہے کی۔

بس بہو کی شیفتہ تھیں۔ نماز اور قرآن شریف سے فارغ ہو کر پوتے پوتیوں کو سمیٹے رہتیں۔ جب خیر سے منہ ہاتھ کے ہونے کو آئے تو ان کا کام بس اتنا رہ گیا کہ تخت پر بیٹھی بیٹھی اُن پر نگاہ رکھیں۔ بچے کن ماں باپ کے تھے۔ چھوٹی عمروں سے ہی پنج وقتہ نمازی تھے۔ آنے جانے والے ان بچوں کو دیکھ دیکھ کر دعا کرتے۔ خدایا سب کو ایسی ہی اولاد دے۔ بزرگوں کی خدمت ان کا ادب اور اچھے طور طریقے۔

پھر خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ خاندان بھر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ نہ دکھ نہ بیماری۔ پھر بھی جان جوان عزیز میاں اچانک گزر گئے۔ ماں اپنے تخت پر بالکل کپا ہو گئیں اور حاجی صاحب نے دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا۔ جس کا پہاڑ ایسا بیٹا دیکھتے دیکھتے اللہ کو پیارا ہو جائے اسے دنیا سے کیا مطلب۔

چھوٹی آپی جب بیوہ ہوئیں ان کی عمر مشکل سے بیس سال رہی ہوگی۔ لہلہاتی دریا کی طرح چڑھتی منہ زور جوانی

اور شوہر کی جوان مرگی۔ دنیا ان کے لئے کبھی اندھیری ہوگئی اور ایسی بے رونقی ہر طرف چھائی جیسے کوئی خوشی، کوئی تجلی کبھی اس گھر میں نہ رہی ہو۔ ہائے اس پھول کی قسمت جو ڈالی سے ٹوٹا اور ہاتھ سے کبھی چھوٹ گیا۔

مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ عزیز میاں کے صدمے سے نڈھال ہو کر ساس سسر بھی ذرا ذرا وقفے سے چل بسے۔ بھرا پُرا گھر خالی ڈھنڈار ہو کے رہ گیا۔ جو بھی آتا آنسو بہا کر چلا جاتا۔ چھوٹی آپی گم صم ادھر ادھر تکا کرتیں۔

اپنی طرح دو بیٹیوں کی انھوں نے کم عمری میں شادی کردی اب انھیں صرف بہو لانے کی دیر تھی تاکہ جلد سے جلد وہ اپنی ساس کے خالی تخت پر پہنچ جائیں۔ زندگی سے اب انھیں صرف اتنی ہی دلچسپی تھی کہ اپنی اولاد کے سکھ سے خوش ہولیں مگر رشید شادی کے لئے تیار نہ تھا۔ عمر اور وقت دونوں کا تقاضہ تھا مگر اس کے دل میں یہ ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ اگر بیوی ماں کی طبیعت سے میل کھانے والی نہ ملی تو اس گھر پر یقینی خدا کا قہر نازل ہو جائے گا اور وہ ماں کی بے ادبی یا دل شکنی کسی حالت میں نہیں چاہتا تھا۔ بہنوں نے پھوپیوں نے اپنی سی کوششیں کر ڈالیں۔ اچھی سے اچھی لڑکیاں دیکھیں مگر رشید نے ہاں کر کے نہ دی نہ ہی اپنا ڈر کسی پر ظاہر کیا۔ سردیاں۔ گرمیاں۔ برساتیں سبھی کچھ بیتتے رہے مگر رشید میاں اپنی جگہ تنے رہے۔ نہ گرمی نے انھیں جھلسایا۔ نہ سردی نے جھکایا نہ ہی برساتیں ان کی خاموش زندگی میں کوئی طوفان لا سکیں۔ تھک ہار کر سب چپ ہو رہے

چھوٹی آپی شروع سے ہی نمازی پرہیزگار تھیں اب تو تہجد کی بھی پابند ہوگئیں۔ وقت نے ان کی رنگت کو سنولا دیا۔ حالات کی مار نے ان کے دل آویز نقش و نگار دھندلا دیئے مگر کیا مجال جو ان کی پیشانی پر کبھی کوئی شکن پڑی ہو۔ جس طرح انھوں نے خوشی دیکھی اسی طرح غم کا سامنا بھی کیا۔ مزاج کا استقلال کم نہ ہونے دیا۔ دن بھر خود کو مصروف رکھتیں۔ رات کو عشاء پڑھ کر دو تین گھنٹے جانے کیا سوئیں کہ پھر تہجد کے لئے کھڑی ہو جاتیں ——

ضعیف الاعتقاد لوگ ان کی عبادت گزاری سے اتنا متاثر تھے کہ دم درود کے لئے ہر وقت ان کے پاس آتے جاتے رہتے اور اعتقاد ایسی چیز ہوتی ہے کہ راکھ کی چٹکی کو بھی خاکِ شفا بنا دیتی ہے۔ جو کوئی بھی ان کے پاس آتا ضرور اپنی مراد پاتا مگر مقری بی ایک ہی کائیاں تھیں۔ خدا نے ہر جاندار کو صرف دو آنکھیں عطا کی ہیں مگر مقری بی کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ اُن کے ہر ہر حصّۂ جسم پر آنکھیں موجود ہیں۔ اپنی پشت کسی نے نہیں دیکھی مگر مقری بی اس میں بھی طاق مانی جاتی تھی۔ اب سے نہیں جس تاریخ سے چھوٹی آپی بیاہ کے آئیں وہ خوب جانتی تھیں ان کے بڑے نندوئی توفیق میاں بری طرح اُن پر ریجھے ہوئے ہیں۔ آپس کا معاملہ۔ دن رات کا آنا جانا ایسے میں بھلا کوئی کہاں تک چھپتا احتیاط کرتا۔ چھوٹی آپی سے توفیق میاں کا آمنا سامنا بھی ہوتا رہتا اگرچہ وہ بہت کم ہنسی مذاق میں حصہ لیتیں مگر توفیق میاں نے تو جیسے مصمّم ارادہ کر رکھا تھا کہ ایک نہ ایک دن اس خوبصورت پودے کو ضرور لچکا کے چھوڑیں گے۔

جب تک ساس زندہ رہیں خزانے کے سانپ کی طرح بہو بیٹیوں کو اپنی نگاہ میں رکھا جب وہ مریں تو چھوٹی آپی کی جوانی شوہر کے انتقال کا جھٹکا کھا کر ایسی خاموش ہوئی کہ کبھی سر اٹھا کے نہ دیا پھر بھی ایک آدھ بار توفیق میاں سے ان کی نظر چار ہو جاتی تو انھیں ایسا ہی معلوم ہوتا جیسے ناگ اپنا پھن کھولے پھنکارتا ہوا اُن کی طرف چلا آ رہا ہے کسی نہ کسی کام کے بہانے وہ فوراً سرک جاتیں اور خود پر

لاحول بھیجتیں کہ شاید یہ ان کا وہم ہی ہو ورنہ شریف گھرانوں میں ایسے حادثات کہاں۔ اب توفیق میاں اسی بہانے چھوٹی آپی کے گھر آجاتے کہ گھر میں مرد نہیں اور رشید کو بڑوں کی صحبت اور شفقت کی سخت ضرورت ہے بغیر بڑوں کے بچے اخلاق و آداب سے کیسے فیض یاب ہوں۔ رات کا کھانا وہ رشید کے ساتھ چھوٹی آپی کے پاس ہی کھاتے اور کافی وقت رشید کے ساتھ گزار کر گھر پلٹتے۔ چھوٹی آپی نے کئی بار ہمت کی کہ کہہ دیں۔ آپ نہ آیا کریں۔ رشید کے لئے میں ہی کافی ہوں مگر کبھی کہہ نہ سکیں۔ نندیں بُرا نہ مان جائیں اور پھر ان کے اپنے اخلاق مانع رہے کہ ایسی بدتمیزی بدتہذیبی کر ڈالیں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ رشید ابھی گھر نہ آیا تھا کہ اُس روز توفیق میاں کانپتے کپکپاتے آئے اور دھم سے دالان والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ پکار کے چھوٹی آپی سے بولے۔

خدا کے لئے مصری بی سے انگیٹھی بھجوا دیجئے ذرا ہاتھ پیر تاپ لوں تو جان میں جان آئے۔

چھوٹی آپی نے انگیٹھی دہکا کر بھجوا تو دی مگر اس سردی میں بھی ان کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھنے لگیں کہ رشید آجائے تو جان میں جان آئے۔ خدا خدا کرکے رشید آیا۔ اور مصری بی نے پھوپا بھتیجے کو کھانا کھلایا تب چھوٹی آپی نے اطمینان کی سانس لی کہ اب توفیق میاں چلے مگر رشید نے اُس رات پھوپا کی حالت دیکھ کر انھیں جانے ہی نہ دیا۔ اصرار کرکے ٹھہرا لیا۔

عشاء کے وقت تک تو مصری بی برابر پہلو بدلتی رہیں مگر جب رات گہری ہوئی اور سردی نے سب کچھ منجمد کر دیا تو وہ بھی غافل ہوگئیں۔ رشید بھی گہری نیند سویا ہوا تھا صرف چھوٹی آپی جاگ رہی تھیں اور تہجد کے وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔ آج نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بمشکل شام وقت گزرا اور وہ تہجد کے لئے کھڑی ہوئیں تو مصری بی نے کلبلا کر کروٹ بدلی اور چپکے سے توفیق میاں کو جگایا۔ انتظار میں ایک عمر بیت چکی تھی جو باقی تھی نہ جانے کب ختم ہوجائے۔ انھوں نے آہستہ سے آنکھیں ملیں۔ چپکے سے اٹھے۔ رضائی کو دوہرا کے پلنگ پر ڈالا اور پاؤں دبا کے اندر چلے۔ چھوٹی آپی عبادت میں مصروف تھیں۔ بہ کٹارسی بھویں۔ نشیلی آنکھیں مختصر دہانہ۔ خوبصورت خمیدہ ٹھوڑی۔ چمکیلا رنگ۔ اُنھیں بے اختیار وہ زمانہ یاد آیا جب وہ دلہن بن کر آئی تھیں اور رونمائی کے وقت اُنھیں دیکھ کر پہلی بار وہ اپنی بیوی کو بھول گئے تھے۔ چپ چاپ دروازے سے لگ کر کھڑے ہوگئے کہ عبادت ختم ہو تو آگے بڑھیں کہ چھوٹی آپی نے گلدانا کھولا۔ کچھ دم کرکے اپنے سینے پر پھونکا۔ جاء نماز سمیٹ کر اٹھیں تبھی توفیق میاں آگے بڑھے اور چھوٹی آپی کو اپنی باہوں میں بھر لیا۔ ایک ثانیے کو تو چھوٹی آپی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر بے اختیار لڑکھڑا گئیں۔ ارادے کے باوجود چلّا نہ سکیں۔ اگر جوان بیٹا اُنھیں اس حالت میں دیکھ لے تو۔؟

آنکھوں میں خوف سے اندھیری سی آئی اور بے ہوش ہوگئیں۔

توفیق میاں نے اٹھا لیا کہ اندر والے کمرے میں لے چلیں مگر عجلت میں چلتے چلتے چوکھٹ سے ٹھوکر لگی اور وہ چھوٹی آپی سمیت دھم سے فرش پر جا پڑے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ گھبرا کے پھر چھوٹی آپی کو اٹھا لیا کہ کسی طرح اندر تک پہنچ لیں کہ رشید کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ دوڑا دوڑا دالان میں آیا اور زنّاٹے سے چلّایا۔

پھوپا میاں....!

توفیق میاں نے چھوٹی آپی کو وہیں پٹخا اور

اور سہاگ لئے۔ چوکھٹ سے ٹکرا کر چھوٹی آپی کی
پیشانی لہولہان تھی اور ان کا چہرہ سُتے ہوئے کپڑے
کی طرح سفید نظر آ رہا تھا۔ رشید نے سنبھال کر ماں
کو اٹھایا اور احتیاط سے پلنگ پر لٹایا۔ منہ پر آہستہ
آہستہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ چھوٹی آپی نے
ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور رشید کو دیکھ کر
بے اختیار سسک پڑیں۔

رشید نے غصّے سے تھرتھراتی اپنی آواز
پر قابو پا کر ماں کو بے تحاشہ سینے سے لگا لیا اور
نرمی سے بولا۔

اماں !

اماں !!

"صبح ہمیشہ بے داغ ہوتی ہے۔ کبھی میلی نہیں
ہوتی اماں۔"

اُسی وقت اُس کی نظر مقری بی پر پڑی جو منہ ڈھانپے
دبے قدموں توفیق میاں کے پیچھے باہر جا رہی تھیں۔
رشید کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج اس کے گھر سے
شیطان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔

اِس شمارے میں

دوسرا سرورق: حصار کے قلعے میں لال پتھر کی مشہور مینار

تیسرا سرورق: ڈیرہ باباشیتل پوری، کیتھل

چوتھا سرورق: ہمم کی مشہور باؤلی

کندن گوڑ گانوی

ریزہ ریزہ تشنہ صحرا کو سمندر دے گئے
اک ہری پتی مجھے آگے کا منظر دے گئے

کیا ہوا تھی، دشمنی بندھوا گئی ہر شخص سے
شہر بھر کے سرکشوں کے مجھ کو تیور دے گئے

پا بیتوں کی تھاہ پانی ہے تو صحرا میں اتر
بوند بالو ریت پر پیغام لکھ کر دے گئے

سیپیوں کے منہ میں دانے ڈال کر ظالم ندی
کھیلنے کے واسطے بچوں کو پتھر دے گئے

رونا ہونا ہے مجھ کو، چاہے دنیا باولی
گاڑ کر گہرے ہیں سِل بھی ایک اوپر دے گئے

فصلِ گل کی قاتلہ ہو گی جو میرے ہاتھ میں
بھاگتی سی، ہنس کے، خون آلود خنجر دے گئے

آگ پانی کو، ہوا کو جس سے اہمیت ملی
وہ چلو مٹی سہی، مجھ کو تو پیکر دے گئے

نذیش کمار

ہانسی کا یادگار مُشاعرہ

ہانسی کے مشاعرے میں شمع مشاعرہ روشن کرتے ہوئے سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ

بزم ادب اُردو ہانسی کی جانب سے تاریخی شہر ہانسی میں گذشتہ دنوں ایک کل ہند اردو مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی نے اس مشاعرے کی صدارت فرمائی۔ بزم ادب کے صدر جناب امیر چند ہکر ممبر اسمبلی وچیرمین ایم۔آئی۔ٹی۔سی ہریانہ نے گورنر ہریانہ کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر جناب ارجن داس کھانڈہ والا نے بابا فرید گنج شکر پر ایک کتاب گورنر موصوف کی خدمت میں پیش کی۔ بابا فرید نے ہانسی میں ہی درگاہ چہار قطب کے مقام پر بارہ برس تک عبادت کی تھی۔

شمع مشاعرہ روشن کرنے کے بعد جناب سید مظفر حسین برنی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اُردو زبان محبت کی زبان ہے، ایک تہذیب ہے۔ غزل کی مقبولیت اس زبان کی مٹھاس کا ثبوت ہے۔ اپنی تقریر کے دوران موصوف نے فرمایا "مشاعرہ کی وجہ سے مجھے وہ مقام دیکھنے کا موقع ملا جو متبرک اور محبت کا سمندر رہے۔ میں بچپن میں ہانسی آیا تھا، درگاہ چہار قطب کی زیارت کی تھی۔ جو محبت اور اخلاص اس زمانہ میں تھا، وہی آج میں چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔"

معروف شاعر جناب بشیر بدر نے میر مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ اس کل ہند مشاعرے میں جمیل تاباں، ممتاز انجم خورجوی، حبیب عاصم، مشیر جھنجھانوی، نصرت گوالیاری، دیوان تصور، نور جہاں ثروت، کرشن کمار مدہوش، ستیہ نند شاکر، قیصر حیدری ——— سلیم شیرازی، اودے بھانو ہنس، جگدیش بھارتی، فاروق بخشی اور ساکا کرتار سنگھ نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔ چند اشعار جنھیں بہت داد ملی اور پسند کئے گئے۔ ذیل میں درج ہیں ـــ

سزا ملی ہے خزاں میں آنکھیں بکھرنے کی
بھری بہار میں جو پھول مسکراتے تھے
(ممتاز انجم خورجوی)

تمہاری شر پسندی سے جلے ہیں کتنے گھر سوچو
کٹے ہیں کتنے سر، اس کا تمہیں احساس کیا ہوگا
بہاؤ خون سڑکوں پہ مگر اتنا کبھی سوچو
وطن جب خون مانگے گا، تمہارے پاس کیا ہوگا
(حبیب عاصم)

تو نے کبھی جو درد کے پودے لگائے تھے
اب آکے دیکھ اُن میں بہت پھول آئے ہیں
(مشیر جھنجھانوی)

گفتگو اُن سے روز ہوتی ہے
مدتوں سامنا نہیں ہوتا
(بشیر بدر)

چلنے لگی زمین تو رُکنا پڑا مجھے
پہلے قدم کے بعد سنبھلنا پڑا مجھے
(نورجہاں ثروت)

میرا نہیں مقام یہ مَیں تو سفر میں ہوں
اپنی نظر سے دور، کسی کی نظر میں ہوں
(کرشن کمار طور)

وقت کے سائے تو چڑھتے ہیں اُتر جاتے ہیں
اپنے محور پہ کہاں دھوپ اُترتی ہوگی
(قیصر حیدری)

ملکہ خورشید

فرق

ہے نظم و ضبط سے تصویر کائنات حسیں
اور تزئینِ گل لالہ سے ہی گلستاں مزین ہے
یہ کائنات کہ ہے
آدمی کے زیرنگیں
جس کی ہر چیز ہے
فطرت کا عطیہ ہم کو
ابر باراں ہو یا کہ ہو دریا
نعمتیں ہیں سبھی بشر کے لئے
مگر اک شرط اعتدال کی ہے
کوئی نعمت نہ ہو فزوں حد سے
ورنہ لعنت بنے گی ہر نعمت،
توڑ دے اپنی حد اگر دریا
آدمی کے لئے تباہی ہے
ٹوٹ کر گر برس پڑے بادل
باعثِ زحمت بشر ہے وہی
گلشنِ زیست میں نہیں زیبا
موجبِ بدنمائی ہوں جو پھول
بس فقط چند پھول ایسے ہوں
باغِ ہستی میں جن سے رونق ہو
جن کے دم سے رہے ہمیشہ بہار
ہے یہی حسن باغِ ہستی کا
ہے اسی نظم و ضبط سے باقی
فرق جنگل میں اور گلشن میں!

آر۔ڈی۔شرما تاثیر

بخشش

پچھلے کئی ماہ سے سیٹھ روکڑی مل کی جو محل نما کوٹھی زیر تعمیر تھی وہ ایک ہفتہ پہلے مکمل ہو چکی ہے۔ آج اُس کا اُدگھاٹن سمارو ہ ہے، یعنی گرہ پرویش کی رسم۔

رام دھن اور اُس کا نوجوان بیٹا برجو شروع سے آخر تک اس کوٹھی کی تعمیر سے وابستہ رہے ہیں مزدوروں کی حیثیت سے۔ رام دھن کا آبائی گاؤں یہاں سے لگ بھگ تین سو میل دُور ہے، روزی کی تلاش اُسے اور اُس کے جوان بیٹے برجو کو یہاں کھینچ لائی ہے اور وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے ہیں یہ کوئی نرالی بات بھی نہیں اس علاقہ کے ہزاروں لوگ رام دھن کی ہی طرح کتنے ہی باہر کے دیشوں میں ہجرت کر کے جا چکے ہیں کچھ عارضی طور پر بیشتر مستقل طور پر۔ شاید یہی قانون قدرت ہے۔ رام دھن اور برجو پچھلے کئی سالوں سے اس شہر میں رہائش پذیر ہیں باپ بیٹا اوسطاً بیس پچیس روپے بچا لیتے ہیں اور باقاعدگی سے چار پانچ سو روپے گھر بھیج دیتے ہیں۔

رام دھن اپنی موجودہ زندگی سے مکمل طور پر مطمئن ہے اُس کی زندگی کا ایک محدود لیکن نہایت ضروری مقصد اس بن باس کے صدقے پورا ہو چکا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے اُس کے پریوار کو کبھی دو وقت پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔

یہ ایک بڑا ترقی پذیر صنعتی شہر ہے کوٹھیوں اور نئے مکانوں کی تعمیر اس رفتار سے ہو رہی ہے کہ اُسے اور اُس کے بیٹے کو باقاعدگی سے مزدوری مل جاتی ہے۔

گھر سے اُس کا رابطہ ڈاک کے ذریعہ قائم ہے ماہ ڈیڑھ ماہ بعد گھر سے خط ملتا ہے جہاں اُس کے گھر والے اپنے جذبات کو کاغذ پر منتقل کرنے کے لئے کسی تیسرے شخص کی مہربانی کے مرہون منت ہیں وہاں رام دھن کی بھی یہی حالت ہے لیکن یہ مشکل کوئی ایسی بھی نہیں۔

رام دھن اور اُس کے بیٹے نے اس سے پہلے بے شمار کوٹھیوں کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا ہے لیکن سیٹھ روکڑی مل کی کوٹھی کا کچھ اور ہی ٹھاٹھ ہے۔ سیٹھ نے سچ مچ روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے اور تمام کام بے حد سرعت سے ہوتا رہا ہے رام دھن نے کبھی اس طرح کے غیر ضروری سوالات پر غور نہیں کیا کہ ان سیٹھ صاحبان کے پاس اتنا دھن آتا کہاں سے ہے؟ یہ بھی نہیں کہ وہ ان سوالات کا جواب نہیں جانتا۔

"یہ سب کرم کھیل ہے، کرم کھیل، ودھی کا

ودھان ہے۔ بھگوان کا بنایا ہے جو کسی کو راجہ کسی کو
رنک کسی کو سیٹھ کسی کو مزدور بنا دیتا ہے ہاں ہاں یہ سب
پچھلے جنموں کے کرموں کے مطابق ہو رہا ہے۔"

لیکن برجو اُس کا بیٹا اُس کا لختِ جگر اس طرح کے استدلال پر کبھی کبھی اُس سے ضرور اُلجھ پڑتا ہے لیکن رام دھن کا وشواس اتنا مضبوط و مستحکم ہے کہ وہ برجو کی الٹی سیدھی باتوں سے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں ہوتا یہ کل کا چھوکرا ان گہرے معاملات کو کیا سمجھے گا۔ کبھی کبھی رات کی تنہائی میں باپ بیٹے میں اس موضوع پر گفتگو چل نکلتی ہے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دونوں کے طرزِ فکر میں نمایاں فرق ہے اُن دونوں میں کافی ذہنی تضاد ہے اس کا کارن یہ ہے کہ بیٹا نئے خیالات سے شدت سے متاثر ہوتا ہے مثلاً وہ یہ بات قبول کرنے سے انکار کرتا ہے کہ دولت کی یہ عجیب و غریب تقسیم لازمی طور پر پچھلے جنموں کے کرموں کے پھل کا نتیجہ ہے وہ اپنے ساتھ کام کرنے والے مستریوں اور دوسرے ہنر جاننے والے لوگوں سے بات چیت کرتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ محل نما کوٹھیاں جس دھن سے تعمیر ہو رہی ہیں وہ کئی بار حق حلال کی کمائی کا دھن نہیں ہوتا۔ ابھی ایک ماہ پہلے اُسے ایک مستری نے ملک بھاگو کی کہانی سنائی تھی کہ کس طرح بابا نانک دیوجی نے اپنے وقت کے ایک امیر ترین شخص کی دعوت اس بنا پر ٹھکرا دی تھی کہ اُس شخص کی کمائی پاپ کی کمائی تھی، اور پھر جب اُس نے اُسی مستری سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا اس یگ میں ملک بھاگو جیسے لوگ موجود ہیں تو مستری نے اُس کی سادہ لوحی پر قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا تھا۔

"واہ بھیاجی! واہ! ارے بھائی ایک ملک بھاگو۔ اس یگ میں تو شاید ایسے بھدر پُرشوں کی گنتی نہ ہو سکے"

لیکن یہ سب وقتی باتیں ہیں جس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ رام دھن اور برجو جیسے لوگوں کو سوچنے کی فرصت ہی کہاں نصیب ہوتی ہے سوچنا، تو چند خوش نصیب لوگوں کے تعیش کا سامان ہے۔ جتنا سخت کام وہ دونوں کرتے ہیں وہ انھیں اس قدر تھکا دیتا ہے کہ عام طور پر رات کو فرش کے بستر پر کمر ٹیکتے ہی وہ نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں برجو کے مطابق وہ ہر روز مر جاتے ہیں اندھیرا ہونے کے بعد اور سورج کے طلوع کے ساتھ ہی پھر سُرجیت ہو اُٹھتے ہیں اور پھر وہی کڑی جسمانی محنت کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔

باپ بیٹے کے سوچنے کے ڈھنگ میں ایک اور نمایاں فرق اُس وقت سامنے آتا ہے جب کسی کوٹھی کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے رام دھن ایسے پھولا نہیں سماتا جیسے یہ کوٹھی اُس کی اپنی ہی بنی ہو اور جب کوٹھی کے مالکان رشتہ دار اُن کے بیٹے بیٹیاں فرطِ مسرت میں جھوم جھوم کر ناچ رہے ہوتے ہیں تو رام دھن بھی خود کو اس خوشی میں شریک سمجھتا ہے اُس کا چہرہ بھی جگمگا رہا ہوتا ہے لیکن اُس کے کلیتاً برعکس برجو کا ردِ عمل بہت عجیب ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس پر کوئی وحشت طاری ہو رہی ہو۔ خاص طور پر اُس وقت جب وہ پری رو جیسی حسین و جمیل امیر زادیوں کو اپنے ہم عمر نوجوانوں کے ساتھ محوِ رقص دیکھتا ہے اُس وقت وہ بھاگ جاتا ہے وہاں سے۔ رام دھن جانتا ہے کہ اُس روز کی برجو کی کمائی اُس کے اندر بھڑک رہی جنسی حیوانیت کی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں صرف ہو جائے گی لیکن وہ سیانا آدمی ہے بیٹے کو روکنے کی کوشش نہیں کرتا وہ خوب جانتا ہے کہ لوگ اگر اُسے پوری مزدوری دینے پر رضامند ہوتے ہیں تو صرف یہ سوچ کر کہ جو کسر اس بوڑھے کے کام میں ہو گی اُسے یہ برجو بہر حال پورا کر دے گا۔

سیٹھ صاحب کی کوٹھی کی آج رسمِ افتتاح ہے اس تقریب میں شہر کے لگ بھگ سبھی معززین مدعو ہیں کوٹھی ایک ہفتہ پہلے مکمل ہو گئی تھی لیکن اُدگھاٹن کا مہورت آج کا نکلا ہے۔ شہر کے ایک مانے ہوئے ودوان جیوتشی نے مہورت نکالا ہے۔

رام دھن اور برجو اسی کوٹھی کے پاس ہی ایک کھنڈر نما عمارت میں رہائش پذیر ہیں جسے عُرفِ عام میں بھوت بنگلہ، کہتے ہیں اس کی وراثت کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس لئے یہ عمارت گورنمنٹ کی تحویل میں ہے لیکن آج کل اُس میں رام دھن اور اُس جیسے اور مزدور اور بے سہارا لوگ رات کاٹ لیتے ہیں اس کے علاوہ یہ عمارت آوارہ حیوانات کی آماجگاہ بھی ہے یہ سب لوگ بھوت پریتوں سے نہیں ڈرتے کم سے کم آج تک اس مخلوق سے اُن کی ملاقات نہیں ہو سکی۔

رام دھن نے اپنے گھر والوں کو چِٹّھی پتر کے لئے سیٹھ صاحب کا پتہ ہی دے رکھا ہے اور وہ ہر روز پتہ کرتا ہے بے حد اشتیاق اور اُمید لئے وہ ہر روز سیٹھ صاحب کے گھر اپنے پوسٹ کارڈ کے لئے پہنچتا ہے یہ اُس کا معمول ہے ہر چند کہ وہ جانتا ہے کہ خط تو اس کا پندرہ بیس روز کے وقفہ سے ہی آتا ہے۔

حسبِ معمول وہ آج بھی سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر پہنچا بڑی گہما گہمی ہے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ آج شاید سیٹھ صاحب تک رسائی بھی نہ ہو سکے لیکن کافی دیر سے گھر سے خیر و عافیت کا پیغام بھی تو نہیں ملا اور پچھلے چند روز سے وہ کچھ زیادہ ہی بے چین و مضطرب ہے۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح سیٹھ صاحب کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا سیٹھ صاحب نے کوئی خاص توجہ نہیں دی صرف اتنا کہا:

" رام دھن! شام کو پتہ کر لینا ابھی ہم لوگ بہت معروف ہیں۔"

رام دھن کو کوفت ہوئی اور جب اُس نے اصرار کیا تو سیٹھ صاحب جھنجلا اٹھے انھوں نے اس اصرار کا بالکل غلط مطلب نکالا اور غصہ میں جو الفاظ انھوں نے کہے وہ اس نیک سیرت انسان کے دل کو چھلنی کر گئے! اُف!!

"میں سب سمجھتا ہوں - آپ لوگ بے حد لالچی ہیں۔ بھئی بال بچوں کا اتنا ہی فکر تھا تو یہاں کس نے بلایا تھا تم کام کرتے رہے ہو تو پوری مزدوری لے کر۔ تقریب ختم ہونے دو اس کے بعد آ جانا وہ اپنی بخشیش بھی لے جانا"

سیٹھ صاحب کا چہرہ ایک انوکھے جلال سے تمتما رہا تھا رام دھن بنا بولے واپس لوٹ آیا وہ اُس دن کہیں مزدوری پر بھی نہیں گیا برجو بھی دن بھر غائب رہا اُسے وہی پرانا دورہ پڑا تھا۔ آج بھی وہ دن ڈھلے لوٹے گا اور حسبِ معمول پیتے ہوئے ہوگا۔

شام ہوئی تو رام دھن کے قدم ایک بار پھر سیٹھ صاحب کی کوٹھی کی طرف اُٹھ گئے اُس کے دِل کی بیقراری نے اُسے صبح والی سرزنش بھلا دینے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر یہ کوئی اَن ہونی یا نئی بات تو تھی نہیں۔

اُدھر تقریب ختم ہو چکی تھی اور سیٹھ صاحب ایک طرف بیٹھے تھے مسرور و مطمئن شاید اُنھیں بھی احساس تھا کہ صبح یوں آپے سے باہر ہو جانا واجب نہیں تھا۔ رام دھن کو دیکھ کر بولے۔

" بھیا! تمہارا کوئی خط نہیں۔ خیر ٹھہرو اپنی بخشیش لے جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جیب ٹٹولنے لگے اُن کی جیب اُن کے رشتہ داروں دوستوں اور دیگر معززین کے تاروں سے بھری پڑی تھی اُن لوگوں کے پیغامات تھے جو خود حاضر نہ ہو سکے۔ سیٹھ صاحب کو یاد آیا کہ ابھی تک اُنھوں نے ان تاروں کو ڈھنگ سے دیکھا ہی نہ تھا۔

" بھیا بیٹھ جاؤ۔۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔ ارے بھئی جلدی کیا ہے ؟"

" نہیں سیٹھ صاحب اجازت دیجئے میں بخشیش لینے نہیں آیا تھا خط کا پتہ کرنے ہی آیا تھا۔ اب میں چلتا ہوں اچھا! رام رام!"

یہ کہہ کر رام دھن واپس ہوا لیکن ابھی چند گز ہی

گیا ہوگا کہ سیٹھ صاحب نے آواز دی۔

"رام دھن! کبھی بخشیش نہیں تو اپنا یہ تار تو لے جاؤ۔"

"تار؟" رام دھن کا سر چکرانے لگا۔ تار؟ اس کے لیے۔ ضرور کوئی مصیبت آن پڑی!

"سیٹھ صاحب کیا لکھا ہے تار میں۔ کہاں سے آیا ہے تار" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارے بھائی! کانپ کیوں رہے ہو۔ دھیان سے سنو۔ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے بیوی بچے بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ زبردست بارش سے تمہارا مکان گر گیا ہے تمہیں جلدی واپس آنے کو کہا ہے۔"

رام دھن نے سیٹھ صاحب سے تار لے لیا اور واپس اس کھنڈر نما بلڈنگ میں پہنچا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد بر جو نمودار ہوا۔ شراب میں دھت ہوش و حواس سے عاری۔

"باپو کیا بات ہے . . . . . . روشنی کیوں نہیں کی" باپ کے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ دیکھا۔ "یہ کیا ہے باپو؟"

"یہ بخشیش ہے بیٹے! سیٹھ صاحب نے کوٹھی کے اُدگھاٹن کی خوشی میں دی ہے۔"

"باپو پاگلوں جیسی باتیں نہ کرو پہیلیاں نہ بجھاؤ باپو کیا ہے یہ؟" بر جو گرجا اور تار کا کاغذ رام دھن سے چھین کر پاس والے گوسائندار کے پاس لے گیا!

جب واپس آیا تو اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

باپو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے یہ سب کرم پھل ہے ایک گھر بن گیا ایک ڈھ گیا۔ ایک ہی بات ہے بڑا گہرا سمبندھ ہے ان دونوں میں یقین نہ ہو تو اس یدوان جیوتشی مہاراج سے پوچھ لو جس نے سیٹھ روکڑی مل کی کوٹھی کا مہورت آج کا نکالا ہے تمہاری اور سیٹھ صاحب کی راشی ملتی ہے باپو سو فی صدی ملتی ہے"

رام دھن چپ رہا۔ آج پہلی بار اسے اس چھوکرے کے سامنے جو پورے ہوش میں بھی نہ تھا کچھ کہنے سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ شکست کھا گیا تھا اور آج اس کے پاس ان زہریلی اور طنز بھری باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا..

قیس جونپوری

غزل

غموں کی دھوپ میں پنہاں کوئی بہار ہے کیا؟
یہ ریگ زار یہ صحرا کبھی لالہ زار ہے کیا؟

زمیں کی مانگ شعاعوں سے بھر گیا سورج
فلک کو خاک نشینوں سے اب بھی پیار ہے کیا؟

مرے خلوص کا دریا اُمڈ پڑے نہ کہیں
تمہارے دل سے رواں کوئی آبشار ہے کیا؟

جدھر بھی جاؤ کوئی منھ سے بولتا ہی نہیں
یہ شہر شہرِ خموشاں سے ہمکنار ہے کیا؟

ملا تھا کل جو سرِ راہ لڑکھڑاتے ہوئے
یہ آدمی تو وہی قیسؔ بادہ خوار ہے کیا؟

نومبر ۱۹۸۴ء کا محبوب و مصور ماہنامہ "تعمیر" نظر نواز ہوا۔ تعمیر اپنی کم قیمت اچھے اوراق، معیاری مضمون ہونے کی وجہ سے ادبی جرائد میں خاص مقام کا حامل ہے۔ اس میں پیش کیے جانے والے سبھی آرٹیکل اچھے ہوتے ہیں۔ اس ماہ پیش کی گئی غزلیں نظمیں اور افسانے کافی پسندیدہ ہیں۔ لیکن ڈاکٹر جاوید کا مقالہ "صالحہ عابد حسین کی ناول نویسی" روشن بڈھیا لوی کی "پیغامبر امن۔ پنڈت جواہر لال نہرو" کافی پسند آئیں۔

میری ذاتی رائے ہے کہ کہ گاہے گاہے خاص نمبر" بھی نکالئے تاکہ اس کی مقبولیت اور اہمیت ادبی حلقوں میں زیادہ ہو!

ایم۔ ناصر احمد۔ رمضان پور

تعمیر ہریانہ کا نومبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ ملا۔ مذکورہ شمارہ "شریمتی اندرا گاندھی: خراجِ عقیدت"، خصوصی نمبر کی حیثیت رکھتا ہے اس دلکش شمارہ میں عظیم رہنما شریمتی اندرا گاندھی آنجہانی سے متعلق دلچسپ مواد ہر حیثیت سے قابلِ مطالعہ ہے۔ مختلف تصاویر کی شمولیت سے بھی اس شمارہ کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔

تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں کہ نہایت مختصر مدت میں آپ نے اتنا لاجواب نمبر نکالا اور شاد کام کیا۔

مصباح اللہ۔ مدراس

تازہ شمارہ بابت نومبر ۱۹۸۴ء نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں "شریمتی اندرا گاندھی۔ سوانح عمری" کارآمد مضمون ہے۔ ڈاکٹر جاوید احمد نے اپنے مقالہ "صالحہ عابد حسین کی ناول نویسی" میں صالحہ کی ناول نویسی پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ان کی انفرادیت کو واضح کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اس مقولہ کی روشنی میں عشرت امبر کا افسانہ "کچے دھاگوں میں لپٹا فیصلہ" پورا اترتا ہے۔ منظومات میں مہدی پرتاب گڈھی کا "نذرانہ عقیدت" فن کی بلندی پر نظر آتا ہے۔

کوکب حسرتی۔ مظفر پور

تعمیر کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ۔ مرحومہ شریمتی اندرا گاندھی کی موت اور شخصیت پر اس قدر مکمل خاکہ آپ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ان کا ظالمانہ قتل ایک عہد کا قتل ہے۔ جمہوریت اور سیکولرازم کا قتل ہے خدا ان کی روح کو دائمی سکون عطا فرمائے۔

شمیم عالم مصحفی، رانچی

میں تعمیر ہریانہ کا پابندی سے مطالعہ کر رہا ہوں آپ کا جریدہ صوری و معنوی دونوں حیثیت سے لائقِ تحسین ہے۔

شکیل احمد۔ سمستی پور

پبلشر اور چیف ایڈیٹر انل راز دان نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس سی او ۱۹۱-۱۸۹ سیکٹر ۱۷-سی چنڈی گڑھ سے جنوری ۱۹۸۵ء کے لیے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ٹی۔ چنڈی گڑھ۔

Photo : Raj Kishan Nain

تعمیر ہریانہ
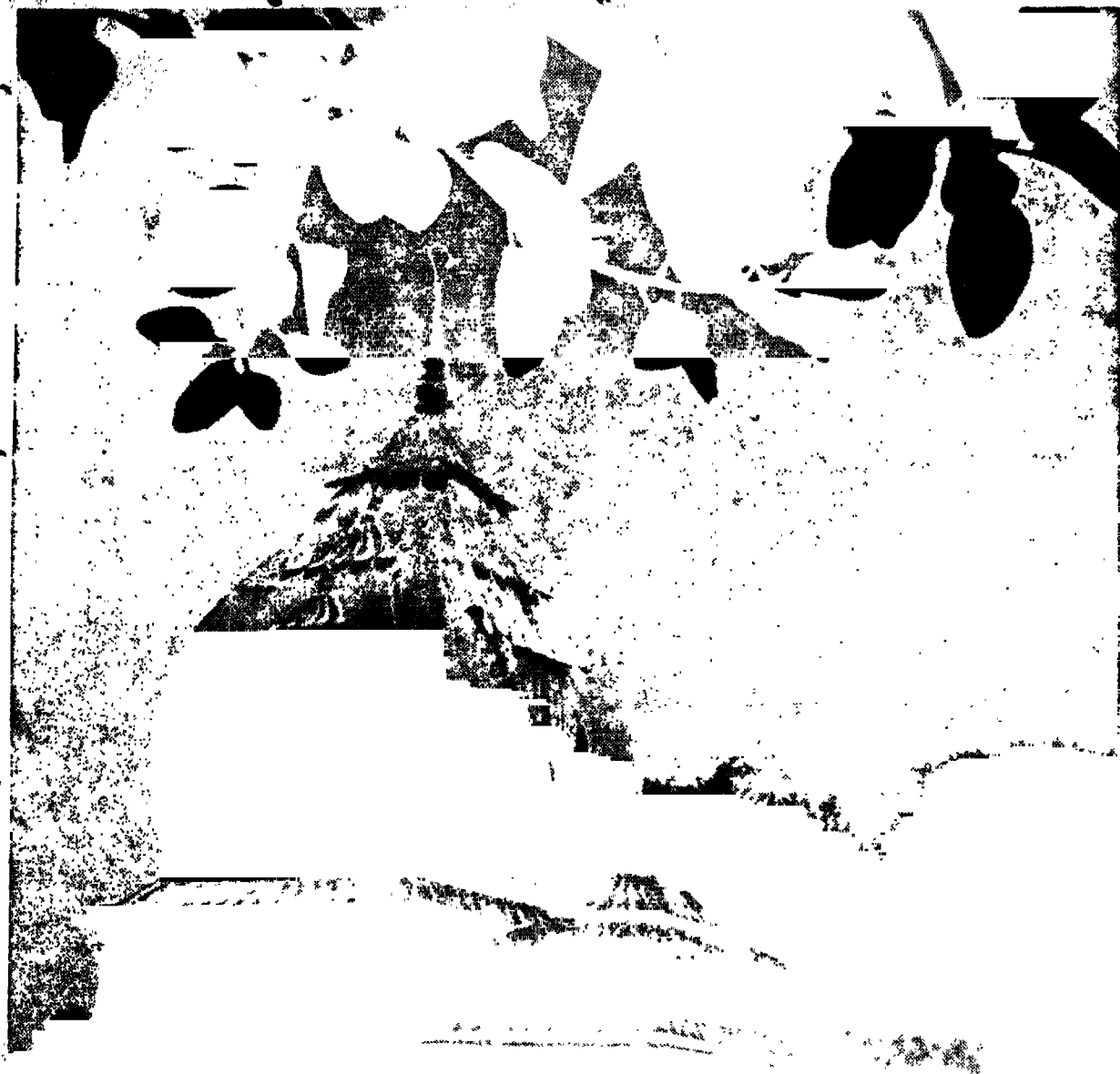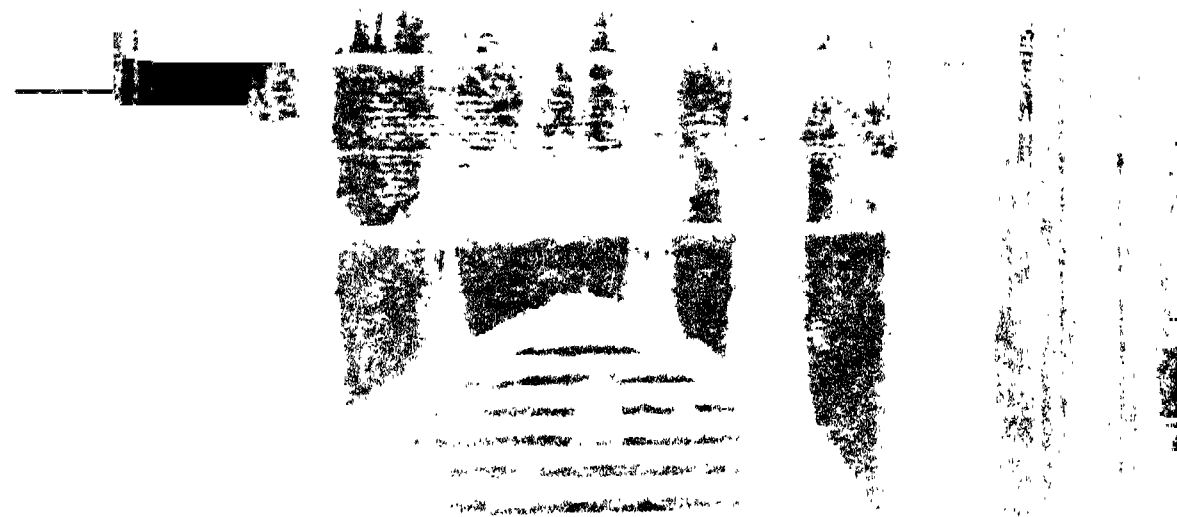
Brahma Sarovar—Kurukshetra

آپ کا محبوب مصور ماہنامہ

مارچ ۱۹۸۵ء شمارہ ۳ جلد ۱۲

مدیراعلیٰ:
اقبال سازدان

مدیر:
ڈاکٹر راجندر روس

نائب مدیران:
سلطان انجم ۔ مدن راہی

سرورق: اے۔ پی۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے

سالانہ ۵ روپیہ

خط و کتابت کا پتہ: مدیر تعمیر ہریانہ

ایس۔ سی۔ او ۱۸۹-۱۹۱، سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ

مضامین کی آرا سے متفق ہونا مدیر کے لئے ضروری نہیں۔

ترتیب

رزّاق افسر

ہولی کا پیغام

رنگ ہولی کے ہیں بکھرے ہر طرف
چہرہ چہرہ اَنگ اَنگ
سارے کپڑے، پوری بستی
گھر سے آنگن
اور آنگن سے گلی تک
پھر گلی سے راستے تک
راستے سے چوک تک
شہر کے اِس اور سے اُس اور تک
گاؤں کی پگڈنڈیوں پر
کھیت سے کھلیان تک
رنگ ہولی کے ہیں بکھرے اس طرح
جیسے ہو آکاش پر
سات رنگوں کی دھنک
رات کو ہولی کی ہر اک چوک بھی
آگ نے ہولی کا ہے ملبہ جلایا
جلتی اور اونچی آگ کی لپٹیں اٹھیں

اتنی ہی باچھیں ہماری کھل گئیں
سب نے اک آواز ہو کر یوں کہا
کہ چلو! ہر اک بُرائی جل گئی
کیا بُرائی اپنی سچ مچ جل گئی
ایک سنّاٹا اِدھر سے ہے اُدھر تک
بس گریبانوں پہ ہے سب کی نظر
آؤ اگلے ورش ہم
ہولی کی کالی رات کی
اِس پوترّ آگ میں
بیکار کے سامان جلانا چھوڑ کر
جھونک دیں ہم
اپنے من کا میل سارا
اپنے من کی کھوٹ پوری
پھر یہ سینہ تان کر
سر اٹھا کر یوں کہیں
لو بُرائی آج ہر اک جل گئی

نشتر خانقاہی

تلاش ایک گمشدہ کی

فور وہیلر کے دھڑدھڑاتے شور اور ہارن کی تیکھی آواز سے ڈر کر روزی، سلطان یوسف زئی کی گود سے اُچھل کر نیچے جا گرا۔ اور صوفے کے پیچھے چھُپ کر اپنے بچاؤ کی کوشش کرنے لگا۔ سلطان یوسف زئی نے جھانک کر صوفے کے پیچھے دیکھا۔ ننھا جانور سہما سہما سا ایک کونے میں چھپا بیٹھا تھا۔

شہر میں آئے ان کا یہ دوسرا دن تھا۔ ابھی صرف ایک ہی رات یوسف زئی نے چاروں طرف سے اٹھتے ہوئے شور اور ہنگاموں کے بیچ بسر کی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اس ماحول میں روزی کچھ زیادہ ہی آزردہ ہے۔

سلطان یوسف زئی نے فرسٹ فلور پر بنے اس چھوٹے سے کمرے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ دہلیز سے بالکل ملی ہوتی سڑک، دائیں اور بائیں دونوں طرف تیز رفتار سواریوں اور بے شمار لوگوں کی بھیڑ سے بھری پڑی تھی۔ کونے میں چھپے ننھے روزی نے کسی انجانے خطرے سے گھبرا کر اپنی آنکھوں اور کانوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے پنجوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے ریشم جیسے ملایم بال خوف کے احساس سے روئی کے گولے کی طرح پھول گئے تھے۔ سلطان نے ہاتھ بڑھا کر روزی کو صوفے کے پیچھے سے باہر کھینچ لیا اور گود میں لے کر اسے دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔

سڑک پر بھاگم بھاگ مچی تھی۔ تیزی سے گھومتے ہوئے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ، ہارن اور سیٹیوں کی آوازیں سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتی ہوئی بھیڑ، آوازوں کے ساتھ لپٹی ہوئی آوازیں اور لفظوں کے ساتھ گڈمڈ ہوتے ہوئے لفظ! ایسا دہشت انگیز ماحول تھا کہ اس نے سلطان یوسف زئی کو بری طرح بدحواس کر دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی کنپٹیاں درد سے چیخ رہی ہوں۔ سفید ریشم جیسے بالوں والا خرگوش، جو اب کبھی آنکھیں موندے، سہما سہما سا اس کی گود میں خاموش بیٹھا تھا، چاروں طرف اٹھتے ہوئے شور کے درمیان دھیرے دھیرے سانس لینے کے لئے اپنے نتھنوں سے ہوا کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں ہر بار اس کا پیٹ ربر کی اوسط آکار والی گیند کی طرح پھولتا اور پل بھر کے بعد پچک جاتا۔

یہ جون کے تیسرے ہفتے کا پہلا دن تھا۔ سامنے ٹنگے ہوئے ٹائم پیس کی سوئی اپنے ڈائل پر چھپے بارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابھی برسات کی پہلی بارش نے دھرتی کے ہونٹ تر نہیں کئے تھے۔ موسمی فضا میں برسات سے پہلے کی اُمس تھی۔ اور سورج کی آنچ سے

سڑک پر بچھے کولتار کو پگھلا کر گیلا کر دیا تھا۔ اچانک سلطان یوسف زئی کو محسوس ہوا جیسے چھت پر لگے پنکھے کی سائیں سائیں ننھے خرگوش کے لئے تکلیف دہ بن گئی ہے۔ تیزی سے گھومتے ہوئے لوہے کے لمبے لمبے ہاتھ، جو اس چھوٹے سے کمرے میں موجود ہوا کو لگاتار بلو رہے تھے اور حبس کے باعث کمرے کے اندر ایک سنسناہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے ننھے خرگوش کو غیر محفوظیت کا احساس دلا رہی ہو۔ سلطان یوسف زئی نے سوچا اور صوفے سے اٹھ کر پنکھے کا سوئچ آف کر دیا۔ تیزی سے گھومتی ہوئی پنکھڑیاں مدھم ہوتی رہتی، دھیرے دھیرے رک گئیں۔ سلطان یوسف زئی کمرے کے اندر بڑھتی ہوئی اُمس سے اُوب کر دروازے سے باہر نکل آیا۔ بغل کی گلی جو دو لمبی اور اونچی دیواروں سے گھری ہوتی تھی، اسے دھوپ کی شدت سے بچانے کے لیے کافی نہیں تھی۔ ننھا روزی، سلطان یوسف زئی کی باہوں میں تھا۔ اور ایک موٹر سائیکل کو رکشا کے ساتھ بھڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ابھی یہ بات وہ پوری طرح جان بھی نہ پایا تھا کہ کیا واقعہ ہوا ہے کہ اچانک ایک ہوائی جہاز بہت ہی نیچی اڑان بھرتا ہوا، اس کے کمرے کی چھت سے گزرا۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز نے خرگوش کے جسم سے سلطان کی پکڑ ڈھیلی کر دی۔ خرگوش نے ایک تیز جست لگائی اور بھاگ کر کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ شدید طور پر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ کمرے کی دہلیز کے سامنے پہنچا، پچھم کی طرف سے تیزی کے ساتھ آتی ہوئی کار کے ہارن نے اُسے اور زیادہ بھونچکا کر دیا۔ وہ گیند کی طرح اچھلا اور سڑک کے دوسرے کنارے پر جا گرا۔ سامنے گلی سے گزرتے ہوئے کتے نے جوں ہی اس کی طرف دیکھا، پوری طاقت سے بھونکتا ہوا ننھے جانور پر جھپٹا۔ خرگوش نے کتے سے جان بچانے کے لئے ایک بار پھر سڑک پار کرنی چاہی۔

لیکن تبھی ایک سائیکل سوار نے اپنی سائیکل کا پہیہ اس سے آ ٹکرایا۔ خرگوش سہم کر سڑک کے بیچوں بیچ پھیل گیا۔ ہوائی جہاز ایک بار پھر بہت نیچی اڑان بھرتا ہوا آس پاس کی چھتوں سے گزرا۔ ایک طرف ہوائی جہاز کی سہما دینے والی گونج اور دوسری طرف خونخوار کتے کے بھونکنے کی آوازیں درمیان میں سڑک پر تیز رفتار سواریوں کا شور اور بے شمار لوگوں کی بھیڑ، ننھے جانور کو لگا جیسے اب بچاؤ کا کوئی راستہ باقی نہ رہا ہو۔ وہ بدحواس ہو کر سڑک کے بیچوں بیچ پھیل گیا۔ دونوں طرف کا ٹریفک ایک حقیر جانور کو بچانے کے لئے اپنے اپنے استھان پر رک گیا۔ تبھی سلطان یوسف زئی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور لپک کر ننھے خرگوش کو اپنی باہوں میں بھر لیا۔ ستّر سال کا یہ بوڑھا، ابھی واپس نہیں پلٹ سکا تھا کہ سامنے کھڑے مسافر نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"جانور پالنے کا شوق ہے اور گھر میں باندھ کر رکھا نہیں جاتا۔ سالے، کمین کہیں کے، راستے میں روڑا بنتے ہیں ——"

ایک نہایت تیکھی آواز سلطان یوسف زئی کے کانوں سے ٹکرائی۔ کوئی اور وقت، کوئی اور جگہ ہوتی تو سلطان یوسف زئی کا پٹھانی خون، موت کا پھندہ بن کر حملہ آور کے گلے میں پھنس جاتا لیکن وہ، نہ اب سلطان یوسف زئی تھا اور نہ یہ، وہ بستی جہاں اس کی بہادری کا سکہ چلتا تھا۔

یوسف زئی، اداس، اداس، اپنے چھوٹے سے جانور کو بغل میں دبائے چپ چاپ کمرے کے اندر آ گیا۔ ہوائی جہاز ایک بار پھر شور کرتا ہوا اس کی چھت سے گزرا۔ سلطان یوسف زئی نے چاہا، وہ پھر اسی بستی کی طرف لوٹ جائے جہاں سے اسے جبراً کھینچ کر بلایا گیا تھا۔

تعمیم ہریانہ

اب سے کوئی پچاس برس پہلے سلطان یوسف زئی کا اکلوتا بیٹا رحمان نمونیا کا شکار ہو کر آناً فاناً چل بسا تھا۔ بیس سال کا ہٹا کٹا خوبصورت نوجوان۔ سلطان یوسف زئی نے ایک سال پہلے ہی اپنے بیٹے رحمان کا بیاہ کیا تھا اور بیوی کی نا وقت موت سے سنسان ہوئے گھر کو بہو کی کلائیوں میں پڑی چوڑیوں کی جھنکار سے بھر دیا تھا۔ لیکن خوشی کے پل کتنی جلدی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں؟ اس کا اندازہ سلطان یوسف زئی کو نہیں تھا۔ ابھی نواز ماں کے گربھ ہی میں تھا کہ رحمان چل بسا۔ اپنے پوتے نواز کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے جوان ہونے تک واقعات کی ایک لمبی زنجیر ہے جو جھرّیاں بن کر سلطان یوسف زئی کے چہرے پر پھیل گئی ہے۔

نواز کوئی تین سال پہلے اپنی ماں خانم کو لے کر اس شہر میں آیا تھا اور یہاں پائپ بنانے والی ایک فرم میں کام کرنے لگا۔ اب سلطان یوسف زئی اس حویلی میں تنہا تھا۔ جہاں اس نے اپنے بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے دن دکھ سکھ بھوگتے ہوئے گزارے تھے۔ ستّر سال پر پھیلے ہوئے واقعات کی لگ بھگ ساری باتیں سلطان یوسف زئی بھول چکا ہے۔ اسے یاد نہیں ہے کب اس کے پُرکھے کابل کے ایک دیہی علاقے سے چل کر بھارت آئے تھے۔ اور کب اپنا پشتینی دھندا چھوڑ کر جلال نگر کی اس بستی میں آ بسے تھے۔ اور کھیت کسانی کا کام کرنے لگے تھے۔ سلطان یوسف زئی کو اپنے جیون کی اب صرف تین باتیں یاد ہیں۔ بیوی زبیدہ اور بیٹے رحمان کی موت۔ یا پھر سفید نرم نرم بالوں والے خرگوشوں کا وہ جوڑا جو پہلی بار اس کی تنہائی کا ساتھی بنا تھا۔

سلطان یوسف زئی نے اس پورے عرصہ میں اپنی ممتا کا سارا ذخیرہ ان پالتو خرگوشوں پہ نچھاور کر دیا تھا۔ جن کی نسل کی اب آخری نشانی روزی کی شکل میں اس کے پاس موجود تھی۔ سلطان یوسف زئی کو یاد ہے جب وہ اپنے پالتو خرگوش کی نرم نرم بالوں سے بھری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا تو اسے ایسا لگتا جیسے رحمان اس کا بیٹا ابھی ننھا سا دودھ پیتا بچّہ ہو اور جیسے وہ اپنی گود میں لئے تھپکیاں دے کر سلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ خرگوش کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی معصومیت اس کی مخمل کی طرح چکنی ملایم کھال، چھوٹے چھوٹے گداز ہاتھوں کا لمس، یہ سب اسے احساس دلاتے جیسے رحمان زندہ ہے اور ماں کی چھاتیوں سے دودھ پی کر اس کی باہوں سے لپٹا کلکاریاں کر رہا ہے۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا، دھیرے دھیرے اس کا پوتا نواز جوان ہو گیا۔ اچنبھا ہوتا ہے سلطان یوسف زئی پر! فولاد جیسی سخت مزاجی کے ساتھ جیون گزارنے والا یہ بوڑھا کس طرح ایک ننھے سے خرگوش کی ممتا پر ریجھ گیا۔ اُس کی ساری کٹھورتا، جذبات کے پانی میں بوند بوند ہو کر بہہ گئی۔ گھایل، پیاسے جذبوں نے، ممتا اور پیار کی کبھی نہ مٹنے والی بھوک نے سلطان یوسف زئی کو اس ننھے منّے جانور کے حوالے سے زندہ رہنے کی امنگ بخشی تھی۔ سلطان یوسف زئی کی وہ باہیں جنھوں نے سالہا سال تک رحمان کے نرم نرم جسم کو سہلایا تھا۔ آج بھی اپنی ممتا کی ان بہچانی بھوک کو سیراب کرنے کے لئے بے چین تھیں۔ آج بھی کوئی ننھا سا بچّہ روزی کی آنکھوں کے پیچھے سے اس کی طرف جھانک رہا تھا۔ کیا اس طرح موت کے دردناک تجربے پر سلطان یوسف زئی نے فتح پالی تھی ——— ؟ شاید!!

ستّر سال کا بوڑھا سلطان یوسف زئی، بوڑھا تو تب ہی ہو گیا تھا۔ جب جوان بیٹے رحمان نے اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔ زندگی کے اگلے بہت سے سال اس نے پوتے کو پالنے پوسنے میں لگائے اور بیٹے کی جوان بیوہ کو خوش رکھنے اسے آرام پہنچانے میں لگا رہا۔ دھیرے دھیرے کاشت کی جتنی اراضی اس

کے پاس تھی، بک گئی۔ بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم خم کہاں تھا، جو کھیت میں جان توڑ محنت کر سکتا۔ اس کی ساری آشائیں، ساری امیدیں اُجڑ گئی تھیں، نواز کے مستقبل سے اور ممتا کی ساری بھوک سیراب ہو رہی تھی، ان ننھے منے خرگوشوں سے، جن کے جسموں کی گرمی اُسے اپنے نوزائیدہ بچّے کے زندہ ہونے کا احساس دلاتی۔ لیکن اپنی زندگی پر منڈلاتے ہوئے خطرے کا احساس اُسے تب ہوا، جب نوازؔ نے روزگار کے لیے شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

بوڑھا دیر تک اپنے چہرے پر پھیلی ہوئی جھرّیاں اور اندر دھنسی ہوئی آنکھیں لئے نوازؔ کی طرف دیکھتا ~~رہا~~ اس نے کہا۔

"میں تمہارے باپ اور دادی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ وہ اب بھی منوں بوجھ تلے دبے میرا انتظار کرتے ہیں۔

قبریں تو زندگی کی تاریخ کے کبھی نہ بھولنے والے اوراق ہیں۔ میں انھیں کیسے بھول سکتا ہوں انھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں، . . . . . اور پھر میرا ایک ہی کھلونا ہے روزی! شہر میں جا کر یہ کہاں رہے گا۔ کیا وہاں سامنے والے میدان جیسی ہری ہری گھاس ہے، کیا وہاں ایسی نرم نرم مٹّی ہے جسے روزی اپنے پنجوں سے کرید سکے۔ کیا وہاں ایسے بے خطر اور کھلے کھلے راستے ہیں، جہاں یہ چاہے تو دوڑ سکے۔

لیکن نوازؔ چلا گیا۔ بوڑھے کے چہرے پر کچھ جھرّیاں اور بڑھ گئیں۔ اس کی کمر کچھ اور جھک گئی۔

[illegible] دور تک، راستے کے آخری موڑ تک، نوازؔ کو جاتے دیکھتا رہا۔

اور پھر چھ مہینے بعد ہی نوازؔ نے اپنی ماں خانم کو بھی شہر بلا لیا۔ اگرچہ اس نے چھٹّی میں یہ بھی لکھا تھا

"دادا ابّا! آپ بھی ماں کے ساتھ آ جائیے۔ اکیلی بھائیں بھائیں کرتی حویلی میں اکیلے کیسے رہیں گے۔"

لیکن سوال مٹّی کے دو ڈھیروں کا تھا، روزیؔ کا تھا، بوڑھا نہیں گیا۔

ایک سال تک سلطان یوسف زئی قبروں اور روزیؔ کی رکھوالی کرتا رہا۔ لیکن دھیرے دھیرے ٹوٹ گیا۔ نوازؔ کی چھٹّی اور ہر مہینے آنے والے خرچ کی آس نے اُجاڑ سائیں سائیں کرتی حویلی نے، تھکن اور بڑھاپے کی بڑھتی ہوئی کمزوری نے اس کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا۔

آخری بار جب نوازؔ اس کی خیر خبر لینے کے لئے جلال نگر آیا۔ تو بوڑھے نے اپنی پوٹلی باندھی، روزیؔ کو بانس کی کنڈی میں رکھا۔ قبرستان میں مٹّی کے دو ڈھیروں پر آخری اداس نظر ڈالی۔ پگڑی کے پلّو سے آنکھوں کا پانی خشک کیا اور پوتے کے ساتھ شہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے بھاری من کے ساتھ بوڑھے کو وداع دی۔

شہر آ کر سلطان یوسف زئی کو لگا جیسے وہ جنگی ہتھیار بنانے والے کسی کارخانے میں آ گیا ہو۔ اور اس کے آس پاس، اس کے چاروں طرف دھماکے ہی دھماکے ہو رہے ہوں۔ اس کی اپنی حالت بھی روزیؔ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ روزیؔ اپنی قابلِ رحم حالت کو چھپا نہیں پا رہا تھا جبکہ سلطان یوسف زئی، پوتے اور بہو کو مطمئن رکھنے کے لئے لگاتار اپنے آپ کو حسبِ معمول بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلطان کو شہر میں آئے یہ ساتواں دن تھا۔ چھ دن اس نے کس انداز سے گزارے تھے، اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ بڑھاپے

نے اسے ہر طرح کے حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھا دیا تھا۔ چھ راتوں سے وہ پوری نیند نہیں سویا تھا۔ نواز فیکٹری چلا جاتا۔ بہو وقت پر اس کے سامنے کھانا رکھ جاتی، دن نکلتا۔ شام ہو جاتی، عمر کا ایک دن اور ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو جاتا۔ اس سب کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے پاس بیٹھ کر بات کرتا۔ نواز کے پاس بھی نہیں۔

اسے لگتا جیسے نواز کے لئے وہ ایک مجبوری بن کر رہ گیا ہے۔ ایک ایسی مجبوری جس سے اگر وہ بچنا بھی چاہے تو شاید نہیں بچ پائے گا۔ یہ چھ دن اس نے شدید خوف اور غیر محفوظیت کے احساس میں گزارے تھے۔ جلال نگر کی ویران حویلی، وہاں کے لوگ، اس کے جیون کا پورا اتہاس، اس اتہاس کے دو پنّے، جو برسوں پہلے مٹی کے ڈھیر بن چکے تھے ایک ایک کر کے اس کی یادداشت میں ابھرتے، اور چیخ چیخ کر اسے آواز دیتے۔ رات ہوتی تو وہ اپنے آپ کو ایسی دردناک حالت میں پاتا، جب دستکیں چُپ ہو جاتی ہیں اور خاموشیاں بولنے لگتی ہیں۔

ننّھا روزی رات بھر بیمار بچّے کی طرح اس کے پہلو میں لیٹا رہتا۔ صبح ہوتی تو اس کی آنکھوں کا سونا پن سلطان یوسف زئی کے ذہنی کرب کو اور بھی تیز کر دیتا۔ اسے شک ہوتا کہ ابھی اگلے ہی لمحے، شور کرتا ہوا کوئی ہوائی جہاز اس کی چھت سے گزرے گا بہت ہی نیچی اڑان بھرتا ہوا، اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں وہ سارا منظر گھوم جاتا کہ اوپر بھورے کی چیل کی مانند اڑتا ہوا طیارہ، سڑک پر شور اور حادثے سے بھڑکتا ہوا ٹریفک اور سڑک کے پاس خرگوش کو دبوچ لینے پر تیار خونخوار کتا۔

"بچاؤ کہاں ہے، حفاظت کا راستہ کہاں ہے؟"

وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتا۔ اور بے چینی کے ساتھ روزی کی پیٹھ سہلانے لگتا۔ روزی جو اس ایک

ہفتے میں سکڑ کر آدھا رہ گیا تھا۔ اس کی کمر کی ابھری ہوئی ہڈی کو ٹٹولتے ہوئے سلطان یوسف زئی، خوف سے کانپ گیا۔ اسے اچانک دم توڑتے ہوئے رحمان کی حالت کا احساس ہوا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ شہر کی سڑکوں اور عمارتوں کے اوپر دھند اور دھوئیں میں لپٹا ہوا آسمان، چاند کی پیلی لاش کو چھاتی سے لگائے ہوئے اونگھ رہا تھا۔ پاس کے اور بھی تنگ کمرے میں نواز اور اس کی ماں بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ بوڑھے سلطان یوسف زئی نے ٹٹول کر روزی کو دیکھا، کچھ سوچا، اور بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کپڑوں کی پوٹلی باندھی روزی کو احتیاط سے بانس کی کنڈی میں رکھا۔ اور دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

سڑک پر ٹریفک کم تھا۔ بھیڑ بھی کم تھی۔ گلی کا کتا چپ تھا۔ اور کمرے کی چھت پر ہوائی جہاز اپنی اڑان پر ابھی نہیں آیا تھا۔ سلطان یوسف زئی اسٹیشن پہنچا۔ اور بے چینی سے جلال نگر لے جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

x x x x x x x

گاؤں کی اداسی حویلی کچھ اور اداس ہو گئی تھی۔ شہر کا وہ شور، جو سلطان یوسف زئی اپنی روح، اپنے ذہن میں ساتھ لے کر لوٹا تھا، اس نے گاؤں کے سنّاٹے کو کچھ اور گہرا کر دیا تھا۔

"ایسا بھیانک سنّاٹا۔ ہو اُف، میرے خدا،" اچانک سلطان یوسف زئی کے ہونٹوں سے نکلا، اور اس نے روزی کو باسکٹ میں سے نکال کر آنگن میں چھوڑ دیا۔ روزی میں اب وہ پہلی سی پھرتی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بیدم سا ہو کر بیٹھ گیا۔

x x x x x

رفتہ رفتہ سلطان یوسف زئی کو گاؤں واپس
آئے ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن نواحی شہر جاتے پر
اسے معلوم ہوا کہ شہر سے شائع ہونے والے ایک
روزنامے میں اشتہار چھپا ہے، گم شدگی کا۔ جس میں لکھا
ہے۔

"ایک ستتر سالہ بوڑھا، جس کا نام
سلطان یوسف زئی ہے، رنگ گورا،
چہرے پر جھریاں، قد لگ بھگ پونے
چھ فٹ، سلیٹی رنگ کی شلوار کرتا پہنے
ہے، ساتھ میں سفید رنگ اور لمبے
بالوں والا ایک خرگوش لیے ہوئے
ہے۔ تقریباً ایک ماہ سے گم ہے جن
صاحب کو ملے، ازراہِ کرم مندرجہ ذیل
پتے پر مطلع کرنے کی زحمت کریں۔"

× × × × × ×

سلطان یوسف زئی کو لگا، جیسے اس سنسار
میں ابھی اس کی ضرورت کم نہیں ہوئی ہے۔ اس کا پوتا،
اس کا پریوار اب بھی اس کی راہ دیکھ رہا ہے۔ نواز کیلئے
ابھی اس کا وجود بیکار نہیں ہوا ہے۔ لیکن دن پر دن
گزرتے گئے، کوئی اسے ڈھونڈنے، کوئی اسے لینے نہیں
آیا۔ جیسے ساری کہانی ختم ہو گئی ہو۔
اور واقعی ساری کہانی ختم ہو گئی تھی۔
انتظار کرتے کرتے سلطان یوسف زئی کی
آس ٹوٹ گئی۔
اس نے کچی مٹی کی دو قبروں کے بیچ، روزی
کو اپنی چھاتی سے لگایا اور دور تک پھیلے ہوئے اس
آسمان کی طرف دیکھتا رہا جو ابھی چیختے چنگھاڑتے
ہوائی جہاز کی زد میں نہیں آیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد

غزل

ہر اک منزل سے ہے شوقِ طلب آگے تری منزل
کہ علم و فن میں ہوتی ہی نہیں ہے آخری منزل

خبر ہی یہ نہ تھی پیروں سے ہے لپٹی ہوئی منزل
قدم گھر سے نکالا ہی نہ تھا اور مل گئی منزل

نہ جانے مرگ و ہستی سے میں کتنی بار گزرا ہوں
نہ یہ جینا مری منزل نہ یہ مرنا مری منزل

بھلانا بھی تجھے مشکل ہے، مشکل یاد رکھنا بھی
خدا جانے یہ میرے شوق کی ہے کون سی منزل

تو پہلے شعر کو موزوں تو پڑھنا سیکھ لے پیارے
پھر اس کے بعد آئے گی کہیں تنقید کی منزل

حیات و موت سے ہے ایک ربطِ مستقل میرا
کہ یہ بھی عارضی منزل ہے وہ بھی عارضی منزل

نہ جانے میں کہاں پھرتا رہا اس کی تمنا میں
حقیقت میں مرے ہی دل کے اندر تھی مری منزل

سلطان انجم

شعروں بھری ایک شام

محفلِ مشاعرہ کی مہمانِ خصوصی محترمہ فہمیدہ ریاض اپنے کلام سے نوازتے ہوئے

۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو برصغیر کی نامور شاعرہ محترمہ فہمیدہ ریاض کے اعزاز میں ہریانہ راج بھون چنڈی گڑھ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت ہریانہ کے گورنر جناب سیّد مظفر حسین برنی نے فرمائی۔ شمع مشاعرہ روشن کرنے کے بعد گورنر موصوف نے اپنی مختصر سی تقریر میں اُردو زبان کی سادگی، شیرینی اور مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے شاعری خصوصاً اُردو غزل کو اس کی آبرو بتایا۔ مہمانِ خصوصی فہمیدہ ریاض کے کلام کو حسنِ ظاہری و حسنِ باطنی کا امتزاج قرار دیتے ہوئے گورنر صاحب نے فیض مرحوم کی مشہور نظم "دعا" کے اس شعر کا حوالہ دیا۔

جرأتِ کفر ملے، ہمتِ تحقیق ملے
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

اور کہا کہ محترمہ فہمیدہ ریاض کی شاعری میں "دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق" نظر آتی ہے۔

میرِ مشاعرہ جناب کشمیری لال ذاکر نے سب سے پہلے جناب راجیندر چاند کو دعوتِ سخن دی۔ چاند کی غزل کا یہ شعر بہت سراہا گیا ؎

زہر سماج کا بہتر ہے کہ ہم خود پی لیں
شہرِ خوابیدہ میں کس کس کو جگایا جائے

فہمیدہ ریاض صاحبہ نے پُرسوز آواز میں اپنی نظم "سرِ شام" سُنا کر سماں باندھ دیا۔ اس کے بعد ہندی کے شاعر دیوی شنکر پربھاکر نے اپنی دو کویتائیں "سمانانتر دوری" اور "تیسرا دنی ملاقات" سُنا کر محفل کو زعفران زار کر دیا۔

جناب ستیہ نند شاکر نے ایک نظم "جموں سے جمشید پور تک" سُنا کر حالاتِ حاضرہ کی سنگینی کا احساس دلایا۔ ایس۔ ڈی۔ کپل کی کویتا میگوں کے سفر سے متعلق تھی۔ جس میں انسان کی کم مائیگی کا پُر اثر بیان تھا —

سر بندر پنڈت سوز کی غزل کے اس شعر کو خاص طور پر پسند کیا گیا ؎

رشتوں کو دیکھتا ہے ترازو کی آنکھ سے
میری طرح تو اس کے خیالات بھی نہیں

فہمیدہ ریاض صاحبہ نے اپنے وطن میں خواتین پر گزرنے والی تیاملتوں کی عکاس نظم "چادر اور چار دیواری" پر داد پائی۔ اس کے بعد کرشن مدہوش نے اپنی دو غزلیں سُنائیں۔ یہ شعر خاص طور پر توجہ کا مرکز بنا ؎

ہاتھوں میں اپنے شام کا اخبار تھام کر
میں سوچتا ہوں بارہا کہ کن خبریں ہوں

جناب رام سہائے ورما نے اپنی کویتا "میں اس سے ہار گیا" میں مفلس انسان کی بے بسی اور بے کسی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کیا۔ راجندر کمار طالب کی غمِ دوراں و غمِ جاناں سے متعلق غزل کے اس شعر نے خوب داد پائی ؎

بھاگتی بھیڑ میں اب میں بھی کہاں تک بھاگوں
تھک گیا ہوں مجھے گرنے سے بچا لو یارو

بزرگ شاعر راز سنتو کھسری نے روایتی انداز کی غزل پیش کی۔ جس کا مطلع تھا ؎

آپ سے ربط ہم کو ضروری بھی ہے
یہ شعوری بھی ہے لاشعوری بھی ہے

میرِ مشاعرہ جناب کشمیری لال ذاکر نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ اُن کا یہ شعر بار بار سُنا گیا ؎

وہ چلا جائے گا زخموں کی تجارت کر کے
مدتوں شہر میں اس شخص کا چرچا ہوگا

سامعین کی فرمائش پر محترمہ فہمیدہ ریاض نے تین نظمیں "پہلی سالگرہ" "خانہ تلاشی" اور "موسم کی پہلی بارش کے نام" نہایت دردبھری اور پُر اثر آواز میں سُنائیں۔ سب سے آخر میں انھوں نے اس دور کے عظیم اُردو شاعر آنجہانی فراقؔ گورکھپوری کو اپنی دلدوز نظم "نذرِ فراقؔ" کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کیا۔ فراقؔ کو اب تک اس سے بہتر شعری نذرانہ شاید ہی کسی اور شاعر نے پیش کیا ہو۔

اس بزم میں اصحابِ ذوق نے شرکت کی جن میں شریمتی جیسیحہ بہ نی، ہریانہ کے منسٹر صاحبان، شریمتی، اور شری پ۔ سی۔ جین چیف جسٹس پنجاب اینڈ ہریانہ ہائی کورٹ، جناب کنہیا لال پوسوال، سابق وزیر، جسٹس کانگ، شریمتی اور شری بی۔ بی۔ کپمری ہان، چیف سیکریٹری ہریانہ، شریمتی اور شری سروپ کشن، سابق چیف سیکریٹری پنجاب، شریمتی اور شری کلونت سنگھ فنانشیل کمشنر ہریانہ شری رشپال ملہوترا، و دیگر معززینِ شہر کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب اور مرکزی علاقہ چنڈی گڑھ کے صحافیوں، اعلیٰ افسران اور دوسرے اہلِ ذوق نے بھی شمولیت کی۔

اپنے گرد و پیش کو اندوہ افزا کر دیا
کیوں دلِ معصوم کو وقفِ تمنّا کر دیا

اپنی خاموشی بھی رسوائی کا باعث بن گئی
ضبطِ غم نے بھی ہمارا راز افشا کر دیا

اے تماشا گر خرد کی آزمائش کے لئے
تُو نے ہر انسان میں شیطان پیدا کر دیا

آدمی ہونے کا دعویٰ کر نہیں پایا خُدا
آدمی نے تو خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا

زندگی کا سامنا کرنا بڑا دُشوار تھا
شامِ غم کو ہم نے وقفِ جام و مینا کر دیا

عشق نے دِکھلا کے اپنا ناز پرور آئینہ
"حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا"

تیرے دم سے تھا قیامِ رونق و آہنگ و نور
تُو نے رخصت ہو کے ہم کو بے سہارا کر دیا

بھوگ میں مَن کھو گیا گو نام روشن ہو گیا
اپنا پاون یوگ ہم نے نذرِ دُنیا کر دیا

من کے سُونے پن کا درپن ہی رہا پیشِ نظر
سوچ نے مجھ کو بھری محفل میں تنہا کر دیا

وہ ابھی خندہ جبیں تھے، مائل و دلشاد تھے
ہو گئے ناراض جب ہم نے تقاضا کر دیا

کیوں نہ ہوں ممنون اس کا دولتِ احساس نے
میرے سُکھ کو دُکھ اور آشا کو نراشا کر دیا

کوزہ گر تُو نے بصد افسوں دلِ بیتاب کو
کوزۂ تن میں سمویا اور دریا کر دیا

کرشن موہن مضطرب ہو اُٹھے اہلِ انجمن
ایک فتنہ گر نے آ کر حشر برپا کر دیا

ابراہیم یوسف

اُردو ڈرامے کے ابتدائی نقوش

اُردو ادب میں ڈرامے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کا پودا کسی دوسرے ملک سے لاکر نہیں لگایا گیا ہے بلکہ اس نے ہندوستان ہی کی مٹی سے جنم لیا ہے اور یہاں کی آب وہوا ہی میں پرورش پائی ہے۔ رام بابو سکسینہ اسے غیر ملکی پودا قرار دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ "اُردو ڈرامہ ایک غیر ملکی پودا ہے جو سرزمین اردو پر انیسویں صدی کے وسط میں نصب کیا گیا اور خوب جڑ پکڑ گیا اور نہایت تندرست اور تنومند معلوم ہوتا ہے"[۱] سکسینہ صاحب نے اس غیر ملک کا نام نہیں لیا جہاں سے یہ پودا لاکر لگایا گیا ہے۔ اردو شاعری کے تعلق سے عربی فارسی اور خاص طور پر فارسی سے اردو نے استفادہ کیا ہے لیکن جس وقت اردو ڈرامہ اپنے بال و پر نکال رہا تھا اس وقت نہ تو عربی میں اور نہ فارسی میں ڈرامے کی کوئی روایت موجود تھی — فارسی میں ڈرامے کی ابتدا ناصرالدین کے عہد میں ہوئی جب انھوں نے ۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۹ء کے درمیان یورپ کے تین سفر کئے اور یوروپین ڈرامے دیکھے اور ان کے انداز میں ایران میں ڈرامے اسٹیج کرنے کا حکم دیا۔ اس سے پہلے ایران میں تقلید یا خیمۂ شب بازی اور تعزیہ گردانی کی جو روایت تھی اس کو ڈرامہ نہیں کہا جا سکتا۔ عربی میں تو ڈرامے کا وجود ہی نہ تھا۔ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ "عرب دنیا میں پہلی بار شعر میں ڈرامہ لکھنے والے لبنانی شیخ خلیل یازجی ہیں جنھوں نے ۱۸۷۶ء میں "المروّۃ والوفاء" کے نام سے ڈرامہ لکھا تھا[۲] اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو ڈرامے کی قلم نہ تو عربی پودے سے لی گئی ہے اور نہ فارسی پودے سے۔ سکسینہ صاحب کو یہ بھی شکایت ہے کہ اردو ڈرامے نے سنسکرت ڈرامے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا حالانکہ اس کا بھی فوراً اعتراف کر لیتے ہیں کہ سنسکرت ڈرامے کا عہد زریں ختم ہو چکا تھا اور وہ کتابوں کی زینت بن کر رہ گیا تھا۔ جس طرح سکسینہ صاحب کا یہ خیال کہ اردو ڈرامے کا پودا غیر ملک سے لاکر لگایا گیا ہے' مفروضہ کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی نہیں کہ اردو ڈرامے نے سنسکرت ڈرامے کو

---

[۱] تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) رام بابو سکسینہ مترجم مرزا محمد عسکری: ص: ۱۴

[۲] مصر میں عربی ڈرامے کا نشو ونما: عبدالحق: عصری ادب دہلی، اکتوبر ۱۹۸۰ء تا اپریل ۱۹۸۱ء ص: ۴۷

بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اردو ڈرامہ جن حالات میں پیدا ہوا ان حالات میں اس نے اپنے مزاج کے مطابق سنسکرت ڈرامے سے استفادہ کیا اگرچہ یہ استفادہ براہِ راست نہیں تھا۔

بھوبھوتی (۷۰۰ء) کے بعد سنسکرت ڈرامے پر زوال آ گیا تھا جہاں اس کے اور وجوہ تھے وہاں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیاسی افراتفری کے باعث وہ شاہی سرپرستی سے محروم ہو گیا تھا خود بھوبھوتی کو شاہی سرپرستی نصیب نہیں ہوئی اور وہ اپنے ڈرامے شاہی درباروں میں کرنے کے بجائے منادر کے صحنوں میں کرتا رہا اس طرح دسویں صدی آتے آتے سنسکرت ڈرامہ اسٹیج سے بالکل غائب ہو گیا اور اس کی جگہ لوک ناٹکوں نے لے لی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوک ناٹک کوئی نئی چیز تھے اور نئی چیز کے لیے پرانی چیز یعنی سنسکرت ڈرامے کو جگہ خالی کرنا پڑی ہو۔ پراکرت ڈرامہ سنسکرت ڈرامے سے پہلے موجود تھا اور بدھ مذہب کے ماننے والے اسے تبلیغی ضروریات کے لئے استعمال کرتے تھے اور مقبول تھا لیکن بدھ مذہب کے عروج کے زمانہ میں ہی اس میں اسقدر خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ اشوک کو ان مخرب الاخلاق پیش کشوں کو بند کرنے کا فرمان جاری کرنا پڑا۔ اس کے باوجود ڈرامائی پیش کشیں ہوتی رہیں۔ بدھ مذہب کے زوال کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی نہ کوئی ضابطۂ اخلاق باقی رہا تھا اور نہ کوئی معیارِ اخلاق۔ جب معاشرہ کی یہ حالت ہو تو علم و ادب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا چنانچہ اس کے اثر سے نہ تو سنسکرت ڈرامہ محفوظ رہا اور نہ پراکرت ڈرامہ۔ علماء کا خیال ہے کہ ان حالات کو دیکھ کر ہی بھرت منی نے اپنا ناٹیہ شاستر ترتیب دیا تھا اور ناٹک کے قواعد و ضوابط مرتب کیے تا کہ ناٹک کے لطیف اور اعلیٰ فن کو اس گندگی سے پاک کیا جا سکے۔

دسویں صدی آتے تک سنسکرت کلاسیکل ڈرامے کا زوال ہو چکا تھا اس کے بعد کی تقریباً پانچ صدیوں کو ڈرامے کا عہد تاریک سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ سو سالوں میں ہندوستان کے نئے ڈرامے کے خدوخال تشکیل پا رہے تھے اسی زمانے میں ایک نیا پیشہ ور طبقہ چرن کے نام سے ابھرا جس نے رقص ڈرامے کو ترقی دی اور نٹی کے نام سے ایک نسوانی کردار داخل کیا یہ رقص ڈرامہ اس قدر مقبول ہوا کہ راجاؤں نے اس کی سرپرستی کی اور نٹی کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔ اسی زمانے میں بھکتی تحریک شروع ہوئی جس سے چرن طبقہ کو اپنے رقص ڈرامے کے لئے نئے موضوعات ملے سیکڑوں مندر تعمیر کیے گئے۔ دیوداسی کے نام سے نٹی ان کا ایک جزو بن گئی۔

ولبھ آچاریہ نے جب کچھ برہمن لڑکوں کو تعلیم دے کر راس لیلا شروع کی تو کولی ذات کے لوگوں نے اس میں بہت دلچسپی لی اور اپنی منڈلیاں بنا کر اسے پیش کرنا شروع کیا یہ لوگ مذہبی خیالات کے تھے اور بھگت کہلاتے تھے اس لئے ان کے ذریعہ پیش کئے جانے والے کھیل بھگت کہلائے۔ مسٹر موہن سروپ بھاٹیہ اپنے ایک ہندی مضمون "برج کی لوک ناٹیہ ودھا" (چھایانٹ شمارہ ۱۴۵ ۱۹۸۰ء) میں اسے قدیم نہیں مانتے بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی پیداوار بتلاتے ہیں لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ بھگت کا ذکر ابو الفضل نے کیا ہے اور مولانا محمد اکرم غنیمت نے اپنی مثنوی نیرنگ عشق (۱۰۹۶ھ) میں اسے تفصیل سے بیان کیا ہے ورنداون بھگتی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں لاتعداد آشرم وجود میں آ گئے تھے۔ ان آشرموں کے گوروؤں نے راس لیلا کو مقبول کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا اور ہر گورو کا آشرم راس لیلا کے رقص و موسیقی سے گونجنے لگا

چونکہ یہ مذہبی عالم تھے اس لئے ان آشرموں میں راس لیلا کا مذہبی تقدس اور کلاسیکل انداز برقرار رہا جس کو بھرت منی نے ناٹیہ دھرمی کہا ہے لیکن بھگت اپنا مذہبی اور کلاسیکل انداز برقرار نہ رکھ سکی اور لوک دھرمی بن گئی اور اس میں ہر قسم کے کھیل پیش کئے جانے لگے اور یہ عوام میں بہت مقبول ہو گئی۔ بھگت کی مقبولیت کی وجہ اس کی موسیقی اور رقص ہیں۔ بھگت کی موسیقی میں دوہا، لاونی خیال، ٹھمری، دادرا، غزل، قوالی اور لوک گیتوں کی دھنوں کا استعمال کیا جاتا ہے اور رقص کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

انیسویں صدی میں جب اردو ڈرامہ وجود میں آیا تو اس وقت راس لیلا اور بھگت شمالی ہند میں بے حد مقبول تھی چنانچہ واجد علی شاہ کے "رادھا کنہیا کا قصہ" پر راس کے اثرات اور امانت کی اندر سبھا پر بھگت کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ اگرچہ رادھا کنہیا کا قصہ اور اندر سبھا اردو ڈرامہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی اردو ڈرامے کی بڑی حد تک مرتب تاریخ بھی مل جاتی ہے لیکن اردو ڈرامے کے نقوش ان سے پہلے مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے ان نقوش کی دریافت ہی ہمارے اس مضمون کا موضوع ہے۔ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صرف تمہید کے طور پر ہے تاکہ یہ بتلایا جا سکے کہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے اس وقت سنسکرت ڈرامہ اسٹیج پر موجود نہیں تھا بلکہ لوک ناٹک تھے جو عوام کے تفریحی مشاغل کہے جا سکتے ہیں۔ سنسکرت سے ان کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد یہ لوک ناٹک جس طرح پیش کئے جاتے تھے وہ اس قدر غیر معیاری اور کمتر درجے کے ہوتے تھے کہ سنجیدہ اور تربیت یافتہ ذہن ان کو بطور فن کے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے شاید یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ابتدا میں ان میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

اردو ڈرامے کی ابتدا کب ہوئی یہ ایک الجھا ہوا سوال ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا خیال ہے کہ اردو ڈرامے کی بنیاد پرتگالیوں کے ہندوستان میں آنے پر پڑ گئی تھی اگرچہ یہ ایک دور از کار خیال معلوم ہوتا ہے لیکن قرین قیاس ہونے کے امکانات اس میں پائے جاتے ہیں اس لئے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما ایک عرب جہاز راں احمد بن ماجد کی رہنمائی میں کالی کٹ پہنچا اور راجہ زیمورن کا مہمان رہا اس کے بعد پرتگالیوں کی آمد و رفت ہندوستان میں شروع ہوئی پہلے پہلے تو ان کا مقصد تجارت اور تثلیث کی تبلیغ کرنا تھا مگر پھر سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا اور گوا پر قبضہ کر کے اس کو اپنا صدر مقام بنایا اور البوقرق ہندوستانی مقبوضات کا پہلا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۵۳۴ء میں بمبئی پر ان کا قبضہ ہو گیا اور اس دوران پرتگالی مبلغ ہندوستان آتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی لکھتی ہیں کہ "بمبئی پر ۱۵۳۴ء سے ۱۶۶۱ء تک پرتگیزوں کا قبضہ رہا۔ پرتگیزوں کا دور حکومت اس لحاظ سے قابل مذمت ہے کہ انھوں نے یہاں مذہب پھیلانے کی خاطر اپنی پوری قوتیں صرف کر دیں تھیں جو لوگ عیسائی بننے سے انکار کرتے ان پر سخت مظالم روا رکھتے تھے۔ پرتگیزوں کے عہد میں کئی پسماندہ قومیں مثلاً کولی، بھنڈاری، آگری، کنبی وغیرہ عیسائی بن گئے اونچی ذاتوں کے ہندو مثلاً برہمن اور پربھو وغیرہ یہاں سے ہجرت کر گئے"[1] چونکہ پرتگالی تبلیغ کے معاملے میں

---

[1] بمبئی میں اردو: ڈاکٹر میمونہ دلوی: ص ۴۶

بے حد پرجوش تھے وہ جہاں بھی جاتے تھے ایک
گرجا ضرور قائم کرتے تھے جو تبلیغ کا مرکز ہوتا
تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نامی لکھتے ہیں کہ "ہر گرجے
اور چیپل میں ایک اسٹیج ضرور ہوتا تھا جس میں
سروس کے علاوہ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے حالات
پیش کیے جاتے تھے[1] پھر فرماتے ہیں کہ "سولہویں
سنہ عیسوی میں یورپ میں تثلیث کی تبلیغ کا
واحد ذریعہ اسٹیج تھا ایک مزین و مرصع اسٹیج پر
حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے حالات پیش کئے جاتے
تھے۔ پرتگیز نے ہندوستان میں بھی یہ طریقہ
اختیار کیا اور اردو کو تثلیث کی پیغام رسانی
کا ذریعہ بنا کر وہ کرسمس کے موقع پر جب
اخلاقی اور اصلاحی تماشے دکھلاتے تو ان میں
فارسی جملے بھی استعمال کرتے تھے[2] اگرچہ نامی
صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کسی ایسے
ڈرامے کا نمونہ پیش نہیں کیا اور بظاہر یہ دعویٰ
قرائن پر مبنی نظر آتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ ایسے تعلیمی کھیل پیش ضرور کئے جاتے
تھے۔ سید امتیاز علی تاج نے ۲ اپریل ۱۸۷۲ء
کے بمبئی گزٹ کے حوالے سے ایسے ہی ایک کھیل
کی تفصیل دی ہے جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے
کہ ایسے کھیل بمبئی میں پیش کیے جاتے تھے یہ کھیل
۱۸۲۲ء کے گڈ فرائڈے کو پیش کیا گیا تھا۔ ہم
یہاں اس کی تفصیل تاج صاحب ہی کے الفاظ
میں پیش کرتے ہیں:

"بمبئی اپنے تعلیمی کھیلوں کے لئے
شہرت رکھتا ہے بندرگاہ میں مقامی
کیتھولک عیسائیوں کی خاصی آبادی
ہے۔ اس جگہ کے ایک گرجا میں لمبی سی
میز رکھی گئی تھی جس پر تیرہ آدمیوں
کے سامنے پھلوں سے بھرے ہوئے
طشت رکھے تھے یہ حضرت عیسیٰؑ
کے آخری طعام کا نقشہ تھا جو لوگ
میز پر بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے
ایک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا
روپ بھر رکھا تھا۔ اگلے روز حضرت
عیسیٰؑ کو مصلوب کیا جانا تھا۔

اگلے روز حضرت عیسیٰ کا مجسمہ
جو دھوم سے تیار کیا گیا تھا سرخ
روغن مل کر گویا، خون آلود بنا دیا
گیا تھا۔ سینٹ انڈریو کے گرجا کے
صحن میں جمعہ کے روز بعد از دوپہر
غیر معمولی ہنگامہ تھا ایک ہزار عورتیں
سر سے پاؤں تک سفید لباس میں
ملبوس بیٹھی تھیں تمام صحن لوگوں
سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے
میں روسٹرم کے پیچھے ایک پادری کھڑا
اونچی آواز میں تقریر کر رہا تھا اس کے
بعد شام کے سائے پھیلنے لگے اور منظر
دھندلا پڑ گیا۔ صحن کے دروازے اور
دیواروں پر بے شمار پارسی اور ہندو
تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے
تھے اس سے ظاہر تھا کہ یہ لوگ ایک
دوسرے کی مذہبی تقریبات کا احترام

---

[1] ماڈرن اردو اسٹیج کا پس منظر: عبدالعلیم نامی: ماہنامہ آج کل دہلی جنوری ۱۹۵۹ء ڈرامہ نمبر: ص ۱۹
[2] ایضاً: ص ۱۴

کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ جب تک
کھڑے رہے بالکل خاموش رہے۔
آٹھ بجے کے قریب حضرت عیسیٰؑ کا
چہرہ بے نقاب کیا گیا اس پر حاضرین
میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ
گئی اور لوگوں کے جذبات ان کی
چیخ و پکار اور سیل گریہ و زاری میں
بہتے ہوئے نظر آنے لگے لوگ مصنوعی
خون کے دھبوں اور موم کی کیلوں کو
حقیقی سمجھتے اور دھاڑیں مار مار کر
رو رہے تھے حضرت عیسیٰؑ کے جسم کو
سولی سے اتارنے اور ان کے چہرے
کی نقاب کشائی میں ایک خاص ڈرامائی
عمل سے کام لیا گیا تھا[1]

اس بات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے واقعات گرجا گھروں میں ڈرامائی انداز میں پیش کئے جاتے تھے اگرچہ مندرجہ بالا کھیل ۱۸۲۲ء میں پیش کیا گیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ یہ روایت پہلے سے موجود رہی ہو گی لیکن جو سوال سب سے اہم ہے وہ زبان کا سوال ہے کہ ان کھیلوں کی زبان کیا تھی چونکہ یہ کھیل تبلیغ کے لئے پیش کئے جاتے تھے اس لئے عوامی زبان کا استعمال ہوتا ہو گا۔ یہاں مقامی بولیوں کے علاوہ ان عربوں کی زبان بھی تھی جو ۶۹۹ء میں حجاج بن یوسف کے ظلم و ستم سے بھاگ کر یہاں آ کر آباد ہو گئے یہ مراٹھی کی ایک قسم تھی جس میں عربی و فارسی کے الفاظ اور محاورات کثرت سے موجود تھے۔ اس کے علاوہ ۱۳۱۸ء میں گجرات کے بادشاہ مبارک شاہ نے حملہ کر کے تھانہ اور ماہم پر قبضہ کر لیا تھا کچھ عرصہ تک راجا نگر دیو اور احمد شاہ بہمنی کا بھی اس علاقہ پر قبضہ رہا لیکن پھر گجرات کے حکمرانوں نے اسے حاصل کر لیا۔ اس طرح چودھویں صدی میں اس علاقہ کا تعلق دکن اور گجرات سے قائم ہو گیا تھا۔ گجرات اور دکن سے جو فوجی اور سول حکام یہاں آئے ہوں گے وہ اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے ہوں گے۔ ڈاکٹر محی الدین زور لکھتے ہیں کہ "کسی زبان کی مختلف شاخیں اسی وقت اہم سمجھی جاتی ہیں جب وہ تحریر کے لئے مستعمل ہو جائیں اس معیار کے لحاظ سے ہندوستان کی تین شاخیں قابلِ ذکر ہیں ۱۔ گجراتی۔ ۲۔ دکنی۔ ۳۔ دوآبہ کی اردو۔ گجرات بھی دکن کی طرح تغلقوں کے عہد میں دہلی کی اطاعت سے آزاد ہو گیا تھا اور وہاں ایک آزاد حکومت کے ساتھ ساتھ اردو زبان ترقی کرنے لگی تھی جس میں تصانیف بھی کی گئیں[2] اس قسم کے خیالات کا اظہار مولوی عبدالحق نے بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "گجرات اور بیجاپور کے بزرگوں کے سلسلے میں ایک بات عرض کرنی چاہتا ہوں کہ دلی کی جو زبان جنوب کی طرف گئی اس کی دو شاخیں ہو گئیں دکن میں گئی تو دکنی لہجے اور الفاظ کے داخل ہونے سے دکنی کہلائی اور گجرات پہنچی تو وہاں کی مقامی خصوصیات کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی[3] اور یہی گجراتی اور دکنی زبانیں تھیں جو چودھویں صدی میں بمبئی اور اس کے مضافات میں پہنچ چکی تھیں جو بخوبی بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی میں لنسر دان جی مہروان جی آرام اور محمود میاں رونق کے اردو ڈراموں میں بہیں لاتعداد دکنی اور گجراتی الفاظ اور محاورات ملتے ہیں۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ پرتگالیوں نے تبلیغ کے لئے

---

[1] خورشید: مرتبہ سید امتیاز علی تاج: ص ۲۰-۲۱ [2] ہندوستانی لسانیات: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: ص ۱۰۶
[3] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام: ڈاکٹر عبدالحق: ص ۶۴

اسی اردو کا استعمال کیا ہوگا جس میں گجری اور دکنی زبان اور محاورات کا استعمال ہوتا ہوگا اور وہ جو تصلیبی کھیل پیش کرتے ہوں گے وہ اسی زبان میں ہوتے ہوں گے۔ اگرچہ ان تبلیغی تماشوں کا فی الحال کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہے لیکن یہ بات بھی بعید از امکان نہیں ہے کہ اس کا کوئی نمونہ دستیاب ہو جائے۔

ڈاکٹر محمد اسلم قریشی اپنی تحقیقی کتاب "ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر" میں لکھتے ہیں کہ "شہاب الدین محمد شاہ جہاں (۱۶۲۸ء – ۱۶۵۹ء) کا دربار ڈرامائی نمائش سے یقیناً آشنا تھا اس امر کی شہادت ایک اطالوی سیاح نکول منوچی (NICCOLAO MANUCCI) کے سفرنامے STORIA DO MOGOR سے دستیاب ہوتی ہے۔ اس سیاحت نامہ کی جلد اول ہندوستان کے ۱۶۵۳ء سے ۱۷۰۸ء تک کے حالات پر مشتمل ہے — اس سیاح نے ۱۶۵۳ء میں وینس سے سفر کا آغاز کیا تھا اور یہ مغربی گھاٹ کے مشہور بندرگاہ سورت میں جنوری ۱۶۵۶ء میں وارد ہوا تھا۔ اس سیاح نے مذکورہ تصنیف میں مندرجہ ذیل واقعہ سپرد قلم کیا ہے[1] واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گجرات کا گورنر ناصر خان انتہائی ظالم شخص تھا جو رعایا پر ظلم و ستم کے ساتھ بے جا محاصل بھی وصول کرتا تھا جب ناصر خان کا ظلم ناقابل برداشت ہو گیا تو وہاں کے تاجروں نے شاہجہاں سے اس کی شکایت کرنا چاہا مگر دربار میں رسائی نہ ہو سکی اس لئے انہوں نے شہنشاہ کے دربار میں ایک کھیل پیش کرنے کی درخواست کی جو منظور ہو گئی۔ ان تاجروں نے ایک کھیل کے ذریعہ ناصر خان کے مظالم کو پیش کیا اور جب شاہجہاں نے تحقیق کرائی تو وہ سب الزامات درست پائے جو تاجروں نے کھیل کے ذریعہ پیش کئے تھے شاہجہاں نے ناصر خان کو رہتاس گڑھ کے قلعے میں قید کر دیا اور شہزادہ مراد بخش کو گجرات کا گورنر بنا کر بھیجا چونکہ مراد بخش ۱۶۳۳ء میں گجرات بھیجا گیا تھا اس لئے یہ کھیل ۱۶۳۲ء یا ۱۶۳۳ء میں کھیلا گیا ہوگا۔

منوچی کے اس بیان سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ شاہجہاں کے دربار میں ایک کھیل پیش کیا گیا تھا جو ڈرامے کے انداز کا تھا لیکن یہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی زبان کیا تھی۔ ہم نے اوپر لکھا تھا کہ اردو کے تین مراکز تھے۔ پہلا دلی، دوسرا گجرات اور تیسرا دکن۔ جہاں یہ اپنے اپنے ماحول کے مطابق ترقی کر رہی تھی جب تک گجرات کا سیاسی تعلق دلی سے نہیں تھا گجری فارسی اثرات سے محفوظ تھی لیکن جب مغلوں نے گجرات فتح کر لیا تو اس پر فارسی اثرات پڑنا شروع ہو گئے۔ چنانچہ خوب محمد چشتی نے اپنی مثنوی "خوب ترنگ" (۱۵۷۸ء) کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "من زبانِ گجرات کہ با لفاظ عربی و عجمی آمیز است گفتہ ام" اس لئے گجرات کے تاجروں نے جو ڈرامہ پیش کیا تھا وہ یہی فارسی و عربی آمیز گجری زبان ہو گی جو دلی اور گجرات میں بولی اور سمجھی جاتی تھی جسے اردو کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ وہ کھیل دستیاب نہیں ہے لیکن جن حالات میں وہ کھیلا گیا تھا اس سے اس کے پلاٹ کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے۔

تصلیبی کھیلوں اور شاہجہاں کے دربار میں کھیلے جانے والے ڈرامے سے یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اردو ڈرامہ کسی نہ کسی شکل میں پیدا ہو گیا تھا لیکن جب تک ان کے نمونے دستیاب نہ ہو جائیں ہم ان کے بارے میں کہ ان کی پیش کش کا کیا

[1] ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر: ڈاکٹر محمد اسلم قریشی: ص ۳۴۸

انداز تھا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

۱۹۷۵ء کا سال اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ اس سال ایک ایسا ڈرامہ (اوپیرا) دریافت ہوا جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سترھویں صدی میں اردو ڈرامہ موجود تھا۔ میری مراد شجیع الدولہ ناٹک سے ہے جسے ماہنامہ آج کل دہلی نے مارچ ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

"یہ اردو اوپیرا تیلگو رسم خط میں تاڑ کے پتوں پر لکھا ہوا تنجور کے مشہور عالم منذر کے سرسوتی محل کتب خانہ میں محفوظ تھا جناب وارانسی رام مورتی رینو پروڈیوسر ہندی پروگرام آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے اسے ہندی رسم خط میں منتقل کیا ہے جسے اردو رسم خط میں لکھ کر ناظرین آج کل کے لئے پیش کیا جا رہا ہے امید ہے کہ اردو محقق اس کی تصحیح کی طرف متوجہ ہوں گے کیونکہ مسودے میں بہت جگہوں پر مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔"

ناٹک کی ابتدا سوتردھار کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"حمد و شکر خداوند تعالیٰ کو سزاوار ہے اور نعت نبی کے نام پہ برقرار ہے۔"

"پس زبان حمد اور نعت کے دریا میں تیرنے سوں عاجز ہو کر بادشاہ اور امیروں کی طرف مائل ہوتی اور راجا شیواجی مہاراج دام ملوکہٗ و دام اقبالہٗ کے فرماں سوں بہتات قصاں سوں ایک قصہ پسند کر کر ناٹک راہ سوں ترجمہ کرنے رجوع ہوئی پس عقل بھی اس زبان کی رفیق یار و انیس اور شریک ہوئی اور ہر دو ایک ہو کر کہنے لگے۔

تجو ہندوستان اور بنگال کے مابین کریم آباد ایک شہر ہے بادشاہ اس شہر کا ملک شاہ اور فرزند اس شاہ کا) شجیع الدولہ اور وزیر اس شاہ کا مشیر الاشیر اور بیٹا اس وزیر کا نطق پذیر اور نقیر لوکل شاہ اور بیٹی اس فقیر کی شرمناک بی بی کا ہے۔

"پس یہ جملہ تحسین چاہتا ہے تو اول نقیب شہر مذکور آتا ہے۔ دیکھو۔"

نقیب کے اعلان کے بعد ناٹک شروع ہوتا ہے اور اختتام سوتردھار کی دعا اور طلب پر اس طرح ہوتا ہے

پس شہزادہ نے تلوار نیچے رکھ کر اپنی بی بی کی بہت دلداری کی اور ہاتھ میں ہاتھ لے کر بستان سرا کے اندر لے گیا۔ پس ہر دو شیر و شکر مانند لعل مل رہے ہمیشہ اونوں کے آل اولاد و کریم آباد کے شہر امن چین سوں رہتے رہے۔

" دعا: الٰہی جیسا وہاں تیسا سب جہاں کو رکھ خوشی سے ہمارے خاوند کو اور اس کے امیراں کو سرسبز رکھ امن و امان سوں رکھ۔

درد.......

وچن: خدا کے فضل سوں موافق خاطر خواہ راجے شیواجی مہاراج دام اقبالہ کے شجیع الدولہ اور شرمناک بی بی کا قصہ پورا ہوا!"

شجیع الدولہ ناٹک (اوپیرا) وہ قدیم اوپیرا ہے جو ابھی تک دستیاب ہوا ہے۔ کہانی میں ڈرامائی کیفیات موجود ہیں سوتردھار پورے ناٹک کے دوران موجود رہتا ہے وہ مناظر بیان کرتا ہے اور قصہ کے تسلسل کو جوڑتا ہے۔ زبان دکنی ہے اور فارسی کا نہ صرف گانوں میں استعمال کیا گیا بلکہ بادشاہ اور وزیر بھی اکثر فارسی میں گفتگو کرتے ہیں۔ مصنف نے اسے شیواجی کے حکم سے تصنیف کیا جانا بتلایا ہے۔ شیواجی کی تخت نشینی ۱۶۷۴ء میں ہوئی اور دیہانت ۱۶۸۰ء میں۔ اس لئے یہ اوپیرا انہیں تاریخوں کے درمیان لکھا گیا ہوگا۔ اس لئے اسے اردو کا دستیاب شدہ قدیم ترین اوپیرا تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ اوپیرا خالص سنسکرت ڈرامے کی

تکنیک پر لکھا گیا ہے۔ اس میں سنسکرت ڈرامے کا سوتر دھار موجود ہے۔ سنسکرت ڈرامہ دیوی دیوتاؤں کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ یہ اوپیرا خدا کی حمد اور نعت سے شروع ہوتا ہے۔ سنسکرت ڈرامے کی طرح سوتر دھار کرداروں کا تعارف کراتا ہے اور نقیب بادشاہ کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ سنسکرت ڈرامے میں راجا اور دوسرے اعلیٰ طبقہ کے لوگ سنسکرت بولتے ہیں اس میں بادشاہ اور وزیر فارسی بولتے ہیں ڈرامے کا اختتام سوتر دھار کی دعا پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح اردو ڈرامہ پر یہ اعتراض کہ اس نے سنسکرت ڈرامے سے فائدہ نہیں اٹھایا خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ڈرامے کے آثار کسی نہ کسی شکل میں پندرھویں اور سولہویں صدی سے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک بات اور عرض کرنا ہے کہ اکثر حضرات کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شکنتلا کا وہ ترجمہ جس کو شاہ فرخ سیر (دسمبر ۱۷۱۲ء سے جنوری ۱۷۱۹ء) کے زمانے میں نواز نامی شاعر نے ۱۷۱۶ء میں برج بھاشا میں ترجمہ کیا اور اس کا ترجمہ مرزا کاظم علی جوان نے ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش پر کیا اردو کا پہلا ڈرامہ ہے۔ نواز ہندی کا شاعر تھا اور ہندی تلفظ سے اپنا تخلص نواج کرتا تھا۔ اس نے شکنتلا ریسین مہلی ہندی کوتا اور دوہوں میں کیا تھا اور جوان نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ نثر میں قصہ بیان کر دیا ہے جس کا اعتراف خود جوان نے کیا ہے کہ "اگرچہ سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا بہت سا پڑھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر التفاتات سے رہ گیا[1] اس لیے نواز اور جوان کو اردو ڈرامے کی تاریخ میں شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایک نے ہندی کا استعمال کیا ہے اور دوسرے نے نثر میں داستان کے طور پر قصہ بیان کر دیا ہے ■

مظہر امام

غزل

تم سے نہ ہم ملے تو زمانے سے کب ملے
جو لوگ بھی ملے وہ تمہارے سبب ملے

اب اتنا رابطہ بھی نصیبوں کی بات ہے
اُس سے کہوں، بخیر ہوں، وہ چاہے جب ملے

تیرا ہی ایک رنگ سبھی سے الگ نہ تھا
اس راستے میں سارے مناظر عجب ملے

کل وہ ملا تھا راہ میں یوں مجھ سے ٹوٹ کر
جیسے ہوائے درد سے شاخِ طرب ملے

ہم تھے کہ آنسوؤں کے سفر پہ رواں رہے
ورنہ بہت سے غم ہمیں ساغر بلب ملے

اک میں، شکست و فتح، مرا مسئلہ نہ تھا
ورنہ اسی محاذ پہ، جلتے تھے، سب ملے

میری گذارشوں پہ تو ہوگا ہی نرم دل
لیکن مزہ تو جب ہے کہ وہ بے طلب ملے

میں بھی گدائے بارگہِ ہجر ہوں امامؔ
مجھ سے کنیزِ غم جو ملے، باادب ملے

---

[1] اردو تھیٹر (جلد اول) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی: ص ۲۲۵

رباعیات

ظفر مرادآبادی

صدرنگ اُجالوں کا بدن ہے بھارت
اک شوخ جواں سال دلہن ہے بھارت
کیوں ناز نہ ہو اپنے مقدّر پہ ہمیں
صد رشکِ چمن اپنا وطن ہے بھارت

ہر ندی میں کنواری کا چھبیلا پن ہے
میدان میں زرسکار سجیلا پن ہے
پربت ہو کہ ساگر ہو مرے بھارت کے
ہر ذرّہ میں بانکپن، انیلا پن ہے

ہر شہر کہ یوسف سا ہو چہرہ جیسے
ہر گاؤں کہ ہو حسنِ زلیخا جیسے
مہکے چمنستان ہیں باغِ فردوس !
صحراؤں کے خاشاک مسیحا جیسے

جو رُت ہے مرے دیش کی متوالی ہے
برسات میں ملہار ہے، ہریالی ہے
ڈھلتی ہوئی سردی میں ہے ہولی کی بہار
اور چڑھتی ہوئی سردی میں دیوالی ہے

صد رنگ و دل آویز مہکتا گلزار !
ہر پھول میں اک دیپ، کھنک، لَو، جھنکار
ٹیگور، فراقؔ، سورؔ، تلسیؔ، غالبؔ
ہر لہجہ غزل، گیت، رباعی، ملہار

●

یوسف ناظم

حق نمک کا

آدمی کے لئے پانی صرف اس لئے ضروری نہیں ہے کہ جب اُسے پیاس لگے تو وہ پانی سے اپنا حلق تر کرلے یا کبھی اس کا جی چاہے تو دن میں دو تین مرتبہ نہائے اور پانی کو دولت کی طرح بہائے یا فرصت ہو تو گھر کے برتن دھوئے اور اور پانی کا نل اس طرح کھلا چھوڑ دے جیسے مائیں اپنے بچّوں کو کھیلنے کے لئے گھر کے باہر چھوڑ دیتی ہیں اور چھوڑ کر بھول جاتی ہیں بلکہ پانی اس لئے ضروری ہے کہ نمک پانی ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ قدرت نے دُنیا میں تری کا حصّہ اس لئے بافراط رکھا ہے کہ آدمی اس سے نمک جمع کرے اور اسے مناسب طریقے سے استعمال کرے۔ ہم نے تاریخ میں کہیں پڑھا تھا کہ ایک زمانے میں لوگ نمک کی ٹکیاں بناتے تھے اور اُنھیں، آج کے روپے کی طرح استعمال کرتے تھے۔ ٹھہریئے ہم سوچ کر بتاتے ہیں کہ یہ کہاں کا سِکّہ تھا۔ ہاں یاد آیا۔ ایتھوپیا میں یہ بغیر تلے ہوئے نمک پارے بازار میں چلتے تھے۔ بارش کے دنوں میں یہ سکّے کس طرح محفوظ رکھے جاتے تھے مؤرّخوں نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا لیکن گذشتہ زمانے کے لوگ بھی کافی ذہین تھے۔ جب وہ لوگ اپنے مرحومین کی نعشوں کو برسوں تر و تازہ رکھ سکتے تھے تو کیا نمک کی ان ٹکیوں کو بارش کے پانی سے محفوظ نہیں رکھتے ہوں گے۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ نمکین سکّہ آج بھی رائج ہے۔ ممکن ہے اُس کی سرکاری کوئی حیثیت نہ ہو لیکن آپس میں یہ کوپنوں کی طرح تو قبول ہی کیے جاتے ہوں گے۔ نمک کے سکّوں میں کالے دھن کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ نمک کو کالے دھن میں منتقل کرنا شاید نمک حرامی کی بات تھی۔ اس نمک حرامی کا تصوّر بھی غالباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اِن کا رواج۔ کسی کے یہاں ایک وقت کا کھانا یعنی چند لُقمے کھا لیتا تو تباہ و برباد ہو جاتا۔ یہ چند لُقمے جن سے شاید اُس شخص کی شکم سیری بھی نہ ہوتی ہو، عمر بھر اس کے دل و دماغ پر مُسلّط رہتے اور اُسے بالجبر نمک حلال بنائے ـــــ یہ بڑی سخت قید تھی۔ بہرحال اب یہ فرسودہ رسم قصۂ پارینہ ہو گئی ہے۔ مانا کہ آج کا آدمی ہر قسم کی مہنگائی سہنے کی ہمّت رکھتا ہے لیکن نمک حلال رہنا تو بہت مہنگا سودا تھا۔

آدمی کی غذا میں نمک تو چاہیئے ہی لیکن آدمی کے چہرے پر بھی نمک درکار رہے۔ بعض بہت ہی خوش نما چہرے، اُن پر ایک نمک کے نہ ہونے کی وجہ سے نظرانداز کر دئے جاتے ہیں۔ آدمی کے چہرے پر زیادہ نہ سہی کم سے کم اتنا نمک تو ہونا چاہیئے جتنا نیم برشت انڈے

یہ چھڑکا جاتا ہے۔ آدمی کے چہرے پر جو نمک پایا جاتا ہے (یا جو پایا جانا چاہیئے) وہ صرف دیکھنے کا ہوتا ہے۔ یہ سائنٹ سیٹنگ کے کام آتا ہے۔ انسانی چہروں پر کھٹاس یا مٹھاس نہیں ڈھونڈی جاتی صرف نمک ہی تلاش کیا جاتا ہے۔

ہمارے شاعر اپنے کلام میں ماہ پاروں کا بہت ذکر کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کو اپنی عملی زندگی میں ماہ پاروں کی نہیں نمک پاروں کی تمنّا ہوتی ہے اور اِن کی تمنّا کا ہر قدم اُسی سمت میں اُٹھتا ہے۔ عملی زندگی سے مُراد وہ زندگی ہے جو ان کی عملی زندگی سے بالکل مختلف بلکہ اکثر صورتوں میں متضاد ہوتی ہے۔ شاعر اصل میں ذائقہ پسند لوگ ہوتے ہیں انھیں ایک ہی وقت میں نمک بھی چاہیئے اور شکر بھی۔ ایک شعر ہم نے کچھ اس قسم کا پڑھا تھا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

پریم چند نے شاید اسی لئے کہا تھا کہ حُسن کا معیار بدلنا چاہیئے۔ لیکن اُن کا مشورہ کسی نے مانا نہیں۔ (جب ہم لوگ کسی بات کو ماننا نہیں چاہتے تو اُسے اپنی تحریروں اور تقریروں میں کوٹ کرتے رہتے ہیں)

یہ نمک جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں زن و شوہر کے تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ جس دن کھانے میں نمک کم یا زیادہ ہو جائے پانی پت کی ایک لڑائی ضرور منعقد ہوتی ہے بیویوں نے اس لئے اب کھانا پکانا ترک کر دیا ہے اور دفاتر میں اِن کی آبادی دن بہ دن بڑھتی ہی جاتی ہے بلکہ دفاتر اب انھیں کی وجہ سے آباد ہیں۔ میاؤں کا یہ آج کا نہیں، صدیوں پرانا وطیرہ ہے کہ گھر کے باہر وہ خواہ ہری مرچ کھائیں یا سُرخ مرچ گھر میں اُن کے لئے نمک اس طرح نپا تُلا ہونا چاہیئے جیسے سونا تولا جاتا ہے۔ کھانے میں نمک کے کم ہونے یا زیادہ ہونے پر طلاقیں ہوئیں یا نہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن برتن کافی ٹوٹے ہیں اور گھر کی دیواروں پر تجریدی آرٹ کے نمونے بھی بکثرت نمودار ہوتے ہیں۔ نمک نے کراکری کی صنعت اور اس کی تجارت کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ بہت سی بیویاں تو جن کی بینائی کثرتِ ویڈیو بینی کی وجہ سے کافی تیز ہو گئی ہے پِسے ہوئے نمک اور باریک شکر میں تمیز نہیں کر سکتیں۔ ہمارے باورچی خانوں میں انقلاب انہی خواتین کی وجہ سے آیا ہے۔ جس طرح آج کل کی کتابوں اور رسالوں میں معنوی خوبیاں کم اور صوری خوبیاں زیادہ ہو گئی ہیں، باورچی خانے بھی اسی طرح بہت خوبصورت دکھائی دینے لگے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب باورچی خانے میں ہر کام بیٹھ کر کیا جاتا تھا۔ اب عورتیں اس لئے نہیں بیٹھتی ہیں کہ انھیں ایلکشن میں کھڑا ہونا ہے۔ اس کی مشق وہ باورچی خانے میں ہی کرتی ہیں۔ کچھ خواتین کو تو یہ تک کہتے سُنا گیا ہے کہ باورچی خانے کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ مردوں کا صحیح مقام یہ ہے ورنہ اس جگہ کا نام ماماخانہ ہوتا۔ وہ اس خیال کی بھی حامی ہیں کہ مردوں کو کھانا کھلانا اِن کا کام نہیں ہے۔ (گُل کھلانا اِن کا کام ہے)

انگریز جب ہندوستان پر بجملہ دو سو گورا فوج کے بل پر حکومت فرماتے تھے تو اُنھیں یہاں کا نمک بہت پسند آیا تھا۔ اتنا نمک اُنھوں نے اس سے پہلے شاید دیکھا بھی نہیں تھا۔ دریائے ٹیمز میں نمک ہونا بھی نہیں ہوگا۔ انگریز اسی لئے بہت ہی پھیکی غذا کھانے کے عادی ہیں اور اُنھیں جب کوئی ایسی بیماری لاحق ہوتی ہے جس میں نمک کھانے کی ممانعت کی جاتی ہے تو اُنھیں مطلق افسوس نہیں ہوتا جبکہ ہمارے یہاں بیمار تو بیمار، تیمارداروں کے چہروں پر بھی مُردنی چھا جاتی ہے۔ انگریزوں نے جب اتنا سارا نمک یہاں دیکھا تو اُنھیں پھر آؤ دیکھنے کی ضرورت تھی نہ تاؤ۔ اُنھوں نے بیک جنبشِ قلم، اِس پر ٹیکس لگا دیا۔ یہ ٹیکس زخموں پر نمک

چھڑکنے کے برابر ہوا۔ ایک تو غلامی کا زخم اُس پر مُستزاد
ٹیکس۔ ہم لوگ مزاجاً ٹیکس دینے کی تائید میں نہیں
ہیں۔ آج بھی جبکہ انگریز یہاں نہیں ہیں، ٹیکس دینے کو
ہمارا جی نہیں چاہتا۔ ہاں کوئی زبردستی وصول کرلے وہ
الگ بات ہے۔ انگریز اگر نمک پر ٹیکس نہ لگاتے تو شاید
ہم لوگ کچھ دن اور مہمان رکھتے کیونکہ ہندوستان تو
غریب خانہ ہے اور ہر بلا کے لئے کھلا ہے لیکن ہمارے
ہی نمک پر ٹیکس لگا کر تو اُن لوگوں نے ہماری رگِ
حمیّت کو (جسے ہم بھول گئے تھے) ورغلایا تھا۔ یوں بھی
ہم لوگ روایتاً نمک کے شیدائی بلکہ سودائی رہے
ہیں۔ کھانے کی تھال میں (تھالی کہنا زیادہ مناسب ہوگا)
جسے آج کل ہم راکس پلیٹ کہتے ہیں۔ نمک الگ سے
ضرور رکھا ہوتا ہے۔ (اسے ہم باضابطہ ایک ڈش کا
رُتبہ دیتے ہیں) اگر تھالی میں نمک نہ رکھا ہو تو شاید
ہماری بھوک ہی نہ کھلے۔ ہمارے بزرگ تو نمک کی مدد
سے حلف وغیرہ بھی اُٹھایا کرتے تھے۔ ایسا ہم نے سُنا
ہے۔ اب یہ سب کچھ تو ہم کرنے سے رہے لیکن نمک کا
ادب و احترام ہمارے یہاں اب بھی کیا جاتا ہے۔

اُردو کے ایک شاعر کے دیوان میں ہم نے نمک کے
تعلّق سے ایک پوری غزل دیکھی تھی جس کا ایک مصرع آج
بھی ہمارے کمزور حافظے میں محفوظ ہے ؏

زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چُنتا نمک

چونکہ غزل کے اشعار ہماری سمجھ سے بالاتر تھے
اس لئے گمان یہ ہے کہ یہ غزل غالب کی ہوگی۔ غالب
ہمیں اس لئے پسند ہیں کہ جہاں انھوں نے صرف سخن فہموں
کے لئے شعر کہے ہیں وہیں کفوظا بہت ہمارا بھی خیال
رکھا ہے اور کہا ہے ؎

بھیجی ہے جو مجھ کو شہِ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال

یا پھر وہ چار مصرعے جو انھوں نے سیم کی پھلی سے
متعلق کہے ہیں۔

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دُعائیں سَو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

یہ اشعار ہمیں اس لئے یاد رہ گئے کہ اِن کا تعلّق
دسترخوان سے ہے اور دسترخوان کا نمک سے۔
نمک تو سبھی کھاتے ہیں لیکن اِن سب کو نمکخوار نہیں
کہا جا سکتا۔ نمک خواری میں حسنِ اتفاق سے نہیں بد اتفاقی
سے خواری شامل ہے (عجیب بات ہے کہ شکر کے ساتھ
خواری کا لاحقہ یا سابقہ جو بھی کہئے منسلک نہیں ہے۔
شکر خوری بھی میوہ خوری اور ہوا خوری کے قبیل کی
چیز ہے)

کھانے کا نمک الگ اور زیادہ کھانے کا نمک
الگ ہوتا ہے۔ کھانا اپنی حیثیت سے زیادہ کھا لیا
جائے (کبھی کبھی دعوتوں میں ایسا کرنا پڑتا ہے) تو اس
کا مداوا بھی نمک ہی ہے جسے لاہوری نمک کہا جاتا
ہے۔ یہ نمک اب نظر نہیں آتا (ویسے لاہور بھی ویزا کے
بغیر کب نظر آتا ہے) ورنہ ایک زمانہ تھا جب ہر گھر میں
لاہوری نمک کا ایک مرتبان ضرور رکھا رہتا تھا۔ اُسی
زمانے کی بات ہے کہ نمکِ جالینوس بھی اتنا ہی مقبول
تھا جتنا کہ اس زمانے میں ایک فلم اسٹار ہوتا ہے
(یا ہوتی ہے)۔ اب لاہوری نمک اور نمکِ جالینوس کی
ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ آدمی پیٹ بھر کر کھانا کھالے
یہی بہت ہے ورنہ پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں"۔

گو کہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ آدمی ۴ عناصر
سے بنا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس شخص کی ترتیب
و تدوین میں نمک کا بھی عنصر ضرور شامل ہے۔ آدمی کے
آنسو ذائقے میں نمکین ہوتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ یہ آنسو
اصلی ہوں مگرمچھ کے آنسو نہ ہوں۔ آنسوؤں کے نمکین

ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی جب کبھی اپنے مُنہ کا مزا بدلنا چاہتا ہے اپنے آنسو پی لیتا ہے (آدمی کتنا خود مُکتفی ہے) اپنی مدد آپ کرنے کی اس سے زیادہ آسان ترکیب کوئی ہے بھی نہیں۔ آٹھ آٹھ آنسو روئیے (لیکن بہائیے مت) اور جتنا چاہے نمک حاصل کیجئے ـــ عورتیں تو اپنے آنسو بطور اسلحہ استعمال کرتی ہیں۔ ایسے نمکین ہتھیار کسی کارخانے میں نہیں تیار کیے جا سکتے۔ خواتین آنسوؤں کے معاملے میں بھی کافی فضول خرچ واقع ہوئی ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم بہت افسردہ ہو جاتے ہیں کہ یہ خواتین کیوں اتنے آنسو بہاتی ہیں۔ ایک خاتون کا واقعہ ہمیں یاد ہے جو کچھ اس طرح کا ہے۔

بس یہ ہوا کہ اُس نے تکلّف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لئے

ویسے تو بہت پہلے ایک شاعر نے بھی کہا تھا کہ اگر وہ رونے پر آ جائے تو دریا کے دریا بہا دے لیکن وہ صرف شاعری تھی۔ شعر اُس نے ضرور کہا لیکن کیا کچھ نہیں جب کہ دو چار دوپٹوں کے آنسوؤں سے تر ہو جانے کا واقعہ، واقعی ظہور پذیر ہوا۔ ذرا سی بات پر اس قدر رونا اپنے آپ کے ساتھ زیادتی ہے اور اس طرح رونے سے کتنا نمک ضائع ہو گیا ہوگا۔

دُنیا کی ہر چیز بدل گئی ہے لیکن یہ نمک نہیں بدلا۔ آدمی نے شرم سے پانی پانی ہو جانا ترک کر دیا ہے (بعض شہروں میں پانی کی قلّت کی بھی یہی وجہ ہے) لیکن یہ نمک آج بھی یوں ہی رکھے رکھے پانی ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں یہ کس بات پر شرمندہ ہے۔ اس لئے تو نہیں کہ ایسے ہم کھاتے ہیں ■

بشیر بدر
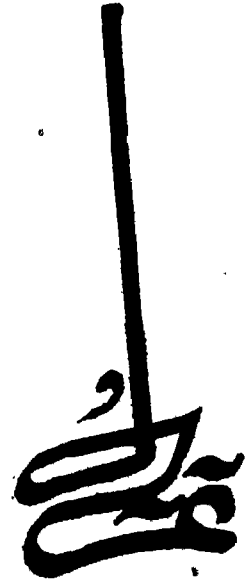
سبھی سے ان دنوں روٹھا ہوا سا لگتا ہوں
میں اپنے آپ کو اب بے وفا سا لگتا ہوں

تمام رات میں گرتی ہوئی حویلی ہیں
دلوں سے نکلی ہوئی بد دعا سا لگتا ہوں

میں وہ خزانہ ہوں حقدار جس کی دنیا ہے
ہزار حصّوں میں بانٹا ہوا سا لگتا ہوں

مری تلاش بدستور اب بھی جاری ہے
وہ مل گیا ہے، میں کھویا ہوا سا لگتا ہوں

چمک رہا تھا یہ چہرہ کسی کی آنکھوں میں
یہ آئینے میں کوئی دوسرا سا لگتا ہوں

تمام رات برستی ہے ریت پر شبنم
میں اپنے چاند سے جب بھی خفا سا لگتا ہوں

قیصر قلندر

تمہارے نام پر.....!

وہی عکسِ جہاں افروز تاروں میں بہاروں میں
سبوئے ماہ میں یادوں کی صہبا بانٹنے والی
بڑی مدت سے میرا کاسۂ اُمید ہے خالی
تمہارے نام پر ساغر چلے ہیں مے گساروں میں

سمن زارِ محبت میں، بہاروں ماہ پاروں میں
شبِ کاکل میں صبحِ عارضِ گلگوں کی ہے لالی
نگاہوں نے صنم سازی کی طرح تو بھی کیا ڈالی
تمہارے نام پہ ساغر چلے ہیں گل عذاروں میں

سلگتی ہو رگِ مینا میں جیسے آتشِ صہبا
مرے شہرِ تمنا میں اسی طرح سے پنہاں ہو!
مری شہزادئ گل، موجِ نغمہ، موجۂ نکہت
مرے شہرِ خیال و بزمِ نغمہ میں غزل خواں ہو!
تمہیں ڈھونڈا تھا میں نے گل زمینوں میں بہاروں میں
چھپی ہو میرے سازِ شوق کے خاموش تاروں میں

راز اٹاوی

عصر جدید کا انساں

جسم، شیشے کا۔
قلب، پتھر کا۔
روح، مٹی کی۔
ہاتھ، کاغذ کے۔
پاؤں، لکڑی کے۔
روپ، لوہے کا۔
زرد چہرے پہ نقرئی غازہ۔
سرد آنکھوں میں آتشیں جلوہ۔
لب پہ اظہارِ جذبۂ اخلاص۔
دل میں تخریب، کد، ریاکاری۔
موجزن خوں میں
تلخیٔ زہراب۔
ہر نفس اک پیامِ استحصال
ہر قدم اس کا وقفِ جنگ و جدال
زیبِ تن،
پیرہن علائق کا
جس میں
ترکِ تعلقات کا رنگ
حسنِ روحانیت سے بیگانہ
رمزِ انسانیت سے بیگانہ
سر پہ ——
دستارِ دانش و عرفاں
یہ ہے،
عصرِ جدید کا انساں

ڈاکٹر جاوید وشِشٹ

سب رس

گولکنڈہ کے بلند قامت شاعر ونثر نگار اور قطب شاہی دربار کے عظیم ملک الشعراء مُلّا اسد اللہ وجہی کے دکنی اُردو کے پہلے ادبی نثری شاہکار "سب رس" کو سب سے پہلے استاد محترم بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے دریافت کیا تھا۔ اُنھوں نے اپریل ۱۹۲۵ء میں رسالہ "اُردو" میں ایک عالمانہ مقالہ سپردِ قلم کرکے اُردو دنیا سے سب رس کا تعارف کرایا۔ ۱۹۳۲ء میں اصل کتاب مع مقدمہ وفرہنگ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے پہلی بار شائع کی۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن ہندوپاک سے شائع ہوئے۔ مولوی صاحب نے صرف چار مخطوطوں کی مدد سے سب رس کو مرتب کیا۔ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی حیدرآباد نے سب رس کو تیرہ ۱۳ مخطوطوں کی روشنی میں ازسرِنو ترتیب دیا ہے اور "سب رس" کی تنقیدی تدوین" کے نام سے ان کا مقالہ شائع ہو گیا ہے۔ مولوی صاحب کی خواہش کے مطابق راقم الحروف نے ۱۹۶۵ء میں سب رس کے "قصّہ حسن ودل" کو مرتب کیا اور ۱۹۷۲ء میں مُلّا وجہی کے انشائیے ترتیب دئے۔ اس طرح سب رس کو دو کتابوں میں منتقل کر دیا۔ یہ دونوں کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

مُلّا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر ۱۶۳۶ء میں سب رس کی تالیف کی۔

سب رس کا دیباچہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وجہی نے حمد، نعت، منقبت کی قدیم روایت کو قائم رکھا ہے۔ حمد کے بعد وجہی "در نعت محمد مصطفیٰ وچہار یار ومنقبت علی مرتضیٰ" کے عنوان کے تحت نعت و منقبت تحریر کرتا ہے۔ مُلّا اسد اللہ وجہی شیعہ تھا، مگر پھر بھی اس نے چہار یار یعنی خلفائے راشدین کا تذکرہ کیا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ بارہ ۱۲ برس کی عمر میں ۱۶۲۶ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔ عبداللہ کی والدہ حیات بخشی بیگم دختر محمد قلی قطب شاہ کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت تھی۔ بقول پروفیسر ہارون خاں شروانی، حیات بخشی بیگم بہ نفسِ نفیس اورنگ زیب عالمگیر کے فوجی کیمپ میں گئی اور اُس نے صلح کے شرائط نامہ پر دستخط کیے تھے۔ جس میں پہلی شرط یہ تھی کہ شاہی خطبہ سے شیعیت کی رنگ آمیزی ختم کی جائے اور سُنّی عقائد کے مطابق خطبہ کو ڈھالا جائے۔ انہی حالات کی نزاکت کے تحت وجہی نے خلفائے راشدین کا ذکر کیا۔ مگر اس کے باوجود وجہی اپنے عقیدے کے اظہار سے نہیں چوکتا۔ لکھتا ہے۔

"محمد کوں جس رات ہوئی معراج
وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج"

"سببِ تالیف و مدح بادشاہ" کے تحت وجہی

آداب دربارداری اور اس کے رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ
ان الفاظ میں کرتا ہے :۔

"سلطان عبد اللہ۔ ظل اللہ! عالم پناہ،
صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ، دشمن پرور،
ثانی سکندر۔ عاشق صاحب نظر،
دل کے خطرے تی باخبر۔ صورت میں یوسف
تے اگلے، آدم بے ہوش ہوئے،
پیغمبر پگلے، حکمت میں افلاطون شاگرد،
سخاوت میں حاتم کا کوے برد، شجاعت
میں رستم گرد، عالی ہمت غازی مرد۔
شمشیر ہور ست کے صاحب، نیم
دھرم ہور ست کے صاحب۔ دارا در
فریدون فر۔ کلیم بیان، مسیحا دم،
مریخ صولت، زہرہ عشرت، خورشید
علم، صباح کے وقت، بیٹھے تخت۔"

مدح بادشاہ کے بعد اپنی طلبی اور بادشاہ کی فرمائش کا
ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"وجہی نادرمن کوں، دریادل گہر سخن کوں،
حضور بلائے، پان دے، بہوت
دے ہور فرمائے النسان کے وجود دیکھ
میں کچھ عشق کا بیان کرنا، اپنا ناؤں
عیاں کرنا، کچھ نشان دھرنا۔ وجہی
بہوتگی گن بھریا، تسلیم کر کر سر پر بات
دھریا۔"

دیباچہ کے آخری حصہ "در زینت سخن و درنام
کتاب گوید" میں وجہی نثر میں تعلّی کا ایک نیا ریکارڈ
قائم کرتا ہے اور یہ سب اپنے حریف مُلّا غواصی سے
اپنا لوہا منوانے کے لئے کرتا ہے۔

وجہی کا یہ دعویٰ بھی غور طلب ہے کہ:

"جیتے چو سالاں، جیتے فہم داراں، جیتے
گن کاراں ہوئے سن آج لگن، کوئی
اس جہان میں، ہندوستان میں، ہندی
زبان سوں، اس لطافت اس چھنداں
سوں، نظم ہور نثر ملا کر، گلا کر یوں
نیں بولیا۔"

وجہی سب رس کی زبان کو ہندی قرار دیتا
ہے اور نظم و نثر کے اس ملغوبہ کو سب رس کا اسلوب
ٹھہراتا ہے۔

دیوی سنگھ چوہان سب رس کے قصّہ حسن و دل
کا ماخذ گیارہویں صدی عیسوی کے ایک ہندوستانی
برہمن کرشن مشر کے تمثیلی سنسکرت ناٹک "پربودھ
چندرودے" کو قرار دیتے ہیں۔ حقیقت میں سب رس
کا ماخذ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی، خماری، اسراری
نیشاپوری کی فارسی مثنوی "دستور عشاق" اور
اس کا نثری خلاصہ "قصہ حسن و دل" اور "شبستان
خیال" ہے۔ پربودھ چندرودے قصہ حسن و دل کا
محرک ہو سکتا ہے ماخذ نہیں۔

بابائے اُردو مرحوم سے لے کر ڈاکٹر نورالسعید
اختر تک سبھی نے وجہی پر یہ الزام لگایا ہے کہ سب رس
کا قصّہ اس نے فتاحی کے قصّہ حسن و دل سے اُڑایا ہے۔
حالانکہ وجہی نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ قصّہ اس
اس کا طبع زاد ہے۔ دیباچہ میں وہ صاف "سبب تالیف"
لکھتا ہے اور دیباچہ کے ایک اہم جملہ سے بھی اس
بات کی تصدیق ہوتی ہے وجہی لکھتا ہے:۔

"اتا نوی بات پاڑیا، گاڑا سو گنج کاڑیا
کچھ نہیں تھا سو لیایا، بات دکھلایا"

وجہی قصّہ حسن و دل کو ایک لوک کتھا سمجھتا
تھا۔ فتاحی نے کرشن مشر سے تقریباً چار سو سال بعد
فارسی میں اور وجہی نے تقریباً چھ سو برس بعد دکنی
اُردو میں یہ قصّہ پیش کیا تھا۔ سرقہ کا الزام نہ فتاحی

پر عائد ہوتا ہے اور نہ وجہی پر۔ اس لئے میں سرقہ کی
اس روایت کو غلط اور بے بنیاد قرار دیتا ہوں۔

سب رس کے قصۂ حسن و دل میں چھوٹے
موٹے ۴۷ کردار ہیں۔ خال کے غلام اور حبشی بچے
ان کے علاوہ ہیں۔ قصہ میں ۴۳ مقامات کا ذکر بھی ہے۔
دل اس قصّہ کا ہیرو ہے جو مغرب کے بادشاہ عقل
کا فرزند ہے اور حسن مشرق کے بادشاہ عشق کی بیٹی
ہیروئن ہے۔

قصّہ کا آغاز تلاش آب حیات سے اور اختتام
عشق و عقل کی جنگ پر ہوتا ہے۔ جس میں عشق کی فتح
ہوتی ہے۔ عقل عشق کا وزیر بن جاتا ہے حسن و
دل کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک دن دل، ہمت اور
نظر تینوں شراب پیتے ہوئے "گلشن رخسار" میں
پہنچتے ہیں "چشمۂ آب حیات" کے کنارے حضرت
خضر کو دیکھتے ہیں۔ ہمت کے کہنے پر دل خضر کی قدم
بوسی کرتا ہے اور خضر آنکھوں میں اسرار
معرفت سمجھا دیتا ہے۔

حسن و دل کا سب سے بڑا بیٹا یہ کتاب
سب رس ہے وجہی کہتا ہے :-

"دل کوں فرزنداں ہوئے، فرزنداں خردمنداں ہوئے
اس فرزنداں میں کا بڑا فرزند سو یو کتاب"۔

سب رس کا اختتامیہ اہم خصوصیات کا
حامل ہے۔ اس میں آرٹ کی بنیادی قدروں کو پیش کیا
گیا ہے۔ نیز فن کی تخلیق کے نفسیاتی اسباب پر بھی
روشنی ڈالی گئی ہے۔ یوں تو پوری کتاب میں شخصیت
کا تجزیہ و تحلیل اور ایک اعلیٰ متوازن شخصیت
کی ترکیب کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سیرت انسانی
میں جو نفسیاتی تضاد پایا جاتا ہے اور اس وجہ سے
جبلتوں کے درمیان جو تصادم ہوتا ہے، اس کی
ایمائی اور افسانوی ترجمانی بھی کی گئی ہے غرض
سب رس کا اختتامیہ فن و نقد فن کے رموز و
نکات کا گنجینہ ہے۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر
کہ "انسان کے وجود ہی میں عشق کا بیان کرنا"
سب رس کی تخلیق ہوتی ہے اور اس فرمائش
میں فارسی کے قصۂ حسن و دل کی طرف ایک مبہم سا
اشارہ بھی پوشیدہ ہے۔

اس قصہ میں انسان کا وجود ہی اس
مہا بھارت کا کوروکشیتر یا اس رزمیہ کا میدان
جنگ ہے جہاں انسان خود اپنے وجود سے برسر
پیکار ہوتا ہے، ایک طرف اس کے جذبات و
احساسات کی طوفانی موجیں مورچہ لگاتی ہیں تو
دوسری طرف اس کی عقل و خرد، فہم و فراست،
ادراک و آگہی کا لشکر صف بستہ ہوتا ہے۔
حقیقت میں یہ جنگ انسان کے باطن کی نفسیاتی
کشمکش ہی ہے۔ جنگ میں عشق کی فتح ہوتی ہے
اور عقل کی شکست۔ مگر جلد ہی ان کے درمیان
صلح ہو جاتی ہے۔ اور عقل کو عہدۂ وزارت
تفویض ہوتا ہے۔ اس طرح دل کو پاسبان عقل
مل جاتا ہے غرض انسان کے وجود میں ایک توازن
اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا اس جنگ کا
انجام انسان کی ذہنی کشمکش کے خاتمے پر ہوتا ہے
اور روحانی سکون، عرفان و معرفت کے مدارج طے
کرتا ہوا خود شناسی پھر خدا شناسی کی منزل تک لے جاتا
ہے۔ غرض وجہی نے بیانی عشق میں بڑی فنکاری اور
چابک دستی سے کام لیا ہے۔ اور ذہنی کیفیات، جذبات
اور مجرد خیالات کو انسانی کرداروں کے سانچے میں ڈھال
کر سب رس کو ایک مکمل اور کامیاب تمثیل کا جامہ
پہنا دیا ہے۔

در اصل سب رس کا تعلق تصوف سے ہے۔

وجہی نے رمزیہ انداز میں تصوف کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے اس کے سارے کردار دوہری شخصیت رکھتے ہیں۔ اپنی مجازی صورت میں یہ کردار کسی قصہ کے کردار معلوم ہوتے ہیں مگر دراصل یہ سارے کردار تصوف کی دنیا کے باشندے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند نے صحیح کہا ہے کہ اُردو نثر کی ابتدائی صدیوں کی تاریکی میں سب رس روشنی کے مینار کی طرح ضو پاش اور جلوہ بار ہے۔ غرض وجہی کی تمثیل کا جواب نہ اس سے پہلے تھا نہ اس کے بعد ہو سکا۔

سب رس میں وجہی کی طول بیانی نے ایک بڑا نقص یہ پیدا کیا کہ تسلسل داستان کی کڑیاں پارہ پارہ ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو ادب کو انشائیہ کی ایک نئی صنف مل گئی جسے اب تک انگلش ایسّے کی دین سمجھا جاتا رہا ہے۔ ان ۶۱ انشائیوں کا محرک دکنی کا پہلا ادبی معرکہ تھا، جو ملّا وجہی و ملّا غواصی کے مابین تقریباً ۲۸ برس تک جاری رہا۔ ان انشائیوں نے بجا طور پر ملّا وجہی کو اردو انشائیہ کا موجد اور باوا آدم ثابت کر دیا ہے۔

سب رس کے سرسری مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وجہی عربی، فارسی، برج، گوجری، اردو اور مراٹھی سے واقف تھا، وہ اردو کو ہندی کے علاوہ "زبان ہندوستان"، اور "قول اہل ہند" کے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ وہ کبیر اور امیر خسرو کے ہندی کلام سے بھی آشنا تھا۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم، سب رس کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ وجہی تہذیب و تربیت کے لحاظ سے بالکل فارسی رجحان کا ادیب تھا۔ یاد رہے کہ وجہی فارسی کا بھی عظیم شاعر تھا۔ غرض سب رس کی مقفیٰ و مسجع عبارت، ہندوی و ایرانی روایات کا مقام اتصال اور ہندی روپ رس اور فارسی رنگ و آہنگ کا سنگم ہے۔

شرر فتحپوری

غزل

خود شناسی کا وہ سفر، تنہا
مرحلہ ساز تھا، مگر تنہا

ذات سے کائنات تک کا سفر
کٹ گیا یونہی بیشتر، تنہا

تھا بھرے شہر میں یہی آباد
میری بربادیوں کا گھر، تنہا

زندگی کی کڑی مسافت میں
رہ گئی گردِ رہگذر تنہا

صحبتِ دوستاں، نصیب کہاں
دل کو روتی ہے چشمِ تر، تنہا

کٹ گئی یونہی زندگی، اے دوست!
شام تنہا، کہیں سحر تنہا

زندگی کے حسیں سرابوں میں
ہم بھٹکتے پھرے شرر تنہا

ہیرا نند سوز
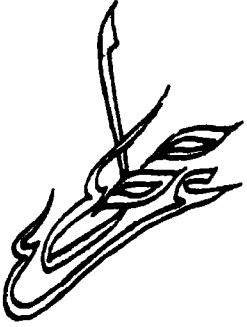
ہم نے بچپن میں بڑوں سے کبھی سُنا تھا ایسا
اور اِس درس کی مکتب میں بھی پڑھتے تھے کتاب
کہ اِن ہاتھوں نے کبھی مُنہ سے بغاوت کی تھی
اور جھیلا تھا اسی جُرم میں فاقوں کا عذاب
یہ کہاوت تھی؟
کہاوت سہی۔ لیکن اِس میں
کل بھی سچّائی تھی اور آج بھی سچّائی ہے
مُلک اپنا بھی تو ہے جسمِ بشر کی مانند
جس کے سینے میں دھڑکتی ہے جواں دل کی طرح
اپنے آباء کی پُرانی تہذیب
جس کی شریانوں میں چلتا ہے لہو بن بن کر
اپنے دریاؤں کا شفاف مقدّس پانی
صوبہ در صوبہ روایات۔ زبانیں۔ مذہب
انھیں اعضا سے تو ہے جِسم کی تکمیل میں حُسن
کوئی بھی عضو الگ، جسم نہیں کہلاتا
کھینچ نہیں سکتی بدن پر کہیں سرحد کی لکیر
خون شریانوں کا بٹ جانا کہاں ممکن ہے
ایسا چاہیں گے تو ہم قتل کے مجرم ہوں گے
ایسا سوچیں گے تو خود روح سے کٹ جائیں گے۔
یہی بہتر ہے کہ ہم جسم سلامت رکھیں
یہ جو ہے کنیا کماری سے ہمالہ تک جسم
ایک بڑی قوم کا جسم

سکھدیو شرما رشک

جب سے ہُوا ہے مجھ کو احساس خوشبوؤں کا
دل ڈھونڈتا ہے سایہ دلبر کے گیسوؤں کا

وہ دن بھی کیا حسیں تھے بچپن کی دل لگی کے
کرتے تھے جب تعاقب راتوں میں جگنوؤں کا

دعوت نظر کو دیتا ہے عید کا نظارہ
شکلِ ہلال بننا تیرے دو ابروؤں کا

بزمِ نشاط چھوڑے گو ہو گئی ہے مُدّت
کانوں میں بج رہا ہے پھر شور گھنگروؤں کا

تکیہ تھا رشکؔ جن پر وہ کام کچھ نہ آئے
ہم کو بھی تھا بھروسا یاروں کے بازوؤں کا

شرون کمار ورما

ایک جنم اور

گیتا بھون

بارش میں بھیگ رہا ہے اس کے پیچھے لکشمی نارائن کے وشال مندر میں گھنٹیاں مسلسل بج رہی ہیں اور اس آواز میں بھگت جنوں کی شردھا بھری آواز شامل ہوتی جا رہی ہے۔ دھرتی پر پھر سے آجا، بگڑی مری بنا جا، گھنشام مُرلی والے

اندھیری جھونپڑی میں، ٹاٹ پر پڑی دیو کی گیتا بھون کے گنبد پر روشن بلب کو دیکھ رہی ہے، ایک آس سی بندھی رہتی ہے اسے دیکھ کر۔

پچھلے برس جنم اشٹمی کے اوسر پر وہ مندر میں ہی تھی۔ روشنی، خوشبو، بھجن شردھالو بھیڑ۔ لوگ اس گھڑی کا انتظار کر رہے تھے، جس پل بھگوان جنم لیں گے۔ بارہ بجے مندر جے جے کار سے گونج گیا تھا۔ بھگوان نے جنم لیا تھا۔ ہر سال ایسا ہی ہوتا ہے۔ مرد پھول مالائیں اور پرشاد لاتے ہیں۔ عورتیں ورت رکھتی ہیں۔ دیو کی نے اس مندر کے آس پاس ہوش سنبھالا ہے۔ بچپن سے دیکھتی چلی آ رہی ہے یہ سب کچھ، یہ رونقیں، یہ سجاوٹیں۔ سنتی آ رہی ہے یہ بھگتی سنگیت۔

اُس کی جھونپڑی اور گیتا بھون کے بیچ گہرا اور بھیگا اندھیرا کسی راکشش کی طرح ڈراؤنا ہو گیا ہے۔ دیو کی کے پیٹ میں درد اُٹھتا ہے، جیسے اندر کچھ حرکت کر رہا ہو۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا پیٹ سنبھال لیا ہے اور دیوار پہ ٹنگے کرشن مُراری کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن مُرلی والا اسے دکھائی نہیں دیتا۔ جھونپڑی میں بھی اندھیرا ہے کہ چراغ کچھ دیر پہلے بُجھ چکا ہے۔ تیل ختم ہو گیا ہے، بوتل میں بھی نہیں ہے۔ سکھو کچھ ضروری چیزوں کا بندوبست کرنے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ جلدی آجائے گی، آئی نہیں ابھی تک۔

گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ بارش ہو رہی ہے۔ جب واسو دیو جی ننھے کرشن کو ٹوکری میں رکھ کر جمنا پار کر رہے تھے تو طوفانی ندی کنہیا کے پاؤں چھو کر اُتر گئی تھی اور وہ صحیح سلامت گوکل پہنچ گئے تھے۔ درد بڑھ رہا ہے۔ جیسے کوئی اُسے اندر سے چیر رہا ہے۔ ماں۔

سڑک پر سے ٹرک کھڑکھڑاتا گزر گیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر کسی انجن نے جھٹکے سے انداز میں زائد بھاپ چھوڑی ہے۔ دیو کی گیتا بھون کے گنبد پہ روشن بلب کو دیکھ رہی ہے، دھیان بٹا رہتا ہے، درد کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

کب چھوٹے گی اس کی جان، جب منتشیہ ماتر

جنم لیتا ہے تو ماں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے، جب بھگوان اوتار لیتے ہیں تو ہماری سرشٹی ہل جاتی ہے۔ یہ طوفان، اندھیرا، بجلی کی چکاچوند، چڑھی ندی، سب سرشٹی کی تکلیف ہی تو ہے۔ کتھا کرنے والے سوامی جی نے یہی سب تو بتایا تھا۔

اوماں۔ دیوکی کی نس نس لوٹ رہی ہے، جیسے اُس کے اندر کوئی بے چین ہو، نیچے اُترنے کے لئے۔ دیوکی ڈر گئی ہے۔ کیا ہوگا، کیسے ہوگا سب! سکھو نہیں لوٹی ابھی تک۔ سکھو کے دو بچے ہیں، تبھی تو وہ دیوکی کی باتیں سن سن کر ہنستی ہے "ڈر مت۔ ہوتی ہے، سب کو ہوتی ہے یہ تکلیف، عورت جات بنی ہی دُکھ بھوگنے کو ہے۔ تیری پہلی بار ہے، جبھی درد جیاستی ہوتا ہے۔ اب لگا کانوں کو ہاتھ، پھر نہیں جائے گی کبھی بسو کے پاس۔"

دیوکی نے سچ مچ کانوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔

سکھو ہنستی ہے "سب ایسے ہی کہتی ہیں اس بکھت پر، پھر بھول جاتی ہیں۔ جب مرد پیار سے دیکھ لے ہے تو کچھ یاد نہیں رہتا، جرا اپنا ہت سے چھو دے تو سب کچھ پگھلنے لگے ہے اندر ہی اندر۔ اپنا شریر تک بس میں نہیں رہتا۔ یہ وردان ملا ہے مرد کو سکھ مرد کا، دکھ عورت کے۔"

بسو ہوتا پاس تو کیا کچھ نہ کرتا اس بکھت۔ اُسے تو چار دن ہوئے پولیس لے گئی۔ حوالدار آیا تھا، دو سپاہی لے کے۔ تینوں نے شراب پی رکھی تھی۔ بسو کو لے جانے لگے تو اُس نے اپنا قصور پوچھا۔ بس اس پر حوالدار نے اس زور سے اس کے ٹخنوں پر موٹا بید مارا کہ بے چارا بلبلا کر گر گیا تھا۔ اور سپاہی اُسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے۔ کسی سے کچھ نہ ہو سکا تھا۔ پولیس کے آگے کس کی چلتی ہے۔ بعد میں ٹھیکیدار نصیب سنگھ مونچھوں کو تاؤ

دیتا ہوا آیا تھا۔ اس نے جمع بھیڑ کو بتایا تھا کہ بسو چرس کا دھندا کرتا ہے۔ تب دیوکی کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ ٹھیکیدار کی نیت اُس کے لئے بہت دنوں سے خراب تھی۔ بسو نے اُسے پھٹکارا تھا۔ ٹھیکیدار نصیب سنگھ، حوالدار بختاور چند اور بسو غریب اُس جرم کے لئے جیل چلا گیا، جو اُس نے کرنا کیا، سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن نصیبوں اور بختاوروں کے آگے کس کی چلی ہے، اب پتہ نہیں بسو کہاں اور کس حال میں ہے۔ رکھے چوکیدار نے بتایا تھا کہ ٹھیکیدار نے، حوالدار کو بوتل اور نوٹ دئے تھے۔

بھیڑ کا شور بڑھ گیا ہے۔ بھگتوں میں کتنی شردھا ہے۔ رات بارہ بجے تک بارش میں بھیگیں گے۔ پورے بارہ بجے بھگوان کا جنم ہوگا، چاندی کے پالنے میں پھولوں کی سیج پر، خوشبوؤں کے گھیرے میں۔ مندر کے چاندی کے دوار بند ہوں گے، اندر شنکھ پھونکے جائیں گے، دوار کھولے جائیں گے اور پجاری پالنا جھلائے گا اور بھگت جن پاگل ہو اُٹھیں گے۔ ہر بھگت کچھ نہ کچھ بھینٹ دے گا، اور پرساد لے کے گھر جائے گا۔

جھونپڑی کی چھت ٹپکنے لگی ہے۔ ہوا بھی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ گیتا بھون کا تنہا بلب اندھیرے سے لڑ رہا ہے۔ جھونپڑی اور گیتا بھون کے بیچ اندھیرا ہے۔ درد کی لہر پیٹ سے نیچے تک اُتر گئی ہے، جیسے اُسے ڈبونے آئی ہو بھگت جن چیخ چیخ کر گا رہے ہیں "میرا پار لگا دے، کرشن مُراری، ہے گردھاری!"
اور درد کی لہریں اُسے ڈبونے پر تلی ہیں۔ بسو نے بتایا تھا کہ اُس نے سرکاری اسپتال کی ڈاکٹرنی سے بات کر لی ہے۔ پیسوں کا انتظام بھی وہ کرے گا۔ پتہ نہیں بسو کس حال میں ہو۔ بہت مارا ہوگا اُنھوں نے اُسے۔

درد کی لہر بار بار اُٹھ رہی ہے۔ چھت تیزی سے ٹپک رہی ہے ۔ اگر پوری چھت ٹپکنے لگی تو ــــ سکھو کہہ گئی تھی کچھ کپڑے نکال رکھو اب تو وہ گٹھری بھی بھیگنے لگی ہے ۔ کہاں رکھے اسے۔

کچھ بوندیں اُس کے چہرے پر گری ہیں۔ وہ ٹاٹ اور گٹھری لے کر دوسرے کونے میں آگئی ہے۔ یہاں سے گیتا بھون کا وہ بلب دکھائی نہیں دیتا۔ بس اندر باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ درد کی لہر چھری کی طرح تیز اور کاٹتی ہوئی آتی ہے۔ کہاں رہ گئی سکھو۔

مندر سے آنے والی آوازیں ہر پل تیز ہو رہی ہیں۔ انجن شاید گاڑی لے جا رہا ہے ۔ چھک، چھک، چھکا چھک۔ سڑک پر کوئی آوارہ گائے ڈکرائی ہے۔ شاید وہ بھی جان گئی ہے کہ گوپال، آنے والا ہے۔ جھونپڑی اُس کونے میں بھی ٹپکنے لگی ہے۔ بھیڑ اونچی آوازیں گا رہی ہے۔ دھرتی پہ پھر سے آجا، گھنشام مُرلی والے۔،

لکڑی کی ٹال کی کتیا بھونکی ہے۔ چھت ٹپک رہی ہے۔ کیچڑ میں سنبھل کر چلتا ہوا کوئی جھونپڑی تک آیا ہے۔ دیوکی ڈر گئی ہے "۔ کون ہے؟" "میں سکھو۔ دیا کیوں نہیں جلایا۔؟"

"تیل نہیں ہے۔"

"جھونپڑی تو ساری ٹپک رہی ہے مجھے دیر ہو گئی۔ بچوں کو دیکھنے چلی گئی تھی۔ بازار بند ہیں، کہیں سے کچھ نہیں ملا، بھیڑ میں ایسی پھنسی کہ بس۔ تُو تو بھیگ رہی ہے۔ کہاں لے جاؤں تجھے اس بکھت۔!"

درد کی لہریں تیزی سے اُٹھنے لگی ہیں۔ دیوکی بلبلا اٹھتی ہے، بارش بھی تیز ہو گئی ہے اور گھنٹیوں کی آوازیں۔

"کے بجے ہوں گے سکھو۔؟"

ساڑھے گیارہ بجے میں مندر کے سامنے تھی۔ دس بارہ منٹ آتے لگے ہی ہوں گے۔ بس بارہ بجنے والے ہیں ــــ بھگوان ــــ

"میں مر جاؤں گی سکھو۔"

سکھو اندھیرے میں دیوکی کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے۔

"جنم ہو گیا۔ جنم ہو گیا" کوئی پکارتا ہوا سڑک پر سے گزر گیا ہے۔

ساری فضا جے جے کار سے گونج گئی ہے۔ لاؤڈ سپیکر بج رہے ہیں، لوگ پاگل ہوئے جا رہے ہیں، بارش تیز ہو گئی ہے۔ سرشٹی کس تکلیف سے گزر رہی ہے۔

"دیوکی، بھگوان نے جنم لے لیا۔ سکھو اندھیرے سے لڑ رہی ہے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ چھت ہر جگہ سے ٹپک رہی ہے۔

ماہنامہ "تعمیرِ ہریانہ" (اُردو) ملکیت وغیرہ کے متعلق تفصیلات
(فارم۔۴، ضابطہ۔ ۸) کے مطابق

مقامِ اشاعت: محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ، ایس.سی.او ۱۹۱۔ ۱۸۹
سیکٹر ۱۷۔ (۳)، چنڈی گڑھ۔ ۱۶۰۰۱۷

وقفۂ اشاعت: ماہانہ۔

پرنٹر پبلشر و مدیر اعلیٰ کا نام: انل راز دان، آئی۔ اے۔ ایس
ڈائریکٹر محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ، چنڈی گڑھ

قومیت: ہندوستانی۔

ملکیت: ہریانہ گورنمنٹ۔

میں انل راز دان یہ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

چنڈی گڑھ
یکم مارچ ۱۹۸۶ء

(انل راز دان)

ساغر شفائی

غزل

اگر وہ شعلہ بدن میرا ہم سفر ہوتا
میں ایک جست میں شہرت کے عرش پر ہوتا

ترا کرشمہ سہی، تجھ سے معتبر ہوتا
اگر میں تیری طرح خود سے باخبر ہوتا

میں باضمیر تھا تا عمر ہی فقیر رہا
میں بے ضمیر جو ہوتا تو تاجور ہوتا

جو تم نہ توڑتے تو یہ مرے لہو کا گلاب
تمہاری زلف کو مہکا کے منتشر ہوتا

خوشا نصیب کہ خانہ بدوش ہے ساغر
جو آج شہر میں ہوتا، بریدہ سر ہوتا

آزاد گورداسپوری

غزل

لو دیتا، جگمگاتا ہوا آسماں، نہ مانگ
ہم تیرہ قسمتوں سے مہ و کہکشاں، نہ مانگ

اربابِ غم سے پرتوِ سوزِ نہاں، نہ مانگ
یہ آگ جلنے والی ہے، اس سے دھواں نہ مانگ

شعلوں سے کر نہ لالہ و نسریں کی آرزو
خاکِ فسردہ طبع سے چنگاریاں نہ مانگ

اک بے حسی کا خشک بیاباں ہے اور میں
میری حیات سے کوئی جوئے رواں نہ مانگ

دینی ہے دادِ آبلہ پائی تو آ قریب
کانٹوں بھری زمیں سے کوئی گلستاں نہ مانگ

آزاد ان کی راہ ہے تاریکیوں کی راہ
آوارگانِ غم سے کوئی کہکشاں نہ مانگ

خورشید ملک

اختر کو جب ضلع بستی کے بانسی قصبہ کا سرکاری دورہ کرنے کا پروانہ موصول ہوا تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا رافیعہ کی طرف سے وہ قریب قریب مایوس ہو چکا تھا مگر اب اس کی یاد از سرِ نو تازہ ہو گئی۔ وہی رافیعہ جس کو اس نے دل و جان سے چاہا تھا اور جس کی یاد میں اس نے نہ جانے کتنی راتیں تارے گن گن کر کاٹی تھیں۔ اختر کو یقین تھا کہ رافیعہ بھی اس کو چاہتی تھی کیونکہ اس نے بارہا رافیعہ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں وہ مخصوص چمک دیکھی تھی جو ایک دوشیزہ اپنے محبوب کے تئیں ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اختر اسی بات کا متمنّی رہا کہ رافیعہ از خود اظہارِ محبّت کرے۔ مرد ہونے کے ناطے وہ احساس برتری میں مبتلا رہا۔ اپنی طرف سے پہل کرنے میں اسے اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا رہا حتیٰ کہ رافیعہ اس سے جدا بھی ہو گئی۔ آج اختر کے ذہن میں یادوں کے دریچے ایک ایک کر کے کھلتے گئے۔ اسے یاد آتے گئے وہ شیریں لمحات جو اس نے رافیعہ کی قربت میں گزارے تھے۔ ساتھ ہی اس کو وہ ایّام بھی یاد آ گئے جو اس نے یونیورسٹی کے شوخ ماحول میں گزارے تھے۔

رافیعہ اس کے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ نہایت حسین، اسمارٹ، شوخ اور بیباک تھی۔ ہر ایک کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔ وہ لڑکوں سے بہت بے تکلّفی سے ملتی تھی۔ اکثر لڑکوں نے اس کی آزادانہ روش کا غلط مفہوم سمجھ لیا اور حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس نے انھیں نہ صرف سختی سے دھتکار دیا بلکہ آئندہ ان سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اختر کی طرف وہ کچھ زیادہ مائل تھی۔ جب فیکلٹی کی ایسوسی ایشن کے لئے انتخابات کا اعلان ہوا تو رافیعہ نے سکریٹری کے عہدے کے لئے اس کے نامزدگی کے کاغذات داخل کر دیئے۔ اختر نے بہت منع کیا مگر رافیعہ نے اس کو کچھ ایسی نظروں سے گھورا کہ اس سے کچھ کہتے نہ بن پڑا۔ رافیعہ نے اس کی پرزور کنویسنگ کی اور اس کو بھاری اکثریت سے کامیاب کروا دیا۔ اختر نے بھی اپنے عہدہ کو اس خوش اسلوبی سے نبھایا کہ سب اس کی اہلیت کے قائل ہو گئے۔ ایک بار اس نے امتحان کی نقص زدہ اسکیم کو تبدیل کروانے کے لئے وائس چانسلر تک سے ٹکّر لے لی اور اسکیم کو درست کروا کر ہی دم لیا۔ اتنی بڑی کامیابی اس نے اپنے اکیلے دم سے حاصل کی تھی۔ جب وہ اسکیم ٹھیک کروا کر فیکلٹی پہنچا تو سب سے آگے بڑھ کر رافیعہ نے اس کی گردن میں پھولوں کا خوبصورت گجرا ڈالا اور

مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔ "آج ہم سب کو آپ پر ناز ہے۔ آپ حقیقت میں ہم سب کے نقیب ہیں۔ آپ پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔"

ایک دن فیکلٹی کی طرف سے سب دہلی کی ایک بین الاقوامی نمائش دیکھنے گئے۔ دن میں وہ لوگ تاریخی مقامات دیکھتے اور شام میں نمائش گھومتے ___ رافیعہ زیادہ تر اختر ہی کے پاس رہنے کی کوشش کرتی۔ جب وہ لوگ قطب مینار دیکھنے گئے تو زیادہ تر لڑکے اور لڑکیاں مینار کی سیڑھیاں طے کرنے چلے گئے مگر رافیعہ نے اختر کو روک لیا۔ دونوں مینار سے ملحق پارک میں ٹہلنے چلے گئے۔ پارک میں بہت سے جوڑے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے ہوئے چپکے چپکے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ رومان لڑانے کے لئے اس سے بہتر جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔

آسمان میں ہلکے ہلکے بادل ہلکورے کھا کھا کر تیر رہے تھے۔ ہوا کی سبک رفتاری نے ماحول بے حد رومان انگیز بنا دیا تھا۔ اختر کو یقین ہوگیا کہ کہ آج رافیعہ اپنے دل پر قابو نہ پا سکے گی اور اپنے سلگتے ہونٹوں سے ضرور ضرور اقرار محبت کرے گی۔ اختر نے اس کا دل ٹٹولنے کے لئے کہا۔ "کتنے خوش نصیب ہیں یہ جوڑے۔"؟ یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اسے امید تھی کہ جواب میں رافیعہ کہے گی۔ "کیا ہم دونوں خوش نصیب نہیں ہیں؟" یا پھر وہ کہے گی، "میں بھی اپنی قسمت پر رشک کر رہی ہوں۔ آپ کو اپنی قسمت پر رشک کیوں نہیں ہے"؟ مگر اس کے برعکس اس نے قطعی غیر متوقع جواب دیا۔ "ان جوڑوں نے خود اپنی زندگی رشک آمیز بنائی ہے۔ کوئی ان کے معاملہ میں کر بھی کیا سکتا ہے؟" اختر مایوس ہوگیا۔ بجھے دل سے اس نے رافیعہ کی طرف دیکھا۔ وہ گلاب کا ایک ننھا سا پھول توڑ کر اسے اچھالنے میں مصروف تھی۔ اختر دل مسوس کر رہ گیا۔

اچانک ہوا تیز ہوگئی۔ سیاہ بادلوں نے پورے آسمان کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہوگئی۔ پارک میں موجود سب ہی گوشۂ عافیت تلاش کرنے ادھر ادھر بھاگے۔ اختر نے بھی بغیر کسی جھجک کے رافیعہ کا ہاتھ پکڑا اور مینار کے عقب والے کھنڈر کی طرف بھاگا۔ دونوں نے ایک شکستہ برآمدے میں پناہ لی مگر دونوں کافی بھیگ چکے تھے۔ رافیعہ کے کپڑے اس کے صندلی جسم سے چپک گئے تھے۔ اس کے چہرے پر تیرتی ہوئی پانی کی بوندیں اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ کر رہی تھیں۔ وہ ایک گوشہ میں سمٹی ہوئی اپنی لمبی سیاہ زلفوں سے پانی نچوڑنے میں مشغول تھی کہ اچانک زور کی بجلی چمکی اور بادلوں نے مہیب گرج کے ساتھ بارش کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کر دی۔ رافیعہ سہم کر اختر سے لپٹ گئی۔ اس کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک لرزنے لگا۔

اب اسے پورا یقین ہوگیا کہ وہ اپنا سر اس کے کشادہ سینے میں چھپا کر ضرور کہہ اٹھے گی "اختر، آپ کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے"، مگر کئی لمحے گزر گئے اور وہ یونہی خاموش کھڑی رہی۔ اختر فیصلہ کر چکا تھا کہ جیسے ہی رافیعہ کچھ کہے گی وہ اس کی پیشانی چوم کر اپنی محبت کا اظہار کر دے گا۔ مگر رافیعہ کی خاموشی نے اس کے جسم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک جھٹکے سے رافیعہ کو اپنے سے الگ کر دیا۔ رافیعہ "سوری" کہہ کر ایک گوشہ میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ اختر نے اس کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک دیکھی جو سرخ ڈوروں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بارش رک گئی۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ رافیعہ کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ دونوں اپنے ساتھیوں میں شامل ہوگئے۔

کئی برس قبل رافیعہ کی بڑی بہن کی شادی کا
سلسلہ اختر کے رشتہ کے ایک بھائی سے چلا تھا مگر
بات چیت فیصلہ کن مرحلہ نہ پار کر سکی تھی۔ رافیعہ
اکثر ان دونوں کا تذکرہ کرتی اور یہ بھی کہتی کہ اگر
دونوں کی شادی ہو جاتی تو وہ ایک مثالی
جوڑا ثابت ہوتا۔ اختر چاہتا تھا کہ رافیعہ اس سے
کہے۔ "کیا ہوا اگر وہ دونوں ایک نہ ہو سکے؟ ہم
دونوں کے درمیان تو کوئی خلیج نہیں حائل ہے، مگر
اس کے برعکس رافیعہ اس کو اپنے قصبہ بالسی آنے
کی دعوت دیتی رہتی۔

اسی کیفیت میں وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ سال
ختم ہونے کو آ گیا اختر کی پڑھائی کا آخری سال
تھا۔ امتحان کے بعد اسے یونیورسٹی کو چھوڑ دینا تھا۔
رافیعہ کو بھی جدا ہونا تھا۔ اختر نے چاہا کہ کم از کم رخصت
ہونے سے قبل صرف ایک بار ذرا سا اشارہ ہی کر دے
تاکہ وہ اپنے گھر جا کر اپنی اور رافیعہ کی زندگی کو
ہم عنوان کرنے کی سعی شروع کر دے۔ مگر افسوس کہ
رافیعہ نے رخصت ہوتے وقت اس سلسلے میں کوئی
بات نہیں کی البتہ اتنی درخواست ضرور کی کہ وہ جلد
از جلد بالسی آئے۔ اختر اس کے یاقوتی ہونٹوں سے
اقرار محبت سننے کے انتظار میں اتنا پریشان ہو چکا
تھا کہ اس نے جھلا کر کہا "ہاں! میں بالسی ضرور
آؤں گا۔ اپنے مرنے سے پہلے ایک بار بالسی ضرور آؤں گا۔"
رافیعہ نے بے ساختہ اس کے مونہہ پر اپنی حنائی انگلیاں
رکھ دیں اور بولی "ہشت! ایسی بات مونہہ سے
نہیں نکالتے۔" اختر کو بھی ضد سوار ہو گئی کہ جب
تک رافیعہ پہل نہیں کرے گی، وہ بھی اپنی زبان بند
رکھے گا۔ غرضیکہ اختر منتظر ہی رہا اور رافیعہ
چلی گئی۔

اختر کو ملازمت مل گئی۔ اس کے گھر والے اس
سے شادی کرنے کے لئے زور ڈالنے لگے مگر اختر کو اب
بھی رافیعہ کا انتظار تھا۔ اسے امید تھی کہ رافیعہ زبان
سے نہ کہہ سکی مگر خط کے ذریعہ ضرور اپنے دل کی بات
کہہ دے گی۔ وہ انتظار کرتا رہا مگر رافیعہ کا ایک خط
بھی اسے نہیں ملا۔ خط لکھنے میں بھی وہ رافیعہ ہی کی طرف
سے پہل چاہتا تھا، اسی لئے اس نے بھی کوئی خط نہیں
لکھا۔ اسی طرح تین سال گزر گئے۔ اس عرصہ میں اسے
رافیعہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں لگ سکا۔ رافیعہ کی یاد
دھیرے دھیرے اس کے ذہن سے نکلتی جا رہی تھی۔
اب وہ پہلے جیسا اضطراب بھی نہیں محسوس کرتا تھا۔
بس اگر کبھی وہ قطعی فرصت میں ہوتا تو رافیعہ کی یاد
اس کے چٹکیاں لیتی۔ اپنی مشغولیت کے دوران اب
اس کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ پہلے یہ کیفیت تھی کہ اٹھتے
بیٹھتے اور سوتے جاگتے رافیعہ ہی کا تصور اسے
پریشان کئے رہتا تھا۔

مگر بالسی کا دورہ کرنے کا پروانہ ملتے ہی
رافیعہ کی یاد از سر نو تازہ ہو گئی۔ وہ رافیعہ سے ملنے
کے لئے بے چین ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ رافیعہ
سے خود اظہار محبت کر دے گا۔ مزید انتظار اس کے
بس کا نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنی شکست
تسلیم کر لینے ہی میں دونوں کی بھلائی ہے۔

رافیعہ کے گھر کا پتہ اس کے پاس موجود تھا۔ وہ صبح
کے وقت بالسی پہنچا۔ اس نے سیدھے رافیعہ کے گھر کا
رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ بڑی چہل پہل
ہے۔ رافیعہ کے بڑے بھائی وہاں کے مشہور وکیل
تھے۔ وہی رافیعہ کے سرپرست تھے۔ اختر نے وکیل صاحب
سے ملاقات کی اور اپنے آنے کا مدعا بیان کیا کہ اسے
رافیعہ سے ملنا ہے۔ وکیل صاحب سخت الجھن میں
گرفتار ہو گئے۔ چند لمحوں بعد وہ بولے "اختر صاحب
آپ بہت نازک موقعہ پر آئے ہیں۔ رافیعہ آپ کا

تذکرہ برابر کرتی رہتی تھی - اسے آپ کے خط کا بہت بے چینی سے انتظار رہتا تھا - آپ نے کوئی خط ہی نہیں لکھا۔ اب آپ آئے بھی تو ایسے وقت کہ . . . .
خیر، میں آپ کی ملاقات اس سے ضرور کرواؤں گا۔"

وکیل صاحب ایک کمرہ میں اسے بٹھا کر اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد سمٹی سمٹی رافیعہ آئی - اس نے اختر کو آداب کیا اور بولی، "کتنی دیر کر دی آپ نے؟ کتنی بے چینی سے آپ کے خط کا انتظار کرتی رہی ـــ آخر کار میں بالکل نا امید ہو گئی اور پھر مجبوراً . . . . ."

اختر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "تم نے بھی حد کر دی - کم از کم ایک بار اشارہ ہی کر دیتیں - میں نے تم کو کتنے مواقع دیئے مگر تم نے تو اپنے ہونٹ ہی سی رکھے تھے۔"

رافیعہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "آپ مرد ہیں لہٰذا یہ بات آپ کے ذہن میں کیونکر آ سکتی تھی کہ لڑکی لڑکے سے زیادہ شدت کی محبت کرتی ہے لیکن اپنی حیا کی انا کی خاطر پہل کبھی نہیں کرتی ہے۔ میں بھی اپنی انا کو مجروح کرنے کی ہمت نہ کر سکی اور آپ کی طرف سے پہل کرنے کی آس لگائے رہی ـــ آپ اگر محبت سے صرف میری طرف دیکھ ہی لیتے تو میں پر کٹے پرندہ کی مانند آپ کی آغوش میں پھڑپھڑا کر آ گرتی۔"

"اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔" رافیعہ نے بیچ ہی میں ٹوکتے ہوئے کہا، "آپ کا بہت بہت احسان ہے کہ آپ نے اپنے دیدار کرا دیئے آپ نے اپنا وعدہ بھی نبھا دیا یعنی آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئے مگر افسوس کہ آپ اپنی موت سے قبل نہیں بلکہ میری موت سے قبل یہاں آ گئے۔ اختر صاحب، کل میری بارات آ رہی ہے۔ جو بات میں آپ سے پہلے کبھی نہ کہہ سکی وہ مجھے اتنے نازک موقع پر آپ سے کہنا پڑی۔ کیونکہ خدا معلوم اب پھر ملاقات ممکن ہو سکے گی یا نہیں۔" اتنا کہہ کر رافیعہ نے اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور اندر بھاگ گئی۔

مگر اختر نے اُن دو موٹے موٹے قطروں کو دیکھ لیا جو رافیعہ کی غزالی آنکھوں سے ٹپک کر اس کے دامن میں جذب ہو گئے تھے۔

شاید رافیعہ کا یہی آخری نذرانہ تھا۔

اسعد بدایونی

غزل

جسے نہ میری اداسی کا کچھ خیال آیا
میں اس کے جملہ محاسن پہ خاک ڈال آیا

یہ عشق خوب رہا باوجود ملنے کے
نہ درمیان کبھی لمحۂ وصال آیا

اشارہ کرنے لگے ہیں بھنور کے ہاتھ ہمیں
خوشا کہ پھر دلِ دریا میں اشتعال آیا

حسین شکل کو دیکھا خدا کو یاد کیا
کسی گناہ کا دل میں کہاں خیال آیا

خدا بچائے تصوف گزیدہ لوگوں سے
کوئی جو شعر بھلا سن لیا تو حال آیا

شمس الدین

چھایا لٹ

ریل

گاڑی اپنی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں تھی۔ وہ کھڑکی سے شام کے دھندلکے میں گم ہوتی پہاڑیوں کو تک رہا تھا۔ وہ بھی تو آج برسوں بعد اپنے گاؤں کو لوٹ رہا تھا۔ جہاں اس کی بوڑھی ماں اور بوڑھا باپ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے وہ اسے دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔ اور جب وہ اپنی ماں کو نئے کپڑے دے گا اور اپنی کمائی اس کے قدموں پہ رکھے گا تو وہ پھولی نہ سمائے گی اور بڑے فخر سے اپنے پڑوسیوں کو بتاتی پھرے گی۔ اور شیاما نہ جانے کیسی ہوگی۔ آتے وقت تو رو رو کر ہلکان ہو گئی تھی۔ اور دو ہی میں روزانہ انتظار کرنے کو کہا تھا۔ مجھ سے روٹھی بیٹھی ہو گی۔ نہ جانے یہ گاڑی آہستہ کیوں چل رہی ہے۔ جانے کب پہنچوں گا۔ اسٹیشن سے گھر تھوڑی دور تھا۔ مگر راستے میں ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے اور شیاما وہاں بیٹھی انتظار کرتی ہوگی۔ مجھے دیکھ کر اسے کتنا آنند ملے گا۔ اور شرما کر بھاگے گی۔ میں بھی بھاگوں گا۔ لیکن راستے میں سیتا کا مکان ہے۔ سیتا۔ پوری چڑیل ہے کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اس کی لگائی بجھائی مشہور ہے۔ خیر۔ پھر میں ماں کو اور شیاما کو لے کر شہر جاؤں گا۔ اور شیاما بہری ہوئے گی اس کا غصہ دور ہو جائے گا۔ شیاما — شیاما گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور وہ خیالوں کی دنیا سے ہوش کی دنیا میں آیا ایک بھاری بریف کیس اس کے سر پہ گرا۔ مسافروں نے جب اسے بوجھ کے تلے سے نکالا تو وہ ان سرحدوں کو بھی پار کر چکا تھا۔

پبلشر اور چیف ایڈیٹر اتم راز دان نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمۂ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔سی۔او۔ ۱۹۱-۱۸۹ سیکٹر ۱۷، سی چنڈی گڑھ سے مارچ ۱۹۸۵ کے لئے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔یو۔ٹی۔ چنڈی گڑھ

Regd. No. NW/CH—15 Tamir-e-Haryana March, 1985
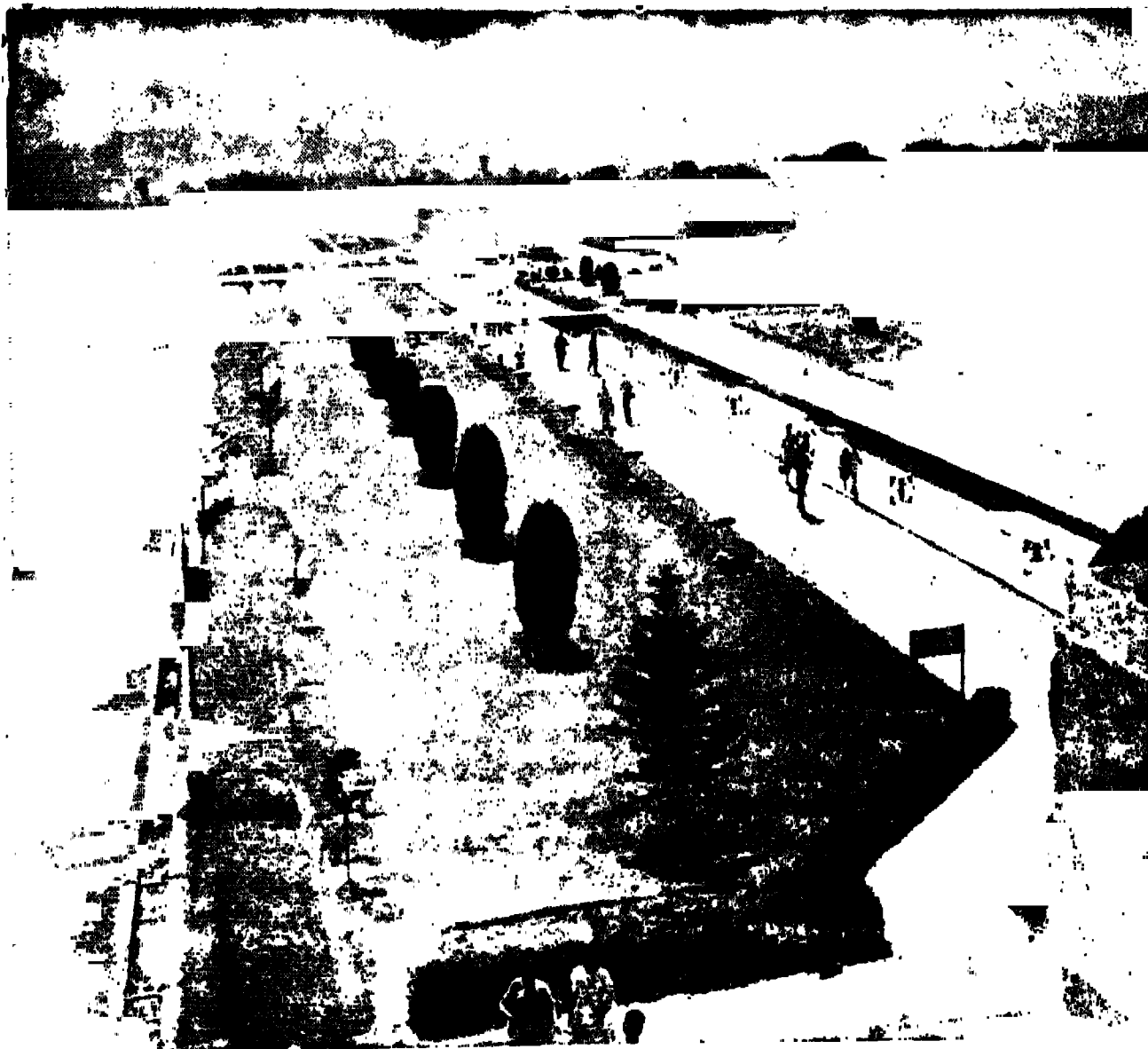
Yadvindra Moghal Gardens—Pinjor

تعمیر
ہریانہ

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

بڑی مسجد ـــ حصار

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

اپریل ۔ ۱۹۸۵ | شمارہ نمبر ۴ | جلد نمبر ۱۳

فی شمارہ ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدیر "تعمیر ہریانہ"
ایس۔ سی۔ او ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ
(مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں)

ترتیب

ہریانہ اسمبلی کے بجٹ سیشن کے افتتاح کے لئے سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ کی تشریف آوری

شاہراہ ترقی پر گامزن ہریانہ

سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ

ژالہ باری کی مار، سرد لہر، بہت تھوڑی اور بے ترتیب بارشوں نے ۱۹۸۴ء کے دوران راجیہ کو متاثر کیا۔ اور ۱۹۸۴ء کے جون، جولائی مہینوں میں بھاکڑہ مرکزی نہر کو لگاتار دو بار توڑے جانے کی وجہ سے سرسہ، حصار، اور جیند میں خریف کی فصلوں کو بھاری نقصان ہوا۔ راجیہ سرکار نے اِن آفتوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں کسانوں کی تکالیف کو کم کرنے کے لئے فوراً قدم اٹھائے اور متاثرہ عوام کو راحت پہنچائی۔

مہندرگڈھ، بھوانی، روہتک، جیند اور حصار اضلاع میں سرد لہر اور نمی کی وجہ سے ۱۹۸۴ء کی ربیع کی فصل کو نقصان پہنچا۔ میری سرکار نے متاثرہ علاقوں میں لینڈ ہولڈنگ ٹیکس اور آبیانہ معاف کر دیا ہے۔ مصیبت زدہ کسانوں کو راحت دینے کے لئے ۵۵و۱ کروڑ روپے کی مرکزی مدد دی گئی۔ کچھ اضلاع میں کیڑے لگ جانے سے کپاس کی فصلوں کو بھاری نقصان ہوا۔ یہاں سرکار نے لینڈ ہولڈنگ ٹیکس اور آبیانہ معاف کرنے کے علاوہ تقاوی اور کوآپریٹو قرضوں کی وصولی ملتوی کر دی ہے۔ فصلوں کو تباہ کرنے والے ان کیڑوں کی روک تھام

کے لئے مرکزی سرکار نے ۱٫۲ کروڑ کی مدد دی۔

بھاکڑہ مین لائن کے لگاتار دو بار ٹوٹنے سے سرسہ، حصار اور جیند میں پینے کے اور آبپاشی کے پانی کی سپلائی میں رکاوٹ پڑنے پر راجیہ سرکار نے فوراً موزوں قدم اٹھائے اور پینے کے پانی کی سپلائی کا انتظام کرکے ٹیوب ویلوں سے پانی کی سپلائی بڑھا کر فوراً راحت پہنچائی۔ فصلوں کو بچائے رکھنے کے لئے مغربی جمنا نہر کے پانی کا رُخ بھی ان متاثرہ علاقوں کی طرف بدل دیا گیا۔ مرکزی سرکار نے راحت کے کاموں کے لئے ۶۹۶ کروڑ روپے منظور کئے۔ ربیع کے دوران کیمیائی کھادوں کی قیمت پر امداد کے طور پر ۳۶۲ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی گئی۔ اس کے علاوہ کپاس کی فصل پر ہوائی چھڑکاؤ کے اخراجات سے چھوٹے اور کوآپریٹو بینکوں میں فصل قرضوں کے لئے بطور مالی امداد ۱٫۲۶ کروڑ کا انتظام کیا گیا۔

خراب موسم کے باوجود ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران راجیہ کی اقتصادی حالت بہتر رہی اور اس میں گذشتہ سال سے ۴٫۲ فی صد کا اضافہ ہوا۔ سال ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران مستقل قیمتوں پر فی کس آمدنی ۱۲۷۰ روپے رہی۔

سال ۸۵-۱۹۸۴ء چھٹے پانچ سالہ منصوبے کا آخری سال ہے اور ساتواں پانچ سالہ منصوبہ اگلے مالی سال سے چالو ہوگا۔

میری سرکار نے ساتویں پانچ سالہ پلان میں ۳۲۰۰ کروڑ روپے کا خرچ تجویز کیا ہے۔ آئندہ سال کے سالانہ منصوبے کے لئے ۵۲۰ کروڑ کا خرچ تجویز کیا گیا ہے۔ فی الحال خرچ کی یہ تجویز عارضی ہے جسے بہت جلد میری سرکار پلاننگ کمیشن کے ساتھ تبادلہ خیال کے بعد آخری شکل دے گی۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے لئے منظور کئے گئے ۱۸۰۰ کروڑ روپے کے خرچ کے مقابلے میں کل خرچ ۱۶۰۳۶٫۷۷ کروڑ روپے ہونے کی امید ہے۔ زراعت اور متعلقہ خدمات۔ کوآپریشن اور صنعت وغیرہ اہم ترین شعبوں میں خرچ اصل آؤٹ لے سے بڑھ جائے گا۔

میری سرکار ۲۰ نکاتی پروگرام زوردار ڈھنگ سے چلا رہی ہے۔ اقتصادی امداد پروگرام کے تحت ۹۵,۵۲۶ خاندانوں نے (جن میں ۲۷۲ و ۲۳ شیڈولڈ ذاتوں کے ہیں) چالو سال کے پہلے دس مہینوں میں فائدہ اٹھایا ہے۔ قومی دیہی روزگار پروگرام کے تحت اس مدت کے دوران ۳۲٫۱۶ لاکھ مین ڈیز کا روزگار پیدا کیا گیا۔ اپریل ۱۹۸۴ء سے جنوری ۱۹۸۵ء تک ۸۴۱۸ ٹیوب ویلز کے کنکشن دئے گئے۔ چالو سال میں جنوری ۱۹۸۵ء کے آخر تک ۵۷۴ پرابلم دیہات میں پینے کے پانی کی سہولیت مہیا کی گئی۔ اور ۵۰۶۰ اشخاص کو گھر بنانے کی جگہ دی گئی۔ گندی بستی سدھار پروگرام کے تحت جنوری ۱۹۸۵ء تک ۹۶,۵۹۶ افراد مستفید ہوئے۔ پرائمری تعلیم کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے دسمبر ۱۹۸۴ء تک ۸٫۲۷ لاکھ بچوں کے نام درج کئے گئے۔ دیہاتی اور شہری علاقوں میں روزمرہ کی ضروریات کی اشیا کی موثر تقسیم کے لئے اپریل ۱۹۸۴ء سے جنوری ۱۹۸۵ء تک ۵۱ نئی فیئر پرائس شاپس کھولی گئیں۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران اس پروگرام کے لئے تجویز خرچ عارضی طور پر ۳۸۰ کروڑ روپے مقرر کیا گیا ہے۔

بجلی کی پیداوار کافی بڑھ گئی ہے اور پلانٹ لوڈ فیکٹر ۱۹۸۵ء میں ۴۱٫۷ فی صد تک بڑھ گیا ہے۔ مستقبل میں بجلی کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے پلاننگ کمیشن نے اس سال میں دو نئے پراجیکٹوں کی منظوری دی ہے۔ یہ ہیں یمنا نگر تھرمل پاور پراجیکٹ اسٹیج-۱، جہاں ۲۱۰ میگاواٹ کے دو یونٹ اور دادوپور مائیکرو ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ جہاں ۱٫۵ میگاواٹ کے چار یونٹ لگائے جائیں گے۔ آخرالذکر پراجیکٹ اسٹیٹ میں اپنی قسم کا پہلا

ہے۔ تجربے کے طور پر ہند سرکار کے سائنس اور ٹیکنالوجی ڈیپارٹمنٹ کی مدد سے کا کرنی (سونی پت) میں ایک ہائبرڈ مائکرو ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ لگایا جا رہا ہے۔ مرکزی سرکار راجیہ میں ایک ایٹمی پاور اسٹیشن قائم کرنے پر بھی غور کر رہی ہے۔

۱۱۰ میگاواٹ پر مشتمل پانی پت تھرمل پراجیکٹ کا دوسرا مرحلہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں چالو ہو جائے گا۔ ۲۱۰ میگاواٹ والے ایک یونٹ کے تیسرے مرحلے کا کام چل رہا ہے جو ۸۸-۱۹۸۷ء میں چالو ہو جائے گا۔ مغربی جمنا کینال ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ کے ۸ میگاواٹ کے دو یونٹوں والے پہلے پاور ہاؤس کی تعمیر کا کام تیزی سے چل رہا ہے۔ جو ۸۶-۱۹۸۵ء میں چالو ہو جائے گا۔

اس سال ۴ گرڈ سب اسٹیشن چالو کئے گئے ہیں سال کے آخر تک (ایک اور ۲۲۰ کلوواٹ) دو ۱۳۲ کلوواٹ اور سات ۳۳ کلوواٹ والے سب اسٹیشنوں کے چالو ہو جانے کی امید ہے۔ اگلے سال ۳۴ نئے سب اسٹیشن چالو ہو جائیں گے ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ۸۰۰۰۰ جنرل ۴۰۰۰ صنعتی اور ۱۲۰۰۰ ٹیوب ویلوں کو کنکشن دینے کا پروگرام ہے۔

بڑی اور درمیانی آبپاشی اسکیموں پر ۱۱۷ کروڑ کے خرچ کی تجویز ہے اس وقت راجیہ میں ۱۹٫۲۶ لاکھ ہیکٹیئر علاقے میں آبپاشی سہولیات میسر ہیں۔ جواہر لال نہرو اور لوہارو لفٹ اریگیشن اسکیموں کا کام مکمل ہو جانے پر ۲٫۸۵ لاکھ ہیکٹیئر علاقے کے لئے آبپاشی سہولیات ملنے لگیں گی۔

سیلاب کی روک تھام کے لئے اٹھائے گئے اقدام کے نتیجتاً ۱۵ لاکھ ہیکٹیئر علاقے کا تحفظ کیا جا چکا ہے۔ ساتویں منصوبے میں ۲٫۶۵ لاکھ ہیکٹیئر اور ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۴۰ ہزار ہیکٹیئر علاقے کو محفوظ کئے جانے کا انتظام ہے۔

اس سال خریف کی فصل کے دوران اناج کی پیداوار ۱۹٫۹۲ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔ چاول کی پیداوار ۱۳٫۵۶ لاکھ ٹن ہوئی جو اب تک کا ریکارڈ ہے امید ہے کہ ربیع کی فصل سے ۵۱٫۴ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار کے نشانے کو حاصل کر لیا جائے گا۔ اس طرح اس سال ۷۱ لاکھ ٹن اناج پیدا ہونے کی امید ہے۔

غریب دیہاتیوں، چھوٹے اور اوسط درجے کے کسانوں، کھیت مزدوروں، دیہاتی کاریگروں اور شیڈولڈ ذاتوں کی مالی حالت سدھارنے کے لئے اگلے سال ۹۸٫۱۱ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

ساتویں منصوبے میں میوات ترقی بورڈ نے میوات علاقے کی ترقی کے لئے ۱۵٫۱ کروڑ روپے تجویز کئے ہیں۔ جس میں سے ۲٫۵ کروڑ روپے ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے مخصوص ہیں۔

ساتویں منصوبے میں پشو پالن کے لئے ۲۵ کروڑ روپے کے خرچ کی تجویز ہے جس میں ۳٫۷۵ کروڑ روپے ۸۶-۱۹۸۵ کے منصوبے کے لئے ہیں۔

کوآپریٹو میدان میں پرائمری کوآپریٹو کریڈٹ اینڈ سروس سوسائٹیاں ۸۵-۱۹۸۴ میں ۱۸۱ کروڑ اور ۸۶-۱۹۸۵ میں ۲۰۰ کروڑ روپے کسانوں کو زرعی اور زراعت سے متعلقہ دوسرے پیداواری کاموں کے لئے دیں گی

ہیفیڈ (HAFED) مارکیٹنگ سوسائٹیوں اور فارم سروس سینٹروں کے ذریعے چالو اور اگلے مالی سال کے دوران ۱۴۰ اور ۱۴۵ کروڑ روپے کی زرعی پیداوار مارکیٹ کرے گی۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے دوران شاہ آباد پلول اور جیند میں قائم تین نئی کوآپریٹو ملوں کے چالو کئے جانے کے

موسم میں تجربے کے طور پر چالو کئے جانے کی امید ہے۔

راجیہ میں جنگلاتی دولت کے اضافے پر خاص زور دیا گیا ہے تاکہ علاقے میں ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھا جا سکے اور ایندھن چارے اور صنعتی کچے مال کی مانگ کو پورا کیا جا سکے۔ چالو سال میں ۱۰ کروڑ پود تیار کی جائے گی اور منصوبے کا کل خرچ ۹ کروڑ روپے سے زیادہ ہوگا۔

چالو سال کے دوران ۶۸۶ ۳ کروڑ روپے کی لاگت سے ۲۳۸ ۱۰۷ لاکھ "مین ڈیز" کا روزگار پیدا ہونے کی امید ہے۔

چالو سال کے دوران گیہوں اور چاول کی جتنی وصولی ہوئی ہے اس نے پرانے تمام ریکارڈ توڑ دئے ہیں۔ میری سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ راجیہ میں خرید مرکز اس طرح بنائے جائیں کہ کسی کسان کو اپنی فالتو پیداوار بیچنے کے لئے دس کلومیٹر سے زیادہ دور نہ جانا پڑے۔

مٹی کا تیل، گیہوں، آٹا، چینی وغیرہ جیسی ضروری اشیاء کی تقسیم کو مضبوط اور یقینی بنا کر کھپت کاروں کا تحفظ کیا گیا ہے اور فیئر پرائس شاپس پر چیزیں خریدنے کے لئے اُن کو دو کلومیٹر سے زیادہ دور نہ جانا پڑے گا۔

بھارت الیکٹرانکس لیمیٹیڈ پنچکولہ میں ۲۱ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک ٹیلی کمیونیکیشن پراجیکٹ قائم کر رہی ہے۔ اور کرنال کے نزدیک ۳۰۰ کروڑ روپے کی لاگت سے تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ لگایا جا رہا ہے دیہی صنعتوں کے منصوبے کے تحت یہ تجویز ہے کہ ۸۶ — ۱۹۸۵ میں ۲۲۰۰ چھوٹے یونٹ قائم کئے جائیں جس سے ۸۸۰۰ لوگوں کے لئے روزگار مہیا ہوگا۔ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لئے خود روزگار منصوبے پر ردعمل حوصلہ افزا رہا۔ راجیہ سرکار نے انڈیا انٹرنیشنل ٹریڈ فیئر ۱۹۸۴ء میں حصہ لیا اور ہمارے پویلین کو ایک تعریفی سرٹیفکیٹ اور میڈل ملا۔

راجیہ میں الیکٹرانکس کے فروغ کو پہلی ترجیح دی جا رہی ہے، گڑگاؤں میں ایک الیکٹرانکس کامپلیکس بن رہا ہے جہاں تقریباً ۵۰ الیکٹرانک اور متعلقہ یونٹ لگ رہے ہیں۔ سرکاری محکموں کا تال میل بہتر بنانے کے لئے کمپیوٹروں کا جال پھیلایا جا رہا ہے۔ غیر ملکوں میں رہنے والے ہندوستانیوں کو یونٹیں لگانے کے لئے گڑگاؤں میں جدید سہولیات سے مزین الیکٹرانک نگر کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ راجیہ میں الیکٹرانک سامان کی سالانہ پیداوار موجودہ ۵۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ساتویں منصوبے کے آخر تک ۶۰۰ کروڑ روپے تک کرنے کا منصوبہ ہے آن سکلڈ صنعتی مزدور کی مزدوری کی کم سے کم در پہلی جنوری ۱۹۸۵ سے بڑھا کر ۴۶۵.۴۰ روپے ماہانہ کر دی گئی ہے۔ بندھوا مزدوروں کا پتہ لگا کر ان کو آباد کیا جا رہا ہے۔

چالو مالی سال کے دوران دو نئے ریجنل رورل بینک انبالہ اور حصار میں کھولے گئے ہیں اس طرح اس راجیہ کے نَو اضلاع ریجنل رورل بینکوں کے تحت آ گئے ہیں۔

پرائمری، مڈل، ہائی، ہائیر سیکنڈری کی تعلیم کی سہولیات بالترتیب ۱۶۲۲، ۱ اور ۲۶۸۵ ۲ کلومیٹر کے گھیرے میں میسر کرا دی گئی ہیں۔ میری سرکار نے ۱۴ — ۶ سال کی عمر کے بچوں کی ۸۵۶۵ فی صد بھرتی کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے چالو سال میں ۵۰ پرائمری اسکول صرف لڑکیوں کے لئے کھولے گئے ہیں۔ اس دوران ۹۹ پرائمری سکولوں کا درجہ مڈل سکولوں تک بڑھایا گیا ہے اور ۹۳ مڈل اسکولوں کا درجہ ہائی سکولوں تک بڑھایا گیا ہے۔ دس جمع دو کے تعلیمی سسٹم کے تحت کچھ منتخب اداروں میں پیشہ ورانہ کورس پہلے ہی چالو کر دیئے گئے ہیں۔ پانچ چنے ہوئے سکولوں میں کمپیوٹر تعلیم

تعمیر ہریانہ

کے پروگرام چلائے گئے ہیں۔ ۸۶ — ۱۹۸۵ میں انہیں ۲۵ سکولوں تک بڑھا دیا جائے گا۔

عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے پیش نظر گڑگاؤں کے دو کالجوں میں ایک کو گرلز کالج بنا دیا گیا ہے۔ چالو مالی سال میں دو نئے غیر سرکاری گرلز کالج کھولے گئے ہیں۔

تعلیم اور ڈسپلن کے ایک ذریعے کے روپ میں کھیل کود کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ ۱۹۸۵ کو انٹرنیشنل یوتھ ایئر کے روپ میں منایا جا رہا ہے۔

دیہی علاقوں کے لوگوں کو روزگار حاصل کرنے میں مدد دینے کے لئے وہاں روزگار مراکز کھولے جا رہے ہیں — شیڈولڈ ذاتوں کے لوگوں کو پیشہ ورانہ تربیت دینے کے لئے ایک کوچنگ اور گائیڈنس سینٹر بنایا جاتا ہے۔

پانچ ہزار لوگوں کے لئے ایک سب سینٹر اور ۳۰ ہزار لوگوں کے لئے ایک سبسڈری ہیلتھ سینٹر کھول کر لوگوں کے گھروں کے قریب ان کے لئے طبی اور صحت کی سہولیات کے فروغ، پھیلاؤ اور سدھار کے لئے سرکار ہمیشہ کوشاں رہی ہے۔ چھٹے منصوبے کے اختتام تک ۱۶۰۰ سب سینٹر کھولے جائیں گے۔ اس دوران ۲۸ سبسڈری ہیلتھ سینٹر کھولے گئے۔ مرکزی سرکار نے ۸۴ — ۱۹۸۳ میں خاندانی منصوبہ بندی کے لئے راجیہ کو ایک کروڑ روپے انعام دیا۔

۸۵-۱۹۸۴ میں ۶۶۲،۷ کروڑ روپے کے خرچ سے ۸۱۰ دیہات میں پینے کا پانی میسر کرنے کی تجویز ہے — ساتویں منصوبے کے پہلے دو سالوں میں باقی ماندہ ۱۳۱۸ دیہات کو ۵۶،۶۰ کروڑ کی لاگت سے یہ سہولیت ملنے لگے گی۔ آنے والے سال میں شہری علاقوں میں پانی کی سپلائی کے لئے ۹۸،۳ کروڑ روپے مخصوص ہیں۔

چالو سال کے آخر تک راجیہ کے ۹۸ فی صد دیہات کو پکی سڑکوں سے جوڑ دیا جائے گا ۸۶ — ۱۹۸۵ میں ۲۰۰ کلومیٹر اور ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ۸۰۷۱ کلومیٹر سڑکیں پکی کر دی جائیں گی۔

سیاحوں کی خدمت کے لئے شاہراہوں پر موجودہ سیاحی مراکز میں توسیع کرنے کے علاوہ کیتھل اور ریمنا نگر میں دو نئے کامپلیکس کھولے گئے ہیں۔ انبالہ ٹورسٹ کامپلکس پر کام چل رہا ہے۔ — نردانہ اور بہادر گڑھ کامپلیکسوں کا کام بھی ہاتھ میں لیا جائے گا۔

عورتوں، بچوں، جسمانی معذوروں، غریبوں وغیرہ کی فلاح کے لئے ساتویں منصوبے میں ۳،۴۴ ۲ کروڑ روپے مخصوص ہونگے جس میں سے ۶۶،۵ کروڑ روپے ۸۶ — ۱۹۸۵ کے منصوبے کے لئے ہیں۔

شیڈولڈ، بیک ورڈ اور وِمکت ذاتوں کی فلاح و بہبود کے لئے ۸۶ — ۱۹۸۵ کے دوران ۶۱۸،۴ کروڑ روپے مخصوص ہیں۔ ساتویں منصوبے میں ۳۲۰۰ کروڑ روپے کے خرچ میں سے ۸۶۲۳،۱۹ کروڑ روپے صرف شیڈولڈ ذاتوں سے متعلقہ منصوبے کے لئے مخصوص ہیں۔

ہریانہ ہاؤسنگ بورڈ چالو سال میں شہری علاقوں میں ۳۰۰۰ سے بھی زیادہ مکانوں کی تعمیر کرے گا۔ دیہی علاقوں میں ۸۰۰ سے بھی زیادہ مکان بنائے جائیں گے۔ مالی اعتبار سے کمزور طبقوں اور کم تنخواہ والے لوگوں کے لئے چالو سال میں ۲۳۰۰ مکان تعمیر کئے جائیں گے۔

راجیہ میں سابقہ فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لئے ۱۹۸۴ میں ۶۵ سال کی عمر سے اوپر سابقہ فوجیوں کو ۱۰۰/- روپے کی مالی امداد دی گئی ہے۔ سابقہ فوجیوں سے ۵۰ ہزار تک کے قرضوں پر ۴ فیصد سود لیا جاتا ہے۔ اپنے ذاتی کاموں کے لئے ۳۱ جنوری ۱۹۸۵ تک ۲۴۴۴۸ سابقہ فوجیوں کو ۸۷،۶ کروڑ روپے کے بینک قرضے دیئے جا چکے ہیں۔

ایک مثالی ریاست۔ ہریانہ

ساگر رام گپتا۔ وزیر خزانہ ہریانہ

۱۹۸۵-۸۶ کے بجٹ کو آخری شکل دیتے ہوئے — وزیرخزانہ جناب ساگر رام گپتا

ہماری اقتصادی حالت کے اہم پہلوؤں اور قابلِ ذکر کامیابیوں کا میں مختصراً ذکر کرنا چاہوں گا۔

خراب موسم اور ناموافق حالات کے باوجود چھٹے منصوبے کے دوران ریاستی معیشت میں مسلسل ترقی ہوتی رہی ہے۔ چھٹا منصوبہ شروع ہونے سے پہلے والے سال یعنی ۱۹۷۹-۸۰ء میں ریاست کی گھریلو پیداوار ۱۹۷۰-۷۱ء کی مستقل قیمتوں کے حساب سے ۱۲۰۰ کروڑ روپے تھی جو ۱۹۸۳-۸۴ء میں ۱۵۴۷ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ تازہ تربیتی اندازوں کے مطابق ۱۹۸۴-۸۵ء میں اس کے ۱۵۹۲ کروڑ روپے تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔ اسی طرح موجودہ قیمتوں پر ریاست کی آمدنی جو کہ ۱۹۷۹-۸۰ء میں ۲۳۲۴ کروڑ روپے تھی ۱۹۸۳-۸۴ء میں ۴۳۲۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی تھی۔ یہ رجحان خوش آیند ہے۔

ہماری ریاست نے فی کس آمدنی میں بھی ترقی کی ہے۔ موجودہ قیمتوں پر ہماری فی کس آمدنی ۱۹۷۹-۸۰ء کے ۱۹۴۹ روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۳-۸۴ء میں ۳۱۴۷ روپے ہو گئی اور اس طرح صرف ۴ سال میں ۶۱ فی صد سے زیادہ اضافہ ہوا۔

چھٹا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۸۰-۸۵ء) ۱۸۰۰ کروڑ روپے کے منظور شدہ آؤٹ لے کی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔ جس کے مقابلے میں ہم ۱۶۲۸ کروڑ روپے خرچ کرنے کی توقع رکھتے ہیں، جس میں قدرتی آفتوں کے سبب پوچھا

اسکیموں پر خرچ کیے گئے تقریباً ۳۵ کروڑ روپے بھی شامل ہیں۔

ملک میں موجودہ قیمتوں کے رجحان سے اگرچہ ریاست پوری طرح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تاہم اس دباؤ کو ممکنہ حد تک روکنے کے لئے ہم کوشاں رہے ہیں۔ ریاستی سرکار نے چھ ہزار مناسب قیمتوں کی دکانوں کے وسیع جال سے ریاستی عوام کو واجب داموں پر اشیائے ضروریہ کی سپلائی یقینی بنانے کے لئے موثر اقدامات کئے ہیں۔

سرکار پبلک اور پرائیویٹ دونوں ہی سیکٹروں میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کے لئے کوشاں رہی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے بجٹ تخمینے کی معاشی اور تعمیری تقسیم یا درجہ بندی ظاہر کرتی ہے کہ راجیہ سرکار کی ۴۵۹ء۶ کروڑ روپے کی کل بالواسطہ مانگ میں سے ۱۴۷ء۶۹ کروڑ روپے کی رقم یا ۳۲ء۲ فی صد کی فراہمی اس کی اپنی سرمایہ کاری کے لئے کی گئی ہے اور ۱۳۵ کروڑ روپے پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کی سرمایہ کاری میں ریاست کا حصہ ہے۔ اس طرح صرف ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران تقریباً کل ۲۸۳ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری ہوگی جو کہ گذشتہ سال کی نسبت ۵ء۶ فی صد زیادہ ہے۔

ہماری مشکلات کے باوجود ۸۵-۱۹۸۴ء کا ریوائزڈ پلان آؤٹ لے بجٹ آؤٹ لے سے بڑھا ہوا ہے ۴۲۹ء۶۳ کروڑ روپیہ کے اصل تخمینہ کے مقابلے میں ہم نے ۴۳۳ء۲۳ کروڑ روپے کے ریوائزڈ آؤٹ لے کا انتظام کیا ہے۔ یہ راجیہ سرکار کی ایک اہم کامیابی ہے۔

پانچ برسوں کی مدت میں یوجنا خرچ کا سب سے بڑا حصہ آبپاشی، بجلی اور اس کے بعد سماجی خدمات اور زراعت پر خرچ ہوگا۔ آبپاشی اور بجلی کے شعبوں کے لئے تقریباً ۹۶۶ کروڑ روپے (یوجنا خرچ کا تقریباً ۵۹ فیصد) مخصوص کئے جانے سے ریاست زیر آبپاشی رقبہ ۳ء۵۲ لاکھ ہیکٹر اور بڑھا سکنے میں کامیاب ہوئی، ٹیوب ویلوں کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ بڑھ گئی ہے اور بجلی کی پیداواری صلاحیت میں ۳۶۲ میگاواٹ کا اضافہ ہوا ہے۔ کیمیاوی کھاد کی کھپت ۶۰ فی صد سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

اس مدت کے دوران درج فہرست ذاتوں، پسماندہ طبقوں اور سماج کے معاشی طور پر کمزور طبقوں کی فلاح پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ان پر تقریباً ۱۶ء۵ کروڑ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ ہے۔

ریاستی سرکار کی اہم کوششوں میں سے ایک کوشش ہے، ہمارے کسانوں کو آبپاشی سہولیات کی فراہمی کے لئے ستلج جمنا لنک نہر پراجیکٹ مکمل کرنا۔ حال ہی میں اس پراجیکٹ پر کام تیزی سے ہونے لگا ہے۔ چونکہ پراجیکٹ قومی اہمیت کا حامل ہے، جس پر کہ بہت زیادہ خرچ آئے گا، اس لئے ہم نے اس پراجیکٹ کے لئے پیشگی امداد کے لئے حکومت ہند سے خاص طور پر گذارش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ حکومت ہند کے سرگرم تعاون اور دلچسپی سے اور حال ہی میں پنجاب سرکار اور پراجیکٹ حکام کی توجہ سے ممکن ہے کہ ہم اسے مقررہ مدت یعنی دو برسوں سے بھی پہلے پورا کرلیں۔

ہریانہ اری گیشن پراجیکٹ کے دوسرے مرحلے میں عالمی بینک کی امداد سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء تک تقریباً ۸۹۶ کروڑ مربع فٹ کو پکا کرنے کا کام پورا ہوگیا ہے۔ سن ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران اس پراجیکٹ کے لئے ۲۶ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

سن ۱۹۸۵-۸۶ء کے دوران فلڈ کنٹرول اور ڈرینیج اسکیموں کے لئے ۱۴ کروڑ روپے کی رقم رکھنے کی تجویز ہے۔

سن ۱۹۸۵-۸۶ء میں بجلی کے لئے ۱۵۰ کروڑ روپے کے آؤٹ لے کا انتظام کیا گیا ہے۔ پانی پت تھرمل پاور پراجیکٹ کے تیسرے اور چوتھے یونٹ کو اگلے برس شروع کرنے کا امکان ہے۔ اس سے تھرمل پاور کی پیداواری صلاحیت ۲۲۰ میگاواٹ بڑھ جائے گی۔ اس کے علاوہ مغربی جمنا نہر پراجیکٹ کے ۸-۸ میگاواٹ والے دو یونٹوں کے آئندہ برس شروع ہو جانے کی توقع ہے۔ اس کے علاوہ ہریانہ سرکار، ریاست میں ایٹمی بجلی گھر کے لئے بھی حکومتِ ہند کو دی گئی ایک تجویز کی پیروی کر رہی ہے۔

ہماری منصوبہ بند ترقی میں زراعت کو اب بھی اول مقام حاصل ہے۔ چالو سال کے دوران ۷۱ لاکھ ٹن کی متوقع کامیابی کے مقابلے میں غذائی اجناس کی پیداوار کا نشانہ ۱۹۸۵-۸۶ء کے لئے ۷۵ء۱۱ لاکھ ٹن تک بڑھایا گیا ہے۔ ۱۹۸۵-۸۶ء کے لئے زراعت اور جنگلات پر پلان آؤٹ لے کے ۲۸ کروڑ روپے سے زیادہ ہو جانے کی امید ہے۔ آئندہ مالی سال کے دوران ۲۵۰۰۰ بایو گیس پلانٹ لگانے کی تجویز ہے۔ انٹیگریٹڈ رورل ڈیولپمنٹ پروگرام کے لئے ۱۲ کروڑ روپے کے آؤٹ لے کا انتظام ہے اس سے ۸۸۷۰۰ انتہائی غریب کنبوں کی امداد ہوگی۔ خطۂ میوات کی ہمہ پہلو ترقی کے لئے ۵ء۲ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت سن ۱۹۸۵-۸۶ء کے دوران ۳۰۰ منی ڈیری یونٹ کھولنے کی تجویز ہے، پشو پالن، مچھلی پالن وغیرہ اسکیموں پر ۵ کروڑ روپے سے زیادہ خرچ ہونے کی توقع ہے۔

ریاست میں قومی دیہی پروگرام کے لئے ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۵ء۱ کروڑ روپے کا اہتمام ہے۔ بے زمین دیہاتیوں کو روزگار گارنٹی کے پروگرام کے تحت روزگار اسکیموں پر ۴ء۲ کروڑ روپے اور خرچ کئے جانے کی تجویز ہے۔

ریاستی سرکار صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لئے بنیادی ڈھانچے کو اور بہتر بنانے کے تئیں لگاتار کوشش کر رہی ہے۔ ۱۹۸۵-۸۶ء میں صنعتوں کی ترقی پر ۹ء۶ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ کرنال میں ۱۳۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری سے تیل صاف کرنے کا کارخانہ اور پنچ کولہ میں بھارت الیکٹرونکس لمیٹڈ کے ذریعہ ۲۱ کروڑ کا ٹیلی کمیونی کیشن پراجیکٹ ریاست میں لگائی جا رہی بڑی بڑی صنعتوں میں سے ہیں۔

سرکار تعلیم کو پہل دیتی ہے۔ اور ہم آئندہ برسوں میں بھی ایسا ہی کرتے رہیں گے۔ چالو برس کے دوران ۹۹ پرائمری اسکولوں کا درجہ بڑھا کر انہیں مڈل اسکول اور ۹۳ مڈل اسکولوں کا درجہ بڑھا کر انہیں ہائی اسکول بنا دیا گیا ہے۔ مفت وردی، اسٹیشنری اور بہتر حاضری پر وظائف کی شکل میں بھی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ ۲۹ تعلیمی اداروں میں ۱۰+۲ سسٹم پہلے ہی لاگو کیا جا چکا ہے۔ سن ۱۹۸۵-۸۶ء کے دوران ۴۹ اور تعلیمی اداروں میں یہ سسٹم لاگو ہو جائے گا۔ ۱۹۸۵-۸۶ء کے دوران تعلیمی سہولیات کے فروغ پر ۲۱ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

ریاستی سرکار، علاج معالجہ، صحت اور پریوار کلیان کے پروگراموں میں وسعت کو بھی اولیت دیتی ہے۔ اس مالی سال کے آخر تک ۱۶۰۰ سب سینٹر کھولنے کا نشانہ پورا کرنے کی توقع ہے۔ چالو سال کے دوران ۸ اسپتالوں، ۸ پرائمری ہیلتھ سینٹروں، ایک دیہی ڈسپنسری اور ۳۹ سب سینٹروں کی عمارتیں بنائی جا چکی ہیں۔ کوروکشیتر،

تعمیرِ ہریانہ

پانی پت، جیند، اور کیتھل کے جنرل ہسپتالوں کا درجہ بڑھا کر ۵۰ بستر سے ۱۰۰ بستر کا کر دیا گیا ہے۔ ۲۵-۲۵ بستروں والے اسپتال سِوانی اور ہیلی منڈی میں قائم کئے گئے ہیں۔

رہائش سے متعلق مسئلے پر ریاستی سرکار کا پورا دھیان رہا ہے۔ سالِ رواں کے دوران ۳۰۰۰ مکانوں کی تعمیر کے مقررہ نشانہ کو بھی پار کر جانے کی توقع ہے۔ آئندہ سال رہائشی مکانات کی تعمیر کے لئے ۷٫۲۹ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

پینے کے صاف پانی کی فراہمی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ سالِ رواں میں ۸۰۰ گاؤں کو یہ سہولت دینے کا نشانہ پورا کر لینے کی توقع ہے۔ سن ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے واٹر سپلائی اور سیوریج اسکیموں پر خرچ کے لئے ۳۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں، جس میں سے تقریباً ۴ کروڑ روپے شہری علاقوں میں صفائی کی حالت بہتر بنانے پر خرچ ہوں گے۔

سن ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے ۳۳ کروڑ روپے سے زیادہ رقم درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح کے لئے ایک اسپیشل کمپوننٹ پلان کے تحت رکھے گئے ہیں۔ ہم نے اس برس ۵۵٫۰۰۰ سے بھی زیادہ کنبوں کو مالی امداد دینے کا بھی نشانہ مقرر کیا ہے۔

آئندہ برس کے منصوبے میں ٹرانسپورٹ سروس پر ۱۲ کروڑ روپے کے اہتمام اور ہریانہ روڈویز کی بسوں میں ۱۵۰ اور بسیں شامل کرنے کی تجویز ہے۔ دہلی چنڈی گڑھ شاہراہ پر آمدورفت کی جانچ کرنے، نظم و نسق کی بہتری اور شاہراہ پر حادثے سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے قریباً ہر ۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر "ٹریفک ایڈ" چوکیاں قائم کی گئی ہیں۔

۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ۲۰ نکاتی پروگرام کے لئے ۸۰٫۱۴ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۴ء سے جنوری ۱۹۸۵ء تک غریبی کم کرنے والی مختلف اسکیموں کے تحت ۶۵٫۰۰۰ سے زیادہ کنبوں نے فائدہ اٹھایا۔ جس میں درج فہرست ذاتوں کے ۳۳٫۰۰۰ سے بھی زیادہ کنبے شامل ہیں۔ اسی طرح اس مدت میں ۵۰۶۰ مکانوں کے پلاٹ دیئے گئے ہیں، ۹۰٫۰۰۰ سے زیادہ افراد کو گندی بستی سدھار اسکیموں کے تحت فائدہ پہنچا ہے۔ ۵۱ واجب داموں کی دوکانیں کھولی گئی ہیں۔

حکومتِ ہند کی طرح ریاستی سرکار کے ملازموں کے لئے ایڈیشنل مہنگائی بھتے کی قسطیں منظور کی گئیں۔ نابینا اور جسمانی طور پر معذور ملازمین کے لئے وہیکل الاؤنس ۵۰ روپے سے بڑھا کر ۷۵ روپے ماہانہ کر دیا گیا ہے۔

چار سال کے، ۴۶٫۸۳ کروڑ روپے کے متوقع خسارے کے مقابلے میں ۹۱٫۵۳ کروڑ روپے کے خسارے کے ساتھ ختم ہونے کی امید ہے۔ پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ اس خسارے کا بڑا حصّہ مرکزی حکومت کی جانب سے دیئے جانے والے ایک قرض کی شکل میں بدل دیا جائے گا۔ (س ل)

کشمیری لال ذاکر

سنتوش کمار

آج سنتوش کمار مر گیا ہے۔
بھری جوانی میں اور اچانک۔
اور کوئی بھی کچھ نہیں جانتا اُس کی جواں مرگی کے بارے میں۔

نہ اُس کی بوڑھی بیوہ ماں۔ نہ اُس کی جوان خوبصورت بیوی اور نہ ہی اُس کا معصوم بچہ، جس کے ذہن میں ابھی زندگی اور موت کا کوئی تصور ہی نہیں۔

اپنی اِس اچانک اور بے وقت موت کے بارے میں صرف سنتوش کمار خود ہی جانتا ہے۔ کسی بھی دوسرے آدمی کو اس کا علم نہیں۔

میرا نام سنتوش کمار ہے اور میں خود ہی آج مرا ہوں، ایک حادثے میں اور اپنی ارتھی بھی خود ہی اُٹھائی ہے، اپنے ہی کندھوں پر اور اُسے جلایا بھی خود ہے —— بڑی بے دردی سے۔ ابھی تو میری راکھ بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔

آج شام ہی تو ہوئی ہے میری موت اور شام کی موت گھر والوں کے لئے بڑی اذیت ناک ہوتی ہے کیونکہ انھیں رات بھر لاش کے سرہانے بیٹھنا پڑتا ہے اور جاگنا پڑتا ہے اور رونا پڑتا ہے اور نیند ایک ایسا سود خور پٹھان ہے جو اگلی صبح پھانسی پر لٹکائے جانے والے قاتل سے بھی اپنا سود وصول کرتی ہے۔ تمام رات آنکھوں میں کاٹنا اپنے آپ میں ایک بہت بڑا ٹارچر ہے اور میں نے وہ ٹارچر بھی اکیلے ہی سہا ہے۔ کمرے میں قریب ہی سوئی اپنی بیوی رادھا کو بھی اس میں شریک نہیں کیا۔ اُسے بھی معلوم نہیں کہ ساری رات میں کس عذاب سے گذر رہا ہوں۔ وہ تو رات کے پچھلے پہر جب وہ بچے کے رونے سے اچانک جاگی تو مجھے کھلی ویران آنکھیں چھت پر گاڑے دیکھ کر گھبرا گئی۔

" سوتے کیوں نہیں ابھی تک آپ؟"

" نیند نہیں آ رہی ہے؟"

" کسی مقدمے کا بوجھ ہے دماغ پر۔؟"

" ہاں ایک ایسے مقدمے کا جس میں میں ہار گیا ہوں۔"

" مقدموں میں ہارنا جیتنا تو ہونا ہی ہے۔"

" یہ مقدمہ دوسری طرح کا ہے۔"

" کس طرح کا؟"

" تم نہیں سمجھو گی۔ سو جاؤ منّے کو اپنی چھاتی پر لٹا کر۔"

" آپ جاگتے رہو گے؟"

" ابھی جاگوں گا تھوڑی دیر اور۔"

"کب تک ؟"

"جب تک سب ملزم پھانسی پر نہیں لٹک جاتے۔"

"تو لٹکا دیجیے ملزموں کو پھانسی پر۔ میں تو سوئی ہوں۔"

ارادھنا نے اپنی معصوم مسکراہٹ کی روشنی سے میری ویران کھوکھلی آنکھیں چندھیا دیں اور کروٹ لے کر سو گئی۔

اور میں اُس حادثے کی تفصیلات کو اپنے ذہن میں اُبھارنے لگا جن کی زد میں آ کر اُسی شام میری موت ہوتی تھی۔ ڈوبتے ہوئے چاند کی مدھم روشنی صرف میرے ہی بستر پر پڑ رہی تھی ایک دائرے کی شکل میں، جیسے اُس جگہ کی نشان دہی کر رہی ہو جہاں میری چِتا بنی تھی، اور میرے معصوم بچے نے چِتا کی لکڑیوں کو آگ لگا دی تھی، شام کے سلگتے دھندلکے میں اور چِتا کی آگ ابھی تک جلا ڈالنے کی حد تک گرم تھی۔ جانے میری یہ راکھ کب ٹھنڈی ہوگی۔ جانے کب!

جس حادثے میں آج میری موت ہوتی ہے اُس کی تفصیلات اس طرح سے ہیں۔

شام کے کوئی پانچ بجے کے قریب میرے گھر کے سامنے سُرخ رنگ کی ایک کار رُکی اور اُس میں سے پانچ آدمی اُترے۔

لالہ گووردھن لال

اُن کی دھرم پتنی شریمتی کیوری دیوی

اُن کا سب سے بڑا لڑکا رام لال

چھوٹا لڑکا پرس رام

اور لڑکی سرلا رانی

کار کے ساتھ ڈرائیور کوئی نہیں تھا۔ لالہ گووردھن لال خود ہی ڈرائیو کر کے لاتے تھے۔ گھر کے باہر گیٹ کے پاس ہی میرے نام کی تختی لگی تھی۔ میرا نام پڑھ کر ہی انھوں نے کار روکی تھی۔ وہ بہت دِنوں کے بعد اِدھر آئے تھے۔ اِس لئے میرا گھر تلاش کرنے میں ذرا دقّت ہوئی تھی اُنھیں۔ میرے گھر کے باہر لگی تختی پہ لکھا تھا۔

سنتوش کمار اگروال

بی اے ایل ایل بی۔ ایڈووکیٹ

لالہ گووردھن لال میرے سگے ماموں ہیں اور اُن کی دھرم پتنی شریمتی کیوری دیوی میری ممانی ہیں۔ اس رشتے سے اُن کے بچے میرے کزنز ہیں۔ میرے پتا جی ملک کی تقسیم سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ اُن کی موت کے وقت میری عمر کوئی چار سال کی تھی۔ وہ ضلع جالندھر کے ایک چھوٹے سے گاؤں سمانہ میں کریانے کی دُکان کرتے تھے اور آس پاس کے گاؤں کے ضرورت مند لوگ اُن سے چھوٹی موٹی رقم اُدھار بھی لے لیتے تھے۔ جسے وہ فصل کے دِنوں میں بمعہ سُود ادا کر دیتے تھے۔ میری ماں چونکہ ان پڑھ تھی اس لئے اُسے پتا جی کے لین دین کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ پتا جی کی اچانک موت ہو جانے سے وہ تمام رقم جو انھوں نے لوگوں کو سُود پر دے رکھی تھی ڈوب گئی۔ اُس کے ساتھ اُدھار کی جو رقمیں لوگوں کے نام تھیں وہ بھی سِوائے چند ایماندار لوگوں کے واپس نہ ہوئیں اس کا انجام یہ ہوا کہ میری ماں کے پاس گزارے کے لئے سوائے ایک چھوٹے سے مکان۔ اُس کے اُتنے ہی چھوٹے آنگن اور اُس میں لگے پانی کے ہینڈ پمپ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ جس کی آدھی فصل مزارعے لے جاتے تھے۔ پتا جی کی موت کے بعد ماں بے چاری کو تو جینے کے لالے پڑ گئے۔ اُس نے اِن ناسازگار حالات میں بھی بڑے حوصلے سے کام لیا اور پوری تن دہی سے میری پرورش کرنے لگی۔ ایک صرف میرے ماموں لالہ گووردھن لال ہی تھے جو ہم ماں بیٹے کی بات پُوچھتے تھے۔ اُن کا جالندھر شہر میں آڑھت کا کام تھا اور اکیلے ہونے کے

باوجود اُسے وہ بڑی کامیابی سے چلا رہے تھے۔ بس
اُنہی کی مدد سے ماں کے مصیبت کے دن کٹنے لگے۔ پتاجی
کے رشتے داروں میں سے تو کوئی بھی سہارا دینے کے لئے
آگے نہ بڑھا تھا۔ پانچویں درجے تک تو میں گاؤں کے اسکول
میں ہی پڑھا کیونکہ اُس زمانے میں وہاں صرف پرائمری
اسکول ہی تھا، اب تو خیر ہائر سیکنڈری اسکول بن گیا ہے۔
میری ماں چاہتی تھی کہ میں آگے پڑھوں لیکن اُس کے پاس
کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ چنانچہ لالہ گوردھن لال ہی
مجھے اپنے ساتھ جالندھر لے گئے۔ اُنھوں نے مجھے
دسواں درجہ پاس کرایا اور پھر وہیں بی اے کرنے
کے لئے ایک پرائیویٹ کالج میں داخل کرا دیا۔ اُنہی دنوں
اُن کے چھوٹے لڑکے اور میرے ممیرے بھائی پرس رام
کا جنم ہوا تھا۔ جب وہ کوئی تین مہینوں کا ہو گیا تو
میں اُسے اپنی بانہوں میں لئے اِدھر اُدھر چکر لگاتا رہتا۔
پرس رام روتا بہت تھا لیکن میری بانہوں میں آتے ہی
فوراً چپ ہو جاتا۔ اُس سے بڑا میرا بھائی یوں تو عمر میں
مجھ سے خاصا چھوٹا تھا لیکن ہم دونوں کا آپس میں پیار
بہت تھا۔ میں تو اُسے اپنے کالج کے فنکشنز میں بھی
ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ میری ماں بیچ بیچ میں مجھے ملنے
آتی رہتی تھی۔ اور چار چھ مہینوں میں میں خود بھی اُسے
ملنے گاؤں چلا جایا کرتا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے
میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے کیونکہ میں نے
اپنی بیوہ ماں کے بے سہارا ہونے کے باوجود اپنی پڑھائی
جاری رکھی تھی۔ بی اے کر لینے کے بعد میں نے ایل ایل بی
میں داخلہ لے لیا۔ لیکن اب میں اپنے ماموں لالہ گوردھن
لال پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ رہتا تو خیر میں اُنھیں
کے پاس تھا لیکن اپنا خرچ چلانے کے لئے میں نے ٹیوشنی
ورک لے لیا تھا۔ اس سے لالہ جی بھی خوش تھے اور میرا
کام بھی تسلی بخش طریقے سے چلنے لگا تھا۔

جس دن مجھے ایل ایل بی کی ڈگری ملی اُس دن
میرے ماموں بہت خوش تھے۔ اُس شام اِس خوشی
میں اُنھوں نے سب کو گرم گرم جلیبیاں کھلائی تھیں۔
اُنھیں دیسی گھی میں تیار کی گئیں جلیبیاں بہت پسند
تھیں۔ اُنھوں نے میرے منہ میں جلیبی ڈالتے ہوئے
کہا۔

"سنتوش آج میں بہت خوش ہوں۔"

"میں بھی خوش ہوں۔" میری ممانی نے میرا
ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"تم بھی کھاؤ جلیبیاں رُکمنی دیوی۔ جی بھر کر
کھاؤ۔"

میرے ماموں نے ایک جلیبی اُس کے مُنہ میں
بھی ڈال دی اور ممانی نے جلیبی سے ٹپکتے ہوئے
شیرے کو اپنے کپڑوں پر گرنے سے بڑی مشکل سے
روکا تھا۔

سب بڑے زور سے ہنسے تھے۔

"مجھے نہیں کھلاؤ گے جلیبیاں بھایا جی؟"
رام لال نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں نہیں؟"

میں نے ایک ایک جلیبی رام لال اور پرس رام
کے مُنہ میں ڈال دی تھی۔

اور پھر سب نے تالیاں بجائی تھیں اور میرے
ماموں لالہ گوردھن لال نے ایک زور کا نعرہ لگایا
تھا۔

"میرا وکیل بھانجہ زندہ باد۔"

"زندہ باد۔" ممانی سمیت سب بولے تھے۔

اور گھر کا سارا ماحول قہقہوں سے گونج اُٹھا
تھا۔

یوں ابتدا ہوئی تھی میرے وکیل بننے کی۔

جب سے مجھے دیسی گھی کی جلیبیاں بہت اچھی
لگتی ہیں۔ اب بھی جب کبھی جالندھر جاتا ہوں مامی ہیراں

گیٹ کے باہر حلوائی کی دکان پر جا کر جلیبیاں ضرور کھاتا ہوں۔ اگرچہ اب وہ دیسی گھی کی جگہ سستے قسم کا گھی استعمال کرتا ہے لیکن جلیبیاں گرم اور خوب کراری ہوتی ہیں۔

کچھ عرصہ تو میں جالندھر میں ہی وکالت کرتا رہا۔ لیکن پھر گوپال سنگھ کے کہنے پر چنڈی گڑھ شفٹ کر گیا۔ گوپال سنگھ کے والد پنجاب ہائی کورٹ کے بڑے مشہور کریمنل وکیل ہیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ بطور جونیئر شامل ہو گیا تھا۔ چار ایک سال اُن کے ساتھ کام کرنے، اُنہی کی رہنمائی میں میں نے اپنی علیحدہ پریکٹس شروع کر دی۔ اب مجھے بھی اچھے کیس ملنے لگے ہیں میری دلچسپی بھی کریمنل کیسز میں ہی ہے۔ ماں اب میرے ہی ساتھ رہتی ہے۔ میری ترقی میں ماں کا کتنا بڑا ہاتھ ہے یہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ گاؤں کی زمین اور مکان میں نے بیچ دیئے ہیں۔ میری شادی بھی چنڈی گڑھ میں ہی ہوئی ہے۔ اور میری بیوی ارادھنا کچھ عرصہ سروس بھی کرتی رہی ہے۔ شروع شروع میں کیونکہ میرا کام جما نہیں تھا۔ اس لئے اُسے سروس کرنی پڑی تھی۔ لیکن جب سے کیشو پیدا ہوا ہے اور میں نے ایک کنال کی کوٹھی کرائے پر لے لی ہے ارادھنا نے سروس چھوڑ دی ہے۔ اُس کی سروس چھڑانے میں ماں کا بھی ہاتھ ہے۔

ایک دن شام کو تھکی ہاری جب ارادھنا گھر لوٹی تھی تو اُس کے سر میں بہت زور کا درد تھا۔ میں بھی بس ہائی کورٹ سے لوٹا ہی تھا۔ مجھے پانی کا گلاس دیتے ہوئے ماں نے کہا تھا۔

"سنتوش، بہو کا نوکری کرنا بہت ضروری ہے کیا؟"

"میں نے کب کہا ہے ضروری ہے۔"

"تو اُس کی نوکری چھڑا دو۔"

"مہینے کے آٹھ سو روپے کم ہو جائیں گے۔؟"

"تو تمہیں بہو سے زیادہ دھن پیارا ہے؟"

"پیارا تو ہے۔"

"ذرا دیکھو جا کر اُسے۔ اپنے کمرے میں نڈھال پڑی ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"دن بھر کام کرتی ہے۔ پھر گھر سنبھالتی ہے۔ کیشو کی دیکھ بھال کرتی ہے نڈھال نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟"

"گھر تو تم سنبھالتی ہو ماں؟"

"بڑھاپے میں مجھ سے خاک سنبھلتا ہے گھر وہی کرتی ہے سب کچھ۔"

"تو کیا کریں؟"

"گھر کے کام کاج کے لیے کوئی نوکر یا نوکرانی رکھ لو۔"

"اور ارادھنا کی نوکری چھڑا دو؟"

"ہاں۔"

"وہ گھر میں بیکار بیٹھے گی تو پھول کر کُپّا ہو جائے گی۔"

"ہو جائے کُپّا۔"

"مجھے مت کہنا کچھ۔"

"نہیں کہوں گی۔"

"بے کار گھر میں رہے گی تو تم سے جھگڑا کرے گی۔"

"وہ جھگڑا نہیں کرے گی۔"

"اتنا وشواس ہے تمہیں ارادھنا پر؟"

"ہاں۔ آخر وہ میری بہو ہے۔"

"مجھے شکایت مت کرنا۔"

"نہیں کروں گی۔"

"خود ہی بھگت لینا۔"

"بھگت لوں گی بابا۔ جب سے وکیل بنے ہو۔ بہت بحث کرنے ہو۔"

"بحث کے ہی تو پیسے لیتا ہوں۔"

"بہت لالچی ہو گیا ہے تُو۔"

"بہت!"

یہ کہہ کر میں نے ماں کو اپنی باہوں میں لے کر دبوچ لیا۔

"کیوں اتنی زور سے کس رہے ہو باہوں میں۔ میری ہڈیاں چٹخ جائیں گی۔"

"کیسے چٹخ سکتی ہیں۔"

میری آواز سن کر ارادھنا اپنے کمرے سے اٹھ کر آ گئی۔

"پیار پیار میں بوڑھی ماں کی سانس گھونٹ دو تم،" وہ بولی۔

"تمہارے تو سر میں درد ہو رہا تھا۔؟"

"تمہیں کیا پروا۔ تم تو اپنی وکالت کرو۔"

"سن لیا، بہو بھی یہی کہہ رہی ہے۔"

"تم دونوں نے تو میرے خلاف سازش کر رکھی ہے۔"

"ہاں کر رکھی ہے۔" ماں نے کہا "تم آرام کرو بہو اپنے کمرے میں، میں چائے لا رہی ہوں تمہارے لئے۔"

اور میری بوڑھی ماں میری جوان بیوی کو اپنی باہوں کا سہارا دے کر اُسے اُس کے کمرے میں لے گئی اور میں اکیلا کھڑا دونوں کی اٹوٹ آستھا کو دیکھتا رہا۔

اُس سے اگلے ہی دن ماں نے ارادھنا کی نوکری چھڑا دی۔ ہفتہ بھر بعد گھر میں ایک پجارن نے کام کرنا شروع کر دیا جس کا گھر والا آس پاس کی کوٹھیوں میں مالی گری کرتا تھا۔

اب ارادھنا گھر سنبھالتی ہے۔ ماں پوجا پاٹھ کرتی ہے اور کیشو کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کیشو بھی تو اپنی پوپلے منہ والی دادی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لگتا ہے دادی نے پوتے پر جادو کر رکھا ہے۔

لالہ گوردھن لال نے جو احسان مجھ پر کئے ہیں۔ اُن کا بدلہ تو میں ساری زندگی نہیں اتار سکتا۔ البتہ اُن کے یا اُن کے دوستوں اور رشتہ داروں کے جو بھی کام میں کر سکتا ہوں ضرور کرتا ہوں۔ اس سے ماں بھی بہت خوش ہے۔ یہ لالہ جی کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بھی کبھی کبھی میری رائے لے لیتے ہیں۔ شریمتی کیورن دیوی سے اُن کا مزاج نہیں ملتا۔ وہ ذرا اور قسم کی خاتون ہیں۔ میں اپنی ممانی کی عزت تو ضرور کرتا ہوں لیکن اُن کے نظریات سے مجھے اکثر اختلاف رہتا ہے۔ وہ روپے پیسے کے معاملے میں خاصی پکی ہیں اور پیسے کو ہاتھ کا میل نہیں سمجھتیں۔ بلکہ رشتہ داروں کو پیسے کا میل سمجھتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر اپنے مزاج کا تیز صابن لگا کر پیسے سے چپٹے اس میل کو چھڑا بھی دیتی ہیں۔ پیسہ ہاتھ میں رہ جاتا ہے اور رشتہ دار میل کی طرح کٹ کر پانی میں بہہ جاتا ہے۔ میری ماں کی بھی ممانی سے زیادہ نہیں پٹتی۔ لیکن ماموں اتنے اچھے ہیں کہ اُن کے سامنے تو میں کبھی آنکھ نہیں اٹھاتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کا بڑا لڑکا رام لال، چھوٹا لڑکا پرس رام اور لڑکی سرلا رانی سب کے سب اپنی ماں پر گئے ہیں۔ اس لئے دھن دولت سے سبھی کو پیار ہے۔ دو برس پہلے رام لال کی شادی بھگواڑہ میں طے ہوئی۔ کچھ خاندانوں میں لڑکے بکتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے زمین کے پلاٹ یا عمارتیں بکتی ہیں۔ بکتی نہیں نیلام ہوتی ہیں۔ جس کی بولی سب سے زیادہ ہو لڑکا اُس کا ہو جاتا ہے۔ رام لال کی بولی بھی خاصی اونچی گئی۔ اُسے بیاہ میں پڑھی لکھی لڑکی کے علاوہ کوئی لاکھ بھر سے اوپر کا مال ملا۔ اُس کی شادی میں شرکت کے لئے ماں، ارادھنا اور میں سبھی گئے تھے۔ کیشو بہت چھوٹا تھا۔

اس لیۓ ارادھنا نہ بھی جاتی تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا لیکن ماں کا خیال تھا کہ اُس کے بھائی کے گھر میں یہ پہلی شادی تھی اس لیۓ سبھی کو جانا چاہیئے تھا۔ ماں کی بات ٹھیک بھی تھی۔ ارادھنا اور میں اور کیشو تو شادی کے اگلے ہی دن واپس آ گئے لیکن ماں ہفتہ بھر کے لیۓ رُک گئی۔ لالہ جی نے اپنی بہن کو نہیں آنے دیا تھا۔

پھر ایک بار رام لال اپنی بیوی کے ساتھ چنڈی گڑھ آیا اور دو روز تک ہمارے ہی پاس ٹھہرا۔ اُس کی بیوی شنو کماری بڑی سوشیل اور کم گو لڑکی تھی اور اُس کے پتا پھگواڑے میں ہارڈ ویر کی دُکان کرتے تھے۔ رام لال لالہ گوردھن لال کے ساتھ ہی دُکان پر کام کرتا تھا۔ زیادہ بیٹھے رہنے سے اُس کا پیٹ بڑھنے لگا تھا اور گال پھولنے لگے تھے۔ دو روز کے بعد جب رام لال اور شنو کماری چلے گئے تو ارادھنا نے اُن کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

"شنو اپنی ساس سے بہت ڈرتی ہے۔"

"یعنی میری ممانی سے؟"

"جی ہاں۔"

"کیوں ڈرتی ہے؟"

"بات بات پر ٹوکتی رہتی ہے بے چاری کو۔"

"وہ تو اُس کی عادت ہے۔"

"اُسے یہ بھی طعنے دیتی ہے کہ وہ جہیز کم لائی ہے۔"

"تو کیا اُس کا باپ اپنی ساری جائداد رام لال کے نام لکھ دیتا؟" میں نے کھیج کر کہا۔

"ماماجی کا بھی خیال ہے شاید۔"

"بہت بے ہودہ خیال ہے۔"

اس واقعہ کے کوئی چھ مہینے بعد مجھے یہ خبر ملی کہ شنو کماری اپنے ماں باپ سے ملنے مایکے گئی تھی اور رام لال اُسے واپس نہیں لایا تھا۔ پھر خبر ملی کہ شنو کماری کا والد خود اُسے سسرال چھوڑ گیا تھا۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ بیٹی دکھی ہو تو بھگتنا ماں باپ کو پڑتا ہے۔

کچھ ہی مہینوں کے بعد رام لال اپنے کسی نجی کام کے لیۓ چنڈی گڑھ آیا اور ایک دن کے لیۓ میرے ہی پاس رُکا۔

ارادھنا نے جب شنو کماری کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بڑی بے زاری سے کہا۔

"وہ دوبارہ مایکے چلی گئی ہے۔"

"کیوں گئی ہے بھائی صاحب؟"

"اُس کا من ہمارے گھر میں لگتا ہی نہیں۔"

"کوئی وجہ تو ہوگی آخر؟" میں نے پوچھا۔

"ماتاجی سے اُس کا جھگڑا رہتا ہے۔"

"جھگڑا کیوں رہتا ہے؟" میں نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

میرے سوال کے جواب میں رام لال نے بڑا تیکھا جواب دیا۔

"سو باتیں ہو جاتی ہیں گھر میں۔ آپ کے گھر میں بھی تو ہوتی ہوں گی؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ارادھنا بول اٹھی۔

"ہمارے گھر میں تو کبھی جھگڑا نہیں ہوتا۔"

"تو اب کر لو"، میں نے ارادھنا کو مخاطب کیا

"میں تو نہیں کروں گی"

"تو مت کرو"

میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ بات طول پکڑ جائے گی بات کا رخ بدل ڈالا اور لالہ گوردھن لال کی صحت کے بارے میں اور پرس رام کے کام کاج کے بارے میں بات چیت شروع کر دی اور ارادھنا اپنی پوربن نوکرانی کا ہاتھ بٹانے کے لیۓ کچن میں چلی گئی۔

اِس دوران پرس رام کی شادی کی بات دو تین جگہ چلی اور ٹوٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ نیلامی کی بولیاں اُونچی نہیں گئی تھیں بیٹے بیچنے کا رواج قائم تھا۔ پھر ایک بار رکشا بندھن کے موقع پہ ماں خود بھی ادھر گئی تھی اپنے بھائی کو راکھی باندھنے کے لیۓ۔ دو دن کے بعد واپس آئی تو بہت خوش نہیں تھی۔

"لگتا ہے، اِس بار بھائی نے زیادہ خاطر نہیں کی!" میں نے مذاق میں کہا۔

"نہیں، سنتوش، یہ بات نہیں۔"

"کیا لڑکیوں والا نام رکھا ہے تم نے میرا؟"

"نام سے کیا ہوتا ہے؟ گُن ہونے چاہئیں۔ تم میں کتنا سنتوش ہے لالچ نہیں کرتے۔ بھگوان بھی تو خوش ہے تم پر۔"

"ماں تو خوش نہیں؟"

"میں کیوں خوش نہیں؟ میرے جتنا خوش قسمت کون ہے؟"

"پر تھوڑا بہت لالچ تو ہونا ہی چاہیئے ماں۔"

"اسی لالچ نے تو میرے بھائی کے گھر کو نرک بنا ڈالا ہے۔"

"اب کیا ہوا؟"

"کیسوری دیوی تو رام لال کی گھر والی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ کون سی کمی ہے گھر میں لیکن پھر بھی بہو کو کم جہیز لانے کے طعنے دیتی رہتی ہے۔"

"ٹکسال لگی ہے اُس کے مائیکے میں کیا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"وہ لوگ تو شاید یہی سمجھتے ہیں۔ اب پھر بے چاری کو مائیکے بھیج دیا ہے۔"

"اُن کی اپنی لڑکی کے ساتھ یہی سلوک ہوا تو پتہ نہیں معلوم ہو گا!"

اِسی لئے تو اب برس رام کی سودے بازی کر رہی ہے میری بھرجائی۔ جو کچھ اُدھر سے آئے اپنی لڑکی دے کر بدلا کر دے۔"

"دکھ پائیں گے تیرے مائیکے والے ماں۔"

"اب کون سا سکھ پا رہے ہیں۔ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے۔" ماں نے جواب دیا تھا۔

لیکن وہ بے حد دکھی اور اُداس تھی۔

مجھے لگا جو کچھ ماں اپنے بھائی کے گھر دیکھ کر آئی تھی وہ سب کچھ اُس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کچھ نہ کچھ اپنے پاس بھی رکھ لیا تھا اور شاید اسی لئے زیادہ دکھی تھی۔

میں بنیادی طور پر بڑا سیلف سینٹرڈ آدمی ہوں اور دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ پھر میرے اپنے پروفیشن کا بھی تو سوال ہے۔ ابھی میرا کام بھی تو پوری طرح سے نہیں جما۔ اس لئے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کیسز پر لگاتا ہوں اور رات دیر تک کام کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ارادھا بھی چڑھ جاتی ہے۔

"کسی بھی سمجھدار لڑکی کو وکیل سے شادی نہیں کرنی چاہیئے!"

"کیشو کو بخار ہے۔ آپ کو بلا رہا ہے۔"

"تم چلو میں آ رہا ہوں۔"

"آپ نہیں آؤ گے۔"

"کیوں نہیں آؤں گا؟"

"اس لئے کہ آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ پیار اپنے مقدموں سے ہے۔"

"مجھے لگتا ہے تم بھی کوئی مقدمہ دائر کرو گی میرے خلاف۔"

"میں نہیں کر سکتی نا۔ اس لئے دکھی ہو رہی ہوں۔"

ارادھنا منہ لٹکائے چلی جاتی ہے اور میں پھر اے آئی آر کے صفحے اُلٹنے لگتا ہوں۔ میرا کل والا مقدمہ بڑی تیاری مانگ رہا ہے۔ جب میں تھک کر اپنے کمرے میں جاتا ہوں تو کیشو سُبک سُبک کر سو چکا ہوتا ہے۔

مجھے میرے پروفیشن نے بہت کاٹ ڈالا ہے اپنے ماحول سے۔

لگتا ہے میں ایک ویران جزیرہ بنتا جا رہا ہوں جہاں شاید بہت دنوں تک کوئی نہیں آئے گا۔ میں شاید خود بھی قدم نہیں رکھوں گا اپنی شخصیت کے ویران جزیرے سے میں بہت دنوں تک۔ جبھی تو مجھے ایک عرصے تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لالہ گوردھن لال کے گھر کے حالات خاصے بگڑ چکے تھے۔

یہ تو ایک دن اچانک تار آیا تو معلوم ہوا کہ شنو کماری مر گئی تھی۔ میرے گھر میں تو کہرام ہی مچ گیا۔ ماں اور میں جب تک جالندھر پہونچے، شنو کماری کا داہ سنسکار ہو چکا تھا۔ پتہ چلا کہ چائے بناتے وقت اس کی ساڑھی کو آگ لگ گئی تھی اور

ہزار کوشش کے باوجود وہ بچائی نہ جا سکی تھی۔ لالہ گوور دھن
لال، شریمتی کیوری دیوی، شنو کماری کے خاوند رام لال، اُسکے
دیور پرس رام اور اُس کی نند سرلا کماری، سبھی کو اُس کی موت
کا بہت دُکھ تھا۔ ماں اور میں زیادہ دیر تک نہ رک سکتے
تھے کیونکہ ارادھنا بیمار تھی اور اُسے اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں
تھا۔ ہم دونوں شام کو واپس آگئے تھے۔

پھر ایک دن یہ خبر ملی کہ شنو کماری کے باپ نے پولیس کو یہ
درخواست دی تھی کہ اُس کی بیٹی اچانک آگ لگ جانے سے
نہیں مری بلکہ اُسے جلا کر مارا گیا تھا اس لئے معاملے کی تحقیقات
کی جائے۔ کچھ ہی دنوں بعد یہ معلوم ہوا کہ پولیس نے ان
لوگوں کے خلاف کیس رجسٹر کر دیا تھا اور گھر کے سبھی افراد کو حراست
میں لے لیا تھا۔ بعد میں لالہ گوور دھن لال اور ان کی بیٹی
سرلا کماری کو تو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن شریمتی کیوری دیوی، رام
لال اور اُس کے بھائی پرس رام کو شنو کماری کو قتل کرنے کے
الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ جو چند دنوں کے بعد ضمانت پر رہا...
ہو گئے تھے۔

ماں نے مجھے کئی بار کہا کہ میں جالندھر جا کر ان لوگوں
سے ملوں اور صحیح حالات جاننے کی کوشش کروں
لیکن میں ٹالتا رہا

کیس کے بارے میں اخباروں میں بھی ذکر تھا۔ میں نے
ارادھنا کو سمجھا دیا تھا کہ وہ ماں کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتلائے
اور نہ ہی اس واقعہ کے متعلق اُس سے کوئی بات کرے۔ اُس نے ایسا
ہی کیا۔ اور اس طرح ماں اپنے بھائی کے گھر کے حالات کے بارے میں
بے خبر رہی۔

گیٹ کے باہر کار کے رُکنے کی آواز میں نے سُنی۔

پھر کال بیل بجی۔

میں ابھی ابھی ہائی کورٹ سے لوٹا تھا اور بے حد تھکا
ہوا تھا۔

سوچا کوئی مؤکل ہوگا جسے اگلے دن کی پیشی کے بارے میں
کچھ پوچھنا ہوگا۔ دروازہ کھولا، تو سامنے لالہ گوور دھن لال
کا تمام کنبہ کھڑا تھا۔ اُس وقت میرے ذہن کی کیفیت وہ تھی
جو ریلوے لائن پار کرتے ہوئے اُس شخص کی ہوتی ہے جس کی پتلون
کی موہری کا ایک حصّہ پٹڑی میں پھنس گیا ہو اور کسی بھی طرح نہ
چھوٹ رہا ہو اور سامنے سے انجن دھاڑتا ہوا تیزی سے اس
کی طرف بڑھتا آرہا ہو۔ بس چند لمحوں کا وقفہ ہو زندگی اور
موت کے درمیان۔

مجھے لگا جیسے دروازہ کھولتے سمے میرے پاؤں کو بھی کسی
پٹڑی نے دبوچ لیا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اپنے مہمانوں کو اندر آنے کے لئے
نہیں کہہ رہا تھا بلکہ انہیں چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکار رہا تھا کیونکہ
اس وقت میری جان خطرے میں تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ سب پھٹی
پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ پھر وہ سب بڑی شکستہ دلی
سے اندر داخل ہوئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔
انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ماں کو اُن کے پاس بھیجا۔ ارادھنا
گھر میں نہیں تھی۔ وہ کیشو کو ساتھ لے کر، کچھ ہی دیر پہلے، آٹھ سیکٹر
میں اپنے بھائی کے گھر گئی تھی۔ وہاں کوئی پارٹی تھی اور تھوڑی دیر
میں مجھے بھی وہاں پہنچنا تھا۔ لیکن اب کہاں ممکن تھا وہاں
پہونچنا۔ میں فوراً باتھ روم میں گھس گیا اور دیر تک اپنے چہرے
پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ سارے کا سارا
خاندان کیوں آیا تھا میرے گھر۔ کچھ دیر کے بعد جب میں ڈرائنگ
رُوم میں داخل ہوا، تو سب لوگ چائے پی رہے تھے لیکن لالہ گوور دھن لال
کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں، جیسے انہیں بڑی بیقراری سے میرا
انتظار تھا۔

"سنتوش کمار مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات
کرنی ہے" لالہ گوور دھن لال نے چائے کی پیالی ایک طرف
رکھتے ہوئے کہا۔

"چائے تو پی لیجئے ماما جی"

"چائے اتنی ضروری نہیں ہے"

"تو فرمایئے"

"چلو تمہارے دفتر میں بیٹھتے ہیں"

میں اُنہیں لے کر باہر والے کمرے میں آگیا جو میرا دفتر ہے

اور دیوار کے ساتھ لگی الماریوں میں قانون کی کتابیں بھری پڑی
ہیں۔ یہی کتابیں کچہری میں میری مدد کرتی ہیں۔ ان کے درمیان
بیٹھ کر میں اپنے آپ کو بڑا محفوظ محسوس کرتا ہوں۔ میں نے لالہ جی
کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی اُن کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"کہئے کیا بات ہے ماما جی؟" مجھے لگا میرا لہجہ بہت گھبرایا
ہوا تھا۔
"تم بہت گھبرائے ہوئے لگتے ہو؟"
"آج بہت کیس تھے۔ تھک گیا ہوں"
"تم پر میرا بہت حق ہے سنتوش کمار"
"اس میں کیا شک ہے ماما جی"
"مجھے خوشی ہے کہ تمہیں بھی اس بات کا احساس ہے"
"آپ کے تو اتنے احسان ہیں مجھ پر۔ میں زندگی بھر نہیں
اتار سکتا"
"بس انہی کا خیال کر لو"
"آپ ہی نے تو ایک بے سہارا اور غریب لڑکے کو اس
قابل بنایا ہے کہ وہ فخر سے زندہ ہے۔ آپ کا بہت بڑا قرضہ ہے مجھ پر"
"میں قرضہ تو واپس نہیں مانگ رہا۔ صرف سود مانگنے
آیا ہوں"

ہوشیار دکاندار اصل کی بات تو کبھی کرتا ہی نہیں صرف
سود کی بات کرتا ہے۔ اصل تو وصول ہو ہی جائے گا۔ سود نہ ڈوب
جائے کہیں۔
لالہ گوردھن لال نے بڑا گہرا وار کیا تھا۔
"آپ حکم کریں ماما جی" مجھے لگا جیسے میرے ماتھے پر پسینے
کے قطرے اُبھر آئے تھے۔

"تمہاری ماسی اور ان دونوں چھوکروں نے مل کر مارا ہے
اُس معصوم لڑکی کو"
"کیا کہہ رہے ہیں آپ" میں چیخا۔
"چیخو مت۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حقیقت ہے"
"تو عدالت میں اقبال کر لیجئے"
"نہیں کر سکتا۔ سب پھانسی چڑھ جائیں گے ان خالو

نے تو اُس کے مرتے وقت کے بیان بھی اپنی مرضی سے دلوائے تھے۔
اُسے دھمکی دی تھی کہ اگر اُس نے کسی کے خلاف بیان دیا تو وہ اُس
کے باپ کو بھی مروا ڈالیں گے"
"ظالم تو آپ ہیں ماما جی جو ان لوگوں کا ساتھ دیتے رہے
ہیں۔ سب کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی تو ہوتا رہا ہے"
میں حیران تھا کہ اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی مجھ میں کہ میں
لالہ جی کے سامنے اس گستاخی سے بول رہا تھا۔
"سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے سنتوش کمار"
انہوں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔
"تو بھگتئے اب"
"نہیں بھگت سکتا"
"تو میں کیا کروں؟"
"تم اس کیس کی پیروی کرو۔ کسی بہت تگڑے وکیل کو
انگیج کر دو"
"نہیں کر سکوں گا ماما جی"
"منہ مانگی فیس دوں گا"
"اسی رقم سے جو آپ سنتو کماری کے باپ کے گلے پر
چھری رکھ کر وصول کرتے رہے ہیں؟"
"تمہاری ماں کا تمام خاندان تباہ ہو جائے گا سنتوش کمار"
"ہو جانے دیجئے"
"میری بات مان لو۔ اس کیس کو سنبھالو اور کسی دوسرے
قابل وکیل کو ساتھ لے لو"
یہ کہہ کر لالہ گوردھن نے نوٹوں کا ایک بڑا سا پلندہ جیکٹ
کی اندر والی جیب سے نکال کر میرے سامنے کر دیا۔
"میری نیلامی مت کیجئے ماما جی۔ اس پلندے کو سنبھال لیجئے"
میں ایک بار پھر چیخا جیسے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت مانگ رہا ہوں
اپنے آپ سے۔
لالہ جی نے بڑی حقارت سے میری طرف دیکھا اور نوٹوں
کا پلندہ اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔
"مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنے نمک حرام ثابت ہوگے"

اُن کی آواز میں کرختگی تھی۔ میں خاموش تھا۔ میری زبان ہی جیسے کٹ گئی تھی۔

"تم تو آستین کے سانپ نکلے۔"

میں چپ تھا۔ لگ رہا تھا جیسے میری کٹی ہوئی زبان سے رِستا ہوا خون میرے منہ میں بھر گیا تھا۔

"جس سنتوش کمار کو میں نے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر پالا تھا وہ آج مر گیا ہے۔"

مجھے لگا جیسے میری کٹی ہوئی زبان کا تمام خون میرے حلق میں جمتا جا رہا تھا میرے ہونٹ کسی نے سی ڈالے تھے۔

"مردود بولتے کیوں نہیں۔ سانپ سونگھ گیا ہے کیا؟"

لالہ جی گرجے۔

واقعی مجھے سانپ نے ڈس لیا تھا اور سارا زہر میری رگوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔ میں اپنی کرسی سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا ہوں۔ گیٹ سے بھی باہر آگیا ہوں۔ لالہ گووردھن لال کوٹھی کے اندر چلے گئے ہیں جہاں ان کے خاندان کے سب لوگ میری ماں کے پاس بیٹھے ہیں۔

"نکل چلو اس گھر سے۔ ان کمینوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔" لالہ جی نے نفرت اور غصّے سے کہا۔ اُن کے خاندان کے سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا ہوا بھائی صاحب؟"

"تمہارے کپوت نے میرے منہ پر تھوک دیا ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔"

"کُتّا اپنی اوقات بھول گیا ہے۔"

میری بھولی، سادہ، ان پڑھ بوڑھی ماں کچھ نہیں سمجھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور اُس کے ہونٹ تھر تھرا رہے ہیں۔ اُس کی نگاہیں مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن میں مگر میں کیوں ہوں کہاں جو اُسے نظر آؤں۔

میں تو سائیڈ لین میں ایک طرف اپنی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن میں سب کو دیکھ رہا ہوں اپنی اندھی ویران آنکھوں سے اور ان کی باتیں سُن رہا ہوں اپنے بہرے کانوں سے۔

جو پانچ آدمی کچھ دیر پہلے کار سے اُترے تھے۔ میرے گیٹ کے سامنے، وہ دوبارہ کار میں بیٹھ گئے ہیں۔ لالہ گووردھن لال نے کار اسٹارٹ کر دی ہے۔ میری بوڑھی ماں گیٹ کے باہر ہاتھ جوڑے خاموش کھڑی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جل رہے ہیں لیکن اُن پانچوں میں سے کوئی بھی اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا اور اسے معلوم نہیں کہ وہ سب لوگ اچانک ہی اتنے کٹھور اور سنگدل کیوں ہو گئے ہیں۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو مجھے لگا وہ سڑک کی طرف نہیں بڑھی بلکہ سائیڈ لین کی طرف مڑی ہے جہاں میں اپنی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور میرے ماتھے پر پسینہ ہی پسینہ اُبھر آیا ہے۔ لالہ گووردھن لال نے پورے زور سے کار کو میری طرف گھمایا ہے اور بلند آواز سے چیخے بھی ہیں۔

"کُتّے، کمینے، کچل کے چھوڑوں گا تجھے۔!"

میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا کیونکہ میرے پاؤں میں کیلیں گڑی ہیں۔ میں زور سے چیختا ہوں اور کار پوری رفتار سے مجھے کچلتے ہوئے سامنے کی صاف، کھلی اور سنسان سڑک پر دوڑنے لگی ہے۔

میری نظروں کے عین سامنے سنتوش کمار اگروال ایڈوکیٹ کی موت ہوئی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اُس کی لاش شمشان بھومی میں جلی ہے۔ اور اُس کے معصوم بیٹے کیشو نے اُس کی چِتا کو آگ دی ہے، جسے زندگی اور موت کے آپسی رشتے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں۔

اُس کی گرم گرم راکھ میں سے ایک نیا سنتوش کمار جنم لے رہا ہے۔ اور اُسے اس بات سے انکار نہیں کہ اُس کے ماموں نے اُسے ایک دن کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھا کر ہیرا بنا دیا تھا لیکن اسے سنتو کماری کے قاتلوں کے ٹولے میں شامل ہونے سے سراسر انکار ہے۔

■■

شفیقہ فرحت

کی ہم نے بغاوت

اِدھر کچھ دِنوں سے بغاوت کا بول بالا ضرورت اور معمول سے کچھ زیادہ ہی بالا تھا۔ صبح کو اخبار اٹھایئے کسی نہ کسی ملک، کسی نہ کسی شہر کا تختہ الٹا ملے گا۔ اور دو چار روز بعد بغاوت نمبر دو کے نتیجے میں یہ الٹا ہوا تختہ پھر پلٹ دیا جائے گا۔ اور پلٹا اور تختہ پھر قلابازیاں کھانے لگے گا۔

خیر ایسی جنگی اور خونی بغاوتوں سے ہمیں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مگر ہنستی کھیلتی پرامن بغاوتیں تھی، ہاتھ باندھے سر جھکائے یلغار پہ یلغار کیے جا رہی تھیں۔

آج نوکرانی نے بغاوت کر دی۔ لیجئے چولہا ٹھنڈا پڑا ہے اور گھر کا نظام درہم برہم۔ میاں سے لڑائی۔ بچوں کی دھنکائی۔ طلبا نے اسٹرائیک کر دی۔ یونیورسٹی بند اور سینما گھر آباد۔ ماسٹروں نے اسٹرائیک کیا۔ امتحان ہوئے بائیکاٹ۔ عورتوں نے WOMEN'S LAB بنائی اور نعرے لگاتی ہوئی گھروں سے نکل کھڑی ہوئیں۔

اور تو اور دو دو چار چار مہینے کے بچے بھی کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں۔ ذرا آنکھیں دکھایئے اور ان کی ماؤں کی نظر بچا کے ہلکی سی چٹکی بھر یئے تو وہ بھی دودھ کی بوتل چھوڑ گلا پھاڑ پھاڑ کے انقلابی گیت گانے لگتے ہیں۔

اور پھر ادبی بغاوت۔ روایت سے بغاوت، شاعری سے بغاوت اور آخر میں خود شاعر سے بغاوت۔!
تو جب یہ رنگِ عالم ہو تو پھر بغاوت کے لئے ہمارا دلِ ناداں کیوں نہ مچلے؟! کہ پاسبانِ عقل کو چکمہ دے کر کبھی یہ کبھی تنہا چھوٹ ہی جاتا ہے۔!

ایک صبح جب آئینہ پہ نظر پڑی تو معمول سے کچھ زیادہ ہی صدمہ ہوا۔ اب پتہ نہیں آئینہ اُس دن دھند لا گیا تھا یا اپنا ہی حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا۔ بہرحال ایک تیر تھا کہ سینہ پہ لگا اور دل سے ہوتا ہوا جگر تک اتر گیا۔ ہم نے فوراً بغاوت کی ٹھانی۔ بھلا کب تک یہ سیدھی مانگ۔ کسی چوہے کی دُم کی سی چوٹی۔ کھچڑی بال۔ اور قصائی کے چھرے کی سی موٹی سیدھی بھنوئیں۔

پھر کیا تھا۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ بھاؤ۔

سمتِ مشرق سے چلا جانبِ مغرب بادل،
ہم بھی گھر سے نکل۔ بزرگوں کے اونچی دکانوں کے پھیکے پکوانوں کے تلخ تجربات کو بھلا کر شہر کے سب سے مہنگے بیوٹی پارلر پہنچ گئے۔ ویسے تو سنا تھا کہ اس بیوٹی پارلر میں داخلے کے لئے دنوں اور ہفتوں پہلے اپوائنٹمنٹ لینا پڑتا ہے۔ مگر یہ شاید شادیوں اور

پارٹیوں کا موسم نہ تھا اور اُس دن غالباً شہر میں کوئی اہم شو شن کلچرل یا ادبی فنکشن بھی نہ ہوگا۔ لہٰذا ہمارے وجود کو غنیمت جان ہمیں فوراً ہاتھوں ہاتھ جھیلتے، ڈھکیلتے اندر پہنچا دیا گیا۔

کمرے میں نصب چاروں طرف بڑے بڑے آئینے۔ پراسرار مشینیں اور بھیانک اوزار دیکھ کر ہمارا جوشِ بغاوت ٹھنڈا پڑنے لگا اور ہم فرار کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ مگر وہ دروازہ جس سے ہم اِس قربان گاہ میں لائے گئے تھے طلسمی انداز میں مضبوطی سے بند ہو چکا تھا اور اندر کے کسی چور دروازے سے دو خواتین جو کسی طرح ان مشینوں اور اوزاروں سے کم بھیانک نہ تھیں وارد ہو چکی تھیں۔

اُن میں سے ایک نے اپنی شکل سے کبھی زیادہ لرزا دینے والی آواز میں پوچھا۔ "کیا کرنا ہے آپ کا؟"

جی میں تو آیا کہہ دیں کہ ہمیں اپنے قتل کے علاوہ کسی اور بات کے تو امکانات نظر نہیں آ رہے۔ مگر پھر خاموش ہو رہے کہ خودکردہ را علاجِ نیست۔

ہماری خاموشی کو اناڑی پن پہ محمول کرتے ہوئے انھوں نے ہمارا بھرپور جائزہ لیا۔ پھر قربانی کے جانور کی طرح ٹٹولا۔ ٹھونکا بجایا اور فرمایا۔

"آپ کا فیشیل ہوگا۔ ہیئر کٹ۔ شیمپو اور ملائی۔"

ہم نے بے وقوفوں کی طرح سر ہلا دیا۔ یہ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ بی بیو ہم تو اپنے حلیئے سے ہلکی سی بغاوت کرنے نکلے تھے۔ اس پنج روزہ پلان سے ہمارا کیا تعلق۔

وہ دونوں کسی ہوئی کمر سمیت آگے بڑھیں اور ہمیں دبوچ کے ایک قدِ آدم کرسی پر بٹھا دیا۔ کھولتے ہوئے پانی میں روتے نا مبارک کو غوطہ دینے ہی والی تھیں کہ ہم چیخے جس کا ظالموں نے کوئی نوٹس نہ لیا

اور اپنے ظالمانہ عمل میں مصروف ہو گئیں۔ اور اس "آتشِ مرطوب"، کو ہم اپنے جرمِ بغاوت کی سزا سمجھ کر برداشت کرتے رہے۔

کہ آہ بھی کرتے تو ہو جاتے بدنام۔!

تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد اسی مظلوم بلکہ مغفور چہرے پہ بڑی بے دردی سے پٹائی کر دی۔ اور ہمیں شدید کرب کے عالم میں تڑپتا پھڑکتا چھوڑ کر ہمارے وجود کو یکسر فراموش کر کے دوسروں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ہمارے چہرے سے لیپ اتارا تو مکّے بازی پہ اتر آئیں۔ گالوں پر چاروں طرف سے وہ کس کس کے چانٹے مارے کہ اگر یہ روز چھٹی والدہ محترمہ کا شیر مبارک نصیب ہوا ہوتا تو قطرہ قطرہ یاد آ جاتا۔

فریاد کی تو فرمایا "فیشیل میں یہی سب ہوتا ہے۔ حسن کی خاطر تھوڑی سی تکلیف تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔"

خیراِتْ بہت، کو تھوڑا جان کر ہم آنسوؤں کو صبر کے گھونٹ کے ساتھ پینے رہے۔ گالوں کے بعد وہ بالوں پہ حملہ آور ہوئیں۔ اور جو جو سلوکِ ناروا ان کے ساتھ روا رکھا وہ ہم حسنِ خام کے خیالِ خام سے دم سادھے سہتے رہے۔

اور پھر بغاوت میں جان سے گزرنا تو پڑتا ہی ہے۔

یقین تھا کہ ہر بغاوت کی طرح اس بغاوت کا انجام بھی انقلاب آفریں اور حسین ہوگا ہم بیوٹی پارلر سے باہر نکلیں گے تو ہماری شخصیت میں انقلاب آ چکا ہوگا۔ کہ حال ہی میں ہم نے یہ لطیفہ پڑھ لیا تھا کہ "ہمارے بیوٹی پارلر سے نکلتی ہوئی کسی لڑکی کو نہ چھیڑیئے۔ ممکن ہے وہ آپ ہی کی ساس یا والدہ صاحبہ ہوں۔!"

خیر بعد اک مدتِ طویل اور اذیتِ شدید ہماری جاں بخشی کا حکم ہوا اور ہمارے ہاتھوں میں کاغذ کا ایک پرزہ پکڑا دیا گیا، جیسے وہ اپنی محنت کا صلہ کہہ رہی تھیں اور ہم اپنے اعمال کی سزا سمجھ رہے تھے۔ بل دیکھ کر ہم سناٹے اور غناٹے میں آ گئے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ گھر سے چلتے وقت نہ صرف اپنی تمام منقولہ دولت ساتھ لے لی تھی بلکہ احتیاطاً چیک بک رکھنا بھی نہ بھولے تھے۔

ڈیڑھ سو کا جرمانہ ادا کر کے ہم بغیر سر پہ پیر رکھے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ راستے میں اپنے "تازہ بہ تازہ نو بہ نو" حسنِ جہاں سوز کا اثر دیکھنے کے لیے دم بھر بھی نہ رُکے۔ ورنہ یقین ہے کہ راستے کے دونوں طرف کشتوں کے پشتے تو لگ ہی گئے ہوں گے۔

دلِ ستم زدہ اور جیب زخم خوردہ کو تھامے سنبھالے گھر میں گھسے تو سامنے دالان میں اماں سے مٹھ بھیڑ ہوئی ایک تو ویسے ہی انھیں کم نظر آتا ہے۔ اس پہ ہمارا یہ حلیۂ بغاوت، دیکھتے ہی چیخنے لگیں۔

"اے ہے شریفن دیکھنا تو یہ کون موئی چڑیل منہ اٹھائے گھسی چلی آ رہی ہے۔ نہ جان نہ پہچان۔ نہ دعا نہ سلام۔"

والدہ صاحبہ کے اس خطبۂ استقبالیہ کو ہم نے ان کی تنگ نظری اور قدامت پرستی سمجھ کر نظر انداز کیا اور آگے بڑھے۔ مگر اس شریفن کی بچی نے تو ہماری ساری اُمنگ ترنگ اور جوش و خروش اور سرخوشی پہ گھڑوں پانی انڈیل دیا۔ کمبخت ہمیں دیکھ کے ٹھٹکی۔ کھی، کھی کرنے لگی۔

اور پھر —— "اے۔ بی۔ بی یہ آپ کو کیا سوجھی،" کہہ کر جو ہنسنا شروع ہوا تو لوٹ لوٹ گئی۔

اب صورتِ حال اور عقلِ اولاد سے اماں کچھ کچھ باخبر ہو گئیں۔ سر پہ دو ہتّڑ مار کے بولیں "اے ہے یہ تم ہو بیٹیا۔ اور دھم سے تخت پہ ڈھیر ہو گئیں۔

جیسے ہمارے مرحوم و مغفور ہونے کا ماتم کر رہی ہو —!

شور و غل سن کے کمروں سے بھابیاں اور کونے کھدروں سے بچے نکل نکل کر آ گئے اور ہمارے آگے پیچھے گھوم گھوم کے یوں حیرت سے دیکھنے لگے جیسے ہم عجائب گھر سے چھوٹا ہوا جانور ہوں یا سرکس کے جوکر —!

بچے ہماری اس ہیئت کذائی پر بے حد مسرور و شاداں ہو گئے۔ کیونکہ ہم پڑھاتے وقت اکثر مار مار کے ان کا بھی حلیہ اسی طرح بگاڑ دیا کرتے تھے۔ پھر وہ سب کے سب عالمِ سرخوشی میں چیختے چلاتے یہ خوش خبری اپنے دوستوں دشمنوں کو سنانے بھاگے۔

بڑی اور چھوٹی دونوں بھابیاں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں کہ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بیگم صاحبہ ہمیشہ ہمارے کپڑوں اور زیوروں پہ ہنسا کرتی تھیں اور ہمیں گنوار اور ان کلچرڈ UNCULTURED کے خطابات سے نوازا کرتی تھیں۔ اب آئے گا مزہ۔

ہم ان سب کم ظرفوں کی حرکتوں پہ جلتے بھنتے غصّے سے پیر پٹختے اپنے کمرے میں آ گئے۔ اور پھر اُسی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا کہ جس پہ صبح نظر ڈالتے ہی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تھی مگر اب آئینہ صاف ہو چکا تھا۔ اور اس میں نظر آ رہے تھے ہم بہ اندازِ دگر۔ بغاوت کے مارے ہوئے، فیشن کے ستائے ہوئے۔ پر کٹی مرغی اور بھیگی چوہیا کے سے چھوٹے چھوٹے بال۔ گال پٹائی کی گرمی اور تھپیڑوں کی بارش سے لال۔ چہرہ فیشیل کی برکتوں سے کچھ کچھ سفید۔ مگر گردن اور ہاتھ پرانے مال کی طرح بدرنگ اور زنگ آلود — کھچی ہوئی بھنوئیں پہلے سے کہیں بے ہنگم۔۔۔۔ یہ تھے ہم —!

دوہرے، تیہرے چوہرے صدموں سے نڈھال پلنگ پہ گر پڑے۔ اور دنوں ہفتوں منہ چھپائے کمرے میں گھسے رہے۔ چلے تھے بغاوت کرنے۔

اوم کرشن راحت

کوھان

پونے پور نام کا ایک نگر تھا وہاں کا راجہ بھدر سین اپنے وزیروں اور دور کے راجہ سندر سین کے شرپسندوں سے اپنے نگر سے باہر کسی درویش کے جھونپڑے میں دن کاٹ رہا تھا۔ بہت دنوں پیچھے درویش کی مت۔ائی اور پرجا کے سہیوگ سے سندر سین کو راج پاٹ چھوڑ کر اپنے دیس بھاگنا پڑا اور پونے پور کا راج پھر بھدر سین کو ملا۔ نگر والوں نے اپنے راجہ کو دوبارہ پا کر نگر بھر میں گھی کے چراغ جلائے۔ شہر کے لوگوں کو عجیب طرح کی خوشی اور خرمی حاصل ہوئی کہ جا بجا اور گھر گھر ناچ رنگ مچ گیا۔ سنگھاسن پر بیٹھ راجہ کو فقیر کی یاد آئی۔ اپنے منتریوں کو لے کر راجہ درویش کی جھونپڑی میں پہنچا لیکن راجہ کے پہنچنے سے پہلے ایک کالے ناگ نے درویش کو کاٹا اور وہ مر گیا۔ راجہ کے مہامنتری کا نام چیتر سین اس کی استری کا نام رکمنی۔ ایک رات رکمنی نے مہامنتری سے کہا جو راجہ ہو کر سندر استری سے بیاہ نہ کرے تو راج کرنا اس کا تشیچل ہے یہ بات کہہ کر رکمنی تو چاندنی کا آنند لینے چھت پر چلی گئی۔ چیتر سین سوچ میں ڈوب گیا اور صبح ہوتے ہی راجہ کے پاس آیا اور بولا مالک ان دنوں آپ بہت دُربل اور اداس دکھتے ہیں۔ راجہ بولا انہیں دنوں مجھے راج چنتا رہتی ہے اس سے شریر دُربل ہوا ہے یہ سن مہامنتری نے کہا آپ سب چنتا مجھ پر چھوڑ دے آپ سکھ چین سے رہیں۔ اپنے پڑوسی راجہ اگر سین کی بیٹی کا نام چندر پربھا ہے چندرے آفتاب چندرے ماہتاب آپ آگیا دیں تو ان سے بات کریں ایک تو آپ کا دل بہلے دوجے راج ونش آگے چلے۔ راجہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ کچھ دنوں بعد راجہ کا بیاہ ہوا اور راجہ سکھ سے عیش کرنے لگا۔ راج کی سب چنتا چھوڑ رات دن آنند میں رہنے لگا۔ بیاہ شادی کے بعد سنتان کی اچھا کا من میں جاگنا قدرتی ہے لیکن چندر پربھا کئی برسوں تک راجہ کی ابھلاشا پوری نہ کر سکی اور راجہ کو پھر چنتا نے گھیر لیا۔ سنتان سے مایوس ہو کر راجہ نے پھر راج کے کام کاج میں رُچی لینا شروع کیا تو مہامنتری گھبرایا اس کو پریشان دیکھ کر رکمنی نے کہا سوامی راج ونش چلانے کے لئے راجہ تو کتنے ہی بیاہ کر سکتا ہے یہ اپنے شاستروں میں لکھا ہے یہ بات کہہ کر رکمنی اپنی داسیوں کے ساتھ باغ میں گھومنے چلی گئی۔ چیتر سین سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر راج پنڈت کو سکھا بجھا کر راجہ کے پاس بھیجا اور اس نے راجہ سے کہا مہاراج اولاد کے بغیر راج سونا رہ جائے گا۔ شاستروں کے مطابق راج ونش چلنا چاہیئے۔ اگر کسی دھرتی میں بیج نہ پھوٹے تو دھرتی بدل کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ راج پنڈت کی بات سن کر راجہ نے مہامنتری کو طلب کیا اور اس بارے

میں صلاح مانگی۔ مہامنتری بولا مہاراج راج پنڈت
ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ آگیا دیں تو مہاراج بہن سین
سے بات چلائی جائے ان کی بہن تاراوتی چندرے آفتاب
چندرے ماہتاب ہے۔ شاید وہ ہمارے یہ سنا وُ ہی کے
انتظار میں ہے۔ راجہ کی سنتان کی تمنا سے محل میں رانیاں
ہی رانیاں اکٹھی ہو گئیں۔ ادھر راجہ بھوگ ولاس میں
لپٹ ہوا ادھر شہر میں وبا پھیلی ہر چھوٹے بڑے،
غریب امیر کی پیٹھ پہ کوہانیں اُگنا شروع ہوئیں۔
حکیم، وید اس عجیب وغریب بیماری کا علاج تو کیا
کرتے وہ خود بھی اس بیماری کے پرکوپ سے نہ بچ
سکے۔ مہامنتری کی پیٹھ پر بھی اونٹ کی کوہان سا ابھار
نمودار ہوا تو وہ راجہ کے پاس چوغہ پہن کر جانے لگا۔
ایک دن راجہ مہامنتری سے بولا۔

مہامنتری یہ دیکھو ہماری پیٹھ یہ ابھار سا کیا
ہے؟

حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں، مالک
برا نہ مانیں آپ میرے پتا سمان ہیں ہر پل جو گزرتا ہے
ہم سب کو جوانی کی طرف نہیں بڑھاپے کی طرف لے
جاتا ہے۔ راجہ من ہی من میں چترسین کی چترائی پر بہت
خوش ہوا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ رات کے وقت محل کے
پاس ایک ٹیلے سے رونے کی آواز سنائی دی۔ راجہ
نے سن کر پکارا کون ہے۔ کوئی جواب نہ پا کر راجہ بستر
سے اٹھا۔ سب نوکر چاکر، داس، داسیاں محل میں سوئے
پڑے تھے۔ رونے کی آواز دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی۔
راجہ یہ دیکھنے کے لئے کہ رات گئے کون روتا ہے کالے
کپڑے پہن کر محل سے نکلا۔ راجہ کا بازار میں پہنچنا
تھا کہ کوتوال نے دھر لیا اور دھکیل کر کوتوالی لے
گیا۔ راجہ کو نہ بتاتے بنتی تھی نہ چھپاتے۔ کوتوال نے
سپاہی کو حکم دیا کہ راجہ کو حوالات میں بند کر دے
یہ کوئی چور جان پڑتا ہے۔ راجہ بہت گڑگڑایا تو
کوتوال بولا کہ تو اپنے ہاتھ کی انگوٹھی مجھے دے تو تجھے
چھوڑ سکتا ہوں۔ راجہ نے انگوٹھی اُتار کر گربڑے کوتوال کی
ہتھیلی پہ رکھ دی۔ اور اس کے ہاتھوں سے چھوٹا۔ راجہ
چھپتا چھپاتا ٹیلے پر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک
گورا چٹا لڑکا برس بیس ایک کا۔ دھاڑیں مار مار کر
روتا ہے کبھی سر کے بال نوچتا ہے تو کبھی چھاتی پیٹتا
ہے آنسو آنکھ میں ایک نہیں اس کا یہ حال دیکھ کر
راجہ نے پوچھا؟

تو کیوں اس قدر چیختا ہے۔ تجھے کیا دُکھ
ہے؟

لڑکا بولا دکھ اس سے کہا جائے جو دکھ دور
کرے اور جو سن کے دکھ دور نہ کر سکے اس سے کہنے کا
کیا حاصل۔

یہ سن کر راجہ نے کہا تو اپنا دکھ کہہ میں اپنی
ہمت کے مطابق تیرا کشٹ دور کروں گا۔

یہ سن کر لڑکا بولا۔ میں اپنی نو بیاہتا استری
کو لے کر اس نگری میں کام کاج ڈھونڈنے آیا تھا۔
میری استری مہامنتری نے ہتھیائی۔ روپے پیسے
شہر کے بیوپاریوں نے ٹھگے کپڑے کوتوال نے چھینے
اور لوگوں نے میری پیٹھ پہ ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ وہ
سیدھی کیسے ہے اور حسد کی آگ میں جل بھن گئے اور
مار پیٹ کے نگری سے نکال دیا۔ راجہ اس کا احوال
سن کر بہت دکھی ہوا اور لڑکے کو ساتھ لے کر چھپتا
چھپاتا محل میں واپس آیا۔ راجہ لڑکے کو بٹھا کر وستار
سے حال پوچھنے لگا، لڑکا بولا میں دیپ نگر کے مہا
پنڈت کا پُتر ہوں۔ میں نے ماتا پتا کی مرضی کے خلاف
سیٹھ کی لڑکی سے بیاہ رچایا اور جب دلہن کو لے کر گھر
پہنچا تو پتا نے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ ناچار جو روپے پیسے
سیٹھ نے اپنی لڑکی کو دیئے تھے ساتھ لے کر اس نگری

میں پہنچا، آگے کا حال احوال ٹیلے پر کہا تھا۔

راجہ بولا۔ جو تو کہتا تھا کہ لوگوں نے تیری پیٹھ پہ ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھا اس کا احوال کہہ۔

لڑکا بولا۔ راجہ آپ کی نگری میں سب کے سب کُبڑے ہیں راج وئید سے پجاری تک اور مہا منتری سے گڈریئے تک، سنا ہے کوئی چھوت کی بیماری ہے جو سب کو لگی ہے۔ راجہ یہ سن کر چنتا میں ڈوب گیا، لڑکے کو وہیں باغ میں بٹھا کر راجہ محل میں گیا اور مرگ چھال بغل میں دبا لنگوٹ باندھ کر کھڑاؤں پیروں میں پہن کر واپس آیا اور لڑکے سے بولا۔

آج سے راج پاٹ تیرے حوالے کہ میں اب بن باس لیتا ہوں کہ عمر کے مطابق بھی اب مجھے بان پرست لینا چاہیئے۔ لڑکے کی نظر راجہ کی پیٹھ پہ پڑی، راجہ معاملہ بھانپ گیا پہلے ہنسا پھر رو دیا۔

لڑکے نے پہلے ہنسنے اور پھر رونے کا سبب پوچھا۔

راجہ بولا میرے ہنسنے کا کارن ہے کہ میں راجہ ہوتے ہوئے بھوگ ولاس میں مگن رہا۔ اور رونے کا کارن یہ ہے کہ مانو جنم بے کار ہاتھ سے گیا۔ میں اب دداع ہوتا ہوں۔

لڑکا بولا۔ اپنے فرض سے منہ موڑنا پاپ ہے۔ ساری رعایا دکھ سے پیڑت ہے اس کا احوال میں نے کہا۔ مہا منتری دشٹ ہے۔ لوگوں کو اس دشا میں چھوڑ کر آپ چلے گئے تو نگری اور نگر واسیوں کا کیا ہوگا۔ آپ میری بنتی مان راج کو راج سمجھ کے کریں میں اپنی بدھی انوسار جو مجھ سے بن پڑے گا آپ کی سہائتا کروں گا۔ لڑکے کی بات مان کر راجہ دربار میں گیا تو مہا منتری بہت گھبرایا اور طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر اپنے گھر گیا۔ سوامی کو دکھی دیکھ کر رُکمنی نے کہا جو پہاتی استری کو گھر میں رکھے۔ بھوگ ولاس کرے اس کا سروناش ہونے میں دیر نہیں لگتی یہ کہہ کر رُکمنی تالاب میں نہانے چلی گئی۔ مہا منتری نے سب سوچ وچار کے بعد اپنا تیاگ پتر راجہ کو بھیج دیا راجہ مہا منتری کا تیاگ پتر سویکار کر کے راج کا کام کاج خود دیکھنے لگا اور ایسا کام میں لپٹ ہوا کہ گھر گرہستی بھول گیا۔ اڑوس پڑوس کے راجیوں سے حکیم بلوا کر ان سے اپنی نگری میں پھیلی بیماری کا کارن پوچھا لیکن کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ ایک دن راجہ پوجا کے کمرے سے باہر نکلا تو ایک داسی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی راجہ نے بڑے پیار سے پوچھا کہو داسی کیا بات ہے؟

داسی بولی مہاراج کی جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

کہو کہو۔ بے جھجک کہو اس وقت ہم پوجا گھر سے آ رہے ہیں۔ ہمارا من کرودھ لوبھ اور اہنکار سے مکت ہے۔ ہم تمہاری بات دھیان سے سنیں گے اور جہاں تک ممکن ہوگا تمہاری مدد کریں گے۔

داسی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی کے لہجے میں کہا راجہ میں چھوٹی رانی کو نہلا رہی تھی ان کی پیٹھ پر بھی کوہان ابھر رہا ہے۔ یہ سن کر راجہ گہری چنتا میں ڈوب گیا۔ وہیں سنگِ مرمر کی چوکی پر بیٹھ کر گردن جھکا لی اور یہ خبر سارے محل میں بارود کی بو کی طرح پھیل گئی اور سب کی سب رانیاں اپنے اپنے بھونوں میں سر جھکا کر بیٹھ گئیں اور اپنی اپنی داسیوں کو راجہ پر کڑی نظر رکھنے کا حکم دیا اور کہا جب راجہ اس دکھد مُدرا سے مکت ہو انھیں اطلاع دی جائے۔

دوپہر تک راجہ وہاں سے نہ اٹھا اور محل میں رانیوں اور داسیوں کی گردنیں اکڑنے لگیں تو داسیوں کی معرفت ایک دوسرے کی رائے لی گئی اور برہمن کے لڑکے کو بلا بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ برہمن کا لڑکا محل میں راجہ کے

پاس ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا مہاراج سارا محل شوک میں ڈوبا ہے۔ رانیوں کی گردنیں ڈھلنے لگی ہیں۔ راجہ نے یہ بات سن کر گردن کو سیدھا کیا اور سب داسیاں اپنی اپنی مالکاؤں کو یہ خبر سنانے دوڑ پڑیں۔ براہمن کے لڑکے نے راجہ سے ان کی چنتا کا سبب پوچھا تو راجہ نے چھوٹی رانی کی دشا جو داسی سے سنی تھی بیان کی اور بولا ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے ایک سال بھی نہیں ہوا اس سے بیاہ کئے یہ سب ہمارے کارن ہوا اگر ہم اسے بیاہ کر اپنے دیس نہ لاتے اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ یہ سن کر لڑکا بولا۔

مہاراج یہ بات جو داسی نے کہی آپ کو کیوں اس کا پتہ نہ چل سکا مطلب اس کا یہ ہوا کہ آپ پہلے بھوگ ولاس میں اتنے مگن ہوئے کہ پرجا کی سدھ بدھ نہ لی اور اب راج پاٹ کے کاموں میں ایسے کھوئے ہیں کہ گھر کی خبر لینے کی فرصت نہیں۔ راجہ لڑکے کی چترائی سے بہت خوش ہوا اور اسی وقت اسے مہا منتری بنا کر ڈھنڈورا پٹوا یا۔ مہا منتری بن کر براہمن کے پتر نے سب سے پہلے پچھلے مہا منتری کو بندی بنا جیل میں ڈالا اور اپنی استری کو اس دشٹ کے گھر سے بلا کر اپنے گھر میں جگہ دی۔ استری مارے شرم کے سر نہ اٹھاتی تھی۔ براہمن کے بیٹے کے سمجھانے پر کہ طاقت والے کے آگے پیش نہ چلے تو یہ بے بسی ہے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اپنی استری کو دلار سے گلے لگایا تو مرجھائی کلی پھر کھل اٹھی۔ پھر لڑکے نے ان بیوپاریوں کی زمین جائیداد قرق کر کے خزانے میں جمع کروائی جنھوں نے اس کے روپے ٹھگے تھے۔ کوتوال کو معطل کر کے جیل بھجوا دیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر اس نے اپنے پتا کو پتر لکھا اور سارا حال بیان کیا اور اپنے مہا منتری بننے کی خبر لکھی۔ یہ خبر سن کر کئی نزدیک اور دور کے رشتے دار پونے پور پہنچے۔ پتا کو نہیں آنا تھا نہیں آئے۔ سب بھائی بہن بھتیجوں کو اچھی اچھی نوکریوں پر لگا کر براہمن کا لڑکا سکھ چین سے رہنے لگا۔

ایک دن اپنی استری موہنی کو اداس دیکھ کر وہ بولا تیرے دکھ کا کارن جانوں تو کچھ اپائے کروں۔ موہنی بولی۔ سوامی، بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ موہنی پچھلے مہا منتری کا رہن سہن اور ٹھاٹ باٹ دیکھ چکی تھی یہاں وہ کچھ نہ پا کر اداس رہنے لگی اور سوامی کے دوبارہ پوچھنے پر بولی آپ کا عہدہ بہت اونچا ہے لیکن گھر میں کانسے کے تھالوں میں کھانا پروسنے میں شرم آتی ہے۔ مہمانوں کے آگے سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہ سن کر براہمن کے بیٹے نے خزانے سے سونا نکلوا کر سنار کے حوالے کیا اور پچاس تھال سونے کے جلد بنانے کا حکم دیا۔ تھال پا کر موہنی بہت خوش ہوئی لیکن کچھ دنوں بعد پھر اداس ہو گئی۔ لڑکا بولا موہنی اپنا دکھ کہہ تا کہ میں جان سکوں اور کچھ اپائے کی سوچوں۔ موہنی نے کہا۔ سوامی بھگوان کا دیا سب کچھ ہے لیکن مہا منتری کی پتنی ہونے کے ناطے نہ ڈھب کے لتے نہ آبھوشن۔ مہمانوں کے آگے جاتے لجا آتی ہے مہا منتری کے حکم سے نگری کے بزاز بڑھیا سے بڑھیا کپڑا لیکر حاضر ہوئے جوہریوں نے زیورات کے ڈھیر لگا دیئے۔ مہا منتری نے پیسے دینا چاہے تو بیوپاری لوگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بولے مہاراج آپ کا اَن کھاتے ہیں۔ آپ کی رعایا ہیں۔ آپ کی چھتر سایہ میں پڑے ہیں۔ یہ تچھ بھینٹ ہے کوئی اور سیوا کا موقع دیں۔ یہ کہہ کر سب کے سب ہاتھ جوڑ کر وداع ہوئے۔ ایک دن صبح سویرے براہمن کا لڑکا تالاب میں اشنان کرنے گیا اور مالش کرنے والا اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چونکا اور جب اس کا ہاتھ رکا تو لڑکا بولا ہاتھ کاہے کو رکا۔ نوکر بولا۔ مہاراج جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ مہاراج آپ تو اس دیا کے شکار ہو سکتے ہیں جو اس نگری میں پھیلی ہے۔

خمار جالندھری

غزل

ہماری حق پرستی کی ملی ہے یہ سزا ہم کو
اِسی اِک جُرم پر سولی پہ لٹکایا گیا ہم کو

بھرے ساغر کو ہم ٹھکرا تو سکتے تھے سرِ محفل
مگر پاسِ ادب تھا ساقیٔ گلفام کا ہم کو

جبیں اپنی جُھکی ہے خود بخود فرطِ عقیدت سے
مِلا ہے جب کہیں کوئی کسی کا نقشِ پا ہم کو

اُنہیں تنہائی میں کہنے گئے تھے حالِ دل لیکن
سُنانے لگ پڑے وہ دوسروں کا ماجرا ہم کو

غمِ جاناں کی اِس کے واسطے تربت ضروری ہے
غمِ دوراں کے آخر قرض کرنے ہیں ادا ہم کو

اُڑی رنگت، نگاہیں مضطرب، ہونٹوں پہ تالے ہیں
محبت کا مِلا ہے دیکھئے کیا کیا صِلا ہم کو

خمارؔ اُس دور سے برسوں رہی وابستگی اپنی
نظر جس دور میں آتا تھا پتھر بھی خدا ہم کو

فاروق شفق

مرے خوابوں کی یہ وادی نہیں ہے
یہاں کوئی بھی فریادی نہیں ہے

چلو واپس چلیں دُنیا میں اپنی
اب آگے کوئی آبادی نہیں ہے

یہ اُڑتے بھاگتے رنگین بادل
یہاں لمحوں کی بربادی نہیں ہے

یہ کیسا شور برپا ہے فضا میں
یہاں سُنتے تھے آبادی نہیں ہے

بہت کچھ دیکھنا باقی ابھی ہے
نئی راہوں کا وہ عادی نہیں ہے

ڈاکٹر جاوید احمد

صالحہ عابد حسین کی افسانہ نگاری

اردو ناول کے بعد افسانہ خواتین قلم کار وں کی مرغوب صنف ہے۔ صالحہ عابد حسین بھی اردو ادب کی ان خواتین ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے ناول اور افسانہ دونوں میں ہی طبع آزمائی کی اور بہت جلد اپنا ایک مقام بنالیا۔ اگر ان کے نو ناولوں میں سے "اپنی اپنی صلیب" اور "گوری سوئے سیج پر۔۔۔" لوگوں کو ہمیشہ یاد رہیں گے تو ان کی کہانیوں اور افسانوں کو بھی فراموش کرنا ممکن نہیں۔ ویسے تو صالحہ عابد حسین نے بے شمار کہانیاں اور افسانے لکھے ہیں مگر چند افسانوں کو باقاعدہ مجموعوں کی شکل میں ترتیب دیا ان مجموعوں کی تعداد پانچ ہے اور یہ حسبِ ذیل ہیں۔

"نقشِ اول، ساز ہستی، نراس میں آس، نونگے اور دردودرماں"

صالحہ عابد حسین کی ادبی و تخلیقی مصروفیات بہت کم عمری سے شروع ہو گئی تھیں مگر پہلا مجموعہ ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آیا اور اس طرح ان کی افسانہ نویسی تقریباً ۴۴ برس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ہماری زندگی میں روزانہ ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو کسی بھی افسانہ کے لئے پلاٹ کا کام دے سکتے ہیں۔ ایک عام آدمی ان باتوں کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے گذر جاتا ہے مگر ایک مصنف جس کا تخیل وسیع، بلند اور ہمہ گیر ہوتا ہے ان باتوں کو ایک اور ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان حادثات و واقعات کو اپنی قوتِ متخیلہ اور دلکش اندازِ بیان کے سہارے جب آرٹ اور ادب کا رنگ و روپ چڑھا کر پیش کرتا ہے تو اس کی دلنشینی، جاذبیت اور ندرت قابلِ دید ہو جاتی ہے۔

پلاٹ میں جو واقعات بیان کئے جائیں ان میں کشش ہونی چاہیئے۔ یہ واقعات چاہے فرضی ہوں، شنیدہ و دیدہ ہوں یا عام زندگی سے مستعار، ان میں سے صرف ضروری اور دلچسپ واقعات کو ہی منتخب کرکے ایک سلسلہ میں باندھنا چاہیئے۔ خاص طور پر ان پہلوؤں پر زور دے کر انھیں تاریکی سے باہر لانا چاہیئے جن پر عام قاری کی نگاہیں نہ پڑ سکی ہوں۔ دنیا میں کوئی واقعہ ایسا نہیں جو بالکل نیا کہلائے جانے کا مستحق ہو اور نہ کوئی افسانہ نگار ایک نادر خیال یا واقعہ کو پیش کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ منتخبہ واقعات میں ندرت اور تازگی اس حد تک موجود ہو کہ قاری کی توجہ فوری طور پر اپنی طرف کھینچ سکے۔ ابتدائیہ میں اتنی کشش

ہونی چاہیئے کہ قاری ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد اسے ادھورا چھوڑنے پر تیار نہ ہو۔ صالحہ عابد حسین کے ایک افسانے "لکشمی" کا ابتدائیہ ملاحظہ فرمائیے۔ اسے پڑھتے ہی کرید پیدا ہوتی ہے اور قاری آگے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"نام"

"لکشمی!"

"کتنے دن کا ہے؟"

"تین مہینے کا!"

"بچے کے باپ کا نام؟"

"بائی — ایک ہو تو بتاؤں"

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ آنکھوں سے جیسے چنگاریاں اڑ رہی تھیں اور چہرے پر بیک وقت غم، غصّے، طنز، حقارت، بے بسی اور مجبوری کے جذبات ناچ رہے تھے۔ کوئی گلاب کو دونوں ہتھیلیوں سے مسل کر پھینک دے، کوئی تاج محل کو مسمار کر دے! کوئی میڈونا کی تصویر پر گندے رنگ اچھال دے؟ لکشمی کے حسن کو بھی اسی طرح مسخ کر دیا گیا تھا" (افسانہ لکشمی)

ان چند مختصر سے مکالموں سے افسانے کا موضوع ذہن میں آ جاتا ہے۔ اس کے آگے کے جملے افسانے کے مرکزی خیال کو واضح کر دیتے ہیں۔ دیگر خواتین قلم کاروں کی طرح ان کا قلم بھی گھریلو موضوعات، نسوانی مسائل اور خانگی زندگی کے حصار سے بہت کم باہر نکل پاتا ہے۔ زیادہ تر کردار متوسط طبقے سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اور چونکہ خود افسانہ نویس کا تعلق بھی اسی طبقہ سے ہے اس لئے غایت درجہ اصلیت نظر آتی ہے اور اس سے بعض معترضین کو یہ کہنے کا موقعہ مل گیا کہ ان کے ہاں "مثالی" قسم کے کردار پائے جاتے ہیں۔

"ان کہانیوں میں آپ کو اپنے اور میرے ماحول کی عکاسی نظر آ سکتی ہے۔ انسانی خصوصاً نسوانی ولولوں کی دھڑکن سنائی دی جا سکتی ہے۔ ان کے دکھ، سکھ، ان کی محرومیاں، کامرانیاں ان کی خصوصیات اور کمزوریاں آپ چاہیں تو اس تصویر میں دیکھ لیں گے"

(ص ۹-۸ - دیباچہ - درد و درماں)

صالحہ عابد حسین کے ہاں یادوں کی بڑی اہمیت ہے۔ یادیں ان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے اندر خود ان کی ذاتی زندگی کی طرح ان کے بہت سے افسانے یادوں کے سائے میں تکمیل کی منزل تک پہنچتے ہیں اور عام طور پر ان میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال ملتا ہے۔ "محرومی، یادوں کے کھنڈر، بھولی یاد ہمرے بھیا دیوتا، درد کا رشتہ، زخم و مرہم (درد و درماں) ان مٹ نقوش (ساز ہستی)۔ ہمدرد اور بابا دنو نگے) وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن کے کرداروں کے لئے یادیں ہی قیمتی سرمایہ ہیں — تقریباً ان تمام ہی کرداروں پر ان کے کسی نہ کسی عزیز یا شناسا کی گہری چھاپ نظر آتی ہے اور بعض کرداروں سے تو خود مصنفہ کے ذاتی رنج و' مترشح ہوتے ہیں۔

مصنفہ کے ابتدائی مجموعوں کے افسانوں خصوصاً خان بہادر، یہ ہندوستان، تجدید الفت اور نراس میں آس کے چند افسانوں میں وحدت تاثر کا فقدان نظر آتا ہے۔ ان افسانوں کی بے

طوالت، واقعات کی ترتیب اور اس میں نیز تسلسل اور اصلاحی پیغام کی بھرمار، وحدت تاثر کو بُری طرح متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً "یہ ہندوستان" میں مسائل کی اس قدر بھرمار ہے کہ ان سب کے سدباب کے لئے مصنفہ کوئی واضح حل پیش کرنے میں ناکام نظر آتی ہیں "تجدید الفت" میں سہیل اور نصرت کی شادی کے بعد کشمیر میں چھٹیاں گزارنے کے وقفہ کو بہت طویل تبلادیا گیا ہے۔ ان کی باہمی گہری محبت کو تبلانے کے لئے اختصار سے بھی کام لیا جاسکتا تھا — یہ افسانہ شادی شدہ ازدواجی زندگی کی الجھنوں اور محبت کی نزاکت کو بطور خاص پیش کرتا ہے۔ زندگی کے سرد وگرم کا مقابلہ کرنے کے بعد سہیل اور نصرت کے درمیان ناچاقی، نفرت اور بدگمانی کی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے اور یہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ مگر قاری افسانہ پڑھنے کے بعد اس تاثر کے علاوہ اور بہت سے تاثرات سے دوچار ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی تاثیر اور کامیابی مشکوک ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر "نمونہ سفر"، "لیلیٰ یا سرلا" "شماتت ہمسایہ" "ہمدرد" "سہاگ رات" "گرم شال" "وہ رکشا والا" اور "ایک سوال" یہ افسانے لئے جائیں تو یہ پڑھنے والے کے ذہن پر صرف ایک اثر چھوڑتے ہیں اور یہ خوبی افسانہ کی کامیابی کی ضامن کہی جاسکتی ہے۔

ان میں سے کچھ افسانے ڈرامائی موڑ لے کر ایک حیران کن طریقہ پر اختتام کو پہنچتے ہیں "نمونہ سفر" "لیلیٰ یا سرلا، محبت کے کھیل" اس کی مثالیں ہیں۔

درد و الم، محرومی اور یاسیت کے بعد صالحہ عابد حسین کے افسانے محبت کے مختلف روپوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان میں اہم ترین جذبہ ممتا کا ہے۔ اس کے علاوہ پاکیزہ محبت کے سارے ہی رنگ الگ الگ افسانوں میں بکھرے ہوتے ہیں۔ بہت کم کردار رومانوی محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں اور خود مصنفہ بھی بعض معترضین کی اس رائے سے بے خبر نہیں اس لئے شروع میں ہی اس کی طرف اشارہ کردیا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ چٹپٹا عشق، نہ وہ
رومانیت جو دنیا ومافیہا سے بے خبر
بنادے اور نہ اور نہ جنسیات، نہ
عریانی، نہ بے باکی۔ بھلا ان خوبیوں
کے بغیر کوئی کہانی مقبول کیسے ہوسکتی
ہے؟" (ص۸ (درد و درماں۔ دیباچہ)

سستی جذباتیت اور عریاں نگاری کے باوجود کوئی افسانہ کس طرح مقبول عام ہوسکتا ہے اور اس کے کردار لازوال حیثیت کے حامل ہوجاتے ہیں اسے دیکھنا مقصود ہو تو مصنفہ کے افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانے متوسط طبقے خصوصًا عورتوں کے مسائل، ان کی حالتِ زار، ان کے افکار اور سماج میں ان کے مقام، ان کی ذمہ داریوں ان کی فطرت وغیرہ کو بحسن وخوبی پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی اپنی پوری تابانی اور گوناگونی کے ساتھ تڑپتی پھڑکتی نظر آتی ہے اور زندگی کے حقائق پر گہری نظر اور عمیق مشاہدے نے ان موضوعات کو دل پذیر بنادیا ہے۔

افسانہ میں واقعات اور ان کی فنکارانہ ترتیب کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعات کن لوگوں کو پیش آگے؟ افراد کے بغیر واقعات کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اہمیت کے اعتبار سے کردار، مرکزی، معاون کردار یا غیر ضروری ہوسکتے ہیں۔ چونکہ مختصر افسانہ اختصار وایجاز کا ایک مکمل نمونہ ہوتا ہے ایک مختصر سے وقفہ میں افسانہ نگار کو قاری تک اس تاثر کو ارسال کرنا مقصود ہوتا ہے لہٰذا اس کے لئے وہ انتہائی ضروری واقعات کی ایک کڑی تیار کرکے اس میں صرف انہی افراد

کو داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے جو اس کے مقصد کے
حصول کے لئے کارآمد اور ناگزیر ہوں ۔ اگر کردار
غیر ضروری اور فاضل ہوں تو پھر اختصار اور وحدت
تاثر دونوں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔

کرداروں کے تعارف کے مختلف طریقے ہیں
مگر افسانوں میں ڈرامائی پیش کش زیادہ مقبول ہے
اس میں کرداروں کا تعارف بتدریج نہیں کروایا جاتا
جو کہ ناول کا خاصّہ ہے ۔ نیز افسانوں میں کرداری ارتقا
بھی تبلایا جانا ممکن نہیں ۔ البتہ کسی خاص کردار (بالخصوص
مرکزی کردار) کی سیرت کی کچھ اہم تبدیلیاں ضرور تبلائی
جا سکتی ہیں کیونکہ بعض اوقات یہی تبدیلی افسانے کو
آگے بڑھاتی ہے یا اسے نیا رُخ عطا کرتی ہے ۔

کرداروں کی آپسی گفتگو اور انکا باہمی
میل جول بھی کردار نگاری کے ضمن میں آتا ہے ایک
مشاق فنکار اپنی شخصیت کو پس پردہ لائے بغیر
کسی کردار کے اوصاف غیر محسوس طریقہ پر قاری کے
ذہن نشین کروا دیتا ہے اگر وہ کرداروں کا تعارف
بیانیہ کا سہارا لے کر کروائے تو خواہ مخواہ اس کی
شخصیت افسانہ میں در آتی اور اسے معیوب سمجھا جاتا
ہے ۔

آج کی کہانیوں میں فرضی اور غیر حقیقی کرداروں
کے بجائے عام انسانوں کے کردار پیش کئے جاتے ہیں
ان کرداروں کا تعلق سماج کے ہر طبقہ سے ہوتا ہے ان
میں بشریت پوری طرح موجود ہوتی ہے یعنی وہ نہ تو
سراسر خیر کا مجموعہ ہوتے ہیں اور نہ ہی اول تا آخر برائیوں
کے مجسمے ۔ اسی کو ہم حقیقت نگاری سے تعبیر کر سکتے
ہیں ۔

صالحہ عابد حسین کے پانچوں مجموعوں میں بکھرے
افسانوں کے سینکڑوں کرداروں کی فہرست میں
کئی درجن کردار ایسے ہیں جنہیں فراموش کرنا ممکن
نہیں ۔ یہ کردار یا تو سماج کے نچلے طبقے سے لئے گئے
ہیں یا درمیانی طبقہ سے ۔ ان میں امیرزادیاں ، اور
بڑے گھرانے کی خوبصورت تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل
لیڈیز بھی نظر آجاتی ہیں اور نچلے طبقے کی مریم ، رانی ،
پھول رانی (مہترانی) اور بھکارن جیسے کرداروں
کی کمی بھی نہیں ۔ اگر اونچے طبقے کے مرد جیسے خان بہادر
ہیں تو ایک رکشہ والا ، ایک قلی اور دھوبی کو بھی پیش
کرکے انھیں لازوال شہرت کا حامل بنا دیا ہے
غرضیکہ صالحہ عابد حسین کے کردار مرکزی ہوں یا
ثانوی ، وہ افسانے کے ارتقا اور تکمیل میں بڑے
مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔ خالہ انّو کا خاکہ ملاحظہ
فرمائیے ۔

" اپنے نام ہی کی طرح وہ بے حد
مختصر تھیں ۔ کوئی سوا چار فٹ کا
قد ، دبلی ایسی کہ پھونک مارو تو اُڑ
جائیں ۔ سوکھے جھریوں بھرے
ہاتھ پیر ـــــ البتہ آنکھیں بہت
بڑی اور چمکدار تھیں ..... پتلی
چونچ جیسی ناک بھی خاص چیز تھی ۔
وہ ہمیشہ سفید موٹی ململ کا ڈوپٹہ
کُرتا اور چھینٹ کا تنگ مہری کا
پھنسا ہوا پاجامہ پہنتیں ۔ سفید
لٹیں ایسی جمی ہوتی کہ کیا مجال ایک
بال ادھر سے ادھر ہو جائے ۔ بیچی
ایڑی کی جوتیاں سر پر ایک کالا رومال
بندھا رہتا ۔ انگلیوں کے پوروں
اور پاؤں کے ناخنوں پر مہندی
اکثر لگاتی تھیں ۔ "

(ص ۱۴۴ ۔ افسانہ خالہ انّو ۔ (درد و درماں)

صالحہ عابد حسین کے نہ صرف افسانوں اور ناولوں

کے کردار اکثر وبیشتر نوجوان نہیں بلکہ عمر رسیدہ
اشخاص ہوا کرتے ہیں یا آپا (افسانہ آپا)۔ نصیبہ بیگم
(افسانہ نصیبہ بیگم)۔ خالہ اتو (خالہ اتو) جج صاحب
(ہمسفر) رکشے والا (افسانہ وہ رکشہ والا۔ رفو
(انمول موتی) وغیرہ کے مرکزی کردار معمر افراد ہیں جبکہ
آزاد (ملاپ) ممتا اور راکھی (ہمدرد) کے روپ میں
بچوں کو مرکزی کردار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔
اس سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ صالحہ بیگم کے
ہاں نوجوانوں کے کردار عنقا ہیں۔ موقع کی مناسبت
سے نوجوانوں کے کرداروں کی بھی شمولیت کی جاتی
ہے "سہاگ رات"، کے راموا ور لاجو "خوشی کی
چند گھڑیاں"، کا چھوٹے خاں "ایک عالم ہے اسی
رنگ میں"، کے نزہت اور خالد "یہ نئی لبستی"
کی لبستی "رقاصہ"، کی سرسوتی۔ لیلیٰ یا سرلا"، کی سرلا۔
"محبت کے کھیل"، کے نیلوفر اور پرویز چند ایسے
کردار ہیں جو نوجوانی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کردار منفرد
کیرکٹر کے مالک ہیں۔ ان نوجوانوں کی محبت ہوا وہوس
کی آلائشوں سے پاک ہے۔

افسانوں کا کینوس محدود ہونے کے سبب چند
کرداروں کی تکرار نظر آتی ہے آپ کے ایک ناول پر
تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا تھا کہ اس میں
بیماریاں ہیں، موت ہے، تعلیم کی اہمیت ہے اور اس
رائے سے اختلاف کی گنجائش کم ہے۔ یہ کردار بھلے ہی
متنوع نہ ہوں مگر یہ فطری اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔
اس کی وجہ افسانہ نویس کا گہرا مطالعہ، مشاہدہ اور وسیع
تجربہ ہے۔ کرداروں کی بنیاد سنی سنائی یا پڑھی پڑھائی
باتوں پر نہیں رکھی جاتی مگر ساتھ ہی ——

"عورت اگرچہ محدود زندگی دکھاتی
ہے مگر اس کا مشاہدہ گہرا ہوتا ہے"،

سماجی کا بھی اور کردار کا بھی۔ اس لئے
جیتے جاگتے کردار آپ کو عورت
ادیب کے یہاں زیادہ ملیں گے۔"

(ص ۱۶ صالحہ عابد حسین۔ انٹرویو، ماہنامہ
شاعر شمارہ ۶-۷ سنہ ۱۹۷۶ء)

کردار اور واقعات میں اولیت کسے دی جائے
یہ چیز افسانہ میں بحث کا موضوع بنی رہی ہے۔ زیادہ تر
افسانہ نگار اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کردار اور
واقعات افسانہ کی تکمیل اور کامیابی کے لئے ضروری
ہیں تو کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا اس کی مقبولیت اور
تاثیر کو خطرہ میں ڈالنے کے مترادف ہے لہٰذا دونوں پر
یکساں زور اور توجہ دی جائے۔ صالحہ عابد حسین کے
زیادہ تر افسانوں میں یہی خوبی جلوہ گر ہے۔ اگر ان کے
افسانے "فنکار۔ کایا پلٹ۔ لکشمی۔ خالہ اتو۔ وہ رکشا
والا۔ نصیبہ بیگم۔ ایک سوال وغیرہ میں مواد سے زیادہ
کرداروں پر زور ملتا ہے تو "یہ نئی لبستی۔ گرم شال۔
شماتت ہمسایہ۔ لیلیٰ یا سرلا۔ محبت کے کھیل" اور
"نراس میں آس"، کے سبھی افسانوں میں موضوع کی
طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

افسانہ کے کرداروں کو قاری سے متعارف
کروانے کے لئے مکالموں کا سہارا لیا جاتا ہے ایک
کامیاب افسانہ نگار تشریحی طریقہ کے بجائے خود کرداروں
کی باہمی گفتگو، حرکات وسکنات کی مدد سے ان کے اوصاف،
طرز گفتگو، طرز فکر وغیرہ کو پیش کرتا ہے۔ مکالموں کے
بغیر افسانہ مفلوج سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

مکالمے ہی کرداروں کے متعلق معلومات بہم
پہنچاتے ہیں، ان کے انفرادی پیکر تراشتے ہیں اور
کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ دراصل افسانہ کو یہ جز
ڈرامہ کی دین ہے۔ ہر شخص کا ایک مخصوص لہجہ، انداز
گفتگو اور تکیہ کلام وغیرہ ہوتا ہے جو اسے دوسروں
سے ممتاز کرتا ہے۔ پس افسانہ نگار کو ان حقائق کی

طرف سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے نیز ہر کردار کو اپنے
سن، مرتبہ، طبقہ، موقع و محل اور اس سماج میں مروجہ عقائد
کا بھی آئینہ دار ہونا چاہیئے دوسرے لفظوں میں اسے غیر
فطری اور بناوٹی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر شخص دوران
گفتگو ایک مخصوص معیار کی زبان استعمال کرتا ہے لہذا
افسانہ نگار کو نہ تو اس گفتگو کو من و عن نقل کرنا مناسب
ہے اور نہ ہی اسے ادبی اعتبار سے اتنا بلند کردے کہ
تصنع مترشح ہو بلکہ مکالمے اس طرح ادا کروائے جائیں
کہ ان میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا ہو جائے اسے ہم یوں
بھی کہہ سکتے ہیں کہ مکالمہ میں حقیقت اور اصلیت کے
توازن کو قائم رکھا جائے۔ اگر ایک بچہ فلسفہ کے مسائل
پر موشگافیاں کرے یا ایک گنوار، زندگی کو حکیمانہ
نظروں سے دیکھے یا ایک دیہاتی کو فصیح زبان بولتا ہوا
دکھلایا جائے تو اس سے حقیقت نگاری کا متاثر ہونا
ناگزیر ہے۔ صالحہ عابد حسین کے مختلف افسانوں کے
ان مکالموں سے جہاں کرداروں کی انفرادیت ظاہر ہوتی
ہے وہیں مصنفہ کی قادر الکلامی کا بھی اظہار ہوتا ہے
کہ ان کا قلم موقع محل اور کردار کی ذہنی سطح اور علمی لیاقت
کی مناسبت سے مکالمے لکھ سکتا ہے۔

ایک قدامت پرست، تجربہ کار اور متفکر ماں
کی پریشانی ان جملوں سے ادا ہوتی ہے، یا نہیں۔
دیکھئے۔

"اری کمبختی ماری آتے آتے دن دہاڑے
نہیں تو رات ہو جائے گی۔ اس شام ہی
سے سناٹا ہو جاوے ہے ـــــ
اس نگوڑی نئی دہلی میں تو ـــــ
نہ جانے ـــــ سجاڑیں جا ـــــ
وہ کون تڑپ رہا ہے تجھے ساتھ
لے جانے کو ـــــ وہ خود نہیں
تھوکتا تجھ پر"

ایک مغرب زدہ لڑکی کا انگریزی آمیز لہجہ
دیکھئے۔

"اپی تو مجھے امریکہ بلا رہی ہیں۔
شامی بھیا نے بھی لکھا ہے
مگر ـــــ مائی مدر از ال ـــــ
اینڈ یو نو ـــــ آئی ایم اے ....
میرا مطلب ہے مجھے ان سے محبت
ہے"

"ہمرے بھیا دیوتا" میں ایک دیہاتی کا
بین سنئے۔

"ہمرے نصیب ہی کھوٹے ہیں۔ ہم
جانت تھے بھیا آگئے ہمرے نصیب
پھر گیو۔"

"یہ نئی بستی" میں جب بسنتی کی ماں اس کی
پٹائی کرتی ہے اور بیٹی چیخ چیخ کر سارے پاس پڑوس
والوں کو جمع کر لیتی ہے تو مختلف گروہ کے افراد کس
طرح اپنی اپنی سوجھ بوجھ طرز فکر اور "ہمت" کے مطابق
اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو یہ مکالمے ان کی انفرادیت
کو واضح کر دیتے ہیں۔ مکالموں کی یہی خوبی صالحہ عابد
حسین کے بیشتر افسانوں میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

ہماری زندگی میں ایسے بہت سے واقعات رونما
ہوتے رہتے ہیں جو دلچسپی کا سبب بن سکتے ہیں مگر ہر
شخص انھیں ایک دلنشین پیرائے میں دہرانے پر
قادر نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ کسی واقعہ یا پلاٹ
کو فنی کامیابی کے ساتھ پیش کرنا بھی ایک مشکل کام
ہے۔ افسانہ نگار کو اختصار کے پیش نظر پورے
واقعہ کی تصویر اشارہ سے کھینچنی ہوتی ہے جس کے لئے
اسے بڑی احتیاط کے ساتھ لفظوں کا انتخاب کرنا پڑتا
ہے۔ لفظوں کی دروبست، متوازن جملے، فقروں کی
چستی اور برجستگی اور اسی کے ساتھ روانی، ندرت اور

دلکشی پر بھی نظر رکھنی ہوتی ہے تاکہ مطلوبہ تاثر قاری تک پہنچ سکے۔

ایک بھائی کی موت پر دوسرے بھائی کے کرب اور مصیبت کا بیان دیکھئے:

"بڑی مشکل سے اس نے آنکھیں کھولیں!
چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں، مسجد
سے دادا میاں کی اذان کی دردناک
پرسوز آواز بلند ہو رہی تھی۔ آسمان
پر ننھی ننھی چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ
مغرب کی سمت غائب ہو جاتے۔ اس
کے بکھرے بکھرے خیالات کی طرح
بادلوں کے آوارہ ٹکڑے بے مقصد،
بیکار ادھر ادھر دوڑ رہے تھے"

صالحہ عابد حسین کو زبان دانی ورثہ میں ملی ہے ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے۔ پھر شوہر بھی ملا تو ایک مانا ہوا ادیب، مستند مترجم اور کہنہ مشق استاد۔ زبان اور قوتِ بیان پر پوری قدرت موجود ہے۔ زبان بڑی سیدھی سادی، رواں دواں، شگفتہ اور برجستہ ہوتی ہے۔ لہجہ میں نسوانی جھلک ملتی ہے۔ عورتوں کی کہاوتوں، محاوروں کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ عبارت میں پانی پت اور دہلی، دونوں کی زبان کا لطف ملتا ہے۔ کہیں کہیں طنز، مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے چند مثالیں دیکھئے

"بھئی یہ بڑے آدمی ہیں۔۔۔۔۔
ان کے پاس سامان بہت سا ہے
اسی لیے چھوڑ آتے ہیں لے جاتے ہیں۔
اور ان لوگوں کو پرواہ بھی نہیں
ہوتی۔ ہم غریبوں کے ہاں جاتے ہیں

کیا لیں آکر؟ ایک کافی موٹی مرغی نے
جو اپنا ہزاروں کا زیور ٹرنک میں
اور قیمتی کپڑا بکسے میں رکھا کرتی تھی
رشک آمیز طنز فرمایا

اور جہاں تک سوز و گداز کا تعلق ہے یہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ ساری ہی چیزیں مل کر اسلوب یا تکنیک کہلاتی ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے افسانوں کی تکنک کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دلنشینی و دلکشی پائی جاتی ہے اور کہیں بھی فنی اعتبار سے جھول نظر نہیں آتا۔

ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں زندگی کی حقیقی تصویریں دکھلائی جاتی ہیں اس لیے اگر اسے زندگی سے مطابقت رکھنی ہو تو اس میں وہی باتیں، واقعات اور حقائق کو پیش کیا جانا چاہیئے جو ہمارے گرد و پیش میں ہوتی رہتی ہیں۔ ہر فنکار زندگی سے متعلق ایک انداز فکر اور نظریہ رکھتا ہے جسے ہم نظریۂ حیات سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اس کی پسند یا ناپسند غیر شعوری طور پر اس کی تحریروں سے جھلک اٹھتی ہے۔ افسانہ نگار پر لازم ہے کہ وہ زندگی سے متعلق اپنے نظریات، اپنا پیام قارئین تک پہنچائے مگر اس کے لیے فن کو قربان کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ فلسفۂ حیات کی پیش کش اس کی تشریح و توضیح اس کا ثانوی مقصد ہونا چاہیئے نیز یہ ملحوظ رہے کہ اس کا افسانہ وعظ و نصیحت اور پند و ہدایتوں کا ایک پلندہ بن کر نہ رہ جائے یا اس کا کھلا پروپگنڈا۔ "نراس میں آس" کے سارے افسانے اس دور کی یادگار ہیں جب برصغیر کا ہر ذکی الحس شخص اس المیہ اور اس کے خونیں عواقب سے

متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ ہنگامی ضرورتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر یہ افسانے تخلیق کئے گئے جن میں اصلاحی، اخلاقی اور درسی پہلو غالب نظر آتا ہے۔ ناصح اور مصلح صالحہ، فنکار صالحہ پر غالب آ گئی ہے اور ہر جگہ مقصدیت کارفرمائی نظر آتی ہے چنانچہ ترا اس میں اس کے افسانے ہنگامی ادب کی طرح ایک مختصر عمر پاکر اپنی اہمیت کھو بیٹھے۔

جہاں تک صالحہ عابد حسین کے نظریۂ حیات کا سوال ہے تو اس کے واضح نقوش ان پانچوں مجموعوں کے افسانوں سے بالکل عیاں ہیں۔ ان کے افسانے عشق و محبت کی مدہوش کن داستانوں، عریانیت، سستی جذباتیت سے پاک ہوتے ہیں۔ ان میں محبت ضرور ہے مگر وہ محبت نہیں جو صرف مرد اور عورت کے بیچ ہوا کرتی ہے یا جس کی اساس ہوا و ہوس اور جنسی تسکین پر ہو۔ ان کے افسانوں میں محبت ایک وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہے جہاں ماں باپ کو اپنی اولاد سے، بھائی کو بہن سے، نوکر کو آقا سے، وطن سے، ہم وطنوں سے حتیٰ کہ بے زبان جانوروں سے محبت ہوتی ہے اور ایسی محبت کو زیادہ تر افسانہ نگار، ناول نویس اور شعرا قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس محبت کے ڈانڈے آگے چل کر عشق حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ افسانہ نویس کا سماجی شعور گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہے اپنے مختلف افسانوں کے ذریعہ انھوں نے تعلیم کی اہمیت، اعلیٰ انسانی اوصاف، عورت کے حقوق و فرائض۔ سیاسی کروٹ، جدید ہندوستان اور اس کے مسائل وغیرہ کی اہمیت اور اس کی توضیح پر زور دیا ہے۔

مانع عمل

سو قسم کے خدشات سما جاتے ہیں دل میں
آتا ہے مرے سامنے جس وقت کوئی کام
آگے نہیں بڑھتا ہیں تفکر کی حدوں سے
افکار بچھا دیتے ہیں ہمت کے لئے دام
خطرات کا احساس عزائم کا ہے دشمن
عقدوں کو یہ سلجھا نہیں سکتا کبھی حل تک
آغاز میں انجام نظر آتا ہو جس کو
وہ فکر کو پہنچائے گا کس طرح عمل تک

تمیر پرواز

حصار

پھنس گیا ہے "میں" کے گھیرے میں دماغ
مل نہیں پاتا تصور کو فراغ
ہو گیا ہے اس کی قدغن سے یہ حال
جا نہیں سکتا کسی جانب خیال
اس کے باعث فہم ہے مجبور سی
قوت افکار ہے محصور سی
ٹوٹ جائے کاش اس "میں" کا حصار
ذہن کو میرے ملے راہِ فرار

رفعت نواز

دُکھ کی بات

موٹر سائیکل تیز رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ میں بار بار رفتار کم کرنے کی تاکید کرتا لیکن مشتاق میری بات ہنسی میں اڑا دیتا۔ جب کوئی موڑ آتا، ٹرک یا بس سامنے آتی دکھائی دیتی تو میرے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور انہونی کے خوف سے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ مشتاق احتیاط سے موٹر سائیکل آگے نکال لے جاتا تو میں محبت سے اس کا کندھا تھپتھپاتا۔ سڑک کھلی اور صاف دیکھ کر وہ اسپیڈ بڑھا دیتا اور میں ذرا سا اچک کر اسپیڈ میٹر دیکھنے لگتا۔ سوئی ساٹھ اور ستر کے درمیان ناچ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں ہوا سوئیاں سی چبھو رہی تھی اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مشتاق کا شرٹ پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور پسینے کی بو کے ساتھ اس کے نوجوان جسم کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ اس کے بڑے بڑے بال ہوا کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ جب کوئی خطرناک موڑ آتا تو وہ جھٹکے سے بریک لگاتا اور مجھے دھکا سا لگتا اور میں اس کی کمر کے گرد ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے سر اس کی پیٹھ سے لگا دیتا۔ تحفظ کا احساس ہوتا۔

سوچتا ہوں یہ لین دین کا سلسلہ بھی عجیب ہے۔ جب مشتاق چھوٹا اور کمزور تھا تو کسی چیز سے ڈر کر وہ مجھ سے لپٹ جاتا تھا اور خود کو محفوظ تصور کرتا تھا اور اب میں اُسے اپنا محافظ سمجھ رہا تھا۔ یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ خواہ مخواہ مشتاق کے ساتھ آ گیا، اکیلا بس پر چلا آتا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں عمدہ نگر پہنچ جاتا اور شادی میں شرکت کر کے دوسرے دن لوٹ آتا لیکن شاید میں مشتاق کو اپنے ماضی اور اپنی یادوں میں بھی شریک کرنا چاہتا تھا۔ برسوں سے اُسے اپنے لڑکپن اور نوجوانی کے قصے سناتا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری بات سُنے۔

عمدہ نگر میں میرے لڑکپن کے چار سال گزرے تھے۔ پانچویں سے آٹھویں درجہ تک وہیں کے ہائی اسکول میں پڑھائی ہوئی تھی۔ ابّا جان عدالت میں ناظر تھے۔ ندی کے کنارے قاضی صاحب کے مکان میں ہم لوگ رہتے تھے۔ مکان کے پچھواڑے مٹی کی دیواروں کا کچا احاطہ تھا جس میں آم، املی، اور امرود کے پیڑ تھے اور یہ احاطہ قاضی کا باغ کہلاتا تھا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد ہم لوگ اسی احاطے میں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ لٹو گھماتے تھے اور درختوں پر چڑھ کر کچے امرود، کیریاں اور املیاں کھاتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں ندی میں ڈبکیاں لگاتے تھے اور گیلی ریت پر لیلیں لگاتے تھے۔ ان بھلے دنوں کی یاد برسوں گزر جانے پر بھی تازہ تھی۔ پھر ابّا جان کا تبادلہ ضلع کی عدالت میں ہو گیا تھا۔ شہر آنے کے بعد بھی سال میں دو تین بار عمدہ نگر جاتا اور دوستوں سے مل آتا تھا۔ میٹرک پاس کرتے ہی مجھے مرکزی حکومت کے محکمے میں ملازمت مل گئی اور بڑے بڑے شہروں میں تبادلے ہوتے رہے۔ شادی ہوئی، بچے

ہوتے اور عمدہ نگر سے تعلق ٹوٹ گیا۔ کبھی کبھی خاں صاحب زمیندار کے خطوط آجاتے تو لڑکپن کی یادیں ذہن میں انگڑائیاں لیتیں، دوستوں سے ملنے کو دل مچلتا لیکن فاصلے اور ذمہ داریوں کا احساس پیروں میں زنجیریں ڈال دیتا تھا۔ چوبیس سال بعد اپنے شہر میں تبدیل ہو کر آیا تھا اور خاں صاحب سے بھی بیس سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے لڑکے کی شادی کا دعوت نامہ دینے آئے تھے۔ ان سے برسوں بعد مل کر خوشی تو ہوئی تھی لیکن اس احساس سے دکھ بھی ہوا تھا کہ ہم لوگ تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بالوں میں سفیدی، آنکھوں کی جوت میں کمی، قویٰ کا اضمحلال اور مزاج کا چڑچڑاپن یہ سب نشانیاں نہ چاہتے ہوئے بھی منوا لیں کہ رخشِ عمر تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہے اور جوان ہوتے بچوں پر حکمرانی غیر محسوس طریقے پر کم ہوتی جا رہی ہے لیکن یہ خواہش کمزوری بنتی جا رہی ہے کہ اپنی پسند ناپسند بچوں میں منتقل ہو جائے۔

خاں صاحب کے لڑکے کی شادی میں شرکت کے بہانے برسوں بعد عمدہ نگر جانے کا موقع مل گیا تھا اور پرانی یادوں کا دفتر کھل گیا تھا۔ ماضی کے پارینہ اوراق یکجا کر کے مشتاق کو دکھانے کا جذبہ جاگا تھا۔ یہ آرزو بھی تھی کہ مشتاق بھی اتنا ہی جوش و خروش دکھاتے ہوئے میری یادوں میں شریک ہو جائے مگر اس کی سرکشی خوفزدہ بھی کر رہی تھی۔

عمدہ نگر میں لڑکپن کے ساتھیوں سے مل کر خوشی سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ وہ لوگ وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے تھے اور اپنے بیٹوں کے قابو میں تھے اور کھل کر بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خاں صاحب نے ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کی ہیئت بالکل بدل گئی تھی پہلے صرف ایک سوٹ ہوا کرتا تھا۔ دو بار ابّا جان کے ساتھ بڑے صاحب کی آمد پر ریسٹ ہاؤس جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ برآمدے میں بید کے مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ اندر والے ملاقاتی کمرے میں صوفہ سیٹ، فرش پر موٹی دری، اور چھت پر چرخ چوں کرتا پنکھا۔ اندر خواب گاہ میں ساگوان کا بڑا پلنگ، تپائی کے ساتھ بید کا مونڈھا اور ایک کونے میں میز کرسی۔ اب تو ریسٹ ہاؤس میں چار سوٹ تھے۔ چم چم کرتا فرنیچر تھا۔ پلنگوں پر فوم کے گدے تھے۔ ٹائیلٹ میں فرش اور دیواروں پر ٹائیلز لگے تھے۔ کمروں میں کولر لگے تھے اور فرش پر دبیز قالین بچھے تھے۔ پہلے ریسٹ ہاؤس کے احاطے کے باہر صرف ہائی اسکول کی عمارت تھی اور دور دور تک ببول، نیم اور املی کے پیڑ تھے۔ اب تو کئی عمارتیں بن گئی تھیں، عمدہ نگر چھبیس سال میں بہت بدل گیا تھا۔ کچے کھپریل اور ٹین کی چھت والے مکانوں کی جگہ سمنٹ کنکریٹ کے دو منزلہ سہ منزلہ مکانات بن گئے تھے۔ بس اسٹینڈ سے چوک تک سڑک کے دونوں کناروں پر دوکانیں لگ گئی تھیں۔ دو سینما تھیٹر کھل گئے تھے۔ کئی گھروں میں ٹی۔ وی، اور ویڈیو بھی آ گئے تھے۔ یہ تبدیلیاں دیکھ کر حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوا۔ کچھ چھن جانے کا احساس بھی ہوا۔ یہاں بھی شہروں والی بھاگ دوڑ تھی فرصت کم اور کام زیادہ تھے اور کم سے کم وقت میں بہت کچھ کر لینے کی خواہش تھی۔

مشتاق عمدہ نگر کو جدت میں رنگا دیکھ کر بہت خوش ہوا "اب ہمارے دیہات اور قصبات بھی شہروں جیسے ہوتے جا رہے ہیں۔ عصری زندگی کی ضروریات کی سب ہی چیزیں یہاں بھی دستیاب ہیں۔ رفتہ رفتہ شہروں اور قصبات کی تفریق بھی مٹ جائے گی اور شہر جانے کا لوبھ بھی ختم ہو جائیگا۔" مشتاق بڑے جوش سے کہہ رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا لیکن اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ رہا تھا اور اپنی ہار کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

دوسرے دن مشتاق کو سویرے جگایا تو وہ چڑ گیا۔ اُسے ریسٹ ہاؤس کے پیچھے والی پہاڑی کی سیر کروانا چاہتا تھا۔ اُسے بتانا چاہتا تھا کہ چھٹی کے دن ہم چار پانچ ساتھی کیسے پہاڑی پر چڑھتے تھے۔ بیر کے درختوں پر چڑھ کر بیر کھاتے تھے۔ تھک کر چشمے کے کنارے بیٹھ کر مرچ پیاز اور گڑ کے ساتھ باجرے کی روٹی کھاتے تھے۔ دوڑیں لگاتے اور کشتیاں لڑتے تھے۔ مشتاق میرے ساتھ سیر کے لئے نکل تو آیا تھا لیکن اُسے میری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا لڑکپن بڑے شہروں میں گزرا تھا۔ جہاں چھٹی کے دن کسی دوست کے یہاں یکجا ہو کر کیرم بورڈ، ٹیبل

ٹینس اور تاش کھیلتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر فلم یا کرکٹ میچ دیکھتے ہیں۔ اور سال دو سال میں ایک بار کسی ہل اسٹیشن چلے جاتے ہیں۔

ہم سیر کر کے لوٹے ہی تھے کہ خاں صاحب کا ملازم تانگہ لے آیا۔ نو بجے عقد تھا اور آٹھ بجے دولہا کے ساتھ گھر سے نکلنا تھا۔ خاں صاحب کی حویلی کے سامنے والے میدان میں بڑا شامیانہ لگا یا گیا تھا کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ ڈیڑھ دو سو آدمی جمع تھے۔ خاں صاحب شلوار پر سرج کی شیروانی پہنے اور طرے دار پگڑی باندھے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ مجھے لپٹا کر انھوں نے زور سے بھینچا۔ پھر مشتاق کو لپٹا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، اور شیروانی کی جیب سے مٹھی بھر بادام نکال کر اسے تھما دیئے۔ مشتاق حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ شامیانے سے ذرا دور چبوترے پر نوبت بج رہی تھی۔ دوسری طرف شہر سے آئی ہوئی بینڈ پارٹی مستعد کھڑی تھی۔ دولہا سر تا پا پھولوں سے لدا حویلی سے برآمد ہوا۔ نوجوان ساتھی اُسے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ پھولوں سے سجی موٹر تک گیا۔ حویلی سے ایک بڑھیا دوڑتی ہوئی آئی۔ بغل سے کالا مرغ نکال کر دولہا پر وار کر کے ایک ملازم کے حوالے کر دیا۔ بینڈ والوں نے فلمی دھن بجانا شروع کر دی، اور موٹر کے پیچھے ہجوم آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ دُلہن کے مکان کے آگے بھی بڑا شامیانہ لگا تھا۔ سفید چاندنیوں کا فرش تھا۔ براتیوں کے بیٹھتے ہی عرق گلاب کی پھواریں چھوڑی گئیں۔ چائے بسکٹ اور میووں کی تھالیاں گشت کرنے لگیں۔ عقد کے بعد شامیانے میں ہی دسترخوان بچھا دیئے گئے اور کھانوں کی خوشبو سے گلی مہک گئی۔

مشتاق کو وہ مکان دکھانا چاہتا تھا جس میں میرا لڑکپن گزرا تھا۔ اس مکان سے کئی معصوم اور پیاری پیاری یادیں وابستہ تھیں۔ کھانا کھا کر تین پرانے ساتھیوں کو لیکر قاضی باغ کی طرف چل پڑا۔ قاضی صاحب کی وفات کے بعد تو مکان کھنڈر بن گیا تھا۔ مکان کے جس حصّے میں ہم رہتے تھے وہ گر گیا تھا اور ملبہ پڑا تھا۔ قاضی صاحب کی بیوہ مکان کے شکستہ حصّے میں رہتی تھیں۔ انہیں سلام کرنے گیا تو بڑی مشکل سے وہ مجھے پہچان پائیں پھر بڑے اصرار سے چائے پلائی۔ باغ بھی اجڑ گیا تھا۔ امرود کے پیڑوں کا نشان تک نہ تھا۔ آم اور املی کے پیڑ اور بھی گھنے ہو گئے تھے آس پاس جنگلی درخت اُگ آئے تھے۔ املی کے بڑے پیڑ کے نیچے پہنچا تو پیڑ پر چڑھنے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔ جوتے موزے اتار کر پتلون کے پائنچے چڑھا کر پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مشتاق ہنس رہا تھا۔ ساتھی منع کر رہے تھے۔ پیر بار بار پھسل رہے تھے۔ پیڑ پر چڑھنے کے گُر بھول گیا تھا پھر بھی کوشش کر رہا تھا سانس پھول رہا تھا۔ پسینے سے بدن شرابور ہو گیا تھا لیکن میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ بیچ والی ٹیڑھی شاخ پر نظر پڑی تو چونک گیا۔ شاید برسوں پہلے املیاں کھاتے کھاتے چاقو سے اپنا نام پیڑ پر لکھا تھا۔ حروف دھندلا گئے تھے لیکن غور سے دیکھنے پر پڑھے جا سکتے تھے۔ مسرت سے بے قابو ہو کر مشتاق کو آوازیں دینے لگا۔ اور اوپر بلانے لگا۔ بڑی مشکل سے سیڑھی کی مدد سے اُسے پیڑ پر چڑھایا گیا۔ وہ خوف کے مارے لرز رہا تھا اور اپنی سفید پتلون پر کالی کالی کھرونچیں دیکھ کر چڑ گیا تھا۔ میں نے بے تابی سے کہا "یہ دیکھو یہ کیا لکھا ہے۔ پڑھو، غور سے پڑھو بیٹا" حیرانی سے اس نے میری طرف دیکھا۔ اور غور سے تحریر پڑھنے لگا۔ آپ کا نام لکھا ہوا ہے اور تو کچھ نہیں۔ اس میں اتنا جذباتی ہونے کی کیا بات ہے۔ خواہ مخواہ آپ نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس نے جھلا کر کہا اور سیڑھی سے نیچے اترنے لگا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے املی کی اُس خمیدہ شاخ پر میں اپنے دھندلاتے ہوئے نام کی طرح معدوم ہوتا جا رہا ہوں۔

قارئین کی نظر میں
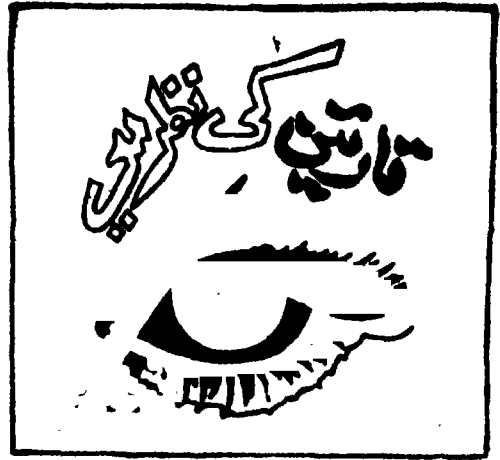
تعمیرِ ہریانہ دسمبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ دستیاب ہوا۔ اور "چغلی" پڑھنے کو ملی۔ نندا رس کا ذائقہ اور اس کا چٹخارہ بڑے مزے لے کر پڑھتا رہا۔
کچھ آپ کی ذہانت اور کچھ آپ کے قلم کا مزاج۔ کافی اچھا سماں باندھ گئے۔

طلعت عرفانی۔ روہتک

دسمبر کے شمارہ میں مزاحیہ "چغلی" یہ بھی ایک مستقل طریقہ ہے، پسند آیا۔ ویسے بھی تعمیرِ ہریانہ کو آپ بے حد معیاری اور ادبی انداز میں مرتب کر رہے ہیں۔ بلاشبہ سرکاری پرچوں میں تعمیرِ ہریانہ کا معیار بلند اور ادبی ہے۔

عشرت امیر۔ مارہرہ شریف یوپی

جنوری ۱۹۸۵ء کے شمارے میں جناب جوگندر پال کا افسانہ "رستے اور رشتے" اور ڈاکٹر نریش صاحب کی غزل بے حد پسند آئیں اور محترمہ ملکہ خورشید کی نظم "فرق" اس شمارے کی جان ہے۔ "تعمیرِ ہریانہ" وہ گلستاں ہے جس میں بے شمار قلم کار، شعرا، ادبا اور مضمون نگار اپنے فنکارانہ جوہر سے معیاری غزلیں، نظمیں اور دلچسپ افسانے مضامین پیش کرتے ہیں۔

خورشید عالم عبدالقیوم قریشی۔ ڈیرہ دون

جنوری ۱۹۸۵ کے شمارے کے سبھی آرٹیکل اچھے تھے لیکن مجھے سب سے زیادہ رستے اور رشتے پسند آیا۔ میں خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ یہ پرچہ روز بروز ترقی کرے۔

تقی احمد۔ گوسنیر کالج۔ رانچی

آج کافی انتظار کے بعد "تعمیر" کا جلد ۱۳ شمارہ ۱ موصول ہوا۔ اس انتظار کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ صبر کا پیمانہ چھلکنے چھلکنے بچا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اس کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے اور خاص کر اداریے کی اپنی الگ پہچان ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے صبر منتظر رہتا ہوں۔ شمارہ ہذا کی غزلیں اچھی ہیں۔ کہانیاں بھی اچھے فنکاروں کی ہیں۔ مقالہ "بھارت رتن ڈاکٹر راجندر پرشاد" قابلِ تحسین ہے۔

ضیا۔ الہ آباد

"تعمیرِ ہریانہ" مجھے خاص طور سے بہت زیادہ عزیز ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ واقعی ہریانہ جیسی ریاست سے اردو کا رسالہ نکال کر آپ اردو ادب کے لئے بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔

معراج احمد انصاری۔ جلالپور

جنوری ۸۵ کا "تعمیرِ ہریانہ" موصول ہوا۔ میں اس رسالے کو باضابطہ طور پر پڑھتا ہوں۔ اس رسالے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اداریہ کافی دلچسپ ہے۔

محمد معین الدین سالک دربھنگہ

پبلشر اور چیف ایڈیٹر انل رازدان نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او نمبر ۱۹۱-۱۸۹ سیکٹر نمبر ۱۷۔سی چنڈی گڑھ سے اپریل ۱۹۸۵ء کے لئے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ٹی۔ چنڈی گڑھ۔

قدیم شیمہ ندہ سے لایت

Photos : RAJ KISHAN NAIN

فیروز شاہ کا محل ــــ حصار

تعمیر
ہریانہ

S A Nomani
10-7-85

قدیم عیدگاہ ـ کیتھل

آپ کا محبوب مصور ماہنامہ

مئی ۱۹۸۵ء | شمارہ ۵ | جلد ۱۳

مدیر اعلیٰ:
رنجیت ایس

مدیر:
ڈاکٹر راجندر روسی

نائب مدیران:
سلطان انجم ۔ مدن راہی

سرورق:۔ مکیش سہگل

فی شمارہ ۵۰ پیسے

شرح سالانہ ۵ روپے

خط وکتابت کا پتہ: مدیر تعمیر ہریانہ، ایس سی او ۱۸۹۔۱۹۰۔۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی، چنڈی گڑھ۔ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

تہذیبِ ہریانہ

سراج انور مصطفےٰ آبادی

دل والوں کا مدھوبن ہریانہ   ہے پریم کا درپن ہریانہ
نسرین و سمن کے پھولوں کا   مہکا ہوا گلشن ہریانہ
جاں بازوں، دلیروں کی دھرتی   ویروں کا ہے مسکن ہریانہ
تاریخِ کتابِ گلشن میں سرخی ہے اسی افسانے کی
تہذیبِ وطن سے نکھری ہوئی تہذیب ملی ہریانے کی

ایثار و وفا کے پیکر ہیں   یہ لوگ محبت والے ہیں
ملتی ہے خیالوں میں وسعت   یہ سادہ طبیعت والے ہیں
دل کھول کے ملتے ہیں سب سے   یہ قلب کی وسعت والے ہیں
تفریق نہیں ہے ان میں کوئی اپنے اور بیگانے کی
تہذیبِ وطن سے نکھری ہوئی تہذیب ملی ہریانے کی

محنت کی چمک ہے کھیتوں میں   باغوں میں یہاں کھلیانوں میں
مزدور و کسان و تاجر ہوں   جذبہ ہے سبھی انسانوں میں
ہر گام پہ آگے بڑھتے رہیں   اک دھن ہے یہی دیوانوں میں
قربان ترے اے شمعِ وطن! مستی ہے ہر اک پروانے کی
تہذیبِ وطن سے نکھری ہوئی تہذیب ملی ہریانے کی

دھرتی جو ہوئی شاداب یہاں   ندیوں سے ہوئی سیراب یہاں
ڈھلتے ہیں حقیقی رنگوں میں   لوگوں کے سنہرے خواب یہاں
ہے جلوہ نمائی فطرت کی   ہر سمت دلِ بے تاب یہاں
ساون کو بہاروں کی دھن ہے بھادوں کو بھرن برسانے کی
تہذیبِ وطن سے نکھری ہوئی تہذیب ملی ہریانے کی

کرتے ہوئے جگ مگ جگ مگ سے   آنچل میں حسینوں کے تارے
مردوں کے ملے ہیں دوش بدوش   شہروں میں یہاں کے مہ پارے
سینوں میں مچلتے جذبوں سے   رنگیں ہیں یہاں کے نظارے
جذباتِ طرب سے رونق ہے انور ہر کاشانے کی
تہذیبِ وطن سے نکھری ہوئی تہذیب ملی ہریانے کی

ستیہ پال آنند

ممّی اور ماں

بچی بھاگتی ہوئی آئی اور پھر جیسے یکایک اُس کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی ہو۔ وہ رُک گئی۔ اُس نے عدمِ اعتمادی سے رانی کی طرف دیکھا جو عمر میں اُس سے دو برس چھوٹی تھی۔ پھر وہ دھیرے سے ایک قدم آگے بڑھی۔ رانی کے چہرے پر نظرے جاتے ہوئے ہی وہ مسکرائی۔ پھر ہنسی۔ رانی بھی ہنس دی۔

رانی نے شندر اور بڑھیا نائیلون کا پھولوں والا فراک پہن رکھا تھا۔ نہانے کے بعد ماں نے ڈھیروں ٹیلکم پاؤڈر اُس کے جسم پر چھڑک دیا تھا جس کی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف اُٹھ رہی تھی۔ اس کے سر پر سنورے اور کٹے ہوئے بالوں میں ایک رنگ برنگی تتلی کی طرح بیٹھا ہوا ربن بہت خوب لگ رہا تھا۔ پاؤں میں موزے اور ان پر بوٹ تھے — اور پھر ان سب باتوں کے علاوہ اُس کے ہاتھوں میں آنکھیں مٹکانے اور سر ہلانے والی گڑیا تھی جو اُس کے پاپا جاپان سے لائے تھے۔ وہ اپنی کوٹھی کے پائیں باغ کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

جب رانی ہنسی تو سڑک پر سے بھاگتی ہوئی آنے والی بچی جو ٹھٹھک کر رُک گئی تھی چند قدم اور آگے بڑھی اور اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اُس کا رنگ سیاہ تھا۔ بالوں میں دھول اور تنکے اٹے تھے چہرے پر بھی گرد تھی اور

تیمیر ہمہ یانہ

کپڑے میل سے سیاہ چیکٹ ہو رہے تھے۔ پاؤں جوتوں سے بے نیاز رہنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے زخمی تھے۔ ایڑیوں میں دراڑیں تھیں اور دائیں گھٹنے کے پاس ایک پھوڑا رِس رہا تھا۔ رانی نے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر دھیرے سے اُس نے اپنی گڑیا کو سینے سے لپٹاتے ہوئے پوچھا

”تمالا نام کیا ہے؟“

بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے لڑکی نے کہا، ”تمالا کیا ہوتا ہے؟ تمرا کہو نا!“

”تمُلا!“ رانی نے ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح دُہرایا۔

”تمُلا..... تمُلا.....“ لڑکی نے زبان نکال کر اُسے چڑایا۔ اور پھر اپنی بزرگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ ”کہو تمرا.....“

”تُمرلا.....“ رانی نے دہرایا۔

اب جیسے اُسے اپنی شاگردہ پر رحم آ گیا ”میرا نام مُجھنیا ہے اور تمُرا؟“

”میلا لانی ہے۔“ وہ بولی۔ ”اور اس ڈال کا نام ڈولی ہے۔“

”یہ ڈال ہے؟“ وہ ہنسی ”ڈال تو پیڑ کی ہوتی

ہے ۔ یہ تو گڑیا ہے !"

"گُلیا !" رانی نے اثبات میں سر ہلایا ۔ "ہاں ڈال نہیں ۔ گُلیا !"

تعارف مکمل ہو چکا ۔ لیکن جُھنیا کو جیسے کسی چیز کی تلاش تھی ۔ اُس نے بے معنی نظروں سے بڑی کوٹھی کی طرف دیکھا جو یقیناً رانی کے ڈیڈی کی تھی ۔ پھر لان کی طرف جس میں خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے ۔

اور پھر رانی کی طرف جو خود ایک خوشنما پھول لگ رہی تھی ۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رانی کے فراک کے کپڑے کی ملائمیت کو انگلیوں سے محسوس کیا اور پھر اُسی ہاتھ سے اس کے سر پر بندھے ربن کو چھوا ۔ جب رانی چپ چاپ کھڑی رہی تو اُس نے جیسے پیار سے بے بس ہو کر پوچھا

"سہیلی بنو گی ؟"

رانی لفظ کا مطلب نہ سمجھ سکی لیکن لہجے کی ملائمیت اور پیار کو اُس نے محسوس کیا ۔ سر ہلا کر اس نے کہا "ہاں ..؟ اور پھر گڑیا بڑھا کر پوچھا ، "گُلیا دیکھو گی ؟"

جُھنیا نے گڑیا کو اس کے ہاتھوں سے لے لیا ۔ غور سے دیکھا ۔ اس کا سر ہلانا اور آنکھیں مٹکانا اُسے بہت بھایا تو اس نے خود نقل کر کے دیکھا ۔ پھر اُس کے گڑیا کو پیٹ سے دبایا تو اُس نے زبان نکال دی ۔ جیسے منہ چڑا رہی ہو ۔ جُھنیا نے بھی ایسے ہی کیا ۔ تب جیسے رانی کو بھی کھیل سوجھ گیا ۔ اُس نے گڑیا لے لی ۔ پہلے سر ہلایا ۔ پھر آنکھیں مٹکائیں اور پھر زبان نکال دی ۔ یکبارگی دونوں ہنس دیں اور پھر آگے پیچھے بھاگتے ہوئے پائیں باغ کی گھاس پر لوٹ پوٹ ہو گئیں ۔

جب وہ بے دم سی ہو چکیں تو جُھنیا کو جیسے کچھ یاد آیا ۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔

"گُلیا دو گی ؟" اُس نے رانی کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا ۔

"لو ۔" رانی نے بڑھا کر گڑیا کو اُس کے ہاتھ میں تھما دیا ۔

"میں لے جاؤں ؟"

"لے جاؤ ۔"

"اپنے گھر ؟" جُھنیا کو اعتماد نہیں تھا ۔

"تملا بھی گھل ہوتا ہے ؟ تہاں ہے ؟ ہم بھی تلیں گے !" ٹھنکنے کے انداز میں رانی بولی ۔ لیکن جُھنیا جیسے پہلے ہی بزرگی کا رتبہ اختیار کر چکی تھی ۔ اس لئے اُس نے پچکار کر کہا ۔

"ہاں ۔ ہاں ، تم بھی آنا ۔ پر اپنی میّا سے پوچھ لو نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" پھر اُس نے کہا ، "گڑیا لے جاؤں ؟"

"لے جاؤ ۔ پھر گھل دکھا کر لے آنا !" اُس نے کہا ۔

اور وہ گیٹ تک جُھنیا کو جاتے دیکھتی رہی اور ہاتھ ہلا ہلا کر بائی بائی کرتی رہی ۔ جُھنیا بے اعتمادی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی لیکن جونہی وہ سڑک پر پہنچی ۔ اُس نے ایسی دوڑ لگائی کہ دو پل میں نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔

رانی مڑی تو جیسے اُسے کچھ یاد آیا ۔ وہ بھاگتی ہوئی مالی کی کوٹھڑی میں گھس گئی ۔

"لام کھلاون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لام کھلاون ۔ ۔ ۔ !"

اُس نے پکار کر کہا اور پھر بستر پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے مالی کو جگایا ۔ "تم نے میلی سہیلی دیکھی ہے ؟"

"ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ "گڑیا ؟ دیکھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ مِسی بابا ، جا کر سو رہو ۔ دوپہر کا وقت ہے ۔"

"ہُنھ ۔ ۔ ۔ ۔ ہُنھ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ ٹھنکی ۔ "گُلیا نہیں ۔ میلی سہیلی جُھنیا ۔ بہت اچھی ہے ۔ بہت تیبلی

ہے۔"

"مسی بابا۔۔۔۔۔۔"، رام کھلاون کھیج کر بولا۔
"بکیل صاحب کو پتہ چلے گا تو ہنٹر سے کھال ادھیڑ دیں گے
میری۔۔۔۔۔ گندے بچوں میں کھیلنے لگی ہے۔ جاؤ جاکر
سو رہو!"

"جاؤ جاکل سو لہو!" اس نے بالکل جھنیا کے
سے انداز میں زبان نکال کر منہ چڑایا اور پیشتر اس کے
کہ رام کھلاون مسی بابا میں اس افسوسناک تبدیلی کو دیکھ
کر بے دم ہو سکتا۔ وہ بھاگ گئی۔

شام ہوئی اور جب مسز گپتا نے سوتی ہوئی رانی کے
پاس نئی گڑیا کو نہ دیکھا تو انھوں نے آیا سے پوچھا۔ آیا
دھک سے رہ گئی۔ اس نے باغ میں دیکھا۔ گھر کا کونا کونا
چھان مارا لیکن گڑیا نہ ملی۔
کیا تم سوتی رہتی ہو۔؟" مسز گپتا نے جھڑکا۔
"آخر ڈال گیا کہاں؟"
"بی جی۔۔۔۔۔۔" وہ روہانسی سی ہو گئی۔ "رانی
بیٹیا سو رہی ہے۔ وہی بتا سکتی ہے نا؟ اب میں کیا کہوں؟"
"دیکھو چنبیلی!" مسز گپتا نے وکیلوں کے سے
انداز میں کہا۔ "رانی تمہارے چارج میں ہے اس لئے نہیں کہ
تم اسے اکیلا چھوڑ دیا کرو۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ کھیلنے
کے لئے کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس لئے اداس رہنے لگی
ہے۔ اس کا وزن بھی کم ہو رہا ہے۔ یہ حال رہا تو میں
اسے ننھیال بھیج دوں گی۔۔۔۔۔ اور پھر سمجھ لو کہ
تمہاری چھٹی۔۔۔۔۔۔"
اس وقت رانی آنکھیں ملتی ہوئی اندر سے آ گئی۔
۔۔۔۔۔ "ممی ممی۔۔۔۔۔" اس نے کہا، "مجھے سہیلی

لا دو!"
"سہیلی۔۔۔۔۔ بیٹے؟" مسز گپتا کو کانوں پر

اعتماد نہ آیا۔ "وہ کیا ہوتی ہے، بیٹی؟"
"سہیلی، ممی۔۔۔۔۔ جھنیا۔۔۔۔۔ اتی
بڑی سی۔۔۔۔۔" اس نے اپنے سر سے تین انچ اوپر لے
جاکر اس کا قد سمجھایا۔ "اس کا بھی گھر ہوتا ہے۔ ہم
وہاں چلیں گے؟"
مسز گپتا نے قہر آلود نظروں سے آیا کی طرف
دیکھا۔ پھر پیار سے رانی کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔
"چلیں گے بیٹے! یہ تو بتا تیرا ڈال کہاں
گیا؟"
"گڑیا کہو ممی، ڈال نہیں!"
"ہاں بیٹے وہ گڑیا کہاں گئی؟" انھوں نے
معنی خیز نظروں سے آیا کی طرف دیکھا۔
"جھنیا کو دے دی ممی۔۔۔۔۔" وہ پھر ٹھنکی۔
"ممی، جھنیا کے گھر لے جاؤ نا؟"
"لے جائیں گے۔۔۔۔۔ لے جائیں گے۔۔۔ اب
تم جاکر کھیلو!" اور پھر رانی کو نرسری روم میں بھیج کر
جیسے بے بس کمزور سی مسز گپتا صوفے پر بیٹھ گئیں۔
"چنبیلی، اب اس کا ڈال نہیں آئے گا تو رام کھلاون سے
پتہ کر کے بتا کہ یہ لڑکی کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔"
آیا کے جانے کے بعد انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس
لی۔ پھر اندر نرسری روم کی طرف دیکھا جس میں اب رانی کھلونوں
سے جی بہلا رہی تھی۔ ان کا من ممتا سے بھر اٹھا۔ کاش
اس کا کوئی بھائی بہن ہوتا؟ جیسے دیواروں سے انھوں نے
کہا، لیکن ایشور نے ایک پر ہی اکتفا کی تھی اور نئے سرے
سے ان کی گود ہری ہونے کے ناقابل بنا دیا تھا۔

جب دو بار کہنے پر بھی رانی اپنی جگہ سے ٹس سے
مس نہ ہوئی تو جیسے مسز گپتا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کھینچ کر

قمر جہاں

اور جھینپ مٹانے کی خاطر کہنے لگے۔

"کیا کروں، میں کچہری چلا جاتا ہوں۔ اس کی ممی کالج میں پڑھانے چلی جاتی ہے۔ پیچھے یہ اکیلی بیٹھی رہتی ہے، یا پھر آیا سے کھیلتی رہتی ہے . . . . . اب بچوں سی کھلنڈری عادتیں سیکھے بھی تو کیسے؟ بس بڑی بوڑھیوں کی طرح بیٹھی باتیں بناتی رہتی ہے . . . . . رانی، او رانی بیٹیا!" انھوں نے پھر پکارا۔

تصویروں والی کتاب چھوڑ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ "ڈیڈی؟" اس نے پوچھا۔

"بیٹے، کب سے تمھیں بلا رہا ہوں۔ ذرا وہ ڈانس دکھا دو نا جو نرسری اسکول میں سیکھا تھا۔ دیکھو تو تمھارے رمیش انکل اور نرپتا آنٹی آئی ہوئی ہیں۔"

رمیش انکل اور نرپتا آنٹی نے اپنی جگہ پچکارا۔ مگر رانی نہ اٹھی۔ صرف تتلا کر بولی، "پل ڈانس کیسے کلوں . . . دد بیٹھے ہوں نو نا!"

"تم اکیلی ہی کر لو بیٹی!" گپتا جی پھر بولے۔

"نیں نہیں کلتی بس . . . . ." وہ کتاب کو گلے سے لپٹاتی ہوئی بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔

"مجھے میلی سہیلی لادو! جھنیا لادو۔ بس، ہاں!"

اکڑ کر اس نے وہیں سے کہا اور پھر نیچے باغیچے میں دیکھتے ہی جیسے اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ "جھنیا!" اس نے وہیں سے پکارا۔ "وہیں لہنا، میں ابھی آئی!" اور کتاب کو پھینک کر وہ مڑی اور اس تیزی سے سیڑھیاں اتری کہ مسز گپتا کا من دھک سے رہ گیا۔

پھر وہ اٹھیں۔ بالکونی سے انھوں نے جھانک کر دیکھا ایک گندی، بہت گندی لڑکی پائیں باغ کے گیٹ پر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں رانی کی گڑیا تھی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح وہ دائیں بائیں ایسے دیکھ رہی تھی جیسے چاروں طرف سے بھیڑیوں کے غول میں گھری ہوئی ہو۔

جب مسٹر گپتا بھی اٹھ کر ان کے پہلو میں آ کھڑے ہوئے تو مسز گپتا نے کہا، "وہی کل والی لڑکی ہے۔ ونڈر، یہ ڈال واپس کیسے لے آئی۔ ایک سو روپے کی چیز تھی!"

مسٹر گپتا نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ڈارلنگ، غریب اکثر ایماندار ہوتے ہیں . . . . . اب آؤ، بیٹھو۔ رمیش اور اس کی پتنی بور ہو رہے ہیں۔ ان دونوں کو کھیلنے دو۔ مدتوں کے بعد تو بے چاری کو اپنا ہم عمر بچہ کھیلنے کو ملا ہے۔"

جب دو اڑھائی گھنٹے کے بعد وہ اپنے مہمانوں کو الوداع کہنے کے لئے گیٹ تک چھوڑنے آئے تو دونوں بچیاں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے بیٹھی تھیں۔ گڑیا ایک طرف لاپرواہی سے پھینک دی گئی تھی، اور وہ باتوں میں مصروف تھیں۔

"اس لڑکی کو گھر میں رکھ لو،" مسٹر گپتا نے کہا۔ "صاف کپڑے پہن لے گی تو کوئی ہرج کی بات نہیں۔"

"کیا معلوم کون ہے . . . . ." ان کی بیوی بولی۔ "کون ذات ہے . . . . ."

مسٹر گپتا ان باتوں میں یقین نہیں رکھتے تھے —— بولے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے گھر رکھ لو۔ اس کے ماں باپ کو کچھ روپے مل جائیں گے تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

جب مہمان چلے گئے تو وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ادھر نکل گئے۔ اس وقت جھنیا کہہ رہی تھی۔

"برکھا بہت ہوتی ہے پھر . . . پھر گرمی پڑنے لگتی ہے تو پھر پیڑ بادلوں سے کہتے ہیں۔ بادل بھیا، بادل بھیا پانی لاؤ، بہت پیاس لگی ہے اور بادل کہتے ہیں گڑ گڑ گڑا گڑ . . . . . لو پانی، لو پانی . . . تو برکھا بہت ہوتی ہے پھر۔ باڑھ بھی آجاتی ہے۔"

تیر پیمانہ

اُس کی بزرگانہ فراست سے متاثر ہوئے بغیر
رانی بولی ”یہ بات تو لام کھلا دن بھی کہتا ہے۔ میری ممّی
کہتی ہے کوئی گندہ بچہ باتھ روم کا شاور کھول دیتا ہے تو
بالش آجاتی ہے۔“

”شاور کیا ہوتا ہے ؟“ جھنیا نے کہنی کے
بل اُچک کر پوچھا۔

اسی وقت اس نے رانی کے ماں باپ کو دیکھ لیا
اس کے سیاہ چہرے پر جیسے اور سیاہی پت گئی۔
وہ اُکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر گھاس کے تنکے توڑنے لگی۔

رانی ماں کو دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں سے لپٹ
گئی ”ممّی ممّی !“ پھر اُسے چھوڑ کر باپ کی طرف متوجہ
ہوئی ”ڈیڈی - یہ جھنیا ہے - میری سہیلی - یہ کہتی
ہے - گل گل گل گل - لو پانی ، پانی“ اور پھر وہ زور
زور سے ہنسنے لگی۔

مسٹر گپتا نے اُسے پچکارا - پھر جھنیا کے
سر پہ ہاتھ پھیرا ”ہمارے گھر رہو گی بیٹی !“

بچی نے ایک لمحہ سوچا - پھر انکار میں سر
ہلا کر کہا ”میں تو اپنے گھر رہتی ہوں۔“

”یہ بھی تو تمہارا گھر ہے نا ؟“ انھوں نے
پھر کہا۔

بچی نے مسز گپتا کی طرف دیکھا - پھر کہا۔
”نہیں ہے - یہ تو رانی کا گھر ہے !“

رانی اُس کے پاس جا کھڑی ہوئی - اُس نے
جھنیا کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا - ”ہم تمہارے گھر جائیں گے -
جائیں گے نا ؟“

اور مسز گپتا نے کہا ”ہاں بیٹی - ہم اس کے
گھر جائیں گے اور پھر اسے لے آئیں گے۔“

جھنیا رانی کے گھر آگئی تو جیسے اس میں انقلاب
آگیا - پہلے دن ہی مسز گپتا نے آیا سے کہا۔

”چنبیلی - اسے ٹب میں گرم پانی سے خوب
نہلاؤ . . . . . اور دیکھو اگر رانی کا کوئی فراک
اسے پورا آجائے تو پہنا دو - اس کی ماں تو بہت لالچی
نکلی - مشکل سے تیس روپے مہینہ پہ راضی ہوئی۔

جھنیا پہ نئے کپڑے پھب اُٹھے - پاؤں
میں چپل پہن کر وہ شام تک اٹھلاتی پھری - پھر
اس نے رانی کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس کی ٹرائی سائیکل
چلانا بھی سیکھا - شام تک ہی وہ نئے گھر میں اس
طرح گھل گئی جیسے مدتوں سے یہیں رہتی آئی ہو۔

دونوں بچیاں بھاگتی ہوئی نرسری میں داخل
ہوئیں تو آیا کپڑے کی تہہ جما کر الماری میں رکھ رہی تھی۔
جھنیا آیا کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ایک فراک کو
کھول کر پھر تہہ جمانے لگی۔

”تہہ لگانے کا ڈھنگ کہاں سے سیکھا ؟“
آیا نے تعریفی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ماں سے۔“

”تیری ماں کپڑے دھوتی ہے کیا ؟ تم دھوبی
لوگ ہو ؟“

”ہاں . . . .“ اُچک کر دوسرا فراک
اٹھاتے ہوئے وہ بولی ”میری ماں کپڑے دھوتی ہے“
”کیلے دھوتی ہے ، کیلے دھوتی ہے . . . .“
رانی نے کہا ”میلی ماں بھی کپڑے دھوتی ہے !“
”مسی یا ہا !“ آیا نے کہا ”گندی باتیں کرو گی
تو ممی سے کہہ دوں گی !“

”آیا بہت چھی چھی ہے !“ رانی نے کہا۔
”ہاں - آیا بہت چھی چھی ہے“ ہمکتے ہوئے جھنیا نے کہا۔
”ماں کیا ہوتی ہے ؟“ رانی نے اس کے گلے
میں باہیں ڈال کر پوچھا۔

"میری ماں، ماں۔۔۔۔۔۔ تمہری ماں تھی!"
رانی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ پھر اُس نے بغاوت کا علم بلند کیا "ممی تو ممی ہے، ماں نہیں ہے!"
لیکن جھنیا نے کہا "چپ کرو۔ تم نہیں سمجھو گی!"

رانی اسکول جاتی تو جھنیا آیا کے ساتھ گھر کے کام کاج میں جٹ جاتی۔ کپڑے تہہ کرتی۔ کھلونے سنبھال کر رکھتی۔ اس کے جوتے صاف کرتی اور جب فارغ ہو چکتی تو اُس کی تصویروں والی کتاب لے کر نیچے پورچ میں جا بیٹھتی۔ جونہی دور سے گاڑی کی آواز سنائی دیتی وہ بھاگتی اور گیراج کے دروازے پر کار سے پہلے پہنچ جاتی رانی کار سے اترتے ہی اسکول کی ڈھیروں باتیں اپنی توتلی آواز میں اسے وہیں سنا ڈالتی۔ رانی کو کھانا پینا بھی بھول جاتا۔ دونوں بھاگتی ہوئی کمروں میں طوفان کی طرح گھومتی رہتیں۔ جب رانی کی ممی کالج سے آجاتی تو بھی یہ ادھم کو بند نہ ہوتی۔ چیختے اور چلاتے ہوئے دونوں نیچے بھاگ جاتیں۔

آیا کو جیسے آرام مل گیا۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گھر ہو آئی۔ جھنیا ایک آرام دہ سائے کی طرح رانی کی زندگی اور پھر گھر بھر کی زندگی پر چھا گئی۔ پہلے جھجک مٹی۔ پھر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اور اس کے بعد اسے اپنی قیمت کا احساس ہُوا۔ وہ خود کو گھر کا ایک اہم فرد سمجھنے لگی۔ رانی کے لئے نوکروں پر رعب گانٹھتی اور اگر کوئی نوکر اُس کی کم مائیگی کا خیال کر کے کڑوی زبان میں کچھ کہہ بیٹھتا تو جیسے آفت آجاتی۔ بابا پاپا تک شکایت پہنچتی۔ ایک بار تو مسز گپتا نے ہنس کر اُن سے کہا۔
"یہ لڑکی تو گھر میں میری جگہ بھی دھیرے دھیرے لیتی جا رہی ہے۔ اس نے سہیلی سے بڑھ کر آیا اور آیا سے بڑھ کر ماں کے فرائض بھی سنبھال لئے ہیں۔"
اکثر شام کے وقت اُس کی ماں اُسے ملنے آتی۔ لڑکی سے ملنے کا تو شاید ایک بہانہ ہی تھا وہ اُس گھر سے اپنا محصول وصول کرنے آتی تھی۔ کچھ پھل مٹھائی وغیرہ مل جاتے۔ کبھی کبھار ایک دو روپے بھی ہاتھ لگ جاتے۔ جب وہ آ کر پورچ میں بیٹھ جاتی تو جھنیا دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتی بڑی سنجیدہ لڑکیوں کی طرح چپ چاپ آ کر ماں کے پاس بیٹھ جاتی۔ باتیں بہت کم کرتی۔ صرف ہاں یا نہ میں ہی جواب دیتی اور جب آیا یا مہاراج اُس کی ماں کے لئے چائے رکھنے آتے تو وہ خود ایک ذمہ دار میزبان کی طرح اٹھ کر پھل یا مٹھائی پلیٹ میں رکھ کر لے آتی۔ اس کے اس حق کو کوئی بھی جھٹلانے کی کوشش نہ کرتا۔

چھ ماہ کا وقفہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ ایک دن شام کو رام کھلاون بھاگتا ہوا آیا اور بولا "جھنیا کا باپ ایشور کو پیارا ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ اس کی ماں بے ہوش پڑی ہے۔ کون جانے بچتی بھی ہے یا نہیں!"
مسٹر گپتا کلب گئے ہوئے تھے۔ مسز گپتا کے بھائی اور بھابی اسٹیشن سے آنے والے تھے اور انہیں گاڑی لے کر انہیں لینے جانا تھا۔ آیا کو رانی کی دیکھ بھال کرنی تھی اس لئے جھنیا اکیلے ہی اپنے گھر چلی گئی۔ مالی اور نوکر چاکر مہمانوں کے لئے کمرے سجانے میں مصروف رہے۔ رانی اپنی آنٹی اور انکل کے لئے کھلونا سی بنی رہی اور مسٹر گپتا اپنے مہمانوں کو سماجی دائروں میں گھماتے رہے۔ اس لئے پورے دو دنوں تک کسی کو جھنیا کا خیال نہ آیا۔
جب تیسرے دن صبح کے وقت باغ کے گیٹ کے باہر ڈھول سے آتے ہوئے۔ کپڑوں میں لپٹی اور لال سوجی ہوئی آنکھیں لئے جھنیا دھوبی برادری کے
تجھ بہر پانہ

کسی آدمی کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تو جیسے گھر کا کتا بھی اُسے بھول گیا اور بھونکنے لگا۔ وہ پھاٹک کھول کر اندر آئے۔ ادھیڑ عمر دھوبی برآمدے کی سیڑھیوں پر ہانپتا ہوا بیٹھ گیا۔ جھنیا اس کے کندھے سے لگی سسکتی رہی۔ کسی نے مسز گپتا کو خبر کی تو وہ باہر آئیں۔ ان کے گرد نوکروں کا جمگھٹا سا لگ گیا۔

"اس کی ماں بھی سورگباس ہو گئی۔" مالی نے کہا۔

دھوبی اٹھا۔ اس نے چندھی ہوئی آنکھیں کھولیں پھر کہا۔ "چھوری" آپ کی ہے بی جی جی۔ باپ مر گیا۔ ماں کال کو بیاری ہو گئی...... اب آپ ہی اس کے مائی باپ ہیں۔"

مسز گپتا نے جھنیا کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظریں فرش پر گڑی تھیں۔ انھوں نے کچھ کہنا چاہا۔ اس وقت پیچھے سے رانی نے آکر اُن کا آنچل تھام لیا۔ رانی حیرت بھری بڑی بڑی آنکھوں سے جھنیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے معاملے کو نہ سمجھ پا رہی ہو۔

مسز گپتا نے رانی کی طرف دیکھا ایک بار پھر جھنیا کی طرف دیکھا اور پھر نظریں گھمائیں۔ دھوبی سے بولیں۔ "تم کیا لگتے ہو چھوری کے؟"

کسی نوکر نے منہ چھپا کر کھی کھی کی اور دھوبی نے کہا۔ "مائی باپ، چھوری میری ہے۔"

مسز گپتا کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ "ارے پر تم لگتے کیا ہو اس کے؟"

دھوبی کی چندھی ہوئی آنکھیں کچھ کھلیں۔ "میرا بیاہ ہوا ہے اس سے بی بی جی...... بارہ برس کی آیو تک ماں باپ کے گھر رہوے ہے۔ پھر سسرال آوے ہے۔"

مسز گپتا نے بے یقینی کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر سب نوکروں کی طرف نظریں گھمائیں اور آخر میں ان کی نگاہ جھنیا پر آکر ٹھک گئی جو شاخ سے ٹوٹی ہوئی کمزور، مرجھائی ہوئی پھنگی کی طرح جھکی کھڑی تھی۔

رام کھلاون مالی نے کہا۔ "یہ ٹھیک کہوت ہے بیم ساب...... بارہ برس کی آیو تک مائیکے رہوے ہے۔ اس کا مائیکہ کون سا ہے۔ کیا بکیل ساب کا گھر ہے؟"

رانی نے دو ہاتھ جھنیا کی طرف پھیلائے لیکن مسز گپتا نے انھیں جھٹک دیا۔ پھر اُسے اٹھا کر پیچھے کھڑی آیا کی گود میں دے دیا جو اس کے چیخنے چلانے کی پروا نہ کرتے ہوئے اُسے اندر لے گئی۔

دھیرے سے مسز گپتا نے کہا۔ "اس کے ماں باپ مر گئے ہیں دھوبی۔ اس کا مائیکہ اب کوئی نہیں ہے۔ تم ہی اب اسے لے جاؤ۔"

شاخ سے ٹوٹی ہوئی کمزور مرجھائی ہوئی پھنگی نے ایک ہاتھ اٹھا کر جیسے کہنا چاہا۔ "ماں....." لیکن مسز گپتا اندر جا رہی تھیں جہاں رانی "ممی ممی" کی رٹ لگائے ہوئے چلا رہی تھی۔

بقیہ: اجنبی رشتے
صفحہ ۲۷ سے آگے

مجھے بھیما را پیٹا اور مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ سارا گھر مجھے پریشان کرتا تھا۔ اسی لئے میں آتم ہتیا کر رہی ہوں کہ روزروز کی مار پیٹ سے ایک ہی دن اپنا خاتمہ کر لوں۔ میری ہتیا کا ذمہ دار میرا پتی انل کمار شرما ہے۔ میرے ساتھ انصاف کیا جائے تبھی میری آتما کو شانتی ملے گی۔

ابھاگن۔ ودشا رانی۔

تعبیر ہے یا نہ

اختر شاہجہاں پوری

بیس نکاتی پروگرام

نورِ سحر ہے بیس نکاتی پروگرام
خلدِ نظر ہے بیس نکاتی پروگرام

منزل اسی طرف نظر آتی ہے دوستو — یعنی جدھر ہے بیس نکاتی پروگرام
سمجھیں نہ اس کو کس لئے سرمایۂ حیات — لعل و گہر ہے بیس نکاتی پروگرام
اب تو ہر ایک فردِ بشر کی زبان پر — شام و سحر ہے بیس نکاتی پروگرام
آؤ بلا رہی ہے ہمیں راہِ زندگی — اذنِ سفر ہے بیس نکاتی پروگرام
جس میں چھپی ہوئی ہے مسرت کی داستاں — ایسی خبر ہے بیس نکاتی پروگرام
کیوں جان و دل سے اندرا جی کی کریں نہ قدر — کیا با اثر ہے بیس نکاتی پروگرام
جس کے جلو میں روشنیاں تابناکیاں — وہ رہگذر ہے بیس نکاتی پروگرام

اختر اسے بنانا ہے مل جل کے کامیاب
جب معتبر ہے بیس نکاتی پروگرام

عشرت امیر

واپسی

کہرا رات کی پلکوں پر ٹنگ گیا تھا! ویسے ہی جیسے آنسو اکثر مٹرو بھگت کی پلکوں پر ٹنگ جاتے ہیں۔ اپنی ٹوٹی چارپائی پر۔ رضائی میں لپٹے ہاتھ سے چلم پیتے پیتے مٹرو ایک لمبی سانس کھینچتا ہے، ہائے رے غریبی . . . . . زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا لیکن میری یہ . . . . . بوسیدہ، پرانی اور پھٹی ہوئی رضائی نہ بدلی، دروازے پر پڑے پھٹے ٹاٹ کے پردے کو بار بار ہٹا کر مٹرو باہر جھانکتا ہے، نندو ابھی تک نہیں آیا . . . . . اتنی رات ہو گئی، نندو کبھی اتنی دیر نہیں کرتا تھا . . . . . .

باہر رات کا کہرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر مٹرو بھگت بھی پریشان ہوتا جا رہا تھا ہائے رے، نندو . . . . ابھی عمر ہی کتنی ہے . . . . . پندرہ سولہ سال . . . . . کھیلنے کھانے کے دن لیکن پیٹ کی آگ، بچارے کو اتنی سی عمر میں ہی رکشہ کا ہینڈل پکڑنا پڑا . . . .

مٹرو کو کھانسی آتی ہے۔ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر بلغم باہر تھوکتا ہے، ٹھنڈ بہت زیادہ ہے . . . . مٹرو کے لئے تو بہت ہی زیادہ . . . . سارا جسم کانپ رہا ہے، باہر کتے بھونک رہے ہیں۔ نندو ابھی تک نہیں آیا ہے۔ اندر نندو کی بہو بھی جاگ رہی ہے . . . . . اس کے کان بھی ٹاٹ کے پردے کی طرف ہی لگے ہوئے ہیں . . . . . . مٹرو سامنے رکھی آگ کو کریدتا ہے . . . . . .

مٹرو کو اپنا زمانہ یاد آتا ہے، پندرہ سولہ سال پہلے گاؤں سے چھ ماہ کے نندو کو گود میں لئے گاؤں سے شہر آیا تھا . . . . . . مٹرو کی گھروالی نے چھ سال کے رامو کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ شریر میں طاقت تھی۔ گاؤں میں ٹھاکر کا ہل جوتتا تھا، چار بیگھہ زمین ملی تھی . . . . دن بھر ہل جوتتے جوتتے شام کو تھک کر چور ہو جاتا۔ تب بھی مزہ تھا . . . . . دن بھر کی محنت کے بعد بھر پیٹ روٹی ملتی تھی، اور رات کو خوب گہری نیند آتی تھی . . . . . چار بیگھہ زمین میں ہی اتنی پیداوار ہو جاتی تھی کہ ہم چار آدمی مزے سے زندگی گذار رہے تھے، زندگی میں بڑا سکھ تھا — جب برکھا کی پہلی پھوار پڑتی تو سارے گاؤں میں ہلچل مچ جاتی۔ لگتا تھا جیسے شدید گرمی سے بے ہوش دھرتی نے پانی ملتے ہی آنکھیں کھول دی ہیں۔ آکاش میں موٹے اور سیاہ بادلوں کا چلنا پھرنا . . . . . . اندھیری رات میں درختوں کے اوپر بجلی کا رہ رہ کر چمکنا، پتوں سے

گرتی بوندیں۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو۔۔۔۔۔
سب جیسے اس شہر کے پنجرے ہیں۔ سپنا ہو گیا
ہے۔ غریبی تو دیہات میں بھی ہے۔ لیکن وہاں لوگ
غریبی کو مل بانٹ کر سہہ لیتے ہیں۔ اگر کسی گھر میں
چولہا نہیں جلا تو سارے گاؤں میں ہنگامہ ہو جاتا ہے،
۔۔۔۔۔ لیکن اس شہر میں ۔۔۔۔ بھوکے
پڑے رہو، کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ مٹرو آگ کو پھر
کریدتا ہے،

اندر بہو کھنکھارتی ہے ــــ ابھی بچی ہی تو
ہے ۔۔۔۔۔۔ دروازے کے پاس سے ایک کتّا
بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا نکل گیا۔ نندو ابھی تک۔۔۔۔
مٹرو کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگتا ہے، کہیں کوئی چکّر
تو نہیں پھنس گیا۔۔۔۔۔ غریب آدمی کا جینا کتنا
مشکل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔

غریب آدمی۔۔۔۔ تالاب کے کنارے کھڑا نیم
کا پیڑ ہے جو بھی آتا ہے، لاٹھی سے مار کر ایک دتون توڑ
کر چلا جاتا ہے، کوئی چھال چھڑا کر دوائی بناتا
ہے۔۔۔۔ اور نیم کا پیڑ چپ چاپ کھڑا سب کچھ سہتا
ہے۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔ ٹھنٹھ بن جاتا ہے یہ
پولیس والے۔ غریب رکشہ چلانے والوں کو بلا وجہ
پریشان کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

اے رکشہ والے، گھنٹی نہیں ہے۔۔۔۔۔
یہاں کھڑے کیوں ہو۔۔۔۔۔۔ رکشہ پر بیٹھ کر
اترتے وقت پیسے دینا تو جانتے ہی نہیں ہیں۔۔۔۔
مانگنے پر۔۔۔۔ بند کر دینے کی دھمکی،۔۔۔۔۔۔۔
ایک آدھ ڈنڈا مار دیتے ہیں۔

دروازے پر آہٹ ہوتی ہے۔۔۔۔ کون
۔۔۔۔۔ نندو؟۔۔۔۔۔۔
"ہاں بابو۔۔۔۔۔۔"

اتنی دیر کا ہے ہوئی رے۔۔۔۔۔
کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک سواری مل
گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔

اچھا!۔۔۔۔۔ ۔ مٹرو کی آنکھیں اندھیرے
میں چمکتی ہیں اس خیال سے کہ آج نندو نے زیادہ
روپئے کمائے ہوں گے،۔۔۔۔۔۔

دوسری طرف۔۔۔۔ ٹاٹ کے پردے
کے پیچھے سے نندو کی بہو سنتی ہے۔۔۔۔۔
"کتنا روپیہ ملا رے!۔۔۔۔؟"
دس روپیہ مل گیا۔۔۔۔
سواری کہاں کی تھی رے؟۔۔۔۔۔
بالسی منڈی کی۔۔۔۔۔۔
ایں۔۔۔ بالسی منڈی کی۔۔۔۔۔۔

مٹرو کا کلیجہ کانپنے لگتا ہے، اُسے بھی اکثر رات کو
بالسی منڈی کی سواریاں ملتی تھیں۔ منہ مانگے پیسے
ملتے تھے۔۔۔۔۔ لیکن محلہ بڑا خراب ہے۔۔۔۔
رات کے دو بجے لوگ لوٹتے۔ کوئی نشہ میں جھومتا
ہوا۔ کوئی گالیاں بکتا ہوا۔۔۔۔۔

اس وقت نہ جانے کیا پاگل پن سوار ہو جاتا
تھا ان لوگوں پر۔۔۔۔۔ آتے وقت تو اچھے خاصے
چھیلا بنے ہوتے، لیکن واپس ہوتے وقت جیسے
کھنڈر کی طرح لٹے پٹے ہوتے،۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ بالسی منڈی۔ اس شہر کا بدنام
محلہ ہے،۔۔۔۔۔۔

"اری بہو۔۔۔۔۔ ۔ نندو آ گیا ہے۔۔۔۔۔
کھانا گرم کر دے۔۔۔۔۔۔۔

ٹاٹ کے پیچھے سے ایک تیرہ چودہ سال
لڑکی نظر آتی ہے جاڑے سے کانپتی ہوئی۔۔۔۔۔

وہ برتن کھڑکھڑاتی ہے۔"
نندو آگ کے پاس سے اٹھ کر پیچھے کی طرف جاتا ہے، مٹرو....... ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر کھلے میں نکلتا ہے....... ٹھنڈ بہت ہے..... پھر بھی......

تھالی میں دو موٹی موٹی روٹیاں اور کٹوری میں دال لے کر بہو آجاتی ہے.........

یہ روٹیاں تو برف کی طرح ہو رہی ہیں۔ نندو بڑبڑاتا ہے...... نہیں کھاتا میں سالی آدمی کی زندگی ہے یا کولہو کے بیل کی....... بہو سناٹے میں آجاتی ہے...... اتنی رات گئے آتے ہو.......

پھر گرم روٹی کہاں سے ملے گی؟

رات گئے آتا ہوں تو تیرے باپ کا کیا، بیٹھ کر گپیں تو ہانکتا نہیں جسم توڑتا ہوں....... لے جا یہ روٹیاں......

بہو چپ رہتی ہے...... پھر وہ روٹیاں گرم کرنے چلی جاتی ہے۔

روٹیاں گرم کر کے تھالی میں رکھنے کے بعد وہ دھیرے سے کہتی ہے....... اتنی رات گئے مت آیا کرو........ اور دیکھو بانس منڈی کی سواریاں مت لے جایا کرو........

کیوں؟...... نندو روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے ہنس کر کہتا ہے۔

ایسے ہی....... بولو..... اب تو نہیں جاؤ گے وہاں........

"اری پگلی....... وہاں کی سواریوں سے پیسہ ملتا ہے.......

اتنے میں مٹرو اندر آتا ہے..... باہر کا اندھیرا اور سناٹا بڑھتا جاتا ہے...... مٹرو پھر اپنی ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھ کر پھٹی پرانی رضائی اوڑھ لیتا ہے....... ہائے بھگوان...... دیہات کا جیون بھی کیا تھا؟ سخت سے سخت ٹھنڈ میں بھی لوگ آگ جلا کر جاڑا کاٹ لیتے تھے۔ یہاں شہر میں آگ جلانے کے لئے بھی لکڑی پیسوں سے خریدنی پڑتی ہے...... کنڈے تو نظر ہی نہیں آتے......

دور سے پولیس والوں کی سیٹی بجتی ہے، کتے بھونکتے ہیں، باہر گلی میں سبوا رام لڑکھڑاتی زبان سے گالی بکتا ہوا جا رہا ہے...... مٹرو بڑبڑاتا ہے۔

سالا سبوا رام آج پھر پی آیا ہے،.......

ہے بھگوان...... آدمی کہاں سے کہا ہو جاتا ہے۔ سالے کو روٹی نصیب نہیں ہوتی لیکن پینے کے لئے نہ جانے کہاں سے پیسہ لے آتا ہے۔

مٹرو کو دوبارہ کھانسی آجاتی ہے، بہت سا بلغم باہر تھوکتا ہے۔ کون جانے خون بھی اس بلغم میں ہو،.... ڈاکٹر کو دکھایا تھا...... تو اس نے کہا تھا۔ ٹی بی ہو گئی ہے، محنت کا کام مت کیا کرو...... دوا لو، اور پھل وغیرہ کھاؤ۔

مٹرو کے چہرے پہ ایک پھیکی ہنسی ابھر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب، مکا کی روٹی تو دو وقت ملتی نہیں..... پھل کہاں سے لائیں۔

مٹرو ایک بار پھر اپنے پرانے دنوں کی طرف لوٹتا ہے۔ زمانہ کیسا آگیا ہے۔ جسے گود میں رکھ کر پالا پوسا .... کھلایا پلایا— وہی اولاد— کتنی سنگدل نکلی.......

رامو شادی کرتے ہی الگ ہو گیا تھا.....

رامو نے ایک دن کہا تھا، بابو ایک جگہ رہ کر گذارہ نہیں ہوتا......

اور مٹرو کے کلیجہ میں یہ بات تیر کی طرح لگی تھی۔ تو جب بچہ تھا...... کمانے کے لائق نہیں

تھا، تب گزارہ کیسے چلتا تھا؟" آج۔ شادی ہوتے ہی تو یہ کہہ رہا ہے۔۔۔۔۔۔

اور آنسو اس وقت بھی مٹرو کی پلکوں پر ٹنگ گئے تھے۔۔۔۔۔

ٹھیک ہے بیٹا ـــ جا۔۔۔ کھا اور کما ۔۔۔۔ خوش رہ۔۔۔۔۔۔

نندو اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔۔۔ اسکول میں پڑھتا تھا بڑی خوشی ہوتی تھی اُسے اسکول جاتا دیکھ کر۔۔۔۔ جب وہ بستہ لے کر اسکول جاتا اور شام کو واپس آتا تو اُسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔ اپنی کمزور صحت، بوڑھے جسم کے باوجود اُسے پھر سے رکشہ چلانا پڑا۔

مٹرو کی آنکھ جھپکنے لگی تھی کہ اچانک اُسے لگا جیسے گلی میں کوئی بھاگ رہا ہے۔ مٹرو کے گھر کے دروازے کے سامنے سے ہی کوئی بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا نکل گیا۔

مٹرو کی نیند پھر غائب ہو گئی۔

مٹرو نے باہر آ کر دیکھا، پچھواڑے اُسے کچھ چیخ دیکا سنائی دی، شاید سیوارام اپنی گھروالی کو پیٹ رہا تھا۔ اس کی گھروالی چیخ رہی تھی، سالی، جا، بھاگ جا، اسی کے ساتھ، میں تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔۔۔ خبردار۔ اگر تو نے گھر سے باہر قدم رکھا۔۔۔۔۔۔۔۔ ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

اوہو۔۔۔۔۔ تو یہ بات، ابھی ابھی کسی کے تیزی سے بھاگنے کا یہ راز ہے۔۔۔۔ مٹرو اندر آ کر پھر رضائی اوڑھ لیتا ہے۔

نندو اب روز رات کو دیر سے آنے لگا ہے، اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جونک دھیرے دھیرے اس کے جسم کا خون چوس رہی ہے۔ کبھی کبھی رات کو وہ زور سے کھانسنے بھی لگا ہے۔۔۔۔۔

مٹرو ادھر نندو کی طرف سے کافی فکرمند رہنے لگا ہے۔ بالکل میرے راستے پر ہی نندو جا رہا ہے، اس کا بھی وہی حشر۔۔۔۔ اے بھگوان یہ کیا ہونے جا رہا ہے۔

سوکھا پڑنے پر گاؤں سے اس لئے بھاگ آیا کہ شہر میں کما لے گا۔۔۔۔۔ قرضہ بھی اتار دے گا، سوکھا بھی ایسا پڑا تھا کہ کھیتوں میں ایک دانہ بھی نہیں ہوا تھا۔

اور اسی وجہ سے مٹرو گاؤں سے شہر آ گیا تھا۔ شہر آ کر اس نے رکشہ چلانا شروع کر دیا۔۔۔ اور پھر وہ گاؤں نہیں گیا۔

ایک دن شہر میں گاؤں کے ٹھاکر مل گئے تھے، انھوں نے مٹرو کی کمزور صحت دیکھ کر کہا تھا، مٹرو، چل گاؤں واپس چل،۔۔۔۔ یہاں تو تو مر جائے گا۔۔۔ لیکن مٹرو نے ٹھاکر کی بات ان سنی کر دی تھی۔

نندو آج بھی رات کو دیر سے لوٹا، آج اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی،۔۔۔۔۔ اور مٹرو سمجھ گیا کہ نندو دارو پی کر آیا ہے۔۔۔۔ وہ تھرا گیا۔ اُف۔۔۔۔۔۔

سولہ برس کا یہ نازک لڑکا اور ابھی سے شراب پینے لگا۔۔ نشہ میں نندو نے پہلی بار اپنی بہو کو مارا بھی، ـــ مٹرو سناٹے میں آ گیا۔ اس نے سوچا۔ یہ لڑکا بھی ہاتھ سے گیا۔۔۔۔۔

اس رات مٹرو کو نیند نہیں آئی، وہ جاگتا رہا۔ رہ رہ کر لمبی سانس لیتا اور بڑبڑاتا، اے بھگوان، کیا ہونے والا ہے۔۔۔۔۔۔

صبح مٹرو نے نندو سے کہا "نندو آج سے تو رکشہ چلانے نہیں جائے گا؟"

لیکن بابو ـــــ پھر گھر کا خرچہ کیسے چلے گا؟"

آج سے میں رکشہ چلاؤں گا ـــــ میں نہ بیمار ہوں اور نہ کمزور ـــــ اب میں اور زیادہ تجھے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا ـــــ

مٹھو کی سانس تیز ہو گئی ـــــ اس کے منہ سے الفاظ نکل نہیں پا رہے تھے،

اور اسی دن اچانک مٹھو نے نندو کی بہو سے کہا، بہو، سب سامان باندھ لے، ـــــ ہم گاؤں واپس جائیں گے ـــــ اس شہر میں میرا نندو کسی کام کا نہیں رہے گا ـــــ

یہ شہر سورگ کا نقاب اوڑھے نرک کے کھنڈر ہیں ـــــ ہمارے لئے گاؤں ہی اچھے ہیں ـــــ ●●

فضا ابنِ فیضی

سمتیں انجانی، سفر تنہا، ذرا آہستہ چل
آنکھ سے اوجھل نہ ہو رستا، ذرا آہستہ چل

تو کسی بھیگے ہوئے بادل کا ٹکڑا ہی سہی
سامنے ہے دھوپ کا صحرا، ذرا آہستہ چل

سلسلہ جو کچھ ہے سانسوں کا، اسے نازک نہ جان
لے اڑے تجھ کو نہ یہ جھونکا ذرا آہستہ چل

پاؤں کے نیچے لکیریں اور لمبی کھنچ گئیں
وقت سے مجھ کو یہ کہنا تھا ذرا آہستہ چل

تیز گامی کی روش، مہلک بھنور سے کم نہیں
ہر قدم ہے آگ کا دریا، ذرا آہستہ چل

رائگانی کے سفر کی کچھ نشانی چاہیئے
جمع کر لوں کچھ نقوشِ پا، ذرا آہستہ چل

اک ذرا سی نیند تو لے لوں کہ لمبا ہے سفر
خواب کا آنکھوں سے ہے رشتا ذرا آہستہ چل

یہ مسافت توڑ دے گی، خیمۂ جاں کی طناب
تو مسافر ہے تھکا ہارا، ذرا آہستہ چل

دیکھ فانوسِ جنوں ہیں پاؤں کے یہ آبلے
بجھ نہ جائے درد کا شعلہ، ذرا آہستہ چل

شوخیٔ رفتار ہی زنجیرِ پا بن جائے گی
تو سہی آہوئے آوارہ، ذرا آہستہ چل

زندگی بھاری مسائل کا ہے پشتارہ فضاؔ
دیکھ! تجھ پر بوجھ ہے کتنا ذرا آہستہ چل

پرویز باغی

وقت بے وقت منظر بدل جاتے ہیں
شہر کے موسموں کا بھروسا نہیں
تیری یادیں سہارا ہیں میرے لئے
اجنبی شہر میں بھی میں تنہا نہیں
ہم بھی کیوں اُس کو ابرِ کرم ہی کہیں
اپنی بستی پہ بادل جو برسا نہیں
بزم میں ہے چراغوں کی کثرت مگر
میرے دل کی طرح کوئی جلتا نہیں
اُس کے ہمراہ برسوں رہے ہو مگر
تم نے پرویز کو اب بھی سمجھا نہیں

عنوان چشتی

عجیب بات ہے سہما ہوا ہے لشکر کیا
دکھائی دینے لگے دُور سے بہتّر کیا
عجیب بات نشہ بھی ہے کرب بھی ہے بہت
اُتر رہا ہے رگ و پے میں "زہرِ نشتر" کیا
جو سُن سکو تو سناؤں، سمجھ سکو تو کہوں
"نظر سراب" ہے کیا اور "دلِ سمندر" کیا
یہ کون سا ہے مصوّر کہ ہونٹ زخمی ہیں
تراشتا ہے یہ بوسوں سے "حُسنِ پیکر" کیا
جو خط لکھو تو ہمارا سلام بھی لکھیو
پھر اُس کی چھت پہ اُترنے لگے کبوتر کیا
کبھی ہے شاعر و صوفی، کبھی حبیب و رقیب
تمہیں بتاؤ کہ عنوانؔ ہے قلندر کیا

ڈاکٹر حسن امام

جوش ملیح آبادی کی شاعری

شبیر حسن خاں جوش، "شاعرِ انقلاب"، قصبہ کنوہارہ ملیح آباد (اودھ) میں ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے تھے اُن کا انتقال ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو ۸۷ سال کی عمر میں اسلام آباد پاکستان میں ہوا۔

جوش اُن خوش نصیب ہونہاروں میں ہیں جنھوں نے ہوش سنبھالتے ہی زندگی میں یادگارِ زمانہ ہستیوں کو بھی دیکھا تھا مثلاً اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، شری پنڈت جواہر لال نہرو اور شری سردار پٹیل [1]

"روحِ ادب"، کے مقدمہ میں اکبر الہ آبادی نے جوش کے خوش آیند مستقبل کی پیشنگوئی کی ہے اور یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ کاش وہ (اکبر الہ آبادی) اقبال اور جوش کے ساتھ یکجا ہوتے۔ [2]

جوش نے اپنے کلام کے بہت سے مجموعے یادگار چھوڑے ہیں مثلاً: روحِ ادب، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، حرف و حکایت، رامش و رنگ، سموم و صبا، سیف و سبو، آیات و نغمات، جنون و حکمت، شاعر کی راتیں، پیغمبرِ اسلام اور نثر میں اپنی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات۔

جوش عصرِ حاضر کے اُن شعرا میں ہیں جو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب کا قول ہے کہ: اقبال کے بعد شاید یہی غزل کو نظم کا تسلسل اور کائناتی لباس اور نظم کو غزل کی رنگینی اور شیرینی بخشنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ "اُن کی غزل میں صفائی، روانی اور سلاست کے ساتھ ایک بلند آہنگی و مردانگی پائی جاتی ہے عشق و رندی اُن کی غزل کا خاص موضوع ہے اس لئے وہ خود کو "ہمتائے حافظ شیراز"، کہتے ہیں۔ ؎

آ رہی ہے صدائے ہاتفِ غیب
جوش ہمتائے حافظِ شیراز

---

[1] "یادوں کی بارات" ــــ جوش ملیح آبادی۔ ص ۲۱۵ ــــ ۲۱۸ ناشر آئینۂ ادب لکھنؤ۔ اشاعت سنہ ۱۹۷۳ء۔

[2] "لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر جج الہ آبادی کی رائے"، روح ادب۔ (سنہ ۱۹۲۰ء تک کا کلام)۔ جوش ملیح آبادی۔ ص ۵ ــ ۶ تاج آفس محمد علی روڈ۔ بمبئی۔

جوشؔ کی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۶ء تک کی غزلیں
قدیم رنگِ تغزّل کو پیش کرتی ہیں۔ ۱۹۲۶ء سے اُن کی
غزلوں میں ایک طرح کا نکھار پیدا ہوتا چلا گیا ہے
یہاں تک کہ وہ غزل کے ایک صاحبِ طرز اور
ایک اچھے مزاج داں ثابت ہوئے اور اُن کی غزلوں
مثلاً: ؎

کرچکیں جب کام اپنا تشنگی کی شدّتیں
کوئی شانے پر لئے رطلِ گراں آیا تو کیا
تشنہ لب ہستی کا پیمانہ چھلک جانے کے بعد
مغبچے آئے تو کیا پیرِ مُغاں آیا تو کیا

اور:

جب گجر کی صدا جگاتی تھی
ہائے کچھ اور نیند آتی تھی
جب چٹختی تھی پور پور اُن کی
دیر تک کائنات گاتی تھی

کو ابدی شہرت حاصل ہوئی۔ قدیم
رنگِ تغزّل میں جوشؔ کی ایک مشہور غزل ہے۔ اس
غزل میں اُن کی قوّتِ غزل گوئی ایک بلند آہنگی کے
ساتھ سازِ غزل چھیڑتی ہے۔ ؎

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اے کلی ناز سے کھل، بادۂ سرجوش اُبل
کہ نگارِ چمن و شاہدِ مستاں آیا
کجکلاہی کا سر و برگ مبارک اے جوشؔ
لے پیامِ شکنِ طرّۂ جاناں آیا

جوشؔ کی ترکیبوں میں بندش کی چستی و دلکشی ہے
اور وہ صوفیانہ مضامین اور معرفت کے رموز نہایت سادگی
سے نظم کرتے ہیں اُن کی ایک مشہور غزل ہے اور خیالات
پاکیزہ ہیں۔ مطلع کا شعر ہے ؎

پا چکا طاعت کی لذّت درد کے پہلو بھی دیکھ
شیخ آ، محراب سے باہر خمِ ابرو بھی دیکھ

اس غزل میں حُسن و عشق کی روح دوڑا کر صوفیانہ
کوائف کو شوخی سے اور معرفت کے رموز کو جس والہانہ
طور سے جوشؔ بیان کرتے ہیں، وہ کچھ اُنہیں کا حصّہ
ہے ؎

تا کجا طنبورۂ یزداں فریبِ خانقاہ
آ، کسی دن میکدے کا رقصِ ہاؤ ہُو بھی دیکھ
موشگافی تا کجا "واللیل" کی تفسیر میں
مہ وشوں کے دوش پر بکھرے ہوئے گیسو بھی دیکھ
حُسن ذرّوں سے اُبلتا ہے کبھی تو جام اُٹھا
دیکھتی ہیں جوشؔ کی آنکھیں جو عالم تو بھی دیکھ!

جوشؔ نے اپنی غزلوں میں عشق و رندی، خمریات،
معاملاتِ حُسن و عشق، صوفیانہ کوائف و رموز اور انقلابی
مضامین بھی نہایت صفائی روانی اور سلاست زبان کے
ساتھ ایک بلند آہنگی اور مردانگی سے بیان کئے ہیں مگر
اُن کے رنگ میں اُن کے ہمعصر جگرؔ مرادآبادی کی جیسی رنگینی
و سرمستی کم ہے اور حق تو یہ ہے کہ غزل کی شیرینی اور
گداختگی اُن کے بس کی بات نہیں۔ اُن کی طبیعت غزل سے
زیادہ نظم کے لئے موزوں تھی، اور جوشؔ اپنی غزل گوئی کے
دور میں نظم سے بیگانہ نہیں تھے۔ اُنھوں نے غزلوں سے
زیادہ اپنی منظومات کے مجموعے یادگار چھوڑے
ہیں۔ اور اُن کی شاعرانہ مہارت کو نظموں میں اچھی طرح
سے اُبھرنے کا موقع ملا ہے۔ اُن کی غزلوں کو یہ مقام حاصل
نہیں ہے۔ اُنھوں نے اپنی نظموں میں حُسن کی جو مورتی بنائی
ہے وہ ہماری دُنیا کی جیتی جاگتی سچّی دیوی معلوم ہوتی ہے۔
جوشؔ اپنی مشہور نظم "جنگل کی شاہزادی" میں ایک تصویر
دل موہ لینے والے انداز میں کھینچتے ہیں ؎

کانوں پہ خوبصورت اِک بالنسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

زاہد فریب، گل رُخ، کافر دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رُخ، نوخیز، حشر ساماں
کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بُو
سرو چمن، سہی قد، رنگین جمال، خوش رو
گیسو کمند، مہ وش، کافور فام قاتل
نظارہ سوز، دلکش، سرمست، شمعِ محفل
ابرو ہلال میگوں، جاں بخش، روح پرور
نسریں بدن، پری رُخ، سیمیں عذار، دلبر
آہو نگاہ، نورس، گلگوں، بہشت سیما
یاقوت لب، صدف گوں، شیریں بلند بالا
غارت گر تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں
گلشن فروغ، کمسن، مخمور ماہ پارا
"دلبر کہ در کفِ اوموم است سنگ خارا

اور حُسن کے لیے اُنھوں نے انتخاب سے کام نہیں لیا اور اُنھوں نے حُسن سے متاثر ہو کر اپنی رومانی شاعری کو پیش کیا، دیو مالا پیکروں کے حُسن کی تصویر کشی جوش نہیں کرتے بلکہ وہ مختلف الوقوع زمانوں کے تجربات ومشاہدات کو منظوم کرتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ حُسن وعشق کے وہ آتش نفس مُغنی ہیں۔ جوش کی نظمیں مثلاً "یہ کون اُٹھا ہے شرماتا"، "جوانی کی آمد آمد"، "اُٹھتی جوانی"، "پری چہرہ"، "جمنا کے کنارے"، "گنگا کے گھاٹ پر"، "مالن"، "دامن والیاں"، "جنگل کی شاہزادی"، "حُسنِ بیمار"، "شاعر کی سناز"، "اشکِ اوّلیں"، اور "کوہستانِ دکن کی عورتیں"، کامیاب لافانی نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں مختلف زمانوں میں اُنھوں نے منظوم کیں اور ان نظموں میں اپنے مختلف زمانوں کے تجربات ومشاہدات کو اُنھوں نے بیان کیا۔ جوش اپنی نظم "کوہستانِ دکن کی عورتیں" میں لکھتے ہیں ؎

واہ کیا کہنا ترا اے حُسنِ ارضِ ماہتاب
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگین شباب
چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں بے مثال
عورتیں ہیں، یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب
یہ جواں چہرے، یہ چہروں میں برنائی کا جوش
تُو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم وگوش
جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس الحفیظ و الاماں
لیجئے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

"شبابیات" کا موضوع جوش کے لئے مخصوص ہے کیونکہ یہ اُن کے حقیقی رنگ ومذاق میں پورا اُترتا ہے جیسے اُوپر کی مثالوں سے واضح ہوا۔ وہ "شبابیات" نظم کرتے ہوئے اس شدّومدّ کے ساتھ عام سطح سے اوپر اُٹھ جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے بعض ناقدین اُن کو "لذت پرست" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر یہ جوش کی شاعری کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ نشاطِ گاہ عالم کا کوئی ماہرو اُن کے اقلیمِ سخن میں آکر چودھویں کا چاند ہی نہیں بلکہ رشکِ مُنیر بن جاتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ "شبابیات" نظم کرتے ہوئے جوش حُسن وعشق کی گفتگو بھی کھول کر کرتے ہیں اور حُسن وعشق کی کوئی بات منظوم کرنے سے پرہیز نہیں کرتے اس لئے بعض ناقدین کو جوش "لذت پرست" نظر آئے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ حُسن اُن کے یہاں ہر حال میں حُسن ہے، چاہے وہ امارت کی جھروکوں سے اٹھکھیلیاں کرتا ہوا نظر آئے یا سڑکوں پر اور بازاروں میں مزدوری کرتا ہوا پامال نظر آئے۔ "حُسن اور مزدوری"، نظم میں جوش کہتے ہیں ؎

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بیقرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
گرد ہے رُخسار پر، زلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں

دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکل عنبر سرشت
ہو رہا ہے کمسنی کا لوچ جزوِ سنگ و خشت
پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہر آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس، مے چمپئی رخسار کی
غم کے بادل، خاطرِ نازک پہ ہیں چھاتے ہوئے
عارضِ رنگیں ہیں، یا دو پھول مُرجھاتے ہوئے
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگینِ شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب
حُسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک، اور پتھر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک کو رسن سے اب چُھڑانا چاہیئے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیئے

جوشؔ کو منظریہ شاعری سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ منظر کشی کرتے ہوئے ادب عالیہ کے بہت سارے الفاظ کا انبار لگاتے ہیں، اس وجہ سے اُن کو الفاظ کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اُن کی تشبیہیں برمحل ہوتی ہیں، وہ مظاہرِ کائنات سے نادر اور اچھوتی تشبیہیں چُن چُن کر نظموں میں موزوں کرتے ہیں اور یہ تشبیہیں بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اُن کی نظموں میں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ اپنے منصبوں کو پہچانتے ہیں اس لئے وہ اپنی جگہوں پر ایستادہ ہیں اور جوشؔ اپنی شاعری میں لفظوں کے جادو سے کہیں بزم آراستہ کرتے ہیں تو کہیں رزم کے سامان برپا کرتے ہیں۔ جوشؔ کو اپنے مطالب کے اظہار کے لئے اپنے کلام میں الفاظ کو ڈھال لینے پر بڑا ملکہ حاصل ہے۔

جوشؔ کی شاعری میں منظر نگاری کے ساتھ جذبات نگاری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں، منظر نگاری کرتے ہوئے بھی جوشؔ جذبات نگاری کی مثالیں جگہ جگہ پیش کرتے ہیں مثلاً جوشؔ کی ایک نظم "پرانی تصویر" ہے۔ اس نظم میں بچپن کی یادیں منظوم کی گئی ہیں جسے ایک تصویر کو دیکھ کر شاعر کے دل نے اپنے عہدِ طفلی کی طرف کروٹ لی اور ایک نظم "پرانی تصویر" لکھی۔ اس نظم میں جذبات نگاری ہے۔ اسی طرح سے جوشؔ کی نظمیں "بہن کی یاد" اور "ماں جائے کی یاد" قابلِ ذکر ہیں اور یہ حسین نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں بھی جذبات نگاری بہت اچھی طرح سے کی گئی ہے۔

جوشؔ کی شاعری کی اعلیٰ ترین خوبی اُن کی انقلابی شاعری ہے، اِس وجہ سے وہ "شاعرِ انقلاب" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں جوشؔ کی انقلابی شاعری کو فراموش نہیں کیا جائے گا، وہ ایک حُریت پسند شاعر ہیں، اُنھیں غلامی کی زندگی سے نفرت ہے، اُنھوں نے انگریزوں کے تسلّط کو ہندوستان پر ایک ظلم و بربریت کے سوا کچھ نہیں سمجھا اس لئے انھوں نے اُس گھڑی ہندوستانیوں کو للکارا تھا، اور اُن کی شاعری دل موہ لینے والی تھی ؎

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ!
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ
اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے
تو ہیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے
تجھ پہ مرے کلام کا ہونا نہیں اثر
چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجوڑ کر
کُھل جائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاجِ سنگ
خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ
خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ
تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام
میں جا کے مقبروں میں سناؤں اگر کلام
خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مُردے نکل پڑیں

جوشؔ نے اپنی انقلابی شاعری میں بہت سے مفید مضامین سمو دئے ہیں اور اپنی انقلابی شاعری کے

ذریعہ سماج کے بعض مذموم پہلوؤں پر سخت تنقید کی ہے۔ مثلاً "پیمانِ محکم"، "غلاموں سے خطاب"، "آثارِ انقلاب" "صدائے بیداری"، "زنداں کا گیت"، "لمحۂ آزادی"، "مستقبل کا غلام"، "زمانہ بدلنے والا ہے"، "شکستِ زنداں کا خواب" "مقتل کانپور"، "حیف اے ہندوستاں"، "تمھوکا ہندوستاں" "نغمۂ قفس"، "مردِ انقلاب کی آواز"، "دردِ مشترک" اور "ناخدا کہاں ہے"، وغیرہ نظموں میں اُنھوں نے ہندوستانی قوم کو مخاطب کیا ہے اور جنگِ آزادی کے لئے ایک انقلاب کی دعوت دی ہے۔ جوشؔ کی انقلابی نظموں نے ایسے وقت میں بڑا کام کیا، اس لئے کہ اُن میں گھن گرج آواز سنائی دیتی تھی اور قوم کو بیدار کرنے کے لئے اس قسم کی شاعری کی ضرورت تھی۔

اُسی طرح سے اُنھوں نے اپنی نظموں میں مزدوروں کسانوں اور پسماندہ طبقوں کے جذبات بھی اس شدّومد کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ اُنھوں نے اُردو شاعری کو حقّ خدمت گزاری سے سبکدوش کر دیا۔

جوشؔ کو رُباعیات سے بھی خاصا شغف ہے۔ اس صنف میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اس کے موضوعات میں بڑی رنگارنگی، وسعت اور تنوّع پیدا کر دیا ہے۔ حقائق و معارف، حُسن و عشق، خمریات، طنزیات غرضیکہ کیا نہیں ہے جو اس مختصر صنفِ سخن میں اُنھوں نے نہیں سمو دیا ہے۔ "جنون و حکمت" جوشؔ کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔

یہاں جوشؔ کی دو رُباعیاں نمونے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ ؎

اک گونج سی تن بدن میں لہراتی ہے
اک تان سی زندگی پہ بل کھاتی ہے
پازیب تمہارے اُنہیں جگ بیت چکا
جھنکار ہے لیکن کہ نہیں جاتی ہے

. . . . (۵) . . . .

یہ رات گئے عینِ طرب کے ہنگام
پر تو یہ پڑا پُشت سے کِس کا سرِ جام
یہ کون ہے۔؟ "جبریل ہُوں"، "کیوں آئے ہو؟"
"سرکارِ فلک کے نام کوئی پیغام"

عصرِ حاضر میں جوشؔ اُردو کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں، اس لئے کہ اُن کی شاعری متنوّع، وسیع، ہمہ گیر اور رنگارنگ ہے۔ اُنھوں نے حُسن و شباب کی شاعری سے انسانی جذبات کی تہذیب کا کام انجام دیا ہے۔ اور انسان دوستی کا ایک پیام دے کر انسانی محبّت کی شمع لوگوں کے دلوں میں فروزاں کر دی ہے۔

جوشؔ کی انقلابی شاعری محض انقلاب، انقلاب کی گھن گرج آواز نہیں ہے بلکہ اُس میں انسان دوستی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے، اور اُس میں سماجی و عمرانی شعور کا گہرا اثر پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔

اس دور میں ہماری شاعری کے سیاسی رجحان میں شدّت و وسعت پیدا کرنے کے ذمّہ دار بڑی حد تک جوشؔ ہی ہیں اور اُنہیں جیسی مقبولیت اب حاصل ہو چکی ہے اچھے اچھے شعراء کو اپنی زندگی میں نصیب نہیں ہو سکی۔ بحیثیت مجموعی جوشؔ عصرِ حاضر کے صاحبِ طرز اور کامیاب شعراء میں ہیں۔

●

بقیہ آنسوؤں کا رشتہ ص۲۱ سے آگے

"یس یہی ٹھیک ہے"، جنرل کا انداز حاکمانہ تھا۔ لاٹ صاحب کی انا لوٹ آئی تھی۔ اس کی آواز میں شیر کی غرّاہٹ تھی۔

سلطانہ حجاب

غزل

غم کو چھپا لیں ٹیس کے خنجر سمیٹ لیں
آنکھوں میں سارے درد کے منظر سمیٹ لیں
ہم بدنصیب اس کے سوا اور کریں بھی کیا
خاموشیوں کے دل میں سمندر سمیٹ لیں
اک شام دل کی شاخ پہ اترا تھا جو پرند
بکھرے پڑے ہیں اس کے جو کچھ پر سمیٹ لیں
ہمدردی و خلوص وفا دوستی کے نام
اپنوں نے پھینکے درد کے خنجر سمیٹ لیں
کیا نام دے سکے گا زمانہ انھیں حجاب
پھولوں کی آرزو میں جو پتھر سمیٹ لیں

منوہر لال ہادی

سانیٹ

جب سے جانے لگ گیا ہے شوق لالہ زار تک
نکہتِ گُل کے فسوں سے یہ مسیحا ہو گیا
اور اس اعجاز کا تا دُور چرچا ہو گیا
رُو بہ صحت ہو گئے ہیں لا دوا بیمار تک
جب سے جانے لگ گیا ہے شوق کوئے نُور تک
جو کبھی محروم بصارت تھے وہ بینا ہو گئے
فہم و دانش کا چھلکتا آبگینہ ہو گئے
دشت پیما ہو گئے ہیں بے بس و مجبور تک
جب سے جانے لگ گیا ہے شوق سجدہ گاہ تک
راہ تاباں، منزلِ تاریک تاباں ہو گئی
زیست آساں ہو گئی، الطاف ساماں ہو گئی
اور چوکس ہو گئے ہیں راہئ گمراہ تک
شوق کی جھنکار جوں جوں تیز ہوتی جائے گی
گردشِ ایام راحت بیز ہوتی جائے گی

تعمیر ہریانہ

مہدی ٹونکی

دُشمن

بچپنے میں جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو جھونپڑوں میں پایا۔ غریبی کی ٹی بی ہم بھائی بہن اور ماں پر ہی نہیں گھر کے در و دیوار پر بھی لگی ہوئی تھی۔ دماغ میں پھڑ پھڑاتا سوچ کا پنچھی ہر وقت چونچیں مارتا ——— کیا جینا اسی کو کہتے ہیں۔ نہ تن بھر پورے کپڑے اور نہ پیٹ میں دو وقت کی روٹی۔ اور نہ سونے کے لئے بے فکر چھت۔ دوسروں کے پاس یہ سب کچھ کیوں ہیں؟ ہمارے پاس کیوں نہیں ہیں؟ کیا زندگی کی یہ اہم ضروریات ہمیں میسر نہیں ہو سکتیں؟

اور تب سوچ کا پنچھی پھڑ پھڑاتا ——— ضرور ملیں گی، ضرور ملیں گی۔ اگر حاصل کرنے کے لئے بھرپور محنت کی جائے۔

پھر میں نے مستحکم ارادہ کر لیا کہ میں سخت محنت کروں گا۔ چاہے جسم تھک جائے ٹوٹ جائے میں تعلیم حاصل کروں گا کوئی کام سیکھوں گا پھر پیسے کے ذریعہ ہر وہ چیز حاصل کروں گا جو امیروں کو حاصل ہے۔ اس ارادے نے پھر مجھے کبھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ میں دن میں اسکول جاتا اور رات میں مشینری کا کام سیکھتا۔

ماہ و سال کب شروع ہوتے ہیں اور کب ختم ہوتے ہیں، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ موسم کتنے رنگین ہوتے ہیں کتنی پریشانی لاتے ہیں۔ مجھے احساس تک نہیں ہوا۔ میری نظروں کے سامنے کتابیں ہوتیں اور مشینوں کے کل پرزے۔ مجھے صبح و شام دن اور رات کالج کے پیریڈ معلوم ہوتے۔ ایک پیریڈ میں ایک مضمون پڑھا ہے تو اگلے پیریڈ میں دوسرا مضمون پڑھنا ہے۔ ابھی اس کلاس میں تھے تو اب لیبوریٹری میں جانا ہے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب میں کالج میں پڑھ رہا تھا تو ایک مکان کے کمرے میں کرائے پر رہتا تھا۔ پڑھتے وقت تازہ ہوا اور روشنی کے لئے کمرے کی کھڑکی کھولتا تو اس کے کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی سامنے مکان کی کھڑکی بھی کھل جایا کرتی تھی اور اس میں سے نکلتا تھا خوبصورت چاند سا چہرہ۔ ایسا چہرہ جس پر سے نظریں ہٹائی نہیں جا سکتی تھیں۔ دو تین منٹ تک میں اسے دیکھتا ہی رہتا تھا۔ وہ بھی کھڑکی کے پٹوں پر ہاتھ دھرے بنا پلک جھپکائے دیکھتی ہی جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں نشے کا سمندر تھیں جس میں ڈوبتا ہی جاتا تھا۔ پھر اچانک مجھے میرے اندر سے کوئی جھنجھوڑتا دماغ میں

میرا مستقبل، میری منزل سگنل دے اٹھتی۔ میں اُس
کی ساحر آنکھوں سے ایسے ہی تڑپھڑا کر آزاد ہوتا —
جیسے ڈوبنے والا شخص جلدی جلدی ہاتھ پاؤں پانی میں
مار کر سطح پر اُبھر کر سانس لے۔ میں ٹیبل کی طرف پلٹتا
اور کتاب کھول کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ وہ کھڑکی کھولے
مجھے دیکھتی رہتی۔ اُس کا چہرہ مجھے ہر صفحہ پر چسپاں
نظر آتا۔ جتنی توجہ سے میں سطروں کو دیکھتا۔ اُتنی ہی
تیزی سے سطریں گڈمڈ ہو کر اس کے چہرے کے خوبصورت
خطوط بن جاتیں۔ میں پریشان ہو جاتا۔ میں سر پکڑ لیتا۔
پھر بال نوچتا ہوا غصہ سے اُس کی طرف دیکھتا۔ وہ
ہنس دیتی اور کبھی گردن جھکا لیتی جیسے وہ اپنی اس
حرکت سے شرمندہ ہے مگر دل سے مجبور رہے۔

میں سوچتا — میں کیا کروں؟ کیا میں بھی اس
سے عشق شروع کر دوں؟ لیکن دوسرے ہی لمحے خیال
آتا — عشق اور شادی کے چکر میں اگر تو پڑ گیا تو
پھر تیرے عزائم کا کیا ہوگا؟ تیری منزلِ مقصود کا کیا
ہوگا؟ کیا تو ان لاکھوں کروڑوں مفلس لوگوں کی
لائن میں کھڑا ہونا چاہتا ہے جن کو دو وقت پھر پیٹ
کھانا بھی نہیں ملتا۔ جن کے تن پر پورے کپڑے بھی نہیں
ہیں۔

میں جلدی سے کھڑکی بند کر دیتا۔ لیکن تازہ ہوا
اور روشنی کے لئے پھر مجھے کھڑکی کھولنا پڑتی اور
وہ مجھے سامنے کھڑی ہوئی ملتی۔ پھر میں نے ذہن پر
جبر کر کے فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے ایک مہینے تک
کے لئے کھڑکی بند کر دی کیونکہ امتحان قریب آ گئے
تھے۔ میں گھٹن اور کم روشنی میں بھی یکسو ہو کر پڑھائی
میں لگ گیا۔

اور جب ایک ماہ بعد کھڑکی کھولی تو سامنے
والی کھڑکی بند ملی اور آگے بھی کئی دنوں تک بند ہی
رہی۔ یہاں تک کہ میں اپنی کھڑکی زور سے کھولتا اور
زور سے ہی بند کرتا مگر وہ کھڑکی نہ کھلنا تھی اور نہ
کھلی۔ میرا جی پڑھائی میں نہیں لگا۔ مجھے تشویش
ہوئی۔ اُس کے مکان کے سامنے پرچون کی دوکان تھی۔
باتوں ہی باتوں میں اُس دوکاندار سے معلوم کیا تو
میرا دل بیٹھ گیا۔ اُس لڑکی کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ
یہاں سے بہت دور، دوسرے شہر میں چلی گئی۔
نہ جانے کیوں میں گہرے غم میں ڈوب گیا۔ کئی دنوں تک
پڑھائی میں دل ہی نہیں لگا۔ بجھا بجھا سا رہا مجھے ایسا
لگا جیسے وہ لڑکی نہیں کھوئی ہو، میری پوری ایک
لائبریری کھو گئی ہو۔

پھر میں نے ہمیشہ کے لئے وہ کھڑکی بند کر دی
اور پڑھائی میں جُٹ گیا۔ ماہ و سال کیسے بیتے مجھے ہوش
نہیں۔ پڑھائی ختم کر کے نوکری کی اور نوکری سے جلدی
ہی بزنس میں اُتر آیا۔ جس کو جس شے سے محبت ہوتی
ہے اور اُس کے لئے محنت بھی کرتا ہے تو وہ شے
اُسے ضرور ملتی ہے مجھے روپے پیسے کی طلب تھی کیونکہ
میں مفلسی میں پلا تھا۔ مجھے بزنس میں خوب فائدہ
ہوا خوب دولت کمائی۔ میں نے شاندار مکان بنوایا،
من پسند خوبصورت لڑکی سے شادی کی۔ جلد ہی میں
تین خوبصورت بچوں کا باپ بن گیا۔ میں ہر طرح خوش
اور مطمئن تھا مگر آج۔۔

آج — آج میری ساری خوشیوں اور
اُمیدوں کی عمارت ڈھے گئی۔ جس خوشحال زندگی
کے لئے میں نے اپنا چین و سکون کھویا، زندگی عیش
و آرام سے گذرے اس کے لئے ایک ایک چیز کو بڑی
جانفشانی سے جمع کیا اور ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر
میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ میری اپنی ملکیت ہیں، مجھ سے

بھی یہ جدا نہیں ہوں گی۔ انہیں کوئی لے نہیں سکتا۔
یہ سب چیزیں، میرے خون پسینے کی دولت ہیں لیکن
ابھی ابھی میرے سامنے یہ خون پسینے کی کمائی ایسے
تقسیم ہو گئی ہے جیسے میں مر گیا ہوں۔ میری ہی موجودگی
میں میرا خون ہر چیز پہ تابعی ہو رہا ہے۔

آج، ابھی جیسے ہی میں اپنی فیکٹری سے گھر
آیا تو بچے مجھے کھیلتے ہوئے آنگن یا ہال میں نہیں ملے۔
میری بیوی کچن میں تھی۔ میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف
گیا۔ مجھے اپنے کمرے میں سے بچوں کی آواز سنائی دی۔
مگر لڑائی جھگڑے جیسی۔ اس لئے میں دبے قدموں سے
کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ میرے تینوں
بچے تیز تیز لہجے میں بول رہے تھے۔ میں نے پردہ ذرا سا
ہٹا کر جھانکا۔ میرا بڑا لڑکا بند الماری پہ پیٹھ لگائے
کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نقلی رائفل تھی۔ وہ
غصے بھرے لہجے میں غرا رہا تھا۔

"یہ میری الماری ہے۔ اس کے اندر کا سارا مال
میرا ہے اس کو کوئی ہاتھ نہیں لگانا ــــ" منجھلا
لڑکا بند تجوری پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی نقلی
رائفل تھی، وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا "یہ تجوری
اب میری ہے اس میں رکھے سارے پیسے میرے ہیں
اسے کوئی نہیں لے سکتا۔"

اور میرا چھوٹا لڑکا بیڈ پر ٹرانسسٹر،
ٹیپ ریکارڈ، ریڈیو کچھ زیورات کے ڈبے پھیلائے
بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں نقلی پستول تھا جسے اس نے
دونوں بھائیوں کی طرف تان رکھا تھا وہ فلمی اسٹائل
میں آنکھیں نکالتا ہوا غرایا "خبردار جو اس طرف دیکھا
اگر کوئی اس طرف بڑھا تو ــــ"

اس منظر سے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔
مجھے میرے ہی لڑکے دشمن نظر آنے لگے۔

بہار صدیقی

غزل

سکوں سے رہتے ہیں بیگانہ بس وہی اکثر
برائیوں پہ جو رکھتے ہیں دوسروں کی نظر

کہیں مزاج میں تلخی کہیں زباں خنجر
یہ جدتوں کے عناصر ہیں آج باعثِ شر

عداوتوں میں ہے سرگرم اب ہر ایک بشر
کثیف دل پراگندہ ذہن حال ابتر

جو چاہتا ہے کہ دنیا رہے شریکِ سفر
بنا نہ بہرِ خدا تو زباں کو خنجر

بھریں گے زخم نہ اس کے کبھی لگائے ہوئے
لگا کسی کے نہ اپنی زباں کے نشتر

خیال فحش نظر بد بہ ہر قدم الجھن
بنا ہوا ہے جہنم ترقیوں کا گھر

نہ اعتبار جہاں ہو نہ اعتماد کا رنگ
مسرتوں کا ہو کیونکر وہاں بہار گذر

سید حسن اختر

غزل

بہت گھٹن ہے مکاں میں، ہوا مخالف ہے
سکون، دل کو ملے کیا؟ فضا مخالف ہے

ہر اک فصیل کھڑی ہے، کسی سہارے پر
کسی سبب ہی زمانہ مرا مخالف ہے

شعور شرط ہے، آتی ہیں کام تدبیریں
ادھر چراغ نہ رکھیئے ہوا مخالف ہے

اُسے خبر نہیں کیا شے ہے مصلحت کوشی
عجب شخص ہے سب کا کھلا مخالف ہے

ملا تپاک سے میں جب، لپٹ گیا مجھ سے
جسے یہ کہتی تھی دُنیا "بڑا مخالف ہے"

میں رہ گیا تھا فقط روشنی میں گمُ ہو کر
مجھے خبر نہ تھی جلتا دیا مخالف ہے

ہے مصلحت کا تقاضہ ابھی نہ سمجھاؤ
ابھی وہ شخص تمہارا نیا مخالف ہے

قاصر مجیبی

غزل

جو آب ذناب سے گذرے وہ زندگی رکھئے
خدا شناس اگر ہیں تو پھر خودی رکھئے

سمجھتے رہیئے ارادوں کو اور اداؤں کو
کہ اپنے پاس کبھی مشعل شناختی رکھئے

لگاتے رہیئے خوشی کو گلے بہت بہتر!
مگر غموں سے بھی تھوڑی سی دوستی رکھئے

بنائیے نہ کبھی خود کو اس قدر قیدی
کہ اپنے آپ سے ملنے کی بے بسی رکھئے

ہمارے بچے گپھاؤں سے کبھی پلٹ آئیں
گھروں میں اپنے ہمیشہ وہ روشنی رکھئے

جہاں میں ذوقِ تعشّر کا زہر پھیلا ہے
بچا کے علم و ہنر فکر و آگہی رکھئے

جو درسگاہِ محبت سے اُٹھ گیا قاصر!
کتابِ حسن اُسی کے لئے کھلی رکھئے

طنز و مزاح

رؤف خوشتر

اور گماں کے اپنا

پہلے لوگ واضح افکار اور صالح اولاد کی وجہ سے دنیا میں مشہور و مقبول ہوتے تھے۔ اب وہ ان دونوں نعمتوں سے محروم نظر آتے ہیں۔ اور یوں اس دنیا میں جانے پہچانے جانے کے لئے سوانحِ حیات کو قلمبند کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

صاحبِ کتاب سوانحِ حیات کے لئے غیر معمولی ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ عام آدمی جس کی خشک اور سپاٹ زندگی جو کسی طرح کے اسکینڈل، کمیشن، خورد برد، رشوت، غبن، معاشقے اور دیگر اتار چڑھاؤ اور سنگین و رنگین واقعات سے یکسر خالی ہو تو وہ بھلا خود نوشتہ داستان کو رنگین کیسے بنا سکتا ہے۔

چنانچہ سماجی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی سائنسی اور دیگر شعبہ جات کے چھوٹے موٹے ماہر جیسے ہی اپنی آپ بیتی کو قلمبند کرنے کا اعلان کرتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ بہتی ہوئی گنگا میں خوب ڈبکیاں لگا کر اب ستانے کے لئے شہرت کا ساحل ڈھونڈ رہے ہیں۔

اس شہانے سوانحی اعلان کے ساتھ ہی ان کے حریف اب حلیف بن جاتے ہیں۔ اور اس متوقع کتابِ زلیست میں اپنا ذکرِ خیر شامل کرنے کی کوشش میں

[illegible]

ایک عدد ہار، ایک فوٹو گرافر اور اخبار کے نمائندے کو لے کر ان کے یہاں پہنچتے ہیں۔

ہار پہنا کر ساتھ میں فوٹو کھنچوا کر اکلوتے صحافی سے ان کا پہلا اور آخری انٹرویو دلواتے ہیں۔ جس میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ اس سوانحی شہ پارے سے کس طرح آنے والی نسلیں متاثر ہوں گی اور وہ شاندار ماضی کے صحت مند اقدار کی جھلکیاں ان اوراق میں پا سکیں گے اور یہ محض ایک داستانِ فرد نہیں حکایتِ عصر ہو گی۔ اس سوانحِ حیات کو عالمی اور آفاقی سطح پر تولنے کی کوشش کرنی چاہیئے وغیرہ وغیرہ

انٹرویو ختم ہونے کے بعد حلیف نما حریف پیشگی مبارک باد پیش کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ یوں "آپ کی ساری زندگی ہمارے لئے کھلی کتاب کی سی ہے لیکن اس کاغذی پیرہن سے آپ کی ہمہ جہت شخصیت ابھر کر آئے گی۔ اور یوں اس قدر افزائی سے ماضی کے تلخ واقعات کو بھلانے پر مجبور کرتے ہوئے تجدیدِ تعلقات کے لئے راہ ہموار کر لیتے ہیں۔

ہم ایک ایسے شناسا کے یہاں پہنچے جو کبھی وزیر تھے پر اب انتخاب میں ہار گئے تھے اور اپنی بدا

حیات قلم بند کر رہے تھے۔ ہم نے دستک دی تو کچھ دیر بعد دروازہ کھولا۔ اندر بلایا۔ میز کے پیچھے پردہ سے چند کتابیں جھانک رہی تھیں۔ غور سے دیکھا تو وہ مشاہیرِ عالم کی خود نوشتہ کتابیں تھیں ـــــ کھسیانے ہو کر کہنے لگے۔

"میری ہنگامہ پرور اور بھرپور زندگی سے ان لوگوں کے کارنامے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ اب میں مشکل میں آگیا ہوں کہ اپنا کون سا کارنامہ لکھوں اور کونسا چھوڑ دوں۔"

ہم نے اُن کی کتاب کی پیش رفت کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے۔ اپنی داستانِ حیات کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے جیسے بچپن، تعلیم، کھیل کود، جوانی، معاشقے، شادیاں، سیاسی ہنگامے، جلوس، تقاریر، خطوط وغیرہ وغیرہ۔

ان ابواب سے متعلق بھرپور معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک سوال نامہ چھپوا کر دوست احباب اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر آپ میری اس کتاب کو جو صدی کی عظیم الشان تحریری یادگار ہوگی، اپنا ذکر چاہتے ہیں تو سوال نامہ پُر کر کے ایک تازہ فوٹو اور سَو روپے کا ڈرافٹ روانہ کریں۔

ماشاءاللہ بڑا اچھا تاثر مل رہا ہے۔ اس کتاب کو شایانِ شان بنانے کے لئے ہر کوئی دامے درمے سخنے تعاون دے رہا ہے۔

پھر پیار سے اپنے سر کے گھنے بالوں اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے۔

"تم تو جانتے ہو۔ الیکشن میں ہارنے کے بعد قلاش ہو گیا تھا اور بال بال مقروض تھا اب سارے قرض اور فرض (بچیوں کی شادیاں) ادا ہو گئے ہیں یہی نہیں وہ لوگ بھی جن کو رقم دینی تھی قرض معاف کر کے سوال نامہ لے گئے ہیں۔

"سوالات تو دیکھیں ذرا"، ہم نے مجسم سوال بن کر پوچھا۔

کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے بس صرف چند سوالوں پر قناعت کر گیا ہوں۔ یہ سوالات ہیں۔

۱۔ میں آپ کو پہلے کہاں ملا تھا؟ اس یادگار ملاقات کو کم سے کم تین سو سطروں میں اس طرح لکھیئے کہ ہر کوئی مجھ سے ملنے کا مشتاق ہو۔

۲۔ آپ مجھ سے کیوں متاثر ہیں؟ جواب واضح ہو تاکہ دوسرے بھی متاثر ہو سکیں۔

۳۔ آپ کو میری کونسی ادا پسند ہے؟ شرمانے سے کام نہیں چلتا۔ آج کل خواتین کو ہی پسند نہیں کیا جاتا۔

۴۔ آپ میرے کہاں تک احسان مند ہیں؟

۵۔ آپ ہر کام مجھ سے ہی کیوں لینا چاہتے ہیں؟

۶۔ مجھے قائد بنانے میں آپ کو خوشی کیوں محسوس ہوتی ہے؟ جبکہ قائد ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

۷۔ آپ کے نزدیک میرا سب سے اچھا کارنامہ کون سا ہے؟ تاکہ دوسروں کو بھی معلوم ہو۔

۸۔ آئندہ انتخابات کے لئے ہر کوئی

میرا ہی نام کیوں لے رہا ہے ؟ اس
ہر کوئی میں آپ بھی ہیں -
۹- میرے بعد جو خلا پیدا ہوگا اُسے
آپ کیسے پُر کریں گے ؟ متوقع خراجِ
عقیدت لکھیں تاکہ اُن کو پڑھ کر میں
بے موت مر جاؤں۔
اب دیکھئے ان سوال ناموں کے بے لاگ اور
غیر جانبدارانہ جوابات اور تفصیلات کی روشنی میں
میں اپنے آپ کو تلاش کر کے آپ بیتی لکھوں گا جو جگ بیتی
ہوگی۔

تو صاحب یوں سوال ناموں، چیکوں ڈرافٹوں
اور عظیم انسانوں کی سوانح حیات سے بھرپور استفادہ
حاصل کرتے ہوئے کچھ اپنی زندگی کے سنسنی خیز واقعات
کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کو اب آپ بیتی اور سوانح
حیات خود نوشتہ سمجھا جا رہا ہے اور سمجھتے ہیں کہ
اپنے شب و روز قلم بند کر رہے ہیں حالانکہ ان کی ساری
معلومات اور کارنامے دوسری شخصیتوں کے ہوتے ہیں
— اور گمان اپنا ہوتا ہے۔

غزلیں

ساحل احمد

اب وہی خود کو منانے نکلے
گھر کی عظمت کو بچانے نکلے
لوگ ہاتھوں میں لئے تھے پتھر
ہم مکاں اپنا بنانے نکلے
کچھ ستاروں کی چمک تھی ایسی
یا ہمیں آگ دکھانے نکلے
پہلی بارش میں زمیں سے کیڑے
موت کا جشن منانے نکلے
سبز رنگوں کے پرندے ساحل
گیت موسم کے چرانے نکلے

کوئی مانگے ہے دعا غور سے سن
دے نہ دستک یہ صبا غور سے سن
سبز ہونٹوں پہ غنائی لہریں
کچھ کہے رنگ ہرا غور سے سن
کوئی شیشہ تو نہیں ہے آنسو
ہاں مگر چھن سے ہوا غور سے سن
صبح دریا پہ کرن کی جنبش
خلق ہوتی ہے صبا غور سے سن
سر ہیں الفاظ بہ قولِ شبلی
ہے حقیقت کہ ریا غور سے سن

●

محبوب راہی

رُباعیات

ہر بات میں اک اپنی سی کر جاؤں گا — جس راہ سے چاہوں گا گزر جاؤں گا
جینا ہو تو میں موت کو دے دوں گا شکست — مرنا ہو تو بے موت بھی مر جاؤں گا

●

یہ دل بھی عجب طرح کی شے ہوتی ہے — کچھ اور ہی اس ساز کی لے ہوتی ہے
وہ راہ جو برسوں کی مسافت مانگے — یہ چاہے تو اک جست میں طے ہوتی ہے

●

رہتا ہے مرا مدِ مقابل مجھ میں — پوشیدہ ہے خود میرا ہی قاتل مجھ میں
مرتا ہوں جسے پی کے میں لمحہ لمحہ — اک زہر ہلاہل بھی ہے شامل مجھ میں

●

اک لمحۂ آخر کی طرح زندہ ہوں — اک جگنو ہوں بجھ بجھ کے بھی تابندہ ہوں
دیوار اندھیروں کی جو میں ڈھا نہ سکا — اس اپنی کم اوقات پہ شرمندہ ہوں

●

کیا شے ہے خوشی رونے کا مقصد کیا ہے — بیداری ہے کیا سونے کا مقصد کیا ہے
میں ہوتا نہ دنیا میں تو کیا ہو جاتا — اور ہوں تو مرے ہونے کا مقصد کیا ہے

●

ہر لمحہ ہے ہر لمحہ کا قاتل، کیا ہے — مرنے کے سوا جینے کا حاصل کیا ہے
اے زیست کو آسان سمجھنے والو — آسان اگر یہ ہے تو مشکل کیا ہے

قمر پروانہ

نکہت شاہجاپوری

اجنبی رشتہ

رات رانی کے تازہ پھولوں کی معطر بیز مہک سے سارا گھر خوشبو میں نہایا ہوا تھا۔ پورنیما کی پُرشباب روپہلی بہار آفریں رات چاند تاروں کی چُنری اوڑھے انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کے مدمست جھونکے اُمنگوں بھری تازگی اور کیف انگیز ہلوریں اٹھا اٹھا کر دل و دماغ کو مسحور کن خوشبوؤں کے گہواروں میں جھلا رہے تھے۔

بارش تھم تھم کر برس رہی تھی۔ نشیب میں بہنے والی ندی میں زبردست طوفان آیا ہوا تھا۔ دونوں جانب کنارے سامان سے لدے ٹرکوں اور راجیہ پریوہن نگم کی سواری بسوں کی لمبی قطاریں کھڑی ندی کے اترنے کا انتظار کر رہی تھیں یہ مصروف ترین قومی شاہراہ کبھی خالی نہیں رہتی۔

بلندی پر بسی آنند نگر کی بستی میں پوسٹ ماسٹر راکیش بابو کا مکان بالکل ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں سے ندی کے دونوں کنارے اور نشیب کا سہانا منظر آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ندی کا پاٹ کافی چوڑا اور گہرا تھا شوقین لوگ اور کلب کے ممبران اس میں ناؤ پر سوار ہو کر تفریح کرتے ہیں۔ راکیش بابو کے مکان کی چار کھڑکیاں اور تین دروازے ندی کی سمت پر کھلتے تھے۔ بابوجی کی اکلوتی بیٹی رچنا واقعی قدرت کی ایک بہترین شاہکار ہے۔ اس کے وجود میں حسن کی تمام خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔ ایم۔ اے۔ اکنامکس کی پرائیویٹ سٹوڈنٹ ہے۔ تعلیم کے ساتھ قدرتی مناظر میں بھی اُس کی کافی دلچسپی ہے۔ وہ اچھی آرٹسٹ بھی ہے۔ گھر میں والدین کے علاوہ دو بھائی اور ایک بھابی بھی ہے۔ چھوٹا بھائی درتیش کمار بیحد چنچل، منہ زور اور شرارتی ہے۔ نویں جماعت کا طالب علم ہے۔ پہلے درجے سے لیکر ابھی تک فرسٹ چلا آ رہا ہے۔ اور بڑے بھیا کی نویلی دلہن ورتا رانی کے مزاج تو آسمان پر ہی رہتے ہیں۔ دو سال گذر جانے کے بعد بھی ان کے دل و دماغ کا جغرافیہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ رات دن ریڈیو سے چپکی رہتی تھی لیکن اب ایک سال سے ٹی۔ وی۔ کیا آگیا ہے کہ اُسے دُنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ وہ بھولے سے بھی گھر کے کام کاج میں ساس نند کا ہاتھ نہیں بٹاتی اور ہمیشہ مصروف رہنے کے ڈھونگ میں مصروف رہتی ہے۔ انل ہسٹری کا پروفیسر ہے۔ جب وہ صبح کالج جانے کی تیاری کرتا ہے تو وہ اخلاقاً تو کیا مجبوراً اس کی کچھ مدد کر دیا کرتی ہے۔ اور کبھی دل نہ چاہے تو ٹکے سا جواب دیکر اپنی دلچسپیوں میں سب کچھ بھول کر مگن ہو جاتی ہے۔

پیر پھسل کر گر جانے سے ماں کے پیر فریکچر ہو جانے سے آج رچنا اکیلی کچن میں جلدی جلدی کام نبٹا

رہی تھی کہ کہیں بھیّا بھوکے ہی کالج نہ چلے جائیں۔ مناّ بھی اسکول جائے گا۔ پپا پوسٹ آفس جائیں گے۔ ایسا نہ ہو یہ لوگ کھانا کھائے بغیر ہی چلے جائیں۔ کام بھی اتنا ہے کہ تنہا ایک آدمی کے بس کا نہیں۔ انل دوبار کچن میں آکر بہن کی پریشانی دیکھ چکا تھا۔ ماں پیر کی تکلیف سے اکیلی اپنے کمرے میں لیٹی کراہ رہی تھی۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اُسے بیحد افسوس ہوا کہ ورشا گھر کے کسی بھی کام میں دلچسپی نہیں لیتی۔ وہ اس کی ماں اور بہن کو نوکرانیوں کی طرح سمجھتی اور ایسا ہی برتاؤ کرتی ہے۔ اور میں خاندانی روایات کو سینے لگائے جھوٹی اور تکلیف دہ شرافت کو نیا ہتے ہوتے اس کی خودغرضی خاموشی سے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ مجھے زبان کھولنا ہی ہوگا۔ میں خاموش تماشائی کی طرح یہ ناٹک روز روز نہیں دیکھ سکتا۔ آخر یہ الٹی گنگا کب تک بہتی رہے گی۔ وہ اکثر ورشا سے گھر کے انتظام اور کام کاج کے بارے میں کہہ کر کالج جاتا اور شام کو آکر وہ یہی دیکھتا کہ ورشا کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی ہے وہ بدستور اپنے معمول کے مطابق اپنی من چاہی زندگی جی رہی ہے کسی کے کہنے سننے کا اس پر کوئی اثر نہیں بلکہ اب وہ انل کو ترکی بترکی جواب دینے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتی۔

آخر ایک دن تنگ آکر انل کے ہاتھ چھوٹ گئے اور اس نے ورشا کی بیت سے ٹپائی کردی دو طمانچے اسکے پھول سے رخساروں پر بھی جمائے۔ گھر میں اچانک اس عجیب سے واقعہ پر سب لوگ بیحد پریشان اور ملول ہوئے۔

ماں نے بیٹے کو اس عمل پر ناراض ہوکر کافی ڈانٹا ڈپٹا وہ بے حد افسوس کے ساتھ بولی: "ارے کوئی عورتوں پر بھی ہاتھ اٹھاتا ہے۔ تیرے باپ نے تو مجھے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہ چھوائی اور تو نے یہ کیا غضب کر دیا منا۔ کتنی بدنامی ہوگی لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ بڑی جگ ہنسائی ہوگی۔ آج تجھے اتنا غصہ کیوں آگیا بیٹے۔ کیا ہوگیا تھا ایسا؟"

تم نہیں جانتی ماں میں کب سے یہ عذاب سہہ رہا ہوں کچھ کہتا ہوں تو زبان لڑاتی ہے۔ گھر میں ذرا سا کام نہیں کرتی اور بات بات پر جواب دیتی ہے۔ بہت بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ اس نے کبھی تمہاری طبیعت کا بھی پوچھا ہے۔ اسے آخر اتنا نشہ ہے کس بات کا تمیز تہذیب تو چھو کر بھی نہیں گزری اس سے۔ آپ کے لاڈ پیار کا وہ ہم سے ناجائز فائدہ اُٹھانے لگی ہے۔ اس گھر کی بڑی بہو ہے یا مہارانی۔ اس کی ان حرکتوں کا ہماری روچی پر بھی خراب اثر پڑ سکتا ہے۔ رچنا خاموشی سے ساری باتیں سُن رہی تھی۔ بابوجی پوسٹ آفس میں تھے۔ مُناّ کہاں چپ رہنے والا تھا گھر کا سب سے چھوٹا ہونہار اور زندہ دل۔ لاابالی چلبلا اور شرارتی لڑکا اسے تو جیسے بھابی اور بھیّا کو چھیڑنے کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہاتھ لگا۔ واقعہ کی گہرائی میں جانے کا اُسے کوئی گمان نہ تھا۔ ابھی بچپن کی حدوں سے اس نے باہر قدم ہی کہاں نکالا تھا۔ جیسے ہی وہ سکول سے لوٹا اور رچنا سے گھر کے گہرے سنجیدہ ماحول اور واقعہ کی نوعیت معلوم ہوئی اس کی رگِ شرارت پھڑکنے لگی۔ فوراً چیچے ٹھلے انداز میں بڑی سنجیدگی سے بھابی کی تھپڑوں سے تواضع کی خبر کو ریڈیو اناؤنسر کی آواز اور انداز میں کہنے لگا۔

"یہ آکاشوانی ہے۔ وِوِدھ بھارتی کا پنچرنگی پروگرام۔ اب آپ انل کمار شرما سے طبلے پر تین تال سنیئے ساتھ دے رہی ہیں شریمتی ورشا رانی شرما۔"

اس کی شرارت بھری باتیں سُن کر انل اس پر لپکا لیکن وہ پہلے ہی بھاگ کر باہر نکل چکا تھا۔ رچنا مسکرا کر کمرے میں چلی گئی ماں نے منا کو تنبیہہ کرنا چاہی لیکن وہ بھاگ چکا تھا۔ انل نے ریڈیو اٹھا کر الماری میں بند کر دیا اور ٹی۔ وی۔ کو رپر لاک لگا دیا۔ پھر وہ شیکسپیئر کا ڈرامہ ہیملیٹ لیکر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ کنکھیوں سے ورشا کو بھی دیکھتا جاتا تھا جو رونے کی ایکٹنگ میں ابھی تک ٹیبل پر سر رکھ کر کہنیوں سے مونہہ چھپائے سسک رہی تھی۔

نعیم بہار ملنہ

کچھ سوچ کر انل نے رچنا کو آواز لگائی۔ رچنا آئی تو اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "سنو رو چی۔ آج سے تم کچن ورک بالکل بند کر دو۔ اور اپنی سٹڈی میں دلچسپی لو۔ آج سے ورشا کھانے پکانے کا کام کریں گی۔ بہت آرام کر چکیں یہ۔ تمہاری پڑھائی بیحد ضروری ہے۔" "اٹھو ورشا منہ ہاتھ دھو ڈالو اور کچن میں پہنچکر کھانا تیار کرو۔ دھیان رہے کھانا ٹھیک ٹائم پر تیار ہو جائے اور اُلٹا سیدھا کچا پکا نہ بنے۔ جاؤ اٹھو جلدی کرو۔"

"نہیں جاتی میں کسی کی نوکر نہیں ہوں۔" ورشا نے جھنجھلا کر کہا۔

"جاؤ ورشا ضد نہیں کرتے۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ آج کے واقعہ کا میں تنہا ذمہ دار نہیں ہوں اگر تم بدزبانی پر اتارو نہ ہوتیں تو تمہارا یہ حال نہ بنتا۔ تم نے خود مجھے زیادتی کرنے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ میں تو تمہیں سمجھا سمجھا کر عاجز آ گیا تھا۔"

"میں نہیں جاتی۔ میں نے کہا نہ میں آپ کے گھر کی داسی نہیں۔ اور آج جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا گیا اس کا انجام بھگتنے کے لئے آپ کو تیار رہنا چاہئے۔ فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔"

ورشا نے تلملاتے ہوئے تقریباً چیخ کر انل کو کھلی وارننگ دے ڈالی۔ وہ غصہ اور شرمندگی سے پاگل شیرنی کی طرح بپھر رہی تھی۔ اُس کا گلابی چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ تھپڑوں کے نشان دونوں رخساروں پر اُبھر رہے تھے۔ رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں تھیں جنہیں وہ مارے غصہ کے دانتوں سے دبا رہی تھی۔ بالوں کی سیاہ ریشمی لٹیں حسین چہرے پر بے ترتیب بکھر گئی تھیں۔ ساڑھی کا آنچل آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ اُسے اپنی بے عزتی پر انتہائی غصہ اور افسوس تھا۔ اور اس پر انل کمار کا کھانا بنانے کے لئے اس سے پیہم اصرار جیسے آگ پر پیٹرول کا کام کر رہا تھا۔

انل بڑے غور سے نہایت پُرسکون انداز میں ورشا کی بدلی ہوئی صورت اور بگڑی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔ اُسے غصہ کے باوجود اس کی اس حالت پر ترس بھی آ رہا تھا لیکن وہ ہمدردی کے دو لفظ کہہ کر بپھرے ہوئے طوفان کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ بس وہ ایک ٹک اُس کے شعلہ بار شباب اور کروٹیں بدلتے ہوئے تیوروں کو دیکھ رہا تھا۔ سامنے رچنا سر جھکائے بیحد غمگین کھڑی تھی۔ اس نے ماحول کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے اپنے بھائی انل سے کہا۔

"بس بھیّا اب رہنے دیجئے۔ بھابی کو زیادہ نہ ستایئے۔ انہیں چھیڑنا کچھ ٹھیک نہیں۔ میں ابھی کھانا تیار کر لیتی ہوں آپ کے کالج ٹائم سے پہلے۔" وہ اتنا کہہ کر کچن میں چلی گئی اور کام میں لگ گئی۔ اُسے بیحد افسوس تھا آج کے ناگوار واقعہ کا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ بھابی کا بھی تو مزاج نہیں ملتا تھا۔ اپنطور کی ایک الگ عورت ہیں۔ اور بھی تو بہو ئیں ہیں۔ عزیز اقارب محلے پڑوس میں۔ ان جیسا کوئی نہیں۔ اور بھیّا بھی پہلے تو خوب لفٹ دیتے چلے آئے اور جب خود پر بیتی تو گھبرا کر ہاتھ اٹھا بیٹھے پتہ نہیں وہ کیا کر بیٹھیں؟ چیلنج تو دیدیا ہے۔ کہیں ایسا کچھ نہ کریں کہ گھر کی عزت مٹی میں مل جائے۔ اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میں تو کچھ بول بھی نہیں سکتی بڑوں کے بیچ میں۔ اُدھر انل اپنی بیوی کو ہموار کرنے کے لئے آہستہ سے غم انگیز لہجے میں بولا۔

"میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا ورشا کہ......

ورشا نے اس کی بات کاٹ کر بیچ میں ہی تلخ اور سخت لہجے میں جھلا کر کہا۔

"میں نے بھی کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ ایسے راکشش آدمی سے پالا پڑے گا۔"

"بس کرو ورشا اب اتنا بھی زہر نہ اگلو چھوڑو پلیز جانے بھی دو کیوں فضول میں رائی کا پہاڑ بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ ہمیں اپنی غلطی کا تو خیال ہونا چاہیئے۔ ہمیشہ بات دونوں جانب سے ہوتی ہے۔ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو اور اپنے آپ کو بالکل بے قصور سمجھ رہی ہو۔"

"اجی رائی کا پربت اور بات کا بتنگڑ میں نے کہاں

وہ تو آپ بنا چکے شریمان۔ اب تو دیکھتے جائیے کیا ہوتا ہے۔"

"پاگل نہ بنو ورشا! میں مانتا ہوں غلطی میری بھی ہے لیکن تم نے تو الف کا افسانہ ہی بنا ڈالا۔ اچھا اسی میں ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کر دو۔"

"اتنی آسانی سے یہ بات یونہی ختم ہو جائے گی۔ اس بھول میں نہ رہیئے آپ۔"

اس نے آپ کو کھینچ کر کہا۔

"تو کیا تم بھی مجھے پیٹنا چاہتی ہو۔ کیا سوچا ہے تم نے۔ کون سی سزا تجویز کی ہے میرے لئے۔ آخر تم انتقام کی آگ کس چیز سے بجھانا چاہتی ہو۔ اگر تمہاری تسلی اس میں ہوتی ہو تو میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں کیونکہ میری اور میرے ماں باپ کی بڑی عزت ہے اور مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ اپنی عزت عزیز ہے۔ سمجھی ورنہ ..... اس کی آواز بھرانے لگی اور وہ خاموش ہو گیا صوفے پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

"نہ۔ نہ۔ اب ایسا کچھ نہ ہو گا..... آپ کی معافی سے میرے دل کے زخم اچھے نہیں ہونے کے۔ اب ہمارے بیچ ایشور ہے۔ میں اب کچھ نہیں سننا چاہتی۔ یہ گھر اور اس گھر کے لوگ نرک اور شیطان کے سمان ہیں میرے لئے۔ آپ کے لئے چاہے دل لگی ہو لیکن میں یہ چوٹ سہہ نہیں سکتی....."

اِدھر یہ باتیں چل رہی تھیں اور اُدھر منا کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے کمرے کی فضا کچھ بوجھل سی لگی اس نے ماحول کو بدلنے کے لئے بھائی کے پیروں میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے ریڈیو اناؤنسر کے سے لہجے میں بھیا اور بھابی کو چھیڑنے کے لئے کمرے کی فضا کو خوشگوار بنانے کے خیال سے اپنے چنچلے انداز میں کہنا شروع کیا:

"یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اکھل بھارتیہ نائیکاؤں کی شرنکھلا میں آج رات دس تیس منٹ پر شریمتی ورشا رانی دوارا رچیت ناٹک 'بڑا اچھا کا آدھا سہاگ' سُننے۔ شیش سہاگ سپتاہ کے دوسرے رویوار کو پرسارت کیا جائے گا۔ پرستت کرتا ہیں۔ شری انل کمار شرما!"

انل تو اسی طرح آنکھیں بند کئے چپ بیٹھا رہا لیکن ورشا تڑپ اٹھی۔ چھوٹے دیور کی اس مزاحیہ چوٹ پر بھڑک کر بولی:

"بہت ٹھٹھول نہ کرو لالہ۔ کہیں بعد کو پچھتانا نہ پڑے۔ اس چیپٹر کو یوں ہی کلوز کر دو تو اچھا ہے۔ بس اب سیما کے اندر ہی رہو۔ میرے دھیرج کو چنوتی نہ دو ورنہ انرتھ ہو جائے گا۔ میں خود اس ادھیائے کو یہیں ختم کر دوں گی۔ وہ ہیم سسکیوں کے درمیان بولی۔" انل خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا قریبی بازار لائبریری میں بے مقصد کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھتا اور رکھتا رہا۔ اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ دماغ نامعلوم اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے سخت رویئے پر دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا۔ اس کی وجہ سے گھر کا ماحول ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ چپ کیوں نہیں رہ سکا۔ بیوی کی بددماغی کو برداشت کرنے کا تو وہ عادی ہو گیا تھا پھر آج اُسے کیا ہو گیا۔ اُسے بیوی کا ماں کے ساتھ طرزِ عمل برداشت نہ ہوا۔ بہن کے ساتھ عدم تعاون کی بات بھی بری لگی۔ اور وہ ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔ بڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد بارش ذرا کم ہوئی تو وہ اٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ راستے میں اُسے شور سُنائی دیا۔ شور ندی کی طرف سے آ رہا تھا۔ لوگ ندی کی سمت دوڑ رہے تھے وہ بھی انجانے خوف سے کانپتا ہوا بھاگا۔ ندی کے کنارے لوگوں کی بھاری بھیڑ جمع تھی اور ندی میں ورشا اور اس سے لپٹی رچنا بہتی ہوئی دور نکل گئی تھیں۔ ندی میں زبردست طوفان آیا ہوا تھا کسی کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ندی میں کود کر ان بہتی ہوئی جواں سال لڑکیوں کو نکال لیتا۔ انہیں ندی کی خونخوار لہروں نے اُلٹ پلٹ کر جانے کہاں بھنور میں ڈال دیا تھا۔

انل کے جاتے ہی ورشا تیزی سے کمرے سے نکلی اور تیز تیز چلتے ہوئے دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ رچنا نے دیکھ لیا اور وہ بھی ہاتھ کا آٹا تھالی میں چھوڑ کر آٹے سے سنے ہاتھوں

سے ہی بھائی کو پکڑنے لپکی لیکن وہ تو تقریباً بھاگتی ہوئی ندی کے پل سے دو دو فٹ ٹوٹے کنارے پر سے چھلانگ لگا کر کود پڑی اُسے بچانے کے لئے اس کے پیچھے ہی رچنا بھی وہیں سے کودی اور اسے پکڑ لیا۔ وہ اُسے تیر کر باہر کنارے پر لانا چاہ رہی تھی اور زور شور خوفناک موجوں کے ڈر سے رچنا سے لپٹ کر بچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ قریب آ گئے۔ دو تین بھنور انہیں لپیٹ کر اچھالنے لگے۔ یہ منظر قریب پانچ منٹ رہا اور پھر تیز اچھلتی موجوں کے تیز تھپیڑوں نے دونوں کو منجدھار میں پہنچا دیا۔ اور پھر پل پر سے بہتی ہوئی ان کی لاشیں دور ہوتی گئیں۔ شور بڑھتا گیا لیکن چڑھتے ہوئے سیلاب میں انہیں بچانے کے لئے کوئی بھی نہیں اُتر سکا اور ادھر بارش نے خطرناک رخ اختیار کر لیا۔ لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے کسی کو خیال نہ رہا کہ انل تنہا کھڑا ایک بیجان مجسمے کی طرح تیز تر بارش میں بلا چھتری کے بھیگ رہا ہے۔ اچانک مُنّا دوڑتا ہوا آیا اور اس سے لپٹ کر رونے لگا۔

"چلو بھیّا گھر ماں بے ہوش پڑی ہے۔ بابا کو جیپ میں ڈال کر آفس کے لوگ لائے ہیں۔ بھگوان کے لئے انہیں سنبھالو بھیّا۔" وہ اُسے کھینچتا ہوا گھر لے جا رہا تھا۔ اسی گھر میں جہاں سے گھر کی لکشمی روٹھ کر ندی کے آنچل میں سما گئی تھی جہاں سے بہن ڈولی چڑھ کر سسرال نہیں گئی بلکہ گھر کی عزت بچانے کی خاطر اپنی جان گنوا بیٹھی ہے۔ اب اس گھر میں کبھی خوشیاں نہیں آئیں گی۔ اب کیا ہوگا۔ ماں کیسے جئے گی لوگ ہمیں کیا کہیں گے۔ ہم لوگوں کو کیا جواب دیں گے۔ قدرت نے ایسا انتقام لیا۔ کیا یہی رشتوں کی عظمت ہے۔ اسی اپنائیت اور عظمت کے سہارے ہم یہ اجنبی رشتے خونی اور زہریلے ماحول میں بھی نباہتے ہوئے جی لیتے ہیں۔ کوئی اس طرح موت کو گلے نہیں لگاتا۔ اور رچنا میری معصوم ننھی رچنا۔ وہ بھی اس کلموہی کی بلی چڑھ گئی۔ کسی نے نہیں بچایا۔ کوئی نہیں اُترا ندی کی منجدھار میں ہوتا۔ اوہ میں گھر سے ہی کیوں نکلا۔ میں نہ جاتا اور وہ باہر نہ نکلتی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُسے جلے کیا

ہوا وہ زور زور سے رونے لگا۔ اپنے ہاتھوں کو دیواروں پر مارنے لگا۔ ریڈیو اٹھا کر پھینک دیا۔ ٹیلیویژن کے تار کاٹ کر باہر پھینکنے نکلا ہی تھا کہ ساتھی پروفیسر جو ابھی ابھی داخل ہوا تھا اس کے ہاتھ سے ٹی۔ وی۔ چھین کر منّا کو دیتے ہوئے بولا:

"صبر کرو انل جو کچھ ہوا خدا کی مرضی تھی۔ ہم اس میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آؤ دوست کپڑے بدلو، تمام تر ہو رہے ہیں۔ ابھی یہ بڑی خبر سُنی اور ادھر بھاگا۔ کیا کسی نے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

"نہیں کون کرتا۔ اس قہر میں کون اترتا۔ جنہیں جانا تھا چلے گئے اور دیکھنے والے ہمیشہ کی طرح دیکھتے رہے۔"

"میں یہی کہوں گا کہ تم ہمت سے کام لو کیونکہ تم خود سمجھدار ہو۔ سب سے پہلے اپنے کمرے کا سامان دیکھو۔ پولیس آنے والی ہے۔ کوئی چیز ایسی نہ ہو جو بعد میں گھر کے باقی لوگوں کیلئے مصیبت ثابت ہو۔

اس نے پروفیسر شاہد کے ساتھ کمرے میں سامان کو بغور دیکھا اور ایک لفافہ سرہانے سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ شاہد نے اس کی جیب سے نکال کر اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ کمرے میں دیکھ بھال کر ہی رہے تھے کہ انسپکٹر شرما اور صدیقی آ گئے چار کانسٹبلوں کے ساتھ۔ گھر کے بزرگ بابو جی۔ ماں اور انل سے کچھ سوالات پوچھے اور کمرے میں بیٹھے ہوئے سامان کا معائنہ کیا۔ کوئی مشکوک چیز نہ ملنے پر لوٹ گئے۔

پولیس کے جانے پر شاہد نے لفافہ انل کو تھما دیا اور اُسے سمجھانے و تسلی دینے لگا۔ بہت لوگ آ گئے تھے۔ وہ تو بس خاموش بیٹھا سب کی باتیں سُنتا رہا۔ سارا دن ہنگامے میں بیت گیا۔ رات کو لیمپ کی روشنی میں وہ خط پڑھنے لگا۔ لکھا تھا:

"پولیس اور محکمہ کے مہودے۔ میں اپنی زندگی سے بیزار تنگ آ گئی تھی۔ میرے پتا میرے ساتھ اتیاچار کرتے تھے آج بھی

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ڈاکٹر راجندر روکس

آنسوؤں کا رشتہ

آج وہ گورنر کے عہدے پر تعینات تھا۔ بچپن سے لے کر عمر کی اِس منزل تک پہنچتے پہنچتے کتنے انقلاب دیکھے تھے اُس نے اپنی زندگی میں مشرقی بنگال یا مشرقی پاکستان کہے جانے والے جس خطۂ ارض کا وہ گورنر تھا، اُس سے وہ فرضِ منصبی کے لئے منسلک ہے۔ اُس کا نفسیاتی ربط اِس مصنوعی پس منظر سے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ ادب و آداب، ضابطوں اور رکھ رکھاؤ کے تانے بانے میں وہ بڑی طرح جکڑا ہوا۔ یہاں تکلّفات کے ملمع کا خول ہر سرگرمی پر چڑھا ہوتا۔ اُنس اور خلوص سرے سے غائب۔

"یور ایکسیلنسی"، "سر"، "حضور"، جناب اعلیٰ جیسے خطابوں کے درمیان دِل کی دھڑکنوں اور جذبات کی تلاش فضول تھی۔

جنّت کے عیش و آرام ہر دم اُس کے روبرو حسینۂ عالم کی ناز و ادا سے بھی دلکش اپنی مرمریں باہیں پھیلائے قدم قدم پر اُس کے خیر مقدم کے لئے بے چین تھے۔

اعلیٰ افسروں کے غول کے غول اپنی خوبصورت بیویوں کو لئے اُس کو گھیرے رہتے۔ یہ لوگ اُس کی ہلکی سی خوشنودی پا کر خود کو خوش قسمت سمجھتے۔

ایکڑوں میں پھیلے اور جنّت کی آسائشوں سے مزیّن گورنر لاج کے ہال کمرے نت نئی دعوتوں اور تقاریب کے طفیل ہمیشہ کھلتے اور مہکتے رہتے۔ ان دعوتوں میں دنیا کی اعلیٰ ترین شرابوں کے دَور چلتے اور دسترخوانوں پر طرح طرح کے لذیذ کھانے لگائے جاتے۔

جہاں بھی وہ جاتا فرشی سلام اُس کا خیر مقدم کرتے۔ توپوں کی سلامیاں دی جاتیں وہ پولیس کے دستوں اور فوج کی ٹکڑیوں کا معائنہ کرتا۔ مگر ان رسمی تکلفات میں اپنائیت کا جذبہ تھا کہاں؟ اُسے اِس رکھ رکھاؤ میں ایک گھونٹ خلوص کا آبِ حیات مل جائے تو وہ اِسے کوہِ نور کی طرح سنبھال کر رکھ لے گا۔ وہ اکثر یہی سوچتا لیکن وہ اپنے چاروں طرف اپنے پن کا سوانگ اسٹیج ہوتے ہوتے دیکھتا نقل سے ہی اُس کا سامنا ہوتا اصل سے نہیں۔

وہ لاکھوں روپے کی گرانٹیں بانٹتا۔ لوگ اُس کی فیاضی اور فراخ دلی کی تعریفیں کرتے۔ اُس کی ستائش میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ اُف! لیکن اِس میں نیاپن کیا ہے؟ جسے اپنا کہا جا سکے ——— ایسا کچھ

کہاں ؟"

تکلّفات میں قید کبھی کبھی تو وہ اِن سے بُری طرح اُکتا جاتا۔ ایسے میں اُسے اپنی ماں کی یاد آجاتی — وہ مُلک، وقت اور عمر کی حدود کو پار کر کے بچپن کے اپنے گاؤں کلانور لوٹ جاتا۔

"عظیم۔ رے عظیم۔ رے موئے سُنتا نہیں کیا ؟" ماں کی غصّے میں ڈوبی آواز کو وہ جان بُوجھ کر ان سُنی کر جاتا۔

"اے بہرہ ہے کیا ؟" ماں اور بھی اونچی آواز میں پُکارتی۔

"ماں سُن تو رہا ہوں — بس برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر پڑھ رہا تھا۔"

"سب جھوٹ۔ جب دیکھو اودھم چوکڑی۔ لیکن مرے تجھے فکر نہیں کہ روٹی ٹکڑا بھی کھانا ہے۔ کب سے تیری باٹ دیکھ رہی ہوں۔"

پڑھی لکھی ہوتی تو ماں پتہ چلتا کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ — حساب تو —"

"بس بس باتیں نہ بنا۔ پڑھی نہیں تو کیا اپنے بچوں کی شرارتوں سے بھی واقف نہیں — پھر وہ مہرو۔"

"اری بھولی ماں آگئی نہ دوسروں کی سِکھائی بہکائی میں۔ خدا —"

"ناحق خدا کو کیوں تکلیف دیتا ہے — نالائق کہیں کے۔ جوہڑ میں اِس طرح سے کودو گے تو کبھی ڈوب کر ہی آؤ گے۔"

"اری واہ۔ ڈوب گیا تو آؤں گا کیسے ؟"

بھولے انداز میں عظیم ماں سے کہتا۔ ماں اکثر شرارتی عظیم کی باتوں کا بُرا نہ مناکر اُسے اپنی باہوں میں بھر لیتی اور ماتھا چوم کر مسرور ہو اُٹھتی — لیکن اب وہ ماں کہاں ؟ صرف اُس کی شفیق یادیں باقی ہیں۔

تعمیر ہریانہ

آج وہ ڈھاکہ سے کسی سرکاری کام کے سلسلے میں اپنے وطن آیا ہوا تھا۔ دِلّی میں وہ ایمبیسی کے ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں ٹھہرا تھا تو راتوں میں وہ اپنے گاؤں کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ مادرِ وطن جو ہوا۔

اُس پاک سرزمین کے لئے جہاں اُس کا بچپن بیتا تھا۔ ہریانہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں کلانور۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے گاؤں کے چاروں طرف دور دور تک پھیلے ہوئے گورے کا منظر گھوم گیا۔ جہاں کہیں کہیں تو ٹخنوں تک ریت۔ بچھی رہتی۔ بچپن میں اُس بالو ریت پر چلتے کئی بار اُس کے پاؤں جھلس سے گئے تھے۔ لیکن یہی ریت صبح و شام کبڈّی کے میدان میں گدّے کا آرام دیتی۔ یہ نہ ہوتی تو روزانہ زخمی حالت میں بچے گھر لوٹتے۔

گورے کی زمین میں جگہ جگہ کیروں جالوں کے جھُرمٹ تھے جہاں گرمی کے موسم میں وہ اپنے رفیقوں سمیت پیپل اور پینجو توڑ توڑ کر خوب کھایا کرتا تھا۔ گوہری کے ساتھ ساتھ جنگلی جھاڑیوں کے بیروں کا ذائقہ تو اُسے کبھی بھولا ہی نہیں، اُس کے لئے اِن پھلوں کی حیثیت چمن کے انگوروں سے کہیں زیادہ تھی۔

یہ برگد، اِس کی گھنی چھاؤں کے آگے بجلی کے پنکھے اور واٹر کولر کیا کریں گے۔ یہاں بیٹھنے اور سُستانے کا اپنا مزہ ہے۔ اور یہ تالاب کوئی چاہے اِسے جوہڑ کہہ کر ناک بھوں سکوڑے لیکن اُس کے بچپن اور جوانی کی سیکڑوں یادیں اِس سے جُڑی ہیں۔ ذرا دِل میں جھانکتے ہی ہزاروں منظر اُس آئینۂ دل پر جِھلملا اُٹھتے ہیں۔ کتنے حسین کتنے دِلکش۔ بچپن میں وہ اِس تالاب میں خوب کودا کرتا۔ بھینسوں کے ساتھ ساتھ تیرا کرتا اور کبھی اُن کی

پیٹھ پر سوار ہو جاتا۔ کتنا آزاد تھا وہ تب۔

سبھی بچے اکثر بات بات پر شرطیں لگاتے۔ ڈبکیاں لگا کر تالاب کے پیندے سے گارا نکال لاتے۔ واہ — اتنے میں کوئی کنارے نیم کے تنے پر چڑھ کر تیسیوں فٹ اونچائی سے چھلانگ لگا دیتا۔ سبھی تعریف بھری نظروں سے اُسے تکنے لگتے۔ اور اب گورنر لاج میں ہی اتنا شاندار سوئمنگ پول ہے۔ لیکن یہ سب بناوٹی ہے ایک دم بے رس۔

"اِٹ اِز آل آرٹیفیشیل۔ نو چارم ایٹ آل" وہ بُدبُدایا۔

اگلی صبح اُس نے علی الصبح تیار ہو کر ناشتہ کیا۔ ڈرائیور کو گیراج سے کار نکال لانے کو کہا تھا۔ پھر اُس نے حکم دیا تھا۔

"وِیل جوان کلانور چلے گا۔ پہلے روہتک آئے گا پھر روہتک دادری روڈ پر کلانور۔"

"مگر صاحب، آپ نے تو بولا تھا دِلّی گھومے گا قطب مینار، لال قلعہ اور جامع مسجد اور پھر آگرہ کا تاج محل" اے ڈی۔ سی نے بڑے ادب سے گورنر صاحب سے پوچھا تھا۔

"وِیل جینٹلمین۔ اب ہمارا ارادہ بدل گیا ہے۔ بس ایک جھلک اپنے قصبے کی دیکھنا چاہے گا جہاں ہمارا بچپن بیتا۔ جس کی مٹی، جس کے ان جل سے ہماری نشو و نما ہوئی، ہماری پرورش ہوئی۔

"رائٹ سر۔" اتنا کہہ کر اے۔ ڈی۔ سی نے کار کا دروازہ یہ کہتے ہوئے کھول دیا تھا، "سر، تشریف رکھیے۔"

پھر وہ مرسیڈیز کار روہتک کی سمت سڑک پر سرپٹ دوڑ چلی تھی۔ جیسے جیسے اس کا موروثی گاؤں کلانور نزدیک آ رہا تھا جنرل محمد عظیم خان گورنر کی دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

اُس کے بچپن کی سیکڑوں یادیں اُس کے آئینۂ دل پر ایک کے بعد ایک کوند جاتیں۔ کتنے بچوں، عورتوں، بوڑھوں کے چہرے اُس کے ذہن میں ابھرتے اور پھر دھندلکوں میں کھو جاتے۔

کچھ تنگ کچھ چوڑی گلیوں کچے گھروں کی تصویریں اُس سے باتیں کرتیں۔ اپنی داستانیں سناتیں اور اُس کے دل میں ایک عجیب سی ٹیس کا احساس چھوڑ کر غائب ہو جاتیں۔

ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد اے۔ ڈی۔ سی۔ نے سنگِ میل پڑھ کر لاٹ صاحب کو بتایا تھا۔ "سر کلانور دس کلو میٹر۔"

لاٹ صاحب نے یہ سن کر صرف سر ہلا دیا تھا۔ وہ پرانی یادوں میں ڈوبے ہوتے تھے۔ انھیں اپنا بچپن ہندوستان کی تاریخ کے ذرّیں دور سے کہیں زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔

اس کے صرف نو منٹ بعد مرسڈیز کار تالاب کے کنارے والی سڑک پر مُڑ گئی تھی۔ کار سے نکلتے ہی جنرل محمود عظیم خان کا گاؤں والوں نے بہت پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ جن میں زیادہ تر چہرے اجنبی تھے، جو پاکستان سے آئے ہوئے مہاجر تھے۔ یہ جان کر تو وہ اور بھی خوش ہوئے تھے کہ گورنر اِسی گاؤں کے باشندے رہے ہیں اور کلانور ان کا موروثی گاؤں ہے۔

پھر چیدہ چیدہ لوگوں نے جنرل صاحب کو سارا گاؤں گھوم پھر کر دکھایا۔ انھوں نے اپنے آبائی مکان کا کونہ کونہ دیکھا۔ چند منٹ ڈیوڑھی میں رُک کر وہ کچھ سوچتے رہے۔ پھر وہ گاؤں والوں کے ساتھ گورے کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ تک وہ کیروں اور جالوں کے جھرمٹوں میں گھومتے اور ان کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

پھر تالاب کے کنارے آکر برگد کی گھنی چھاؤں میں گھاٹ پر بیٹھ گئے۔ اور بڑے شوق سے تالاب میں بچوں کو نہاتے چھلانگیں لگاتے، دیکھتے رہے۔ بھینسیں روزمرّہ کی طرح وہاں تیر رہی تھیں۔ جنرل کو لگا گویا اُس کے بچپن کے سین فلمائے جا رہے ہوں۔

جنرل کی گاؤں میں آمد کی خبر جب اُن کی پُرانی مہترانی ریشماں کو ہوئی تو وہ دوڑی دوڑی وہاں چلی آئی۔ اُسے عظیم کتنے پیار سے تائی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

دور سے ہی بوڑھی ریشماں نے پیار سے پکارا، "رے عظیم، میرے بچے خوش تو ہو؟"

یہ الفاظ سُنتے ہی جنرل کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر مادرِ وطن کی پاک مٹّی میں جذب ہو گئے تھے۔ پیار کا جذبہ اونچ نیچ چھوٹے بڑے کی قید سے آزاد ہو کر گلے مل رہا تھا۔

جنرل تائی کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے تھے۔ بوڑھی تائی کا دایاں ہاتھ آشیرواد دینے کے لئے جنرل کے سر کی طرف اُٹھ گیا تھا۔ یہ سب کچھ کسی ڈرامے کی ریہرسل کی طرح ہو رہا تھا۔

جنرل کا جواب تھا، "تائی جی، سب ٹھیک ہے۔"

"بچّے میری بہو کو نہیں لایا۔ وہ مزے میں تو ہے؟"

"بالکل مزے میں تائی جی۔"

"رے، اب تو بیٹا جوان ہو گیا ہو گا — بالکل تیرے پر گیا تھا۔"

"ہاں تائی جی۔"

"رے گڈّو کا بیاہ کر دیا۔ مجھے ریشماں دادی کہہ کر بلایا کرتی لاڈ لڈواتی تھی مجھ سے۔ رے اُسے کبھی میری یاد آوے ہے۔"

اتنے میں جنرل نے سَو کا نوٹ جیب سے نکال کر بوڑھی ریشماں کے ہاتھ میں تھما دیا تھا،

"بیٹا میں تو تجھ سے تیری۔"

"کیا ہوا تائی جی تیری بہو پوچھے گی تو کیا جواب دوں گا کہ ریشماں تائی کی کوئی خدمت کی یا نہیں۔"

بوڑھی تائی جی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے تھے۔ وہ اپنے بیٹے عظیم کو ہزار ہزار دعائیں دیتی گھر لوٹ رہی تھی۔

پھر جنرل اپنی مرسیڈیز کار میں بیٹھ کر دلّی کے لئے روانہ ہو گیا تھا، اُس نے گاؤں کی کچھ اور یادیں اپنے دل میں محفوظ کر لی تھیں۔

راستے میں اے۔ ڈی۔ سی نے پوچھا،

"سر۔ بوڑھی ریشماں کی آواز سُن کر آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں چھلک آئے تھے۔"

"جوان لوگ مجھے لمبے چوڑے خطابوں سے بلاتے ہیں۔ لیکن مجھے اس آدھے ادھورے نام سے عظیم کہہ کر یا تو میری ماں بُلاتی تھی یا پھر یہ بوڑھی تائی ریشماں۔ ورنہ مجھے اتنے پیار سے کون بُلاتا ہے۔"

"اور پھر تم نے بوڑھی ریشماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی تو دیکھے ہوں گے۔ آنسو دل کی زبان ہوتے ہیں۔ آنسوؤں کے رشتے میں کتنا اپنا پن ہوتا ہے۔ کتنی سچائی۔ آنسوؤں کا رشتہ مُسکان کے رِشتے سے کہیں اونچا ہے۔ لافانی اور لامحدود۔"

"سر وہ بھی ٹھیک ہے۔"

(باقی ص۲۳ پر)

تعمیر ہریانہ

قارئین کی نظر میں

ماہنامہ تعمیر ہریانہ کا فروری ۱۹۸۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالہ خوب سے خوب تر کی راہ پر گامزن ہے محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کا افسانہ "جنت کی کھڑکی" پڑھنے کے بعد ذہن پر دیر تک اثر انداز رہا۔

عبداللہ چودھری۔ بسنت پور رگو گھوڑ

فروری کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ مقصور سبزواری عروج زیدی، ایم۔ آر۔ قاسمی۔ آزاد گلاٹی اور رونق شہری کی غزلیں پسند آئی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر عادل صدیقی کا مضمون لائق مطالعہ ہے۔ مختصر ہوتے ہوئے بھی کم از کم یہ مضمون نئی نسل کے سامنے غور و فکر کے در کھولتا ہے۔ افسانے اچھے ہیں۔ غرضیکہ کم قیمت میں آپ عوام کے دلوں میں ادب کا خزانہ بھر رہے ہیں اداریہ اور ڈاکٹر راجندر دلس کے افسانے کی کمی ضرور محسوس ہوئی۔

اقبال ساجد۔ علیگڑھ

فروری کا شمارہ موصول ہوا۔ سبھی تخلیقات معیاری ہیں۔ زیادہ تر تخلیقات میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے جو قابل تحسین امر ہے۔ ڈاکٹر بشیشر پردیپ کی کہانی "دھکتی بجھتی آنکھیں" نے انسانی ذہنوں کو جھنجوڑنے کی سعی کی ہے افسانہ نگار جتنا اچھا انسان ہے اتنا ہی اچھا بننے کی دوسروں کو تلقین کرتا ہے۔ صالحہ عابد حسین کی جنت کی کھڑکی بھی پسند آئی۔

تسکین زیدی۔ کانپور

ہریانہ کی تعمیر و ترقی کا علمبردار مصوّر ماہنامہ تعمیر ہریانہ فروری ۸۵ء بہت سارے خوبصورت افسانے اور غزلیں سمیٹے نظر نواز ہوا۔ دیر سے ملنے کے باوجود بھی سارے گلے شکوے دور ہو گئے "تعمیر ہریانہ وہ جریدہ ہے جس میں بے شمار قلم کار شعرا، ادبا اور مضمون نگار اپنے خونِ جگر کے جوہر سے معیاری غزلیں، نظمیں اور دلچسپ افسانے، مضامین پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ہم لوگ تعمیر ہریانہ کے تمام قلم کار حضرات کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

خورشید عالم عبدالقیوم قریشی

تعمیر ہریانہ ماہ بہ ماہ نکھرتا جا رہا ہے اردو ادب کے چند گنے چنے رسالوں میں اس کا شمار کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ طالب علموں اور دیگر قارئین کے لئے یکساں مفید اور طرب انگیز ہے اس میں اچھی کہانیاں، عمدہ منظومات، معلوماتی مضامین سب ہی چیزیں منتخب ہوتی ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ **محمد سیف اللہ۔ گرول، دربھنگہ**

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت ایسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او۔ ۱۹۱-۱۸۹ سیکٹر ۱۷۔ سی چنڈی گڑھ سے مئی ۱۹۸۵ء کے لئے شائع کیا
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ ٹی چنڈی گڑھ

گجری محل ۔ حصار

Photos : Raj Kishan Nain

ماضی کی یادگار — حصار قلعے میں پتھّر کا تخت

Photo : Raj Kishan Nain

جون ۱۹۸۵ء | شمارہ ۶ | جلد ۱۳

مدیر اعلیٰ:
رنجیت ایس

مدیر:
ڈاکٹر راجندر روتس

نائب مدیران:
سلطان انجم ۔ مدن راہی

سرورق: اے۔ پی۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدیر "تعمیر ہریانہ" ایس۔ سی۔ او۔ ۱۸۹ ۔ ۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں

ترتیب

دوسرا سرورق: شیخ طیب کا مقبرہ۔ کیتھل
تیسرا سرورق: قدیم بے (باؤڑی)۔ کیتھل
چوتھا سرورق: بسنت سرسوتی تیرتھ پیہوا

باعث مسرت ہے کہ چودھری بھجن لال نے آج ہریانہ کے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر چھ سال کامیابی سے پورے کر لئے ہیں۔ ہریانہ ان کی بے مثال اور ترقی پسند راہنمائی میں ترقی اور خوشحالی کی منزلوں کی طرف گامزن ہوا ہے۔

فخر کی بات ہے کہ ہریانہ نے اس مدت میں تقریباً سبھی شعبوں میں قابل داد ترقی کی ہے۔ اناج کی پیداوار 70 لاکھ ٹن تک پہنچ گئی ہے جبکہ چھ سال پہلے یہ صرف 50 لاکھ 40 ہزار ٹن تھی۔ اسی طرح چھوٹی صنعتی اکائیوں کی تعداد سال 1979-80 میں 21 ہزار سے بھی کم تھی وہ اب بڑھ کر 63 ہزار سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ ان میں سے 20,500 اکائیاں دیہی علاقوں میں لگائی گئی ہیں جن میں 55,000 افراد کام کرتے ہیں۔ ان اکائیوں میں کام کرنے والے 60 فیصد سے زیادہ افراد سماج کے کمزور طبقوں سے ہیں۔ ہریانہ ملک میں استعمال کے لئے اور برآمد کے لئے مختلف قسم کا صنعتی سامان تیار کرتا ہے۔ ہم 152 کروڑ روپے سالانہ قیمت کا سامان برآمد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ 4,690 پرابلم ویلجز میں سے 3400 دیہات کو دیہی واٹر سپلائی سکیم کے تحت پینے کے پانی کی سہولیت دی جا چکی ہے اور 1987ء تک سبھی دیہات کو پینے کے صاف پانی کی سہولیت دینے کی امید ہے۔ ہریانہ کو 1982-83 اور 1983-84 کے دوران فیملی ویلفیئر پروگرام میں قابل تعریف کام کے لئے انعام حاصل ہوئے ہیں۔ دیہات میں بجلی لگانے کے کام میں بھی متوقع کامیابی ملی ہے۔ ناز کی بات ہے کہ ہریانہ کی تمام ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی گئی ہے اور 44,825 ہریجن گھروں کو رعایتی شرحوں پر ایک ایک پوائنٹ کے بجلی کے کنکشن دئے گئے ہیں۔ غریبی دور کرنے سے متعلق پروگراموں کو بھی پورے زور شور سے لاگو کیا جا رہا ہے اور 4 لاکھ 35 ہزار سے بھی زیادہ خاندانوں کو غریبی کی سطح پار کرنے میں مدد دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہریانہ میں تقریباً تین لاکھ بے گھر لوگوں کو رہائشی پلاٹ دئے گئے ہیں۔ کل ملا کر ہریانہ ترقی کی شاہراہ پر برق رفتاری سے گامزن ہے۔

اس موقع پر میں نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہریانہ مستقبل میں بھی چودھری بھجن لال کی قیادت میں خوشحالی کی نت نئی منزلیں طے کرتا رہے گا۔

ہریانہ میں قابلِ دید ترقی

بھجن لال، وزیر اعلیٰ ہریانہ

ہریانہ اٹھارہ سال پہلے ملک کی ایک الگ صوبے کی شکل میں وجود میں آیا۔ گزشتہ چھ سالوں میں ہریانہ میں قابلِ داد ترقی ہوئی ہے اور تقریباً ہر میدان میں اس کے حصول قابلِ دید رہے ہیں۔ اہلِ ہریانہ میں نئی امید اور حوصلے کی کرن طلوع ہوئی ہے اور انھوں نے سخت محنت سے اس کم بید اواری علاقے کو ملک کے اَن بھنڈار میں بدلنے کے چیلنج کا کامیابی سے سامنا کیا ہے۔ ہریانہ کے لئے بار بار کا سوکھا، پچھڑا پن اور غریبی عہدِ پارینہ کی بات ہوگئی ہے۔ دستیاب مین پاور اور ذرائع کے موزوں اور دانشورانہ استعمال سے بہت ہی قلیل مدت میں غریبی دور ہوگئی ہے۔ در اصل اب ہریانہ کی کایا پلٹ گئی ہے۔ دوسرے صوبوں کے رہنے والوں اور غیر ملکیوں تک کے لئے اب ہریانہ ترقی اور خوشحالی کی مثال بن گیا ہے۔ اتنی کم مدت میں ہریانہ کی ہمہ پہلو ترقی دوسرے صوبوں کے لئے رشک کا موضوع بن گئی ہے۔

زراعت میں جدیدیت، صنعتی مراکز کی توسیع آبپاشی ذرائع کا زیادہ سے زیادہ استعمال، صحت اور تعلیم کی سہولیات میں اضافہ، ٹرانسپورٹ اور کمیونیکیشن کے ذرائع میں توسیع۔ سبھی نے ہمارے اقتصادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہماری ترقی کی بنیاد ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل پیرائی سے ہمارے عوام کا معیارِ زندگی بلند ہوا ہے۔ ہمارے نوجوان وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی محرک راہنمائی میں ترقی کی رفتار اور بھی تیز ہوئی ہے۔

ہریانہ میں ہوئی ترقی پر روشنی ڈالنے سے پہلے میں عزت مآب مرحوم وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے تئیں اہلِ ہریانہ کی عقیدت اور تشکر کا اظہار کرنا چاہوں گا۔ اُن کے دل میں ہریانہ کے لئے خاص شفقت تھی۔ گزشتہ چھ سالوں میں ہریانہ کو ان کے دانشورانہ مشوروں، راہنمائی، اور ذاتی دلچسپی سے بہت فائدہ پہنچا۔ ہماری ترقی کے امکانات ان کے خوابوں کے بھارت کے عین مطابق ہیں

اپنی برق رفتاری کے طفیل پسماندہ ہریانہ کا شمار آج ملک کے بیشتر ترقی یافتہ صوبوں میں ہونے لگا ہے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی، صنعتی امن اور عوام کی توقعات سے باشعور رابطہ میں سے سُکھ اور خوشحالی کے خوابوں کو تعبیر مل گئی ہے۔

یہ چھوٹا سا صوبہ جس کا رقبہ ملک کے کل رقبے کا ایک فی صد ہے اور آبادی ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ہے معاشری، اقتصادی ترقی کے نقطۂ نظر سے مثالی بن گیا ہے۔

ہریانہ کے ۸۲ فی صد سے بھی زیادہ عوام کا انحصار زراعت پر ہے۔ ہریانہ کی اقتصادی خوشحالی کی بنیاد ہونے کی وجہ سے سرکار زراعت پر سب سے زیادہ توجہ دیتی ہے۔ زیادہ پیداوار دینے والے بیج، کیڑے مار دوائیاں، اور کیمیاوی کھاد، سائنسی آلات قرضے اور دوسری سہولیات کی فراہمی کے طفیل ہریانہ کے جفا کش کسانوں نے سال ۱۹۸۴ء ۸۵ میں ۷۰ لاکھ ٹن اناج پیدا کیا ہے جبکہ ۱۹۷۹ء ۸۰ میں صرف ۵۰ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن اناج کی پیداوار ہوئی تھی۔ اب ہریانہ اناج کے مرکزی ذخیرے میں زیادہ سے زیادہ اناج دینے والے صوبوں میں سے ہے۔ ۱۹۸۵ء ربیع کے دوران ۲۰ لاکھ ٹن ریکارڈ گیہوں خریدی گئی۔

پانی اور بجلی زراعت کے لئے لازم ہیں۔ خشک سالی زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے دستیاب پانی کے تمام ذرائع کے استعمال کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ عالمی بینک کی مالی امداد سے جل مارگوں کو پکا کرنے کا ترجیحی پروگرام چل رہا ہے۔ ۳۶ کروڑ ۷۰ لاکھ مربع فٹ سے بھی زیادہ جل مارگ پکے ہو جانے سے تقریباً ۱۵۰۱ دا کیوسک بیش قیمت پانی کی بچت ہوئی ہے۔

لفٹ آبپاشی اور چھڑکاؤ آبپاشی سے خشک سال ناہموار علاقوں میں بھی آبپاشی ہونے لگی ہے۔ اس وقت ۳۶ لاکھ ہیکٹر علاقے میں آبپاشی ہوتی ہے۔ جبکہ ۸۰ - ۱۹۷۹ء میں صرف ۳۱ لاکھ ۳۱ ہزار ہیکٹیر میں ہی آبپاشی ہوتی تھی۔ ہریانہ کو راوی بیاس سسٹم سے فالتو پانی میں سے اپنے حصے کا پانی مل جانے پر ہماری کچھ اسکیمیں بارہ ماسی ہو جائیں گی۔ ہریانہ نے ستلج یمنا لنک نہر کا اپنے حصے کی تعمیر کا کام پورا کر لیا ہے۔ چالو سال میں پنجاب کے علاقے میں آنے والے نہر کے علاقے کی تعمیر کے لئے ۷۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ ہمارے حصے کا پانی ہریانہ میں آجانے پر زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو جانے کی امید ہے۔

آج کل بجلی ہماری ترقی پذیر اکانمی کی اصل بنیاد بن چکی ہے۔ ہریانہ میں اب بجلی کی فی کس کھپت ۲۴۷ یونٹ تک پہنچ گئی ہے جبکہ ۱۹۷۹ء - ۸۰ میں یہ صرف ۲۲۲ یونٹ تھی۔ اسی طرح اس اثنا میں بجلی کی پیداوار کی الائیڈ کیپسٹی ۱۰۷۷ میگا واٹ سے بڑھ کر ۱۳۳۴ میگا واٹ ہو گئی ہے۔ پانی پت تھرمل پراجیکٹ، یمنا نگر تھرمل پاور پراجیکٹ اور دادو پور رمنی ہائیڈل پراجیکٹ کے مکمل ہونے پر بجلی کی الائیڈ کیپسٹی میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔

ہریانہ نے سرکاری خرچ پر تمام ہریجن بستیوں میں بجلی لگا کر اور ہریجن گھروں میں رعایتی دروں پر ایک ایک پوائنٹ کے کنیکشن دے کر معاشری انقلاب کی سمت بے مثال قدم اٹھایا ہے۔ اب تک تقریباً ۸۲۳۰ د ۴۴ ہریجن گھروں میں یہ سہولیت میسر ہے۔ ۴۰۰۰ سے بھی زیادہ دیہات کی گلیوں میں بھی بجلی کی روشنی پہنچ چکی ہے۔ اب دیہات میں شیڈولڈ ذاتوں اور پسماندہ طبقات

کے لئے نئی چوپالوں کی تعمیر پر خرچ سرکار کرتی ہے۔ سرکار نے شہروں میں بھی ان طبقوں کے لئے چوپالیں بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہر سال تقریباً ۲ ہزار ہریجنوں کو گھروں کی تعمیر کے لئے ۲ ہزار روپے کی درپہ سبسڈی دی جاتی ہے۔

ہریانہ کے اقتصادی ڈھانچے میں صنعت کا مقام بہت اہم ہے جو روزگار کے نئے موقعے فراہم کرانے کے علاوہ ترقیاتی منصوبوں کی شروعات کے لئے زرمبادلہ بھی فراہم کرتی ہے۔ آج ہریانہ میں صنعت صرف روایتی کپاس، چینی کاغذ اور سیمنٹ تک ہی محدود نہیں بلکہ الیکٹرانک سامان، کار بنانے اور تیل صاف کرنے کے میدان میں بھی اس نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ بھارت الیکٹرانکس لمیٹڈ پنج کلا میں ٹیلی کمیونیکیشن کے آلات بنانے کے لئے ۱۲ کروڑ روپے سے الیکٹرانک پراجیکٹ لگا رہا ہے مرکزی سرکار ۳۰۰ کروڑ روپے کی لاگت سے کرنال کے نزدیک تیل صاف کرنے کا پراجیکٹ لگا رہی ہے۔ گوڑگاؤں میں پبلک سیکٹر یونٹ ماروتی اُدیوگ کی بنائی ہوئی رنگین کاریں اب بھارت کی سڑکوں پر عام دیکھنے میں آتی ہیں۔

دیہی علاقوں میں قائم ۲۰ ہزار ۵ سو سے زیادہ صنعتی اکائیوں میں تعلیم یافتہ دیہاتی بے روزگار نوجوانوں کو روزگار ملتا ہے ان اکائیوں میں ۵۵ ہزار سے زیادہ لوگ کام کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو خود روزگار اسکیم کے تحت اپنے روزگار قائم کرنے کے لئے تقریباً ۱۰ کروڑ روپے کے قرضے دیئے گئے ہیں گذشتہ چھ سالوں میں چھوٹی اکائیوں کی تعداد میں ۱۵۰ فی صد سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اب تو تقریباً ۶۳ ہزار چھوٹی صنعتی اکائیاں مختلف قسم کا سامان تیار کر رہی ہیں جبکہ ۷۹ - ۱۹۸۰ء میں ایسی ۲۰۷۵۰ صنعتی اکائیاں تھیں۔ سرکار اور صنعت کاروں کی مجموعی کوششوں کے طفیل ہماری صنعتی اشیاء کی سالانہ برآمد ۵۲ اکروڑ روپے تک بڑھ گئی ہے۔ جبکہ ۱۹۷۹ء - ۱۹۸۰ء میں صرف ۸۵ کروڑ روپے کی برآمد ہوتی تھی۔

الیکٹرانک ترقی کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ ہریانہ اسٹیٹ الیکٹرانکس ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے یونائیٹڈ نیشنز کی مدد سے مفید ڈھانچہ تیار کیا ہے جس میں انبالہ کا ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ سینٹر بھی شامل ہے گوڑگاؤں میں الیکٹرانکس سینٹر بن رہا ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰۰ الیکٹرانکس اور متعلقہ اکائیاں لگائی جائیں گی۔ الیکٹرانک اشیا کی سالانہ پیداوار موجودہ ۱۵۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ساتویں منصوبے کے اختتام تک ۶۰۰ کروڑ روپے ہو جانے کی امید ہے۔

تعلیم کے میدان میں پرائمری تک تعلیم مفت ہے پرائمری مڈل ہائر سیکنڈری اور کالج سطح کی تعلیمی سہولیات بالترتیب ۱ کلومیٹر، ۳٫۶ کلومیٹر، ۵٫۲۶ کلومیٹر ہے اور ۵٫۸۴، ۱۰ کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ ہم نے ۸۶-۱۹۸۵ء کے سیشن سے ۱۰+۲ تعلیمی سسٹم چالو کر دیا ہے۔ ہریانہ میں تمام ایک ٹیچر والے اسکولوں کو تعلیم کا معیار بلند کرنے کے مقصد سے ۲ ٹیچر والے اسکول بنا دیا گیا۔ لڑکیوں۔ پچھڑے طبقوں اور شیڈولڈ ذاتوں اور دوسرے کمزور طبقوں میں تعلیم کو ہر دلعزیز بنایا جا رہا ہے۔

سرکار ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود کے لئے تعلیمی، اقتصادی اور معاشری پروگرام مرتب کر رہی ہے۔ اب تک ۴ لاکھ ۳۵ ہزار خاندانوں کو غریبی کی سطح میں اوپر اٹھانے کے لئے مدد دی جا چکی ہے۔ اب تک ۱ لاکھ ۳۵ ہزار ایکڑ فالتو زمین ۶۱۶۲۷ بے زمین لوگوں میں بانٹی جا چکی ہے۔ اسی

رہے ۳ لاکھ بے گھر لوگوں کو سو سو مربع گز کے پلاٹ گھر بنانے کے لئے دیئے جا چکے ہیں۔ ہاؤسنگ بورڈ کے بنائے ہوئے ۲۰ ہزار مکانوں میں سے ۱۵ ہزار مکان سماج کے کمزور طبقوں کو الاٹ کئے گئے ہیں۔ میوات کے پسماندہ علاقے کی ترقی کے لئے ۸ کروڑ ۸۲ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ اس علاقے میں صنعتیں قائم کرنے کے علاوہ دوسرے ترقیاتی پروگراموں پر کام تیزی سے چل رہا ہے۔

آئی۔سی۔ڈی۔پی کے تحت بچوں، حاملہ خواتین دودھ پلانے والی ماؤں اور ۱۵ سے ۴۴ سال تک کی عمر کی عورتوں کو سرکار کی طرف سے متعدد سہولیات دی جاتی ہیں۔ اس وقت ہریانہ کے ۳۱ بلاکوں میں یہ اسکیمیں چل رہی ہیں۔ کام کاج والی خواتین کو گھریلو ماحول میسر کرانے کے لئے ضلع ہیڈ کوارٹروں پر ہوسٹل بن رہے ہیں۔

پانی انسان کی اولین ضروریات میں سے ہے۔ ہریانہ کے کئی علاقے زمانۂ قدیم سے اس نعمت سے محروم رہے ہیں۔ سرکار کی طرف سے ان علاقوں کو صاف پینے کا پانی میسر کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ۴،۶۹۰ میں سے ۳،۴۰۰ ایسے دیہات کو پانی مہیا کر دیا گیا ہے۔ باقی ماندہ دیہات کو ۱۹۸۷ء کے آخر تک یہ سہولیت بہم پہنچا دی جائے گی آج کل روزانہ ۲ دیہات کو یہ سہولیت دی جا رہی ہے۔

صحت مند شہری ملک و قوم کی دولت ہوتے ہیں۔ ہم اسپتالوں، ڈسپنسریوں اور پرائمری ہیلتھ سینٹروں کے ذریعے اپنے عوام کو طبی سہولیات بہم پہنچا رہے ہیں اور یہ سہولیات ۵ کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں طبی سہولیات پر خرچ بڑھ کر ۴۹ روپے ۹۲ پیسے ہو گیا ہے۔ جبکہ ۱۹۷۹-۱۹۸۰ء میں صرف ۱۷ روپے ۲۲ پیسے خرچ کئے جاتے تھے، برسوں کی تعلیم اور حوصلہ افزائی کے طفیل فیملی ویلفیئر پروگرام ہر دلعزیز ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۲-۸۳ء اور ۱۹۸۳-۸۴ء میں ہریانہ کو اس میدان میں عمل پیرائی اور حصول کے لئے ایوارڈ مل چکے ہیں۔

ہریانہ سبھی دیہات کو پکی سڑکوں سے جوڑنے والا ملک کا پہلا صوبہ ہے۔ سڑکوں اور اعلیٰ ٹرانسپورٹ سروس سے عوام کے لئے نئے دور کی شروعات ہوئی ہے۔ نئے بس اسٹینڈ، راستوں پر بنے ہوئے بس سٹاپ آرام دہ بسوں کی وجہ سے ہر[illegible]ڈویز ملک بھر میں مشہور ہے۔

سیاحت کو بڑھاوا دینے کی ہریانہ کی کوششوں اور کارکردگی کی سیاحوں اور سرکردہ سیاحی اور تجارتی اداروں نے خوب تعریف کی ہے۔ اہم ترین قومی شاہراہوں پر بنے ہوئے ہمارے سیاحی مراکز کے نام پرندوں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں — ان مراکز میں ریستوران، بار، ہوٹل، کاٹیجز پیٹرول پمپ، کانفرنس ہال اور کچھ مراکز میں کشتی کی سیر اور مچھلی پکڑنے کی سہولیات میسر ہیں۔ سورج کنڈ میں بنا ہوٹل راج ہنس، ایک جوڑ بین الاقوامی سیاحی مرکز ہے۔ آج ہریانہ میں ۳۲ دلکش سیاحی مراکز ہیں۔ اس سال چالو ہونے والے اہم منصوبوں میں انبالہ میں ونکنگ فشر، نروانہ میں نیل کنٹھ، اور بڈکھل میں ڈرائیو ان تھیٹر شامل ہیں

زمین ہوا اور پانی وغیرہ قدرتی نعمتیں انسانی زندگی کے لئے لازم ہیں۔ بڑھتی ہوئی شہری آبادیاں اور اندھا دھند درخت کاٹنے سے ہماری جنگلی دولت اور جنگلی جانور کم ہو گئے ہیں۔ ہریانہ سرکار نے ہوا اور پانی کو آلودگی سے پاک رکھنے اور ماحولیاتی توازن بنائے رکھنے کے لئے حال ہی میں الگ محکمہ قائم کیا ہے۔ تین چار سالوں میں بڑی تعداد میں درخت لگائے گئے ہیں۔ ہم ہر سال فی شہری ۹ درخت لگا رہے ہیں۔ پچھلے سال ۱۰ کروڑ درخت لگائے گئے۔ چالو سال میں بھی اتنے ہی درخت لگائے جانے کی امید ہے۔ ان میں پھل دینے والے، سجاوٹ کے لئے،

ـسے کے لئے، عمارتوں کے لئے صنعتوں کے لئے اور ایندھن وغیرہ کے لئے سبھی قسم کے درخت شامل ہیں۔
۶ ہزار ہیکٹر علاقے میں جنگل لگانے کے مقصد سے ۲۳ کروڑ ۳۲ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک منصوبہ تیار
یا جا رہا ہے۔

گذشتہ چھ سالوں میں ہریانہ کی بے مثال ترقی کی یہ مختصر کہانی ہے۔ ترقی کی ہماری تمام کوششوں میں
منت کش اہلِ ہریانہ کے پرزور تعاون سے نئے اور مضبوط ہریانہ کا طلوع ہو رہا ہے۔ ہم صاف اور قابلِ
نتظامیہ فراہم کرنے اور شانتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر سگالی کے ماحول میں ترقی کی رفتار کو تیز کرنے
ے لئے پرعزم ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی محرک قیادت میں ہم جدید ترین تکنیکی ترقی کے
ساتھ ساتھ اپنی بیش قیمت ثقافتی وراثت کو محفوظ رکھنے کے تئیں بھی باشعور ہیں۔
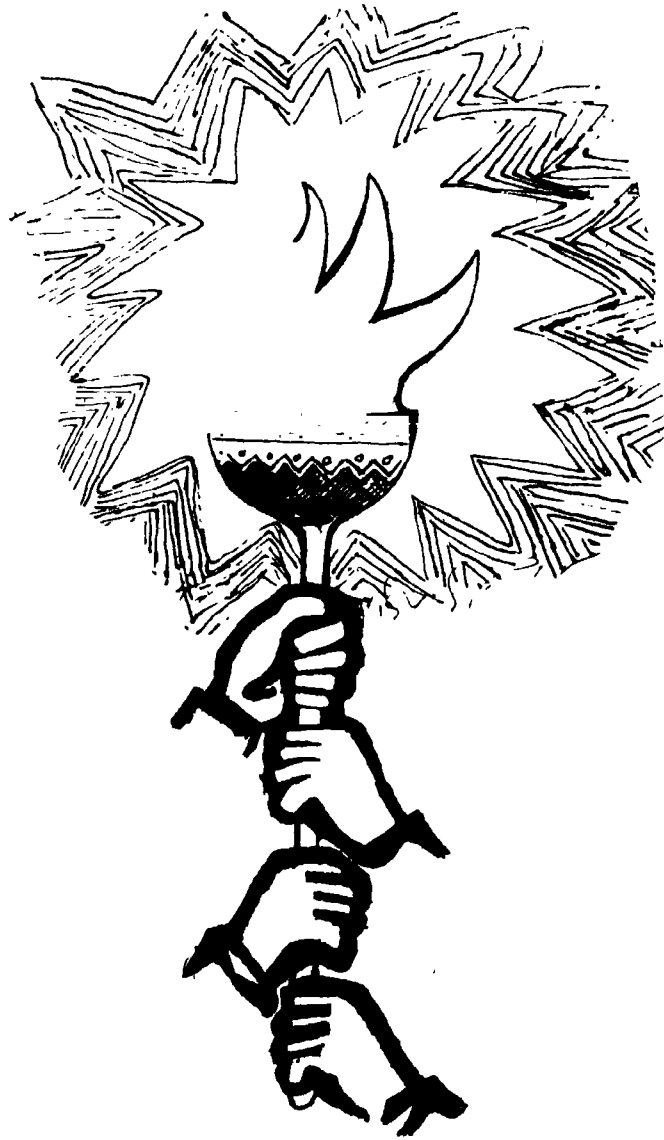
ہریانہ تیز رفتاری سے اپنے اولین نشانے کی جانب آگے بڑھ رہا ہے۔ یہاں ہر ایک بالغ مفید روزگار میں لگا ہوا ہے۔ نئی ترقیاتی سکیمیں سکھ اور خوشحالی دینے والی ہیں۔ صحت اور تعلیمی سہولیات دستیاب ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی، امن اور خیر سگالی کا ماحول ہے۔ عوام کے تئیں باشعور ترقی پسند ہریانہ میں سکھ اور خوشحالی کی گہما گہمی ہے۔ ۲۰ نکاتی پروگرام کی تیز اور پُر اثر عمل پیرائی سے عوام کی کایا کلپ ہوگئی ہے شری راجیو گاندھی کی متحرک راہنمائی میں ہماری اقتصادی حالت مضبوط ہوئی ہے۔ زراعت، صنعت، بجلی آبپاشی، کمیونی کیشن، سماج سیوا، ٹرانسپورٹ، تعلیم اور صحت کی سہولیات کے میدان میں اہم ترقی ہوئی ہے۔ اب ہم الیکٹرانک انقلاب میں داخل ہو رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار ہماری ترقی کے ضامن ہیں۔

- زرعی پیداوار 70 لاکھ ٹن تک پہنچ گئی ہے جبکہ 80-1979ء میں یہ صرف 50 لاکھ 40 ہزار ٹن تھی۔
- آبپاشی تحت کُل رقبہ 36 لاکھ ہیکٹر تک بڑھ گیا ہے اور ساتویں منصوبے کے اختتام تک یہ 37 لاکھ 98 ہزار ہیکٹر ہو جائے گا۔
- اس وقت 63 ہزار سے زیادہ چھوٹی صنعتی اکائیاں مختلف قسم کا سامان بنا رہی ہیں جبکہ 80-1979 میں ان کی تعداد 20,750 تھی۔ 20,500 دیہی اکائیوں میں 50 ہزار سے زیادہ لوگ کام کرتے ہیں جن میں 60 فیصد کمزور طبقوں کے ہیں۔
- صنعتی اشیاء کی برآمد سے ہمیں 152 کروڑ سالانہ زر مبادلہ حاصل ہو رہا ہے۔
- بجلی کی پیداواری کپیسٹی 1433 میگاواٹ تک بڑھ گئی ہے جبکہ 80-1979 میں یہ 1073 میگاواٹ تھی۔
- پرائمری سکول، مڈل سکول، ہائیر سیکنڈری اور کالج کی سطح کی تعلیمی سہولیات بالترتیب ایک کلومیٹر 2,37 کلومیٹر، 2,95 کلومیٹر اور 10,45 کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔
- 4,690 پرابلم دیہات میں سے 3400 سے زیادہ دیہات میں صاف واٹر سپلائی کی سہولیت بہم پہنچائی جا چکی ہے۔ باقی ماندہ تمام دیہات میں 1987ء تک یہ سہولیت میسّر کروا دی جائے گی۔
- 187 ہسپتال، 93 پرائمری ہیلتھ سینٹر 234 ڈسپنسریاں 70 سب سڈری ہیلتھ سینٹر اور 1623 سب سینٹر عوام کی صحت اور طبی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں۔ ہریانہ صحت کے تحفظ کیلئے فی کس 49,92 روپے

خرچ کر رہا ہے۔ 83-1982 اور 84-1983 میں ہریانہ کو فیملی ویلفیئر میں قابلِ داد ترقی کے لئے ایوارڈ حاصل ہوئے ہیں۔

- تمام ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی گئی ہے اور 44,825 ہریجن گھروں کو رعائتی دروں پر ایک ایک پوائنٹ کے کنکشن دیئے گئے ہیں۔ 4100 دیہات کی گلیوں میں بھی بجلی کی روشنی کی سہولیت بہم پہنچا دی گئی ہے۔
- سبھی دیہات کو پکی سڑکوں سے جوڑ دیا گیا ہے۔ پکی سڑکوں کی لمبائی 80-1979ء میں 16,700 کلو میٹر سے بڑھ کر اب تقریباً 20 ہزار کلو میٹر تک پہنچ گئی ہے۔
- ہریانہ روڈویز کی تقریباً 2900 بسوں میں ہر روز 10 لاکھ 82 ہزار مسافر سفر کرتے ہیں اور یہ بسیں ہر روز آٹھ لاکھ کلو میٹر کا سفر طے کرتی ہیں۔
- 435 ہزار سے زیادہ خاندانوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اُٹھانے میں مدد دی گئی ہے۔
- ایک لاکھ 35 ہزار ایکڑ فالتو اراضی 41,627 ضرورت مند لوگوں کو تقسیم کی جا چکی ہے۔ 3 لاکھ بے گھر لوگوں کو مفت رہائشی پلاٹ دیئے گئے ہیں۔

گذشتہ چھ سالوں میں ملک کے نقشے پر مضبوط اور متحرک ہریانہ کا طلوع ہوا ہے۔ ہماری سرکار صاف اور قابل انتظامیہ فراہم کرنے، ترقی کی رفتار تیز کرنے اور جدید ترین تکنیک کا استعمال کرنے کے لئے پُرعزم ہے۔ ہم سبھی مذہبوں کے لوگوں میں فرقہ وارانہ خیرسگالی اور امن بنائے رکھنے کا عہد کئے ہوئے ہیں۔ آیئے ہم ذات اور مذہب کے محدود خیالات سے اُوپر اُٹھ کر مُلک کی یک جہتی اور سالمیت کو بنائے رکھنے کیلئے متحد ہو کر کام کریں۔

مجھے پُورا یقین ہے کہ اہلِ ہریانہ غریب امیر کے درمیان کی کھائی کو پُر کرنے کے قومی تعمیر کے اہم کام میں دلی تعاون دیں گے۔ اور برابری کا معاشرہ بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے تاکہ ترقی کا فائدہ غریب طبقے کو پہنچ سکے۔

بھجن لال

وزیر اعلیٰ ہریانہ
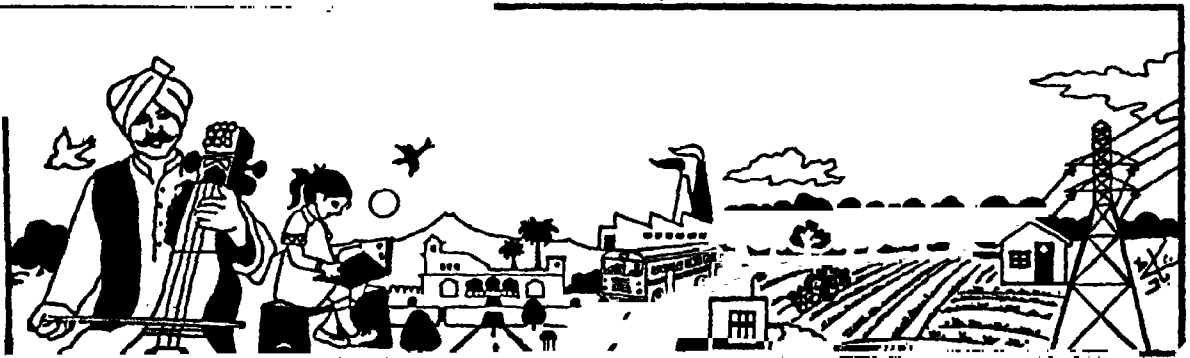
ہریانہ ـــ ترّقی کی کہانی ـــ تصویروں کی زبانی

کاشتکاری کے جدید ترین طریقے اپنانے سے ہریانہ میں
زرعی پیداوار 70 لاکھ ٹن تک پہنچ گئی ہے

گزشتہ چھ برسوں میں جھبڑ کاڈ سیٹوں کی تعداد
16،118 ہوگئی ہے

لفٹ آبپاشی سکیموں سے ناہموار اور خشک سال علاقوں
میں سبز انقلاب آگیا ہے
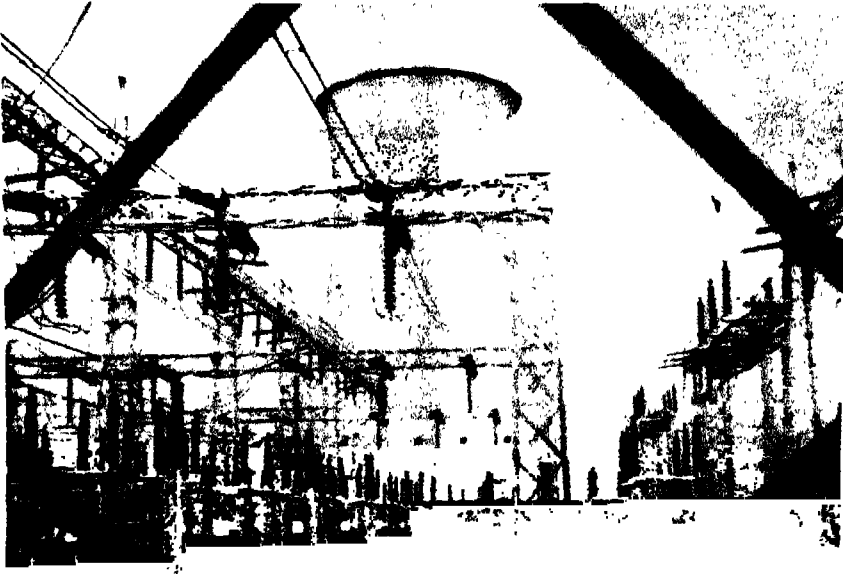
تھرمل پاور پلانٹ بجلی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ

4,690 پرابلم دیہات میں سے 3400
دو پینے کے پانی کی سہولیت فراہم کی جاچکی ہے
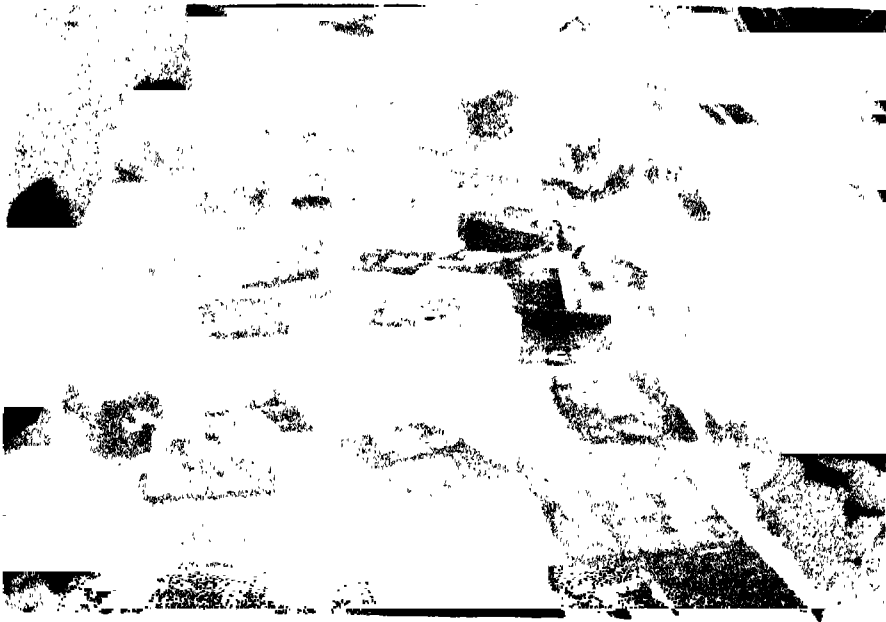
پرائمری، مڈل، ہائر سیکنڈری اور کالج کی تعلیم کی سہولیات بالترتیب اکلومیٹر، 2،37 کلومیٹر، 2،45 کلومیٹر اور 2،37 کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں

ومن ٹریننگ سینٹروں میں زیرِ تربیت خواتین

بے سہارا عورتوں کو روزی کمانے کے اہل بنانے کیلئے
وِمن ٹریننگ کم پروڈکشن سینٹر

مشہور سیاحی مرکز ہوڈل میں ہاتھی کی سواری

کرتار سنگھ دُگل
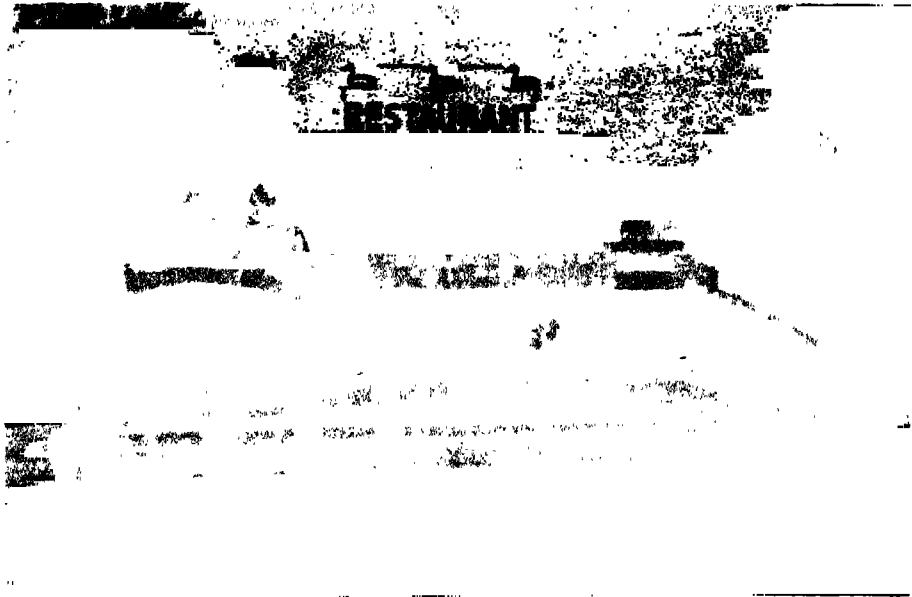
کس کے گھر جائیں

(ایک متوسط درجہ کے گھر کا گول کمرہ)

سلمیٰ ——— (ٹہلتے ہوئے جاں نثار اختر کا شعر گنگنانا)

صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اس وعدہ شکن کو بھولیں

(پوسٹ مین کی آواز)

پوسٹ مین ——— پوسٹ مین۔ (خط پھینک کر گھنٹی بجاتا چلا جاتا ہے)

سلمیٰ ——— ارے یہ تو لطیفہ کی چٹھی ہے (پڑھتی ہے) "تم نے بچی پر جیسے جادو کر دیا ہو۔ اب یہ میری رتی بھر پرواہ نہیں کرتی۔ (سسکیاں) (دروازے پر دستک) (سنبھل کر) کون ہے؟

فرید ——— (باہر سے) امی پروین آنٹی آئی ہیں۔

سلمیٰ ——— آجاؤ پروین۔ دروازہ کھلا ہے۔ (خط آتش دان پر رکھ کر بتی جلاتی ہے۔) اور سلائی لے کر بُنتی ہے)

پروین ——— سلمیٰ کیا ہو رہا ہے۔

سلمیٰ ——— بٹیا تمہیں چھوڑ کر باہر سے ہی لوٹ گیا ہے۔

پروین ——— برآمدے میں کھیل رہا ہے۔

سلمیٰ ——— ان بچوں کو سردی نہیں لگتی۔ (آتش دان کے قریب بیٹھ جاتی ہیں۔)

پروین ——— کیوں تمہیں زکام ہے کیا۔ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں۔

سلمیٰ ——— مجھے تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔

پروین ——— آج کون سی نئی بیماری ہے۔

سلمیٰ ——— نہیں بیماری تو پرانی ہی ہے پروین۔

پروین ——— کچھ معلوم بھی تو ہو۔

سلمیٰ ——— عورت کی بیماریاں دو ہی ہوتی ہیں۔ ایک بچے پیدا کرنے کی بیماری اور دوسری محبت کرنے کی بیماری۔

پروین ——— لیکن پہلی بیماری سے تو تم چھٹکارا پا چکی ہو۔

سلمیٰ ——— (آہ بھر کر) تو محبت کرنے سے کون کسی کو روک سکتا ہے۔

پروین ——— (چھیڑتے) اچھا تو اب کون سی محبت آن چمٹی ہے۔

سلمیٰ ——— محبت پرانی ہی نبھ جائے تو۔

پروین ——— محبت شہد کی طرح جتنی پرانی اتنی ہی میٹھی۔

سلمیٰ ——— تم بھی یہی کہتی ہو۔

پروین ——— ہاں تیس برس کی عمر میں کسی کو اتنی سمجھ تو آ ہی جاتی ہے۔

سلمیٰ ——— (سوچتے) محبت شہد کی طرح جتنی پرانی اتنی ہی میٹھی۔

پروین ——— پرانی محبت کا نشہ سبھی کتنا پیارا ہوتا ہے۔

سلمیٰ ——— لیکن کبھی کبھی پتہ ہی نہیں چلتا کہ محبت کس جگہ ختم ہوتی ہے۔ اور نفرت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

پروین ——— مرد کی محبت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے۔

سلمیٰ ——— شاید۔ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔

پروین ——— عورت کے دل کے اتھاہ ساگر میں اُس کی ہر محبت مدہوش پڑی رہتی ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی محبت کیلئے ایک عورت لاکھ بار اپنے آپ کو قربان کر سکتی ہے۔

سلمیٰ ——— شاید۔ شاید تم ٹھیک کہتی ہو (اپنے خیالات میں ڈوبی ہے) (جانثار اختر کا شعر گنگناتی ہے)

صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اس وعدہ شکن کو بھولیں

پروین ——— تمہیں آج کیا ہو گیا ہے ؟

سلمیٰ ——— (آنسو بھر کر) پروین مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ آج میں بہت دُکھی ہوں۔

پروین ——— لیکن کچھ بتاؤ بھی تو۔ تم نے تو کبھی اپنا دل اتنا چھوٹا نہیں کیا۔

سلمیٰ ——— ہاں پروین۔ میں نے ایک مرد کو چھوڑا جس کے لیے میں نے ایک پھول جیسی بیٹی پیدا کی اور میری آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا۔

پروین ——— لطیف کی کیا بات ہے وہ تو فرشتہ ہے۔ جس طرح تم دونوں ہنستے ہنستے الگ ہوئے میں نے جب بھی کسی سے بات کی ہے کوئی مانتا تھوڑا ہی ہے۔ کسی کو یقین نہیں آتا کہ کوئی مرد بھی اتنا ———

سلمیٰ ——— لیکن اب اُسے کیا ہو گیا ہے۔ (روتی ہے) (چھٹی پروین کو دیتی ہے)

پروین ——— یہ تو لطیف کی چھٹی ہے۔ (پڑھتے ہوئے) تم نے بچی پر جیسے کوئی جادو کر دیا ہے اب یہ میری رتی بھر پرواہ نہیں کرتی۔ آخر ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں بڑے دنوں کی چھٹیاں یہ تمہارے پاس ہی کیوں گذارے۔ خیر اس بار تو میں اسے بھیج رہا ہوں لیکن جب چھٹیاں ختم ہو جائیں تو اسے سیدھا ہوسٹل بھجوا دینا میں اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم ایک اور بچے کی ماں بن چکی ہو پھر تم اس کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔

سلمیٰ ——— (چھٹی چھینتے ہوئے) بس بس۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔

پروین ——— لطیف اور اس طرح کی چھٹی لکھے میں کہتی ہوں اُسے ہو کیا گیا ہے۔

سلمیٰ ——— یہ مرد۔

پروین ——— مرد ذات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

سلمیٰ ——— پھر تو۔ میں تمہیں کہاں تک لطیف کی قربانیوں کی کہانیاں سناؤں۔

پروین ——— وہ لطیف! اور یہ لطیف!! مجھے تو

حیرت ہو رہی ہے۔

سلمیٰ ______ پہلی بار جب اسے پتہ چلا کہ میں فاروق کو چاہتی ہوں......

پروین ______ شاید اُس نے تمہاری کوئی چِٹھی دیکھ لی تھی۔

سلمیٰ ______ نہیں میں اور فاروق ٹیلی فون پر باتیں کر رہے تھے۔ نہ جانے کیسے اس کا ٹیلی فون ہمارے ٹیلی فون کے ساتھ جُڑ گیا اور اُس نے سب کچھ اپنے کانوں سے سُن لیا۔

پروین ______ پھر؟

سلمیٰ ______ اُس دوپہر وہ کھانے کے لئے گھر نہیں آیا۔ شام کو میں کلب میں تھی کہ دورے کا بہانہ کر کے وہ دس دن کے لئے دہرہ دون چلا گیا اور پھر خطوں کے ذریعہ ہم نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے ایک بار بھی اُس نے بُرا نہیں کہا۔ ایک لمحے کے لئے بھی اُس نے مجھے شرمندہ نہیں کیا۔

پروین ______ اور پھر جس طرح تم دونوں الگ ہوئے۔

سلمیٰ ______ ہائے وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکی۔ پہلی بار لطیف اُس صبح مجھ سے پہلے اُٹھ گیا تمام کام جو میں ہر روز کرتی تھی میرے اُٹھنے سے پہلے اُس نے کر لئے۔ دروازوں کو کھولنا۔ نوکروں کو بلانا۔ جھاڑ پونچھ کروانا۔ ناشتہ کے لئے کہنا۔ ناشتہ میز پر لگواتا اور اُس دن ناشتہ کرتے ہوئے کبھی وہ میرے توسٹوں پر مکھن لگاتا۔ کبھی بار بار شہد میرے آگے کرتا۔ بچّی کیلئے وہ ڈھیر سے کھلونے خرید لایا۔ اور نئے کھلونوں کے چاؤ میں بیٹی کو پتہ بھی نہ چلا کہ اُس کی ماں اُس سے جدا ہو رہی ہے۔ اور جب میں موٹر میں بیٹھی تو اس نے گلاب کا ایک آدھ کھلا پھول مجھے پیش کیا۔

پروین ______ گلاب کا ادھ کھلا پھول تمہارے جوڑے میں کتنا اچھا لگتا ہے۔

سلمیٰ ______ اُس نے میرے سب زیور مجھے دیئے۔ میرے تمام کپڑے اُس نے میرے ساتھ کر دیئے۔ گھر کی جو چیز مجھے پیاری تھی۔ مجھ سے چھپا کر اس نے موٹر کے پیچھے رکھوا دی۔

پروین ______ پچھلے سال مسوری میں لطیف سے ملی تھی۔ کتنی دیر تک تمہاری باتیں ہوتی رہیں اس کے ماتھے پر بل تک نہ پڑا۔ اُس کے ہونٹوں پر شکایت تک نہ آئی۔

سلمیٰ ______ میری جس جس سہیلی سے لطیف ان دنوں ملا ہر کسی سے اُس نے یہی کہا کہ محبت کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ جب تھی تب تھی اب نہیں رہی تو نہ سہی۔

پروین ______ دل کا دریا سمندر سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ دل کی بات کون جانے۔

سلمیٰ ______ اور آج کتنے برسوں سے ہر سال بچّی دو بار میرے پاس آتی رہی ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے پاس بڑے دنوں کی چھٹیوں میں میرے پاس اور پھر بیچ میں بھی اگر کبھی اُس کی

طبیعت خراب ہوئی تو آٹھ آٹھ دس
دس دن میرے پاس گزارتی رہی
ہے۔

پروین ——— اور اب اُسے کیا ہو گیا ہے ؟

سلمیٰ ——— میں کہتی ہوں پروین یہ مرد اِن مردوں کا
کوئی بھروسہ نہیں۔

پروین ——— لیکن سلمیٰ لطیف کے معاملے میں مجھے
دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے

سلمیٰ ——— وہ کیا۔

پروین ——— میں سوچتی ہوں وہ جو سات سال
سے ویسے کا ویسا ہے یہ جو سات سال
سے وہ ویران کا ویران ہے یہ بلا
وجہ نہیں۔

سلمیٰ ——— (گھبرا کر) تمہارا مطلب ؟

پروین ——— میرا مطلب ہے کہ لطیف کی آنکھوں
میں کبھی کبھی جس محرومی کا عکس نظر
آتا ہے جو روکھا پن کبھی کبھی اس کے
نالوں سے جھانکتا ہے جو اکھڑ پن کبھی
کبھی اس کی آواز میں سنائی دیتا
ہے۔ وہ بلا وجہ نہیں ہے۔ اُس کے
گھر کے لان کی گھاس کا برابر کٹی ہوئی
نہ ہونا۔ اس کے کپڑوں کے کسی نہ کسی
بٹن کا ٹوٹا رہنا۔ اس کا کبھی داڑھی
بڑھا لینا کبھی کٹوا دینا۔ کبھی مونچھیں
رکھ لینا کبھی منڈوا دینا یہ بلا وجہ
نہیں ہے کہ کئی بار ہنستے ہنستے اس کی
ہنسی رک جاتی ہے اور ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ جیسے ایک دم اس کی
آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں گے۔

سلمیٰ ——— پروین۔

پروین ——— سوچو تو سہی اگر لطیف چاہتا تو کیا
ان سات برسوں میں ——— سلمیٰ یہ تمہیں
کیا ہو رہا ہے تمہاری انگلیاں کس
تیزی سے سلائیاں چلا رہی ہیں۔

سلمیٰ ——— تمہارا مطلب ہے۔

پروین ——— پچھلے سال مسوری میں میں نے دیکھا
کہ کلب میں جس میز پہ وہ ایک بار
بیٹھتا تھا پھر کبھی اُس میز کی طرف دیکھتا
تک نہ تھا۔ ایک دن اگر کسی سے بات
کرتا تھا تو اگلے دن یوں خالی خالی
نظروں سے اُس کی طرف تکتا جیسے اجنبی
ہو۔ آخر یہ سب کیوں ؟

سلمیٰ ——— تمہارا مطلب ہے اس کی ذمہ دار میں ہوں۔

پروین ——— نہیں میں یہ نہیں کہتی۔ میں تو بس یہی
کہتی ہوں کہ لطیف انسان ہے فرشتہ
نہیں۔

سلمیٰ ——— ہاں وہ انسان ہے فرشتہ نہیں، کاش
وہ فرشتہ ہوتا۔ اگر وہ فرشتہ
ہوتا تو کوئی زلیخا ایک بار تو اس کا
دامن چاک کر ڈالتی۔

پروین ——— یہ تمہاری انگلیاں سلائیوں کو پھر
اس تیزی سے کیوں چلا رہی ہیں۔

سلمیٰ ——— کچھ نہیں پروین کبھی کبھی نہ جانے مجھے
کیا ہو جاتا ہے۔

پروین ——— یہ کیا بن رہی ہو جس کی تمہیں اتنی
جلدی ہے ؟

سلمیٰ ——— بیبئے کا سوئٹر۔

پروین ——— تو اس کی جلدی کیا ہے

سلمیٰ ——— ہاں جلدی تو کوئی نہیں۔ میں سوچتی ہوں
جو کام ہو جائے وہی اچھا ہے جس

ذمہ داری سے بھی لوگ سبکدوش ہو جائے
اتنا ہی بوجھ کم۔ جن کا سفر لمبا ہوتا ہے
وہ زیادہ بوجھ سر پر نہیں اٹھائے پھرتے۔

پروین ـــــ آج یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔

سلمیٰ ـــــ آج میری بچی آئے گی۔

پروین ـــــ بچہ تو تمہارے پاس ایک پہلے بھی ہے۔

سلمیٰ ـــــ (سوچتے) ہاں بچہ تو میرے پاس ایک پہلے بھی ہے۔

پروین ـــــ پھر اس بچے میں اور اس بچے میں کیا فرق ہے

سلمیٰ ـــــ اس بچے میں مصری جیسا مزہ ہے۔
اس بچے میں شہد جیسی مٹھاس ہے۔ اس بچے کے لئے میں سانس سانس جیتی ہوں۔ اس بچے کے لئے میں سانس سانس ترستی ہوں۔ اس بچے کو دیکھ کر میرے دل کو ٹھنڈک پہنچتی ہے اس بچے کے لئے میں راہ میں آنکھیں بچھائے رہتی ہوں۔ ہائے میں ماں ہوں کوئی میرے دل میں جھانک کر دیکھے۔ لاکھ ارمان بھرے ہیں اس بچے کے لئے
لاکھ دعائیں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہیں۔ اس بچے کے لئے۔
ایک ماں کے دل میں کوئی بچہ کسی دوسرے بچے کی جگہ نہیں لے سکتا
(موٹر کا ہارن)

پروین ـــــ ایں۔ یہ باہر کون ہے۔ میں دیکھتی ہوں (جاتی ہے)

سلمیٰ ـــــ (اپنے آپ) سچ مچ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔
میری انگلیاں کیوں اتنی تیزی سے سلائیاں چلا رہی ہیں۔ آج مجھے یہ کیا ہو رہا ہے۔ (سوچتے) جب کوئی ممتا اس طرح تڑپتی ہے جس طرح میرے اندر کی ماں سسک رہی ہے تو خدا کوئی از حد سنگ دل خدا ہو گا جو نہ پسیجے آخر میں چاہتی بھی کیا ہوں۔ ایک ماں اپنی بچی کو دیکھنے کے لئے بے چین ہے ایک ماں اپنی اولاد کو سینے سے لگا کر اپنے دل کی آگ بجھانا چاہتی ہے۔ یہ خدا اتنا رحم دل سنا جاتا ہے میری یہ چھوٹی سی آرزو بھی کوئی آرزو ہے

پروین ـــــ (باہر سے) سلمیٰ دیکھو تمہارے لئے میں کسے لائی ہوں۔

زینت ـــــ آداب امی۔

سلمیٰ ـــــ (بچی کو کھینچتے ہوئے) ہائے آج تو اللہ سے چاہے جس نے کچھ اور مانگا ہوتا۔

پروین ـــــ سلمیٰ تمہیں معلوم ہے اسے یہاں کون چھوڑ کر گیا ہے۔

سلمیٰ ـــــ تم کس کے ساتھ آئی ہو بیٹی۔

زینت ـــــ ڈیڈی کے ساتھ

پروین ـــــ لطیف خود اسے یہاں پہنچا کر گیا ہے۔

سلمیٰ ـــــ یہ ہارن۔ تمہارے ڈیڈی کی کار کا تھا۔

پروین ـــــ وہ تو اس نے واپس جاتے ہوئے کہیں گیٹ میں بجایا تھا۔ میں بھی تو اس کی کار کو پیچھے ہی سے دیکھ پائی

سلمیٰ ـــــ لیکن تم تو آج رات کی گاڑی سے آ رہی تھیں۔

زینت ـــــ ڈیڈی کو یہاں کوئی کام پڑ گیا تھا اسی لئے مجھے بھی ساتھ لے آئے۔ امّی ڈیڈی نے نئی کار خرید لی ہے۔

سلمیٰ ـــــ اچھا۔ کیا رنگ ہے ؟

زینت ـــــ چاکلیٹ امّی۔

سلمیٰ ـــــ چاکلیٹ (خیالات میں ڈوبی)

پروین ـــــ چاکلیٹ تو تمہارا محبوب رنگ ہے

سلمیٰ ـــــ ہاں پروّو!! چاکلیٹ میرا محبوب رنگ ہے۔ پچھلی بار زینت کے ڈیڈی نے کار خریدی۔ میں چاکلیٹ چاکلیٹ کرتی رہی۔ لیکن اس رنگ کی کوئی کار ملی ہی نہیں۔

زینت ـــــ دو کاریں تھیں امّی ایک سبز ایک چاکلیٹ۔ ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا۔ بیٹی تمہیں کون سا رنگ پسند ہے۔ مجھے چاکلیٹ رنگ پسند تھا۔ اور ڈیڈی نے وہی کار خرید لی۔

پروین ـــــ سلمیٰ تمہاری بیٹی ہو بہو تمہاری شکل نکل رہی ہے۔

سلمیٰ ـــــ (سوئی ہوئی) اچھا بیٹا سامان اپنے کمرے میں رکھوا کر ہاتھ منہ دھو لو۔

زینت ـــــ اچھا امّی (جاتی ہے)

سلمیٰ ـــــ اس گھر میں ایک کمرہ ہمیشہ میری بچّی کے لئے خالی رہتا ہے۔

پروین ـــــ میں پوچھتی ہوں سلمیٰ لطیف نے یہ کیا کیا۔ بچی کو باہر اتار کر چپ چاپ چلا گیا

سلمیٰ ـــــ بالکل کوٹھی کے اندر آ گیا تھا؟۔

پروین ـــــ برآمدے میں آ کر اس نے سامان اتروایا۔ بچی کو اتارا اور چلا گیا

سلمیٰ ـــــ تمہارا مطلب ہے اگر آیا تھا تو اندر چلا آتا۔ بنا بتائے بنا کچھ کہے سُنے کسی کے گھر میں گھُس آنا۔

پروین ـــــ فرید کہاں گیا ہے۔ تمہارا بیٹا کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔

سلمیٰ ـــــ ہائے مجھے تو اس کا خیال بھی نہیں رہا۔ پڑوسیوں کے ہاں چلا گیا ہو گا۔ جس گھر میں بچّے کی آیا کو دلچسپی ہو اُس گھر میں بچے کو زیادہ جانا پڑتا ہے۔

پروین ـــــ (اٹھتے ہوئے) اچھا سلمیٰ اب میں چلتی ہوں۔

سلمیٰ ـــــ میں تو سوچتی ہوں تم کچھ دیر اور ٹھہرتیں۔

پروین ـــــ نہیں تمہاری بچی تیار ہو کر آ جائے گی اور تمہارا دل بہلاتے گی (جاتی ہے)

سلمیٰ ـــــ (اپنے آپ) لطیف یہ تم نے کیا کیا ؟ برآمدے تک تم اس گھر میں گھُس آئے۔ تم اس دہلیز تک آ گئے جہاں ہر روز کھڑی ہو کر میں فاروق کا انتظار کرتی ہوں۔ یہ تم نے کیا کیا ؟

زینت ـــــ (آتے ہوئے) امّی ڈیڈی نے یہ خط دیا تھا۔ (سلمیٰ خط پڑھتی ہے)

سلمیٰ ـــــ اچھا بیٹی چلو دیکھیں تمہارا بھائی کہاں ہے۔

زینت ـــــ امّی اب ڈیڈی مجھے ہوسٹل بھیج دیں گے۔ ؟

سلمیٰ ـــــ (دُکھ سے) ہاں بیٹی۔

زینت ——— امی میں ہوسٹل میں نہیں جاؤں گی۔

سلمیٰ ——— (پژمردہ لہجہ) اچھا بیٹی۔

زینت ——— امی میں تمہارے پاس رہوں گی۔

سلمیٰ ——— (گلے لگاتی ہے) اچھا بیٹی۔ اچھا بیٹی۔
اچھا بیٹی۔

فرید ——— (آتے ہوئے) امی۔

زینت ——— بھیا۔

فرید ——— باجی۔

(بچے گلے ملتے ہیں)

زینت ——— بھیا میں تمہارے لئے بہت سے ٹکٹ
لائی ہوں۔ بہت سی تصویریں لائی ہوں
کنچے لائی ہوں۔ دو گیندیں لائی ہوں
اور اپنے بچائے ہوئے پیسوں سے
ایک ہوائی جہاز لائی ہوں اپنے راجہ
بھیا کیلئے (دونوں جاتے ہیں)

سلمیٰ ——— کیسے بانہہ میں بانہہ ڈالے ہنس رہے
ہیں۔ کھیل رہے ہیں۔ اور اسے شاید
یہی بُرا لگتا ہے۔ (خط پڑھتے) بیٹی
آخری بار تم سے ملنے آ رہی ہے۔ اس
کے بعد میں اسے ہوسٹل میں بھیج دوں گا۔
(سسکی) ہائے کوئی یہ کیوں نہیں
سوچتا کہ میں ماں ہوں ایک ماں اپنے
ہر بچے میں پھر سے جنم لیتی ہے اور ہر
بچہ اسے ہر دوسرے بچے سے زیادہ
پیارا ہوتا ہے۔

فرید ——— (آتے ہوئے) امی دیکھو بہن میرے
لئے کیا لائی ہے۔

زینت ——— (دور سے) امی میں بھیا کے لئے
جُرابیں بن رہی تھی (سلائی اور اُون
ہاتھ میں)

سلمیٰ ——— اچھا بیٹی تمہیں جُرابیں بُننا بھی آگیا
ہے۔ کتنا ہاتھ صاف ہے تمہارا۔
کس نے سکھایا ہے تمہیں جُرابیں
بُننا

زینت ——— میری سہیلی نے۔

سلمیٰ ——— کیا نام ہے تمہاری سہیلی کا۔

زینت ——— شہلا۔ امی۔

سلمیٰ ——— اور بھی کوئی سہیلیاں بنائی ہیں تم نے۔

زینت ——— ہاں امی۔ موہنی۔ رضیہ۔ روزی اور قمر

سلمیٰ ——— تمہاری آیا وہی ہے۔

زینت ——— ہاں امی تمہیں سلام کہتی تھیں۔
امی تمہاری ایک تصویر آیا نے اپنے
کوارٹر میں چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔
ڈرائنگ روم والی تمہاری تصویر
گر کر ٹوٹ گئی ہے۔

سلمیٰ ——— اور کھانے والے کمرے کی؟

زینت ——— وہ پتہ نہیں امی

فرید ——— امی۔

زینت ——— جو تصویر ٹوٹ گئی ہے وہ کہاں
ہے

زینت ——— معلوم نہیں امی۔

فرید ——— امی۔

سلمیٰ ——— اس بار امرود کے پیڑوں پر پھل
آئے ہیں؟

زینت ——— ہاں امی۔

فرید ——— امی میری بات بھی تو سنو۔

سلمیٰ ——— پچھلے برآمدے میں دھوپ ویسے
ہی آتی ہے۔

زینت ——— ہاں امی۔

فرید ——— میری بات نہیں سنتا کوئی۔

سلمیٰ ـــــ ہاں بیٹا بولو تم کیا کہتے ہو۔
فرید ـــــ اب ہم بہن کو نہیں جانے دیں گے بس یہیں رہیں گی۔
زینت ـــــ ہاں امی مجھے اپنے پاس رکھ لو۔
فرید ـــــ امیّ جان!!
زینت ـــــ امی تم مجھے بہت یاد آتی تھیں (سلمیٰ گم سُم)
فرید ـــــ امی۔
زینت ـــــ امی۔
سلمیٰ ـــــ (دبا لہجہ) ہاں بچوں ہاں (آنسو) (ٹیلی فون کی گھنٹی)
فرید ـــــ میں ٹیلی فون سنوں گا۔ (جاتا ہے)
زینت ـــــ امیّ تم رو رہی ہو؟
سلمیٰ ـــــ نہیں تو بیٹی۔ (وقفہ)
زینت ـــــ امیّ کیا یہ بھیّا کا سوئٹر بن رہی ہو؟
سلمیٰ ـــــ ہاں بیٹی۔
زینت ـــــ میں بھیّا کے لیے اودے رنگ کی جرابیں بن رہی ہوں۔ تم بھیّا کیلئے اودے رنگ کا سوئٹر بن رہی ہو۔
فرید ـــــ (باہر سے) امی ڈیڈی کا ٹیلی فون ہے دس منٹ میں آ رہے ہیں۔
زینت ـــــ امی یہ کیسے ہوا اُودا رنگ میں نے بھی چنا تم نے بھی۔
سلمیٰ ـــــ تم میری بیٹی جو ہو۔ جو میری پسند ہے وہی تمہاری پسند ہے۔
زینت ـــــ امی۔ ڈیڈی مجھے ہوسٹل کیوں بھیج رہے ہیں۔
سلمیٰ ـــــ پھر کیا ہوا بیٹی تم ہوسٹل میں رہنا۔
زینت ـــــ میں ہوسٹل نہیں جانا چاہتی۔
سلمیٰ ـــــ (بات بدل کر) بیٹی یہ تو بتاؤ کیا تم نے کبھی وہ لال غرارہ پہنا ہے میں سوچتی ہوں آج کل تم اسے پہنا کرو نہیں تو چھوٹا ہو جائے گا۔
زینت ـــــ امیّ میں ہوسٹل نہیں جاؤں گی۔ امی مجھے اپنے پاس رکھ لو۔
سلمیٰ ـــــ (ٹالتے) دیکھوں باہر کون ہے۔
زینت ـــــ (ماں کے قریب) امی میری امی تم پھر رو رہی ہو۔
سلمیٰ ـــــ نہیں تو میری بچّی۔
زینت ـــــ تو تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں۔
سلمیٰ ـــــ نہیں میری بیٹی نہیں۔ (موٹر کی آواز)
زینت ـــــ باہر کوئی آیا ہے۔
سلمیٰ ـــــ (آنسو پونچھ کر) فرید کے ڈیڈی ہوں گے۔ اُنھیں کی کار کی آواز ہے۔
زینت ـــــ میں دیکھتی ہوں۔
سلمیٰ ـــــ (شعر گنگناتی ہے)

صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اُس وعدہ شکن کو بھولیں

فاروق ـــــ (آتے ہوئے) ہیلو یہ کون آیا ہے۔ بٹیا رانی آئی ہے
سلمیٰ ـــــ ہیلو۔
فاروق ـــــ تمہیں پھر زکام ہو گیا؟ تمہاری آنکھیں کیسی لال ہو رہی ہیں۔
سلمیٰ ـــــ ہاں فاروق۔
فاروق ـــــ فرید کہاں ہے۔
سلمیٰ ـــــ یہیں کہیں ہو گا۔
زینت ـــــ ادھر گیا تھا میں دیکھتی ہوں (جاتی ہے)
فاروق ـــــ زینت کس کے ساتھ آئی ہے
سلمیٰ ـــــ اپنے ڈیڈی کے ساتھ۔
فاروق ـــــ (حیرانی) لطیف آیا تھا۔
سلمیٰ ـــــ ہاں۔

فاروق ـــــ (تعجب سے) لطیف خود آیا تھا۔

سلمیٰ ـــــ ہاں۔

فاروق ـــــ کیا مطلب ہے تمہارا۔

سلمیٰ ـــــ لطیف اپنی کار میں بیٹھ کر خود زینت کو پہنچانے آیا تھا۔

فاروق ـــــ ہوں۔ رکا نہیں۔

سلمیٰ ـــــ یہ اس کے دو خط ہیں۔ ایک ڈاک سے آیا تھا۔ دوسرا اس نے زینت کے ہاتھ بھجوایا ہے

فاروق ـــــ (پڑھتے ہوئے) یہ اب اسے کیا ہوگیا ہے؟

سلمیٰ ـــــ مرد ذات کی بات کون جانے۔

فاروق ـــــ پھر بھی اس قسم کے خط لکھنا کہاں کی شرافت ہے۔

سلمیٰ ـــــ (بھرائی آواز) مجھے یاد ہے جیسے کل کی ہی بات ہو۔ جب میں چلنے لگی تھی تو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ بچی تمہاری امانت ہے۔ جب تمہارا دل چاہے بلا لیا کرنا۔

فاروق ـــــ اب کون بلی چھینک گئی ہے۔

سلمیٰ ـــــ یہ وہی جانے۔

فاروق ـــــ اس طرح کسی کی ازدواجی زندگی کو خراب کرنا کہاں کی انسانیت ہے
(گاڑی آواز)

سلمیٰ ـــــ معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگ گئی ہے۔ (جاتی ہے)

فاروق ـــــ (اپنے آپ) بے ہودہ۔

سلمیٰ ـــــ ہائے آگ سامنے سول لائنز میں لگی ہے۔ شعلے کس طرح آسمان کی طرف لپک رہے ہیں۔

فاروق ـــــ (قریب آکر) کسی بے چارے کا گھر جل رہا ہے

سلمیٰ ـــــ کسی سے کوئی لاپرواہی ہوئی ہوگی۔

فاروق ـــــ آج کی رات کتنی سیاہ ہے۔

سلمیٰ ـــــ رات اتنی سیاہ نہیں ہے جتنی آگ کے شعلوں کی وجہ سے معلوم ہو رہی ہے۔

فاروق ـــــ بڑی بھیانک آگ ہے۔

زینت ـــــ امی ہم کھانا کھائیں؟

سلمیٰ ـــــ ہاں بیٹی آیا سے کہہ دو تمہیں کھانا دے دے۔

زینت ـــــ آیا تو کہیں نظر نہیں آرہی۔

سلمیٰ ـــــ پڑوسیوں کے ہاں گئی ہوگی۔

فاروق ـــــ یہ آیا تمہاری پڑوسیوں کے ہاں بہت جاتی ہے

سلمیٰ ـــــ (زینت) اسے بلوا لو بیٹی۔ (زینت جاتی ہے)

فاروق ـــــ زینت کتنی بڑی ہوگئی ہے۔

سلمیٰ ـــــ اب بارہواں سال لگا ہے۔

فاروق ـــــ لڑکیاں بیل کی طرح بڑھتی ہیں۔

سلمیٰ ـــــ (اداس) یہی عمر ہے جب بچی کو ایک ماں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

فاروق ـــــ (طنزاً) اور اس کا باپ اسے ہوسٹل بھیج رہا ہے۔

سلمیٰ ـــــ ایک بار مجھے بھی ہوسٹل بھیجا گیا تھا۔ میں رات رات بھر روتی رہتی تھی۔ تیسرے دن اماں آکر مجھے گھر لے گئیں۔

فاروق ـــــ جہاں تک ممکن ہو ایک خاص عمر تک بچوں کو اپنے ماں باپ کے پاس رہنا چاہیئے۔

سلمیٰ ـــــ جوان ہو رہی لڑکیوں کیلئے ماں کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔

فاروق ــــ تم ٹھیک کہتی ہو سلمیٰ۔

سلمیٰ ــــ اب میری بچی ہوسٹل بھیج دی جائے گی۔

فاروق ــــ لیکن میں پوچھتا ہوں ایک مہذب شخص کیلئے ایسا کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

سلمیٰ ــــ اس تہذیب ہی کا تو سارا رونا ہے تہذیب کے راستے پر ہم آگے نکل گئے ہیں لیکن جذبات کے لحاظ سے ہم وہیں کے وہیں رہے۔

فاروق ــــ تم تو آج فلسفہ چھانٹ رہی ہو۔

سلمیٰ ــــ جس تن لاگے وہی تن جانے۔

فاروق ــــ تمہارا مطلب ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے؟

سلمیٰ ــــ یہ بات نہیں ہے فاروق۔ تم تو میری زندگی ہو تم ہی تو میری آخری امید ہو۔

فاروق ــــ میں کہتا ہوں کہ اگر تم کہو تو میں لطیف سے بات کروں۔

سلمیٰ ــــ تم اس سے کیا کہو گے

فاروق ــــ مجھے جو کہنا ہے کہہ لوں گا بس تمہاری اجازت چاہیئے۔

سلمیٰ ــــ نہیں نہیں فاروق تم لطیف کو نہیں جانتے۔

فاروق ــــ میں لطیف کو نہیں جانتا؟ جس کے ساتھ میں آدھی رات تک کلب میں بیٹھا تاش کھیلتا رہا ہوں۔

سلمیٰ ــــ تم لطیف کو نہیں جانتے فاروق۔ مرد کو مرد مشکل ہی سے پہچان سکتا ہے مرد کو سمجھنے کیلئے عورت کی آنکھ چاہیئے۔

فاروق ــــ یہ تمہاری انگلیاں کس تیزی سے سلائیاں چلا رہی ہیں۔

سلمیٰ ــــ (ایک دم) اوہ۔ ہاں۔ میں بیٹھے سو
سوئیٹر بن رہی ہوں۔

فاروق ــــ کیا آج ہی اسے ختم کرنا ہے۔ یہ تمہاری کیسی عادت ہے سلمیٰ۔ جو بات دل میں آگئے اسے پورا کر لینا۔ اس وقت اسی لمحہ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

سلمیٰ ــــ کاش زندگی میں کوئی آدمی جو اس کے دل میں آجائے اسے پورا کرسکے۔

فاروق ــــ اس وقت تمہارا دل کیا چاہتا ہے۔

سلمیٰ ــــ میرا دل چاہتا ہے؟ (زور سے ہنستی ہے)

فاروق ــــ کہو نہ تمہارا دل کیا چاہتا ہے۔

سلمیٰ ــــ (ایک دم ہنسی روک کر) میرا دل چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک چاقو ہو اور اسے میں تمہاری پیٹھ میں گھونپ دوں۔ (آنسو گر جاتے ہیں)

فاروق ــــ (سلمیٰ کو سمجھاتے ہوئے) سلمیٰ سلمیٰ میری جان کیا ہو گیا ہے سلمیٰ تمہیں۔

سلمیٰ ــــ (روتی ہے) معاف کرنا فاروق۔ مجھے معاف کرنا میں بہت بدنصیب ہوں۔

فاروق ــــ حوصلہ رکھو سلمیٰ۔

سلمیٰ ــــ میں بہت دکھی ہوں

فاروق ــــ میں تمہیں برانڈی لاکر دیتا ہوں۔ (جاتا ہے)

سلمیٰ ــــ (سوئیٹر اٹھاتے) یہ سوئیٹر مجھے ختم کرنا چاہیئے۔ آخر کیوں؟ جلدی کیا ہے؟ میں کیوں یہ سوئیٹر ختم کرنا چاہتی ہوں؟ کیا میں کہیں جا رہی ہوں؟ میں تو کہیں بھی نہیں جا رہی ہوں۔ پھر جلدی کیا ہے۔

فاروق ــــ (بوتل گلاس لاتے ہوئے) میں آیا ہے کہہ آیا ہوں کہ بچوں کو سُلا دے۔ زینت اب بڑی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا اِدھر آکر کیا دیکھے گی۔ (گرم پانی ملا کر دیتا ہے)

سلمیٰ ــــ ہاں زینت بڑی ہو گئی ہے

فاروق ــــ اسے ایک دم پی لو سلمیٰ۔

سلمیٰ ــــ (پیتے ہوئے) فاروق مجھے اور برانڈی دو۔ آج میں اپنے آپ کو بھول جانا چاہتی ہوں

فاروق ــــ (برانڈی دیتے) ہاں آدمی کو بھول ہی جانا چاہیئے یہ زندگی کی بدمزگیاں۔

سلمیٰ ــــ لیکن کئی ان سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔

فاروق ــــ کچھ لہریں ایسی ہوتی ہیں جو چٹان سے ٹکرا کر اوپر ہی اوپر اٹھتی ہیں۔

سلمیٰ ــــ اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو خود تو اوپر اٹھیں یا نہ اٹھیں چٹان کی جڑیں ہلا دیتی ہیں۔

فاروق ــــ مجھے یہ بتاؤ سلمیٰ کہ آج نہیں کیا ہو رہا ہے؟

سلمیٰ ــــ (نشے میں) ہائے آج میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ میں ماں ہوں۔

فاروق ــــ میں کہتا ہوں لطیف کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا ہے۔ بڑا اپنے آپ کو نئی روشنی کا انسان کہتا ہے۔

سلمیٰ ــــ یہ اب اُس سے کون پوچھے؟

فاروق ــــ تم بھی تو اس کی باتیں کرتی نہیں تھکتی تھیں۔

سلمیٰ ــــ جس شرافت کا ثبوت اس نے ہمارے الگ ہوتے ہوئے دیا تھا۔ اس کی کون تعریف نہیں کرتا۔

فاروق ــــ لیکن اب کیا ہو گیا ہے۔

سلمیٰ ــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

فاروق ــــ آج کل کی نئی روشنی میں ایک بچے کو اس کی ماں سے چھین لینا میری نظر میں انتہائی ظلم ہے۔

سلمیٰ ــــ ہائے اس سے جا کر اب یہ کون کہے۔

فاروق ــــ میں جا کر اس سے یہ کہنے کو تیار ہوں۔ یہ کہاں کی شرافت ہے جتنا حق ایک باپ کو اپنے بچے پر ہوتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ حق ایک ماں کا اپنے بچے پر ہوتا ہے۔ نئے زمانے میں نئی روشنی میں چونکہ ایک ماں بچے کے باپ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی اس لئے اس سے اس کا بچہ چھین لیا جائے۔ ماں کی ممتا کا تو کچھ لحاظ ہونا چاہیئے۔ بچے کے معصوم دل کا تو کچھ خیال ہونا چاہیئے۔

سلمیٰ ــــ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن وقت کی حکومت اس کی طرف ہے حکومت کا قانون اس کے حق میں ہے۔

فاروق ــــ قانون وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ سنگدل انصاف سے اوپر بھی کوئی چیز ہے۔ چونکہ بچے کی ماں کچھ کرتی ہے اس لئے بچے سے ماں کی چھاتیوں کی ٹھنڈک چھین لی جائے چونکہ بچے کی ماں کچھ کرتی ہے اس لئے بچے کو ماں کے حیات بخش لمس سے الگ کر دیا جائے۔ ماں کی پلکوں تلے چھپے ہوئے لاکھوں ارمان ایک بچے کے

خدوخال کو سنوارتے ہیں سجاتے ہیں۔

سلمیٰ ——— تم ٹھیک کہتے ہو۔

فاروق ——— میں تو یہاں تک مانتا ہوں کہ ماں میں چاہے لاکھوں برائیاں ہوں اس کے بچے کو اس سے الگ نہیں کرنا چاہیئے وہ کتنے گناہوں کی تاریکی میں گھری ہوئی ہو۔ ایک ماں اپنے دل کے کسی کونے میں روشنی کی کرن چھپائے رکھتی ہے۔ اپنے بچے کے لیئے۔ شیرنی جنگل کے تمام جانوروں کو کھاتی ہے۔ لیکن جب اپنے غار میں آتی ہے تو اپنے بچے کے لئے اپنی کوکھ کے جائے کے لئے وہ ریجھ ریجھ جاتی ہے۔ سو سو جانیں قربان کرنے کو تیار رہتی ہے۔ ایک ماں کو اس کے بچے سے کبھی الگ نہیں کرنا چاہیئے۔

سلمیٰ ——— فاروق۔ میری جان۔

فاروق ——— ایک ماں کو اس کے بچے سے کبھی الگ نہیں کرنا چاہیئے۔ آج کل کے نئے زمانے میں آج کل کی نئی روشنی میں اس طرح کی باتیں کرنا جیسی لطیف کر رہا ہے میں تو حیران ہوں۔

سلمیٰ ——— (ایک دم جیسے کھل اٹھی) فاروق۔ اس کا مطلب ہے کہ

فاروق ——— جب تم لوگ الگ ہوئے تھے اس وقت اگر وہ چاہتا۔ اگر اس کی مرضی ہوتی تو وہ تمہیں روک سکتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے خود لکھ کر اس نے تمہیں دوسری شادی کی اجازت دی اور اب اس طرح داد بلا مچانا کوئی شرف ہے۔ کوئی انسانیت ہے۔

سلمیٰ ——— (خوش ہو کر) میں سوچتی ہوں۔ میری جان۔

فاروق ——— میں کہتا ہوں۔ یہ بے انصافی ہے۔ نہ صرف تمہارے ساتھ بلکہ میرے ساتھ بھی۔ ہمارے بچے کے ساتھ بھی۔ ایک گھر کی عورت جب پریشان ہوتی ہے تو اس گھر پر گویا غم کی گھٹا چھا جاتی ہے۔ جیسے کسی کمرے کے تمام پردے گرا دیئے جائیں اور اس میں کسی کا دم گھٹنے لگے۔ اس نئے زمانے میں اس نئی روشنی میں۔

سلمیٰ ——— (ایک دم آگے بڑھ کر) فاروق فاروق میری بات تو سنو۔

فاروق ——— میں مانتا ہوں ایک ماں کو اپنے بچے پر پورا پورا حق ہے چاہے وہ اس بچے کے پاس رہے چاہے نہ رہے۔

سلمیٰ ——— (اور بھی تیزی سے) تو پھر میری جان۔ میں لطیف کے پاس چلی جاتی ہوں۔

فاروق ——— ہاں ہاں تمہیں ضرور اس کے پاس جا کر اسے سمجھانا چاہیئے۔

سلمیٰ ——— نہیں۔ یہ نہیں فاروق میں لطیف کے پاس چلی جاتی ہوں۔

فاروق ——— (گھبرا کر) کیا مطلب۔

سلمیٰ ——— میرا مطلب ہے کہ میں لطیف کے پاس واپس چلی جاتی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے

فاروق ——— (چیختی آواز) یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

سلمیٰ ——— (دامن چھوڑ کر) میں کہہ رہی ہوں فاروق میں لطیف کے پاس چلی جاتی ہوں۔ اگر وہ زیادتی کر رہا ہے تم تو سمجھدار ہو۔

فاروق ——— (حیرانی) تم کیا کہہ رہی ہو؟

سلمیٰ ——— (سمجھاتے) یوں کہتی ہوں کہ میں لطیف کے پاس واپس چلی جاتی ہوں۔ میرا اب کیا ہے میں اُس کے پاس رہ لوں گی اپنی بیٹی کے لئے۔

فاروق ——— (ہکا بکا) اور ہمارا بیٹا۔

سلمیٰ ——— تم اسے میرے پاس بھیج دیا کرنا گرمی کی چھٹیوں میں بڑے دن کی چھٹیوں میں (ہاتھ تھام لیتی ہے)

فاروق ——— تمہارا مطلب کیا ہے ؟

سلمیٰ ——— میرا مطلب ہے کہ اگر میں لطیف کے پاس چلی جاؤں اپنی بچی کے لئے تو تم تو بیٹے کو میرے پاس بھیج دیا کرو گے (سسکی بھر کر) میرا اب کیا ہے۔ کسی طرح میرے دن کٹ جائیں گے ہائے میں ماں ہوں ایک ماں جو صرف بچوں کے لئے جیتی ہے۔ تم تو نئے زمانے نئی روشنی۔

فاروق ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

سلمیٰ ——— ہو سکتا ہے کیوں نہیں ہو سکتا ؟ جیسے لطیف بیٹی کو بھیجا کرتا تھا ویسے ہی تم بیٹے کو بھیج دیا کرنا۔

فاروق ——— (گھبرا کر) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

سلمیٰ ——— (فریادی لہجہ) یہ ہو سکتا ہے فاروق لطیف ابھی ویسے کا ویسا ہی ہے میں اُسے سمجھاؤں گی میں اسے منا لوں گی میں اپنی بیٹی کے پاس چلی جاتی ہوں تم بیٹے کو میرے پاس بھیج دینا تم سمجھ دار ہو۔ مہذب ہو نئے زمانے کے ہو۔

فاروق ——— (غصہ) یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

سلمیٰ ——— (الگ سے) یہ ہو سکتا ہے فاروق۔ میری جان یہ ہو سکتا ہے کہو تم بیٹے کو تو مجھ سے نہیں چھین لو گے ---------- تم تو نئی روشنی ------

فاروق ——— (کھٹی آواز) یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے (اسی طرح بولتا کمرے سے چلا جاتا ہے)

سلمیٰ ——— (شعر گنگناتی ہے)

صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اُس وعدہ شکن کو بھولیں

زخمی حصاری

غزل

کیوں رہے عالم بے کسی عمر بھر
کیوں تڑپتی رہے زندگی عمر بھر

اپنے ظلمت کدوں میں جو بیٹھے رہے
دیکھ پائے نہ وہ روشنی عمر بھر

زندگی کے مسائل نہ حل ہو سکے
سوچتا ہی رہا آدمی عمر بھر

زندگی کے سفر میں وہ پیچھے رہے
جن پہ چھائی رہی بے حسی عمر بھر

صحن گلشن میں زخمی ہر اک خار کی
رنگ و بو سے رقابت رہی عمر بھر

غلام ربانی تاباں

غزل

دریا تھا یا سراب دھندلکوں میں کھو گیا
اک آسرا تھا وہ بھی سرِ شام سو گیا

پھر یوں ہوا کہ پھول کھلے دل کے آس پاس
ایسا لگا کہ دشت چمن زار ہو گیا

موجوں کا اضطراب بھی تھا، ناخدا بھی تھا
اب کیا بتائیں کون سفینہ ڈبو گیا

دیوار و در پہ لکھی ہیں کتنی کہانیاں
صدیوں کا درد شہر کی پہچان ہو گیا

لگتا ہے صحنِ باغ میں رقصِ شرر کے بعد
ہر مرحلہ بہار کا آسان ہو گیا

تاباں شراب خانے میں کچھ روشنی تو ہے
مسجد بھی سو گئی ہے، شوالا بھی سو گیا

پرکاش فکری
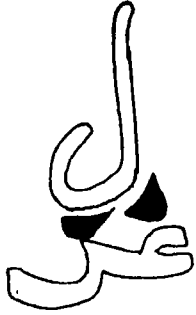
میدانوں سے دھوپ گئی اب پربت بھی دھندلائے
شام اندھیری لے کر آئی کالی رات کے سائے

اپنی اک دہلیز کبھی تھی، وہ تو کب کی چھوٹی
کس کے در پہ دستک دیں اب کون ہمیں بتلائے

ساتھ ہوا کے سب کو دیکھا اپنی سمت بدلتے
اپنی سمت بدلنا لیکن ہم ہی سیکھ نہ پائے

عمر کی لمبی راہ گزر پہ ایسے دل کا ساتھ
ذرا ذرا سی باتوں پہ جو روئے اور رلائے

پھولوں والا موسم بھی ہے ایک سنہرا پنچھی
ویراں شاخ پہ چہکے دو پل اور کہیں کھو جائے

خوابوں کے بھی نقش مٹے سے یادیں بھی بے رنگ
ان کی گرد اتارے آ کر ایسی برکھا آئے

دھول میں مل کر دھول بنے تو آئے اس کو چین
مٹی کی یہ کایا فکریؔ کتنا بوجھ اٹھائے

محمد محسن جواد

وطن پرستی کا علمبردار

فراق

اگر ہم اردو شاعری کے عناصر خمسہ کو ترتیب دینا چاہیں تو اس زمرے میں میر، غالب، اقبال، جوش اور فراق کو شامل کر سکتے ہیں۔ میر نے اردو شاعری کے ساغر میں زہر غم گھول دیا۔ غالب نے اردو شاعری کو بلند تخیل عطا کیا۔ اقبال نے اردو شاعری کو فلسفہ حیات کی دولت بخشی۔ جوش نے اردو شاعری کے دل و دماغ کو ہمت و حوصلہ کا نشہ دیا اور فراق نے اردو شاعری کے طاق میں ہندوستانیت اور آفاقیت کی شمعیں روشن کیں۔

بنیادی طور پر فراق غزل کے شاعر ہیں ہی نہیں بلکہ غزل کے امام ہیں لیکن انھوں نے رباعی کی وادی میں بھی نئی راہیں نکالی ہیں جن میں ہندوستانی سماج کے چراغ جل رہے ہیں ان کی شاعری میں ہندوستان کی دھرتی کی خوشبو ملتی ہے ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی رسوم، ہندوستانی موسم ہندوستانی مناظر کی جو اچھوتی اور نادر شعری تصویریں ملتی ہیں وہ اردو زبان کے بہترین اور اعلیٰ نمونے ہیں ؎

باغ جنت پہ گھٹا جیسے برس کر کھل جائے
سوندھی سوندھی تری خوشبوئے بدن کیا کہنا

زلف شبگوں کی چمک پیکر سیمیں کی دمک
دیپ مالا ہے سر گنگ و جمن کیا کہنا

فراق نے ہندوستان کی ارضیت اور یہاں کے رنگا رنگ تہذیبی عناصر کو اپنے اشعار میں جذب کرنے کی شعوری کوشش کی ہے اور اس کے مثبت نتائج بھی بر آمد ہوئے۔ اس بارے میں خود فراق کا خیال ہے "میں اس حقیقت کو بہت اہمیت دیتا ہوں کہ اردو شاعری میں ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی مزاج کا غالب عنصر ہونے ہوئے بھی اردو شاعری کو فارسی، عربی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں جو آفاقی کلچر کے عناصر ہیں انھیں ضرور جذب کر لینا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتا ہوں کہ اردو ادب و شاعری میں ہندوستانیت اور بلند ترین ہندوستانیت اسی طرح کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے جیسے جرمن ادب میں جرمنیت، روسی ادب میں روسیت اور حجازی ادب میں حجازیت اور بھوبھوتی، کالیداس، بھرتری ہری اور ٹیگور کی شاعری اور پریم چند کے ادب میں ہندوستانیت۔"
خوشی کی بات یہ ہے کہ فراق نے اپنے اس نظریہ

ملوصِ دل سے عمل بھی کیا ہے اور امر واقعہ ہے کہ
ِ اق کی شاعری میں جو حیات بخش خدوخال ابھرے ہیں
ہندوستانی تہذیب ہی کے بطون سے پھوٹے ہیں
ے لیے ان میں وہ رس بھی ہے جو سنسکرت شاعری
طرۂ امتیاز ہے اور وہ نرمی اور گھلاوٹ بھی جو
ندوستانی تہذیب کی پروردہ ہے فراق اردو
شاعری کے مزاج داں بھی تھے اور ہندوستانیت
کے حقیقی عناصر کے اداشناس بھی۔ اسی لیے ان کی شاعری
یں جب یہ عناصر خارجیت سے داخلیت کی طرف سفر
رتے ہیں تو اس میں ایک نئے موسم کی تازگی اور سرشاری
پیدا ہو جاتی ہے اور شعری جمالیات کا ایک افق تابندہ
ہو جاتا ہے حقیقت یہ بھی ہے کہ فراق کی شاعری میں
ہندوستان کے تہذیبی عناصر کی بازیافت اردو ادب
کا ایک تاریخی واقعہ ہے جسے مستقبل کا مورخ نظر
انداز نہ کر سکے گا۔

نظیر اکبرآبادی کے بعد فراق ہی وہ شاعر ہیں
جنھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستان اور یہاں
کی فضا کو بہت اہمیت دی ہے انھیں گلہ ہے کہ
اردو شاعری میں ہندوستانیت ابھی بہت کم ہے
وہ اپنے مجموعۂ کلام "روپ" میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک ایسی شاعری کا تعلق ہے جسے ہم
صحیح معنوں میں ہندوستانی کہہ سکیں جس میں یہاں
کی فضا کی ٹھنڈک اور گرمی ہو، ہندوستان کی
کی مٹی کی خوشبو ہو۔ یہاں کی ہواؤں کی لچک
ہو۔ جو یہاں کے آکاش سورج اور چاند ستاروں کا
آئینہ ہے اور ان کو آئینہ دکھائے . . . . . .

رباعی میں محض اضطراری چیزیں نہیں تھیں بلکہ
ان کوششوں میں بھی، میں ہندوستان اور
ہندوستان کے کلچر کی تھرتھراتی ہوئی زندگیوں
کو چھو لینا چاہتا تھا۔ میں اپنی اس کوشش میں
کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ الگ بات ہے۔"

گنگا اشنان یہ چمکتے بجرے
ناؤں میں سوار مہ جبینوں کے پرے
سنگم میں لگا کے غوطہ اٹھتا ہے یہ کیوں
موجوں کے بھنور سے جیسے زہرہ ابھرے

گنگا میں چوڑیوں کے بجنے کا یہ رنگ
یہ راگ، یہ جل ترنگ، یہ رو، یہ امنگ
بھیگی ہوئی ساڑیوں سے کوندے لپکیں
ہر پیکرِ ناز میں کھنکتے ہوئے چنگ

فراق کی نظموں میں اُن کی وطن پروری کا جذبہ
نمایاں طور پر پایا جاتا ہے فراق کی یہ نظمیں وطن پروری
اور ہندوستان دوستی کے جذبات سے بھی معمور ہیں اور
انسانی عظمت کی بھی نشان دہی کرتی ہیں آزادیٔ ہند کے
بعد فراق نے اپنی ایک نظم میں مادرِ ہند کو جو خراجِ عقیدت پیش
کیا ہے اُس کے چند بند یہ ہیں ؎

ہند کے گھونگھٹوں تلے کتنی سہانی آگ ہے
صبح کو ماں کے ماتھے پہ آج نیا سہاگ ہے
آج وطن کے نونہال پھر سے ہیں مائلِ سفر
آنکھوں میں ہیں وہ ماہ و سال غیب ہے جن سے بے خبر
اٹھ جو پڑے ہو اہلِ ہند بڑھتے ہی رہنا کام ہے
کھوٹی نہ ہو رہ حیات تم سے یہی پیام ہے

اردو شاعری میں وطنیت اور ہندوستان
دوستی کا جذبہ ہمیشہ پایا گیا۔ قدما کے کلام میں تو ہندی
الفاظ اور ہندوستانی تلمیحات کا بھی کافی استعمال ہوا ہے
لیکن فراق کے کلام میں یہ تشبیہیں یہ تلمیحات الفاظ جس
کثرت سے پائے جاتے ہیں اتنی کثرت سے شاید کم شاعروں

کے یہاں ملیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ فراقؔ ہند قدیم
کے ادب روایات اور فلسفے سے بہت متاثر تھے سنسکرت
کے قدیم شہ پاروں میں انھیں بجا طور پر حسن نظر آتا ہے
مگر وہ قدیم ہندوستان اور سنسکرت ادب کے شیدائی
ہوتے ہوئے بھی اس ملک کی مشترکہ تہذیب اور اس
تہذیب کی ایک نشانی، اردو کے سچے پرستار تھے
(ایسے پرستار کہ جسے اردو نہ آتی ہو اسے وہ پوری
طرح مہذب بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھے) ہندوستان
اور اردو دونوں کے پرستار ہوتے ہوئے وہ چاہتے
تھے کہ اگر اردو میں ہندوستانیت کی روح جلوہ گر ہو
جائے تو اس کی شاعری میں اک معصومیت اور طہارت
پیدا ہو جائے گی۔ اس تعلق سے وہ خود لکھتے ہیں:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستانیت
کی روح اگر اردو شاعری میں سرایت کر سکے تو اس کی
شاعری میں ایک معصومیت کائنات و حیات کی ایک
ہم آہنگی ایک طہارت ..... آجائے گی جس سے ایسے
سنسار سنگیت پھوٹ نکلیں گے جو سورگ سنگیت
کو بھی مات کر دیں گے۔"

"فراقؔ اس جذبہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اور
اس کا ثبوت ان کے مجموعۂ کلام "روپ" کی رباعیوں میں
جگہ جگہ ہندوستانی تلمیحات و تشبیہات کا خوبصورت
اور بہایت برمحل استعمال سے ملتا ہے۔ لیکن ان کی غزلوں
کے اشعار بھی اس حسن سے خالی نہیں۔ ؎

لٹکے لٹکے کالے گیسو، گورے گورے لمبے بازو
مل کے رواں ہیں گنگ و جمن ساتھ خراماں رام و لکھن

وحدتِ عاشق و معشوق کی تصویر ہوں میں
نل کا ایثار تو اخلاصِ دمن مجھ کو دیا

؎
ادا میں کھینچتی تھی تصویر کرشن و رادھا کی
نگاہ میں کئی افسانے نل و دمن کے ملے

ارضیت اور ہندوستانیت کی یہ فضا حسرتؔ
موہانی کے یہاں بھی ملتی ہے وہ بھی جسم و جمالِ یار کی
خوبیوں کے ادا شناس اور حسن کی لمسیاتی کیفیتوں کے
مزاج داں تھے مگر ان کی شاعری کی فضا گھر آنگن تک
محدود ہے اور فراقؔ کی شاعری صرف دیومالاؤں اور اساطیری
داستانوں سے اخذ کردہ تشبیہات تک ہی محدود نہیں
بلکہ اس کا اظہار ہندوستان کے موسموں برساتوں،
ہواؤں، دھندلکوں، چاندنی راتوں، دریاؤں، پھولوں
اور راگوں کے استعاراتی اسلوب کے اظہار کے ذریعے
معرضِ وجود میں آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان
کا محبوب ہندوستان ہی کا ہے ان کی رباعیوں میں ہندی
کے "ریتی کال" کی جھلک ملتی ہے۔ چند رباعیاں پیش
ہیں: ؎

ہونٹوں میں وہ رس کہ جس پہ بھونرا منڈلائے
سانسوں کی وہ سیج جس پہ خوشبو سو جائے
چہرے کی دمک پہ جیسے شبنم کی ردا
مدھر آنکھوں کا کام دیو کو بھی چھلکائے

تیرے قدموں پہ چاند سر کے بل جائے
مکھڑے پہ پڑے نظر کہ سورج ڈھل جائے
اوشا کی لالیما ہو پانی پانی
شرمانے کی یہ ادا کہ بجلی گل جائے

چڑھتی جمنا کا تیز ریلا ہے کہ زلف
بل کھاتا ہوا سیاہ کوندا ہے کہ زلف
گوکل کی اندھیری رات دیتی ہوئی لو
گھنشیام کی بانسری کا لہرا ہے کہ زلف

فراق کی رباعیات میں جس طرز حیات کی تہیں
ملتی ہیں ان میں ایک مانوس فضا کی خوشبو ملتی ہے
جو کہ خالص ہندوستانی ہے اور یہاں کے جغرافیائی
ماحول کی ناگزیر پیداوار۔ مثلاً سے

دیوالی کی شام گھر پتے اور سجے
چینی کے کھلونے جگمگاتے لاوے
وہ روپ منی مکھڑے پہ اک نرم دمک
بچے کے گھروندے میں جلاتی ہے دیئے

کومل پد گامنی کی آہٹ تو سنو
گاتے قدموں کی گنگناہٹ تو سنو
ساون لہراہے مدمیں ڈوبا ہوا روپ
اس کی بوندوں کی جھنجھناہٹ تو سنو

فراق کی رباعیوں میں احساس جمال پوری طرح
بیدار نظر آتا ہے یہاں گوشت پوست کی ہندوستانی
عورت محبوبہ کی شکل میں اپنی تمام تہہ رعنائیوں کے
ساتھ ہنستی بولتی لجاتی اور دل لبھاتی ہوئی دکھائی
دیتی ہے ملاحظہ ہو۔

وہ نکھرے بدن کا مسکرانا ہے ہے
رس کے جوبن کا گنگنانا ہے ہے
کانوں کی لوؤں کا تھرتھرانا کم کم
چہرے کے تل کا جگمگانا ہے ہے

جب پچھلے پہر پریم کی دنیا سولی
سکھیوں کی گرہ پہلی کرن نے کھولی
جوبن رس چھلکاتی اٹھی چنچل نار
رادھا گوکل میں جیسے کھیلے ہولی

راتوں کی جوانیاں نشیلی آنکھیں
خنجر کی روانیاں کٹیلی آنکھیں
سنگیت کی سرحدوں پہ کھلنے والے
پھولوں کی کہانیاں رسیلی آنکھیں

آئینہ در آئینہ ہے شفاف بدن
جلوے کچھ اس انداز سے ہیں عکس فگن
اک خواب جمال ہے کہ بندھا ہے طلسم
وہ روپ جھلکتا ہوا جادو درپن

محبوب کے حسن وجمال کو ہندوستانی
پس منظر میں دیکھتے ہوئے محبوب کی ارضیت
وجسمانیت کے بیان میں صاف گوئی اور جرأت کا
یہ واضح تصور فراق سے پہلے اردو شاعری میں نہیں
تھا بقول گوپی چند نارنگ :

"قدیم شاعری میں حسن کا زمینی تصور تو
موجود رہا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اک
حد تک صنف لطیف ہی سے ماخوذ تھا مگر وہ محض
جھلک ہی جھلک ہے حسن کی ٹھیٹھ مادیت اور اس کے
انسانی اور زمینی تقاضوں کا صحیح عرفان ہماری قدیم
شاعری میں نہیں ملتا۔ اس زمانے میں حسن کے تمام
پہلوؤں اور کیفیتوں کی عکاسی محبوب خیال کی
جاتی تھی۔ اور اس محبوب کی ذات کو طرح طرح کے پردوں
میں رکھا جاتا تھا یہ پردے کہیں وضع داری کے
تھے کہیں ندامت اور سنجیدگی کے اور کہیں وقار
و آداب کے۔"

اس کے برعکس فراق کا کارنامہ یہ ہے کہ
انھوں نے اپنی شاعری میں عورت کو عورت کی حیثیت
سے پیش کیا۔ اور نہایت جرأت اور صاف گوئی سے
کام لیتے ہوئے حسن کے زمینی اور فطری تصور کو ایک
بنیادی قدر کی حیثیت سے قبول کیا۔ فراق کے

جمالیاتی احساس کی آگ لطافت اور نزاکت کے
پر دوں کے پیچھے نہیں رہ جاتی بلکہ ان سے چھن چھن
کے آتی ہے اور دل کے تاروں کو چھوتی ہے
ملاحظہ ہو ؂

ہے روپ میں وہ کھٹک وہ رس وہ جھنکار
کلیوں کے چٹکنے وقت جیسے گلزار
یا نور کی انگلیوں سے دیوی کوئی
جیسے شب ماہ میں بجاتی ہو ستار

سنبل کے تر و تازہ چمن ہیں زلفیں
بے صبح کی شب ہائے فتن ہیں زلفیں

خود خضر یہاں راہ بھٹک جاتے ہیں
ظلمات کے بہکے ہوئے بن ہیں زلفیں

غرض کہ غزل نظم اور رباعی کی رعنائیاں
اور افکار سمیٹ کر رموز جبات اور اسرار
کائنات کی عقدہ کشائیاں کر کے اپنے اشعار میں
ہندوستانیت کی روح سمو کر، میر و غالب کے
ہمنوا بن کر فراق نے اپنے کلام کو ایسا دو آتشہ
بلکہ سہ آتشہ بنا دیا ہے کہ ؂

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جاتے ہے

خاندانی منصوبہ بندی کے پس منظر میں

شاہد میر

ہمارے درد ہمارے الم بہت سارے
جو ہوگئے ہیں زمانے میں ہم بہت سارے
جلائے جاؤں کہاں تک چراغ سجدوں کے
جبیں تو ایک ہے نقشِ قدم بہت سارے
زمیں کی آنکھ میں سیرابیوں کے خواب نہیں
نہ بجھ سکیں گے دہکتے شکم بہت سارے
سفر کی سمت دھند لکوں میں کھو گئی ہے کہیں
کہ آس پاس ہیں نقشِ قدم بہت سارے
روش روش پہ ہوں خوش منظری کے افسانے
اٹھیں جو ساتھ ہمارے قلم بہت سارے

رؤف خوشتر

کبھی کبھی

موسم کے علاوہ جلسہ کی نوعیت کے پیشِ نظر مہندر ناتھ نے جیکٹ پہن کر آئینہ میں اُچٹتی نگاہ ڈالی۔ سونے کی زنجیر میں جکڑی دستی گھڑی اور ہیرے کی انگشتری کو الماری کے سیف میں رکھتے ہوئے وہ اپنی سفّاک مسکراہٹ پہ قابو نہ پا سکا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا وہ اصلی روپ سامنے آ گیا ہو جسے وہ دوسروں کے روبرو چھپانے میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔

کتابوں سے سجی الماری کھولی۔ کارل مارکس سے لے کر عصرِ حاضر کے محنت کشوں کے قائدین کی تحریر کردہ کتابیں بھری تھیں۔ کتابوں کو سلیقے سے ہٹا کر اُن کے پیچھے وہسکی کی بوتل نکالی۔ وہسکی کے چار گھونٹ میں اُسے وہ اہم مطالبات یاد آئے جو اپنی شعلہ بیان تقریر سے منوائے تھے۔

اب مہندر ناتھ کا شمار ملک کے چوٹی کے مزدور قائدین میں ہوتا تھا۔ مسلسل میٹرک فیل ہونے کے بعد ہی وہ خود کو عملی سیاست کے قابل سمجھا۔ اور آہستہ آہستہ محنت کشوں کے ساتھ جلسوں، ریلیوں میں شریک ہو کر یونین میں اپنا اثر جمانا شروع کیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہاں جو زیادہ بولتا ہے بازی اُس کے ہاتھ ہوگی۔ پھر تو وہ بڑی ہوشیاری سے مزدوروں کے مسائل پہ گفتگو کرتا۔ مالکوں سے ملتا اور بے باکی سے مزدوروں کے مطالبات رکھتا۔ یوں اب اُس کے اشارے پر مزدور رہنے لگے۔

لچھے دار باتوں، خوبصورت وعدوں اور گھن گرج نعروں سے وہ محنت کش اور نچلے طبقات کے افراد کو اپنا گرویدہ بنا لیتا۔ اُس کی دھواں دھار جوشیلی تقریر سننے کے لئے ہزاروں افراد کشاں کشاں چلے آتے۔

کچھ کے اور ناخواندہ سامعین کو وقتی طور پہ خوش آئند زندگی کے حسین خوابوں کی لبستی میں ذہنی ہجرت کرواتا اور یوں ان کے دل و دماغ پر اپنی ہمدردی کا سکّہ جماتا لیکن پسِ پردہ وہ اُن سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے روپیوں سے زندگی کی خوشیاں بٹورتا جن کو روزِ روشن میں عوام کے سامنے کوستا سرِ شام ہی خوبصورت چمکدار کاروں میں لدے اور دبکے ہوئے سرمایہ دار آتے اور سربمہر لفافوں میں کچھ دے جاتے اور یوں اس کا ضمیر خوشنما اور بھاری لفافوں تلے دب کر رہ گیا۔

وہ مزدوروں اور مالکوں کو ایک خاص فاصلہ پر رکھتا۔ اور اگر سرمایہ دار اور مالک مِل اس کے مطالبات ٹھکرا دیتے تو وہ مزدوروں کو ہڑتال پہ

اُکساتا۔ شہر بند کا اعلان کرتا۔ اس کے ایک اشارے
پر سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

پچھلے کئی دنوں سے مل مزدور اجرتوں میں
اضافہ کا مطالبہ کر رہے تھے آج مہندر ناتھ کے زیرِ
صدارت ایک بڑا جلسہ منعقد ہونا تھا جس میں یہ طے
ہونا تھا کہ مطالبات قابلِ قبول نہ ہونے کی صورت
میں اگلا اقدام کیا ہونا چاہیئے۔

اُس نے سوچا ایسے گرم ماحول میں کار لے جانا
دانشمندی نہیں۔ کار نو وزیروں اور سرمایہ داروں
کے یہاں لے جانا چاہیئے۔ یہ قلاش اور مشتعل مزدور
اُس کی چمچاتی کار پر غصہ نہ اتاریں۔

اُس نے کار لے جانے کا خیال ترک
کر دیا۔

۵۵۵ سگریٹ کا ٹین رکھ کر بیڑی کا بنڈل
اٹھایا اور مکان سے باہر نکل آیا۔ قریب ہی اُسے
سائیکل رکشہ دکھائی دیا۔ رکشہ میں بیٹھتے ہوئے
اس نے مقام کا پتہ بتلایا اور ماچس طلب کی۔

ماچس لیتے ہوئے اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔
رکشہ والے کا ہاتھ بخار میں تپ رہا تھا۔

"کیوں بھائی تمہیں تو بخار ہے۔ ایسی حالت
میں رکشہ چلا رہے ہو۔ ذرا آرام کر لیتے۔"

"کیا کریں بابو جی۔ سُنا ہے کل ہڑتال ہوگی۔
شہر بند ہوگا۔ بھلا ایسے ماحول میں ہم کیسے
رکشہ چلائیں گے۔ بچوں کا پیٹ بھی تو پالنا ہے۔
پتہ نہیں ایسا کرنے سے لیڈروں کو کیا ملتا ہے؟"

رکشہ والے کے ان جملوں نے غریبوں کے مسیحا،
مزدوروں کے محسن اور بہی خواہ کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ
دیا۔

اُس نے رکشہ کو بائیں طرف موڑنے کو کہا۔ ڈاکٹر
عتیق العالم کے یہاں رکشہ والے کو لے گیا اور ڈاکٹر سے
بھرپور علاج کرنے کے لئے کہا وہیں دواخانہ سے اپنے
ساتھی کو فون کیا۔

"سنو آج کا جلسہ ملتوی کر دو۔ اب ہڑتال
اور بند کو بند سمجھو۔ ہمارا ملک اب یہ چونچلے برداشت
نہیں کر سکتا۔ ہم اپنے مطالبات مالکان سے گفت و
شنید اور جمہوری انداز سے منوائیں گے۔ تمام مزدور
بھائیوں کو واپس جانے اور کل کام پر حاضر ہونے
کے لئے کہو۔"

فون رکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے
محسن، مربی اور مسیحا کو دیکھنے لگا جو ایک مریض تھا۔

اب اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا سویا ہوا ضمیر
رنگین اور بھاری لفافوں کو ہٹاتا ہوا اُس کے سامنے
مسکرا رہا ہو۔

۱۔ تحقیقات بھجواتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

۲۔ تحقیقات کاغذ کے ایک طرف، حاشیہ چھوڑ کر اور خوشخط لکھیں اور اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔

۳۔ تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجئے۔

۴۔ جوابی امور کے لئے ڈاک ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھجوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۵۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت اور شو ایجنسی کے لئے سیلز مینیجر سے رابطہ قائم کیجئے۔

ذکی طارق

۱

غزل

نہ سچ سمجھ کے کوئی بات صاف کر لینا
نہ کوئی فیصلہ اپنے خلاف کر لینا

چلے بھی آؤ کہ سارے خطوط روشن ہیں
حصارِ روح کا تم بھی طواف کر لینا

کہیں نہ زخموں کا یہ سائبان بن جائے
تم اِس ردائے نظر میں شگاف کر لینا

جو اجنبی ہے ابھی دوست بھی وہ اپنا تھا
نہ اُس کی بات سے یوں انحراف کر لینا

یہ انگلیاں کبھی اُسی کے لہو میں ڈوبی ہیں
بچھڑ کے اُس سے نہ تم اعتراف کر لینا

خورشید افسر بسوانی

ہم بناتے ہوئے نقشِ کفِ پا اور چلے
حوصلہ ہو تو ذرا بادِ صبا اور چلے

زندگی جلتی ہوئی ریت کا اک جادہ ہے
ہم بھی دیکھیں جو کوئی آبلہ پا اور چلے

زد میں شعلوں کی مرا گھر ہے مگر کیا کہیے
میں ہی کہتا ہوں ابھی اور ہوا اور چلے

لفظ کو دینے لگے ان کے لبوں کو چھو کر
اک ذرا سلسلۂ حرف و نوا اور چلے

ان لکیروں میں مرا عکس نظر آتا ہے
کاش کچھ دن ترے ہاتھوں کی حنا اور چلے

ڈاکٹر راجندر وتس

اور قندیل بجھ گئی

ایک لمبی مدت کے بعد مہیندر گھر لوٹا تھا۔ ان بیس برسوں میں گھر کے پس منظر میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ پہلے اس کے گھر کی بائیں طرف دوسری گلی کا ایک مکان ہی تین منزلہ تھا یا پھر اسی گلی میں کچھ دوسرے دو چار مکان دو منزلہ تھے۔ لیکن بیس سال پہلے مہیندر کی اپنی گلی کے سارے مکان ہی ایک منزلہ تھے۔ اس کے اپنے موروثی مکان کا بیشتر حصّہ ایک منزلہ ہی تھا۔ اس کی سیڑھیوں کے اوپر ایک ممٹی بنی ہوتی تھی یا پھر بائیں طرف پچھلے کوٹھوں پر دو چوبارے تھے، جس کی وجہ سے یہ مکان حویلی کہلاتا تھا۔ اب تو ساتھ والے تقریباً سبھی مکان دو منزلہ بن گئے تھے اور تین منزلہ مکان کی دوسری منزل اب مہیندر کے مکان سے نظر نہیں آتی۔ پہلے دوسری منزل کے چھجے میں بیٹھے لوگ صاف دکھائی دیتے تھے۔

مہیندر کی زندگی کا ایک بہت اہم اور نازک حصہ اسی حویلی کے چوباروں اور ان کے سامنے والی چھتوں پر گھوم پھر کر بسر ہوا تھا۔ اسے ان چھتوں کی منڈیروں پر گھومنا بہت پسند تھا۔ اس کے بچپن اور جوانی کی سینکڑوں یادیں اور واقعات ان چوباروں اور چھتوں سے جُڑے ہوئے تھے۔

بہت وقت پہلے حویلی کے ان چوباروں اور چھتوں پر سے تین منزلہ مکان کے اوپر والے چوبارے کے سامنے والی چھت پر رات کے وقت قندیل جلتی ہوئی نظر آتی تھی، مہیندر کو اس چھت کی منڈیروں کے جھروکوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی سے عجیب سا چین اور سکون ملتا تھا۔ تب وہ خیالوں کی ایک رنگین دنیا میں کھو جایا کرتا تھا۔

مہیندر بہت ذہین اور حساس مزاج کا مالک تھا۔ جب وہ گاؤں کا اسکول چھوڑ کر قصبتی ماحول میں آیا تو اسے یہ سب کچھ کافی عجیب سا لگا تھا۔ یہ گاؤں کے ماحول سے بالکل الگ اور نیا پن لئے ہوئے تھا۔ اس نے قصبے کے ہائی اسکول میں ساتویں میں داخلہ لیا تھا۔ اسے یہاں کے بچے گاؤں کے اسکول کے بچوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ صاف ستھرے اور چست چالاک نظر آتے تھے۔ وہ بیچارہ کچھ دن تو اپنی ماں کے ہاتھ کے سِلے کپڑے۔ کچھا، قمیض اور ٹوپی پہن کر اسکول جاتا رہا، جبکہ دوسرے بچے درزی کی دوکان سے سلے قمیض، نکر یا پائجامہ پہن کر آتے

ورکئی بچوں نے تو کپڑوں پر دھوبی سے استری بھی کروائی ہوتی۔
وہ ہمیشہ اپنے ہی خیالوں میں کھویا رہتا۔

اس نئے پس منظر نے اُسے احساسِ کمتری کا شکار بنا دیا تھا۔ انھیں دنوں ہندوستانی تاریخ کا نہایت المناک واقعہ پیش آیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ہند کا بٹوارہ ہوا۔ اور ایک عظیم مُلک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ مہیندر کے گھر کی بائیں طرف کی اُس تین منزلہ حویلی میں پاکستان کے نوشہرہ قصبے سے دو مہاجر خاندان آکر بس گئے۔ اُن میں سے ایک خاندان درمیان کی منزل میں اور دوسرا خاندان پہلی منزل میں رہنے لگا۔ گرمیوں میں پہلی منزل کے خاندان کے افراد تیسری منزل پر سویا کرتے تھے۔ وہاں رات کو دیر تک قندیل جلتی رہتی تھی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ لوگ گئی رات تک جاگنے کے عادی تھے۔ کئی بار اُن لوگوں کی کھُلی ہنسی ماحول میں کھنک کر اُسے تازگی بخشتی۔ وہ لوگ مہیندر کے زمیندار خاندان کے افراد کی طرح اونچا ٹھٹھا مار کر کبھی نہیں ہنستے تھے۔

پتہ نہیں ایسے میں مہیندر کا دھیان خود بخود ان لوگوں کی طرف کیوں بٹ جایا کرتا ہے وہ رفیوجی لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنتے اور ان کی چال ڈھال اور بات چیت میں ایک پُر کشش شائستگی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کی وجوہات تھیں کہ مہیندر اندر ہی اندر اِن لوگوں سے جُڑتا اور سٹتا چلا گیا۔ انجانے میں ان لوگوں کے ساتھ اُس کا ذہنی رشتہ قائم ہو گیا۔ وہ الہڑ اور ناتجربہ کار تو تھا ہی۔

بالغ ہونے سے پہلے انسان کی زندگی کے چند سال بڑے نازک ہوا کرتے ہیں، اس عمر میں اُس کے احساس اور جذباتی قسم کے دل و دماغ میں کئی ایسے طوفان اُٹھتے ہیں، کچھ ایسے موڑ آتے ہیں کہ اُس کی زندگی کی راہ ہی بدل جاتی ہے۔ انسان بننا کچھ چاہتا ہے اور بن کچھ اور ہی جاتا ہے۔ ان دنوں اگر کسی بڑے بوڑھے یا سُلجھے ہوئے دوست کی نیک صلاح نہ ملے تو وہ بھٹک جاتا ہے اور اگر ایک بار راستہ بھٹک گیا تو لاکھ کوششیں کرکے بھی اس نقصان کی تلافی نہیں ہو پاتی۔ دراصل یہ انسان کے بننے اور بگڑنے کے دن ہوتے ہیں۔ انسان اس کچی عمر میں ماحول سے بہت جلد اثر قبول کر لیتا ہے۔ مہیندر پر بھی گردوپیش کے ماحول نے ایسے ہی اثر چھوڑے تھے اور اُس کو در در کی ٹھوکریں کھانے اور کئی بار شکست کا منہ دیکھنے کے لئے مجبور ہونا پڑا تھا۔

اس نوعمری میں نفسیاتی توازن بنائے رکھنا اور نوخیز اور جوان لڑکیوں کی طرف مائل نہ ہونا اکثر لڑکوں اور نوجوانوں کے نزدیک ایک دشوار مسئلہ ہوتا ہے۔ کچھ ہی ایسے ہوں گے جو اس مسئلہ سے دوچار نہ ہوتے ہوں۔ اُن میں سے بیشتر کو تو بُری طرح ناکام ہوتے اور تڑپتے کراہتے دیکھا گیا ہے۔ اکثر نوعمر اِس میدان میں اُتر تو آتے ہیں لیکن وہ اِس کے خطرناک اور تباہ کُن نتائج سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہندوستانی پس منظر اور سماجی حالات ان کا دامن گھٹن، درد اور مایوسی سے بھر دیتے ہیں۔

ان دنوں مہیندر ذی فہم ہوتے ہوئے بھی کسی جوان لڑکی کے ساتھ کھُل کر بات نہیں کر سکتا تھا جوان اور خوبصورت لڑکیوں سے میل جول بڑھانے

کہ اُس نے کئی موقعے ہاتھ سے جانے دیئے تھے اور انھیں لمحوں کو بعد میں اُس نے اپنے خیالوں میں بار بار دہرایا تھا۔ اُن سے ملنے جلنے کے تصور میں وہ کئی بار غوطے لگاتا۔ انہی لمحوں کو جب وہ جیتا تو کچھ سوچ کر کبھی کبھی افسوس سے ہاتھ ملتا اور کبھی کچھ سوچ کر اُس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا، لیکن وہ

اس میدان میں ہمیشہ ہی تصورات کے گھوڑے دوڑاتا، حالانکہ اپنے من میں وہ اُس پڑوسی لڑکے بشیشر کو

بہت خوش قسمت مانتا، جس کا دوسرے محلے کی دولت مند بیوہ کے گھر آنا جانا تھا۔ کئی بار تو وہ رات کے گیارہ بارہ بجے گھر لوٹتا۔ سُنا تھا کہ وہ اُس بیوہ کے لڑکے اور لڑکی کو پڑھاتا ہے۔ وہ ایک شرابی زمیندار کی دوسری بیوی تھی۔ عمر تھی صرف بتیس سال۔ شرابی خاوند نے اپنی بیوی کی ضروریات اور آرام کا کبھی خیال ہی نہیں کیا تھا۔ اُس کو بیوی کا درجہ دیا ہی نہیں۔ اُسے ہمیشہ لونڈی ہی سمجھا۔ بیوہ ہونے کے بعد تو اُس کا صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ وہ شہد پر مکھی کی طرح گر پڑی۔ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ بشیشر دولت مند بیوہ کی

جوان بیٹی کے لئے ہی وہاں جاتا ہے۔ مہیندر دل سے بشیشر کو بُرا انسان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سوچتا اگر وہ بشیشر کی جگہ پر ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ خود بھی ایسا ہی کرتا۔ اور اگر ایسا ہو ہی جاتا تو کیا وہ خود کو خوش قسمت نہ سمجھتا۔ مگر ایسے ہی خیالات کی ادھیڑبُن میں اُلجھے ہوئے مہیندر کا دھیان رات کو تیسری منزل پر جلنے والی قندیل کی روشنی کی طرف چلا جاتا اور اُس کے پیچھے

جھانکتا اور مسکراتا ایک مانوس چہرہ دکھائی دیتا۔ جیسے وہ چہرہ کہہ رہا ہو۔ "مہیندر تم پر کسی دوسرے کا حق ہے۔ مجھے یقین نہیں تم کچھ اور بھی سوچ سکتے ہو۔"

محلے بھر میں اجیت کے بارے میں بھی بہت

چرچا چلا کرتا۔ خاص طور پر اُس کی بابت عورتوں کو کانا پھوسی کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ مہیندر اُس اجیت کو بھی للچاتی نظروں سے دیکھتا۔ کسی نے اُس کو بتایا تھا کہ اُس سے عمر میں تین سال بڑا اجیت اپنے گھر کے سامنے والی ادھیڑ عمر کی خاتون کے گھر جاتا ہے، جس کی اکلوتی بیٹی بھرپور جوان ہے اور خوبصورت بھی۔ وہ گھنٹوں مل کر تاش کھیلتے ہیں۔ اُس ادھیڑ خاتون کا خاوند دو سال پہلے چل بسا تھا، جو ایک جوان بیٹی کے علاوہ ایک تین سال کا لڑکا بھی چھوڑ گیا تھا۔ اب اس لڑکے کی عمر پانچ سال تھی۔ اُس معصوم کو ان باتوں کا کیا علم؟ لوگ اکثر باتیں کرتے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مہیندر سوچتا کہ عورت مرد کا مل بیٹھ کر باتیں کرنے، وقت گزارنے میں حرج ہی کیا؟ بھابی اور دیور کو بھی ایک دوسرے کا ساتھ بہت اچھا لگتا ہے۔ ہاں کئی بار اخباروں میں دیور بھابی کے رشتے کو لے کر کئی بھلی بُری خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن وہ تو کسی عورت اور مرد کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے لوگ بھی تو ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں۔

مہیندر سوچتا کہ کاش وہ بھی اجیت کی طرح ان رنگین ماں بیٹی کے ساتھ خوش گپیاں ہانک سکتا؟ ایسے ہی خیالوں میں جب مہیندر ڈوبا ہوتا تو اچانک اُس کے ذہن کو جھٹکا لگتا اور اُس کی نظر رات کے وقت تیسری منزل پر جلتی ہوئی قندیل اور جھروکوں سے چھنتی اُس کی روشنی کی طرف چلی

جاتی اور تبھی وہاں سے جھانکتا، مسکراتا ہوا ایک
دلکش چہرہ اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔

مہیندر کو قندیل کی روشنی سے گہرا
لگاؤ تھا ہو سکتا ہے کہ یہ لگاؤ کسی خوبصورت چہرے
کے تصوّر کی وجہ سے ہو؟ وہ کئی بار اپنے چوبارے
میں بیٹھا ہوا رات کا بیتابی سے منتظر ہوتا۔ اکثر
نوعمر لڑکوں اور جوانوں کو دن کا انتظار ہوتا ہے
کہ کب دن نکلے اور اُن کے من پسند لوگ سڑکوں
بازاروں کلبوں، ہوٹلوں اور سینما گھروں میں چہکتے
اور دمکتے دکھائی دیں لیکن مہیندر کا تو رات سے قندیل
کی روشنی سے اور اُس روشنی کے پیچھے سے جھانکتے
اور مسکراتے ہوئے چہرے کے تصور سے اٹوٹ رشتہ
تھا۔ ویسے اُس نے کبھی کبھار ہی تیسری منزل کی منڈیر
سے اُس خوبصورت چہرے کو دیکھا تھا۔ ہاں اُس نے
اتنا ضرور محسوس کیا تھا کہ اُس حسینہ کی نظریں ہمیشہ
اُس حویلی پر ہوتی ہیں جہاں مہیندر ادھر اُدھر گھومتا یا
اپنی پڑھائی میں مشغول ہوتا۔ اس تاک جھانک میں مہیندر
کو بھی مزہ ملتا۔

ایک دن مہیندر کے ایک دوست نے
بتایا کہ اُس لڑکی کا نام سرلا ہے جو اُس تین منزلہ مکان
کے گراؤنڈ فلور پر رہتی ہے۔ اُس دن پہلی بار مہیندر
کو اُس چاند کی دید کا موقع ملا تھا۔ ایک لمحے کے لئے
جب مہیندر کی نظریں اُس کی کجراری نظروں سے
ٹکرائیں تو وہ لجا کر جھک گئیں، اور وہ تیز تیز قدموں
سے چلتی ہوئی گلی کی دوسری نکڑ کی طرف گھوم گئی۔
مہیندر نے اُس وقت محسوس کیا تھا کہ
ہو نہ ہو سرلا اُسی کے لئے بنی ہے۔ وہ اُس کا انتظار
کرے گا۔

میٹرک کرنے کے بعد مہیندر نے کالج میں
داخلہ لے لیا مگر اُس کا پڑھائی میں جی نہ لگتا۔ اُسے
ہمیشہ قندیل کی روشنی کے پیچھے جھانکتے ہوئے سرلا
کے چہرے کی یاد ستاتی رہتی۔ انہی دنوں ایک بار بابا
نے اُسے گاؤں بلا کر اُس کی شادی کی بات چلانی
چاہی تو مہیندر نے صاف انکار کر دیا اس پر بابا نے
اُس کا کالج کا خرچ بند کر دینے کا فیصلہ سُنا دیا۔
اور مہیندر کو کالج چھوڑنا پڑا۔ دراصل بات یہ تھی کہ
جب مہیندر آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو نزدیک
کے گاؤں میں ایک لڑکی سے اُس کی منگنی کر دی گئی تھی
اور اب گاؤں والے اس شادی کے لئے زور ڈال
رہے تھے، لیکن مہیندر کا کہنا تھا کہ جب تک وہ اپنے
پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا، وہ شادی نہیں کرے گا،
اور اُس میں آٹھ دس سال بھی لگ سکتے تھے۔ لیکن
بزرگوں کو یہ بات منظور نہیں تھی۔

حقیقت میں مہیندر یہ شادی کرنا ہی نہیں
چاہتا تھا۔ مہیندر بڑے بوڑھوں کے اس دقیانوسی
نظریے کے خلاف تھا اور پھر اُس کے روبرو سرلا کی جھکی
جھکی آنکھیں تھیں وہ کسی اور سے شادی کر کے اُن سے
بیوفائی کرنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

پھر ماں نے ایک بار گاؤں سے آئی چاچی کی
بھتیجی کے رشتے کی لڑکی سے مہیندر کی شادی کرنے کی
بات چلانے کی کوشش کی، اس نے پھر انکار کر دیا۔
آخر کار وہ کرتا بھی کیا؟ اپنے دل کا حال کسے سُناتا؟

اُس کے چچیرے بھائی نے اُس پر بہت
احسان کئے تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ مہیندر ان کی
بات نہیں ٹالے گا۔ اسی یقین پر انھوں نے اپنی سالی
کے ساتھ مہیندر کی شادی کا ذکر چھیڑا اور اُسے لڑکی

دیکھنے کے لیئے دلی جانے کے لیئے کہا۔ مگر وہ چُپی سادھ گیا۔ اُسے یہ بھائی کے دل کو ٹھیس لگی۔ مگر مہیندر مجبور تھا۔ وہ ان کو اپنے دل کی بات کیسے کہتا؟ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے اور سرلا کے خاندان کے بیچ کوئی تال میل بیٹھتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک امیر تاجر خاندان کی لڑکی تھی اور مہیندر ایک متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کے ماں باپ اور خاندان کے دوسرے لوگ دقیانوسی خیالوں کے تھے۔ انھیں کب منظور تھا کہ ان کے گھرانے کے لڑکے کی شادی کسی دوسری ذات کی لڑکی سے ہو۔ اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ اصل ماجرا کیا ہے تو گھر میں طوفان کھڑا ہو جاتا۔ پھر کیا کیا جائے؟ وہ بار بار سوچتا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مہیندر نے بی۔ اے۔ پاس کر لیا اور پھر بی۔ ٹی۔ کی ٹریننگ بھی لے لی اور وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ماسٹر لگ گیا۔ لیکن شادی کے بارے میں اُس کی خاموشی برقرار رہی۔ گلی محلے کے لوگ مہیندر کے شادی سے انکار کو لے کر اکثر چہ میگوئیاں کرتے۔ ایک بار ایک منہ پھٹ عورت نے یہاں تک کہہ دیا کہ عورت کو قابو میں کرنا مہندر کے بس کی بات نہیں۔ میں نے اُس کو کئی بار ڈکا اور ٹٹولا بھی لیکن اس نے آنکھ تک نہ اُٹھائی اور ہاں ہوں تک نہ کی۔ دیکھنے میں تو کتنا بانکا سجیلا دکھائی دیتا ہے مردانگی کے بنا بھی آدمی کوڑی کا نہیں۔ دوسری کہہ رہی تھی، جس لڑکی کے ساتھ شادی ہوئی بیچاری کی قسمت پھوٹ جائے گی۔ اس پر تمام عورتیں ہنس ہنس کر دوہری ہو گئیں تھیں۔

لیکن کچھ ہی دور بیٹھی مہیندر کی ماں یہ سب کچھ سُن کر سکتے میں آ گئی اُس دن جب مہیندر گھر لوٹا تو اُس نے اُس سے روز کی طرح لاڈ دُلار سے بات کی۔ پوچھنے پر ماں نے کہا تھا، بیمار رہتی ہوں نہ جانے پرماتما کے گھر سے کب بُلاوا آجائے۔ مجھ ابھاگن کو تو بہو کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوگا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس سے مہیندر کے دل پر گہری چوٹ لگی تھی، کیونکہ صرف ماں ہی تو تھی جس نے اُسے دل و جان سے چاہا تھا۔ سبھی الزام لگاتے کہ ماں کے زیادہ لاڈ پیار نے اُسے بگاڑ دیا ہے۔ مہیندر کو بھی اپنی ماں سے بہت محبت تھی لیکن پھر بھی وہ مہیندر کو شادی کرنے کے لیئے نہ منا سکی تھی۔ شادی کے نام پر اس کا چہرہ مُرجھا جاتا۔

تھک ہار کر ماں نے بیٹے کو کچھ کہنا سُننا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مہیندر ماں کے دل کے درد کو بخوبی سمجھتا تھا۔ ماں نے بیٹے کی آنکھوں میں مجبوری کی جھلک دیکھی تھی۔ ماں کے دکھ کو مہیندر بھی سمجھتا تھا مگر قندیل کی روشنی کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے چہرے نے اُسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ یہ بھی نہیں سرلا کی کہانی مہیندر تک نہ پہنچی ہو۔ اُس پر کیا گذرتی ہو گی۔ اس بات کا اندازہ مہیندر کو بھی نہ تھا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ اُسے ہسٹیریا کے دورے پڑنے ہیں۔ وہ رات رات بھر جاگتی رہتی ہے اور پاگلوں کی طرح بڑ بڑاتی ہے نہ معلوم اُسے کیا ہو گیا ہے؟ بچپن سے تو اُسے ایسا کچھ نہیں تھا، پچھلے سات سال سے گھر والے سمجھا بجھا رہے

ہیں کر شادی کر لو، لیکن اُس کو ضد ہے کہ شادی نہیں کرے گی۔ گھر بھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ کسی کی نہیں سنتی۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اُس کا ایک ہی علاج ہے شادی۔ اور جتنی جلد ہو کر دینی چاہیئے۔ سب ڈرتے ہیں کہ زبردستی کی تو خودکشی کر لے گی

مہیندر جانتا تھا کہ اُس کے ساتھ کس کس نے وفا کی۔ ان دونوں کی محبت کے بارے میں کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر دونوں نے اپنی تمناؤں کا گلہ گھونٹ لیا تھا۔ سرلا بھی جانتی تھی کہ اُس کا محبوب کتنا خوددار ہے۔ گھُٹ کے مر جائے گا لیکن بھیک نہیں مانگے گا۔ اپنی محبت کا اظہار اُس نے کبھی بھی اپنی زبان سے نہیں کیا۔ سرلا کے سامنے بھی نہیں۔ اُس کا پیار تو اُس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ دنیا چاہے اُس کے بارے میں کچھ بھی کہتی رہے، مگر وہ بیوفائی نہیں کرے گا۔ سرلا جب کبھی اُس کی صورت دیکھ لیتی تو پھول کی طرح کھِل اٹھتی۔ ایسے موقعوں پہ دونوں ایک دوسرے کو چوری چوری دیکھ لیتے۔ ہاں ایک بار دونوں کی نظریں کچھ لمحوں کے لئے ضرور ملی تھیں۔ سرلا اُس دن راس لیلا دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ کتنے خوبصورت تھے وہ لمحے۔ بس اتنی ہی نزدیکی سے دیکھا تھا انھوں نے ایک دوسرے کو۔ یا پھر دونوں کی ملاقات ہوئی تھی تصورات میں۔

قدرت کے کھیل نرالے، اور من چاہی کب پوری ہوتی ہے۔ مہیندر کی ماں کو اب دورے پڑنے لگے تھے ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ خون کی کمی ہے شوگر کی بیماری اُس کو کئی سالوں سے تھی۔ لیکن اُن دنوں یہ بیماری اور بھی بڑھ گئی تھی۔

"بس یہ سمجھو کہ بڑھیا چند دنوں کی مہمان تھی۔"

ڈاکٹر کی بات سُن کر اور ماں کی موت کا تصور کر کے مہیندر تڑپ اٹھا تھا۔ اُسے کوئی بھی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ وہ ماں کی خواہش کو کیسے پورا کرے؟

"میں نے ماں کو تا زندگی دکھ دیا ہے، ایک آخری خواہش تھی۔ بہو کا منہ دیکھنے کی، وہ بھی پوری نہ کر سکا۔ لعنت ہے ایسے بیٹے پر۔ رام نے تو ماں باپ کی خواہش کے لئے راج پاٹ تک کو ٹھکرا دیا تھا۔ ایک وہ بھی بیٹا تھا جس نے باپ کی خواہش پوری کرنے کے لئے جنگل کی خاک چھاننی منظور کی۔ اور ایک وہ ہے کہ۔۔۔۔ وہ سوچتا۔

اُس کے سامنے ماں کی صورت آ گئی، جس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ کانپ اُٹھا۔ اگلے ہی پل وہ ماں کے پاس بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا، "ماں ماں میں شادی کروں گا۔ تم جہاں کہو۔ جس کے ساتھ چاہو۔"

اِس پر ماں کا مرجھایا ہوا چہرہ کھِل اُٹھا۔ "تو میں بھائی جان کی سالی کو پیغام بھجوا دوں"۔ وہ بولی۔ بس پھر کیا تھا۔ مہیندر کی شادی کی خبر محلے بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ سبھی حیران تھے۔ خاص طور پر عورتیں، کہ یہ ناممکن بات کیسے ممکن ہوئی۔

ایک بوڑھی کہہ رہی تھی مجھے یقین تھا کہ لڑکا بُرا نہیں۔ یہ سوچ سمجھ کر ہی شادی سے انکار کر رہا ہے۔ اب سُنا ہے پکی نوکری کا حکم ہو گیا ہے۔ بڑی عقلمندی کی بات ہے۔

دوسری کہہ رہی تھی، ماں کو جی جان سے چاہتا ہے۔ سوچا ہو گا کہ چند دن کی مہمان ہے۔

بہو کی صورت تو دکھا دوں۔"

تیسری کہہ رہی تھی، دنیا چڑھتے سورج کو سلام کرتی ہے۔ اب مہیندر کے دن پھر گئے ہیں، نہیں تو سب اُس کو بُرا کہتے تھے۔

اور پھر کچھ دن بعد ہی حویلی کے سامنے بینڈ باجا بجا تھا۔ ماں کی جان لبوں پر تھی مگر وہ بہت خوش تھی۔

"میں نہ کہتی تھی کہ میرا مہیندر میری بات نہیں ٹالے گا۔"

مہیندر سہرہ باندھ کر گھوڑ چڑھی کے لئے تیار تھا۔ رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ اُس نے گھوڑی کی رکاب پر پاؤں رکھا اور اُچک کر سوار ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ شور مچ گیا۔ لوگ اکٹھے ہوگئے۔ دور سے آوازیں آرہی تھیں کہ رنبیر جیوں کی لڑکی نے تیسری منزل سے چھلانگ لگادی ہے چھلانگ لگاتے وقت اُس کے دائیں ہاتھ میں جلتی ہوئی قندیل تھی۔ زمین پر گرتے ہی وہ مرگئی اور قندیل بجھ گئی۔

یہ سنتے ہی مہیندر کے ہوش اُڑ گئے۔ گھوڑی کی لگام اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گھوڑی بدک گئی۔ وہ توازن نہ رکھ سکا اور دھڑام سے سڑک پر آگرا۔ اُس کے سر میں گہری چوٹ لگی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ ماں اُس کے صدمے کو برداشت نہ کرسکی۔ اب اُن بیچاری بوڑھی ہڈیوں میں جان تھی ہی کہاں؟ اٹھنے کی کوشش میں گر پڑی اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ مہیندر کے سسرال والوں کو یہ سب پتہ چلا تو انھوں نے شادی سے انکار کردیا۔ پورے ایک ہفتے بعد مہیندر کو ہوش آیا تو وہ حویلی کے چوبارے میں لیٹا ہوا تھا۔ شام ہوئی پھر رات آئی، لیکن سامنے والے مکان کی تیسری منزل پر کسی نے قندیل نہ جلائی۔ پتہ چلا کہ اس مکان کو منحوس سمجھ کر سترلا کے گھر والوں نے کوئی دوسرا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

مہیندر سوچ رہا تھا، تو کیا محبت کی وہ قندیل اب کبھی روشن نہ ہوگی۔ روشن بھی کیسے ہو۔ ماں مرچکی ہے۔ سترلا قربان ہوچکی ہے دامن پر داغ گویا سر میں چوٹ کھائی ......

ہاں اب وہ قندیل بجھ گئی تھی۔ اب اُس تمنزلے پر کوئی قندیل نہیں جلائے گا شاید کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ قارئین، پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور اُن کی مدد سے "تعمیر ہریانہ" کے خریداروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ہمیں اپنے ادب نواز دوستوں سے ایک بار پھر درخواست کرنا ہے کہ وہ خریداروں کی تعداد بڑھانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ پرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ پرچے کی خریداری کے لئے ایجنسیاں قائم کرنے کے لئے بھی ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔

— ادارہ

ماہ مئی کا "تعمیر ہریانہ" موصول ہوا۔ سبھی تخلیقات معیاری اور اثر انگیز ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مختلف کیاریوں سے پھول توڑ کر اور سب کو ملا کر ایسا حسین اور دل کو لبھا دینے والا گلدستہ تیار کیا ہے کہ اس کی انفرادیت پر مہر ثبت ہو گئی ہے۔ غزل اور افسانے آپ کی ادبی بصیرت کے آئینہ دار ہیں خاص کر افسانہ "آنسو کا رشتہ" اور ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب کی غزل واقعی دلچسپ اور قابلِ ذکر ہیں۔

خورشید عالم عبدالقیوم (ڈہری اون سون)

میں کل کچھ کتابوں کے خریدنے کے لئے سرکاری بک ڈپو کلکٹریٹ روڈ پر گیا تو دیکھا کہ وہاں تعمیر ہریانہ ماہ اپریل ۸۵ء کا رکھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً خریدا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سرکاری بک ڈپو کو تعمیر کی ایجنسی مل گئی ہے اور ہر ماہ رسالہ وہاں مل جایا کرے گا کیونکہ یہ رسالہ آگرہ میں نہیں ملتا تھا۔ واقعی اتنی کم قیمت میں اتنا معیاری ادبی پرچہ نکال کر آپ اہلِ اردو پر احسان کر رہے ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کے سنتوش کمار نے بہت متاثر کیا جو کہ پوری طرح علامتی افسانہ ہے رفعت نواز کی دکھ کی بات اور اوم کرشن راحت کا کوہان بھی پسند آیا۔

خالد پرویز شمشی (آگرہ)

مئی ۸۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ میں "تعمیر ہریانہ" کا پرانا قاری ہوں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ رسالہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ سبھی افسانے معیاری ہیں جو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ تعجب ہے اتنا سستا پرچہ اور اتنا سارا مواد! خدا کرے یہ پرچہ آگے بڑھتا رہے۔

محفوظ آہنی (گیا)

"تعمیر ہریانہ" ہریانہ سے شائع ہونے والا شاید واحد ادبی اردو رسالہ ہے جو کچھ دیر سے ہی سہی مگر ہر ماہ پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ اس کا ہر شمارہ قابلِ داد ہوتا ہے۔

ایم اظہر (بھاگل پور)

"تعمیر ہریانہ" کا جلد ۱۳ شمارہ ۴ اپنے دامن میں ہریانہ کے ارتقائی منازل کو سمیٹتے ہوئے نظر نواز ہوا۔ آپ کی دور اندیشی اور دور رسی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہ میں نہیں کہتا ہوں بلکہ شمارہ ہذا کا سرورق، کشمیری لال ذاکر کی کہانی "سنتوش کمار" شیفتہ فرحت کا "انشائیہ" کی ہم نے بغاوت" اور رفعت نواز کی کہانی "دکھ کی بات" سے عیاں ہے۔

ضیا چکلدیوی (بہار)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس سی او نمبر ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ سے جون ۱۹۸۵ء کے لئے شائع کیا۔

طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو ٹی چنڈی گڑھ

Photo : Raj Kishan Nain

Photo : Raj Kishan Nain

ماہانہ

تعمیر

جولائی ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۷ | جلد نمبر ۱۳

مدیر اعلیٰ:

رنجیت الیسر

مدیر:

سلطان انجم

سرورق: اے۔ پی۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔ سی۔ او ۱۸۹-۱۹۱

سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

ترتیب

عوام

مہدی پرتاپ گڈھی

یہی ہیں مادرِ گیتی کے ہونہار سپوت
انھیں سے ملتا ہے تہذیب آگہی کا ثبوت

انھیں سے گلشنِ ہستی میں آبیاری ہے
انھیں کے عزم کا دنیا میں فیض جاری ہے

انھیں کی قوتِ بازو ہے زندگی کی امین
انھیں کے فیض سے سونا اُگل رہی ہے زمین

انھیں نہ تخت کی حاجت، نہ تاج کی رغبت
بس اِن کو چاہیئے امن وسکون کی دولت

حیات بخش جو قدریں ہیں اُن کے حامی ہیں
خلوص ومہر ومحبت کے یہ پیامی ہیں

عوام ہندو ہیں، مسلم نہ سکھ نہ عیسائی
عوام اصل میں اک دوسرے کے ہیں بھائی

عوام لفظوں کو بارود تو بناتے نہیں
یہ آستینوں میں خنجر کبھی چھپاتے نہیں

عوام مسلکِ انسانیت کے شیدائی
انھیں نے چہرۂ ہستی کو دی ہے برنائی

عوام قوموں کے معمار، ملتوں کے امیں
اگر یہ چاہیں زمانہ ہو اِن کے زیرِ نگیں

وجود اِن کا ہے تخلیق حکمت وتعمیر
انھیں کے ہاتھوں نے بخشی حیات کو توقیر

کٹے انگوٹھوں نے اُن کو کبھی دیا اعزاز
ہوا ہے جلیانوالہ انھیں سے سرافراز

انھیں سے باپو کی عظمت، انھیں سے نہرو کا نام
انھیں سے جوہر وآزاد کو ملا ہے دوام

جو نقش چاہو اُبھر آئے اِن کے چہروں پر
ہیں سادہ خاکوں کی مانند اِن کے ذہن ونظر

انھیں سے گوتم وچشتی کا نام روشن ہے
انھیں کا دم ہے کہ صحرا بھی آج گلشن ہے

عوام بھٹکے تو اک نسل راہ بھول گئی
عوام بگڑے تو تاریخ شرمسار ہوئی

ملے جو کرشن تو ارجن صفات ہو جائیں
بدی ملے تو دریودھن کے ساتھ ہو جائیں

یہ ملک عوام سے، جمہوریت عوام سے ہے
ہمارا نام جہاں میں انھیں کے نام سے ہے

اُٹھے تو عالمِ ہستی پہ چھا گئے ہیں عوام
قدم اُٹھایا تو منزل تک آ گئے ہیں عوام

یہی ہیں باعثِ تخلیقِ سرخوشیٔ حیات
جہاں میں مظہرِ تعمیر ہے انھیں کی ذات

فکر تونسوی

ایک بے ربط مضمون

آج میں نے پختہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک بے ربط مضمون لکھوں گا۔ پختہ فیصلوں میں ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے نتائج ہمیشہ غلط نکلتے ہیں — ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے یہ پختہ فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ سگریٹ کبھی نہیں پیئے گا۔ شام تک حالت اتنی دگرگوں ہو گئی کہ اُسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نے تشخیص کے بعد کہا۔ "اس آدمی کا صرف ایک علاج ہے۔"

"کونسا؟"

"سگریٹ"

اُسے سگریٹ پلایا گیا۔ اور وہ خوش و خرم گھر لوٹ آیا۔ گویا جو چیز آپ کو مرض بخشتی ہے۔ وہی چیز شفا بھی دلاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ (بشرطیکہ جبراً و قہراً آپ اُسے تسلیم کر لیں) کی ہی کرم فرمائی ہے کہ ہر شے میں تھوڑا سا مثبت اور تھوڑا سا منفی مواد ڈال دیتا ہے جس کی بدولت وہ تواریخ وجود میں آتی ہے جو درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہے — پروفیسر، طالب علم سے سوال پوچھتا ہے۔

"رومن تہذیب کا زوال کیونکر ہوا؟"

طالب علم جھٹ جواب دیتا ہے: "کیونکہ وہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔"

کئی حضرات کو زوال کے تصوّر سے ہی اتنا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ عمر بھر عروج کی طرف جانے سے ہچکچاتے رہتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک نوجوان رہتے ہیں، انتہائی حسین، وجیہہ شباہت کے مالک، یہ تو خیر تنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ اُس کے والد صاحب، فرماتے ہیں کہ یہ بالکل اپنے پردادا پر گیا ہے اور والدہ کا دعویٰ ہے کہ نہیں، یہ سو فی صدی پرنانا پر گیا ہے (دونوں نے نہ پردادا کو دیکھا ہے نہ پرنانا کو) پھر اس پُرکشش نوجوان نے ایک نہایت بھونڈی لڑکی سے شادی کر لی حالانکہ علاقہ بھر میں ایسی قیامت بپا لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ جو اس نوجوان کے حریمِ شوق کے تصوّر سے ہی اپنی نیندیں حرام کرتی رہی تھیں۔

میں نے اُس نوجوان سے پوچھا۔ "تم نے کسی قیامت خیز حسینہ سے شادی کیوں نہیں کی؟"

وہ بولا۔ "کیونکہ وہ مجھے زوال کی طرف لے جاتی —"

"آج کل تمہاری وجاہت اور اُس کے
بھونڈے پن کی پوزیشن کیا ہے؟"
"وہ بدستور بھونڈی ہے، میں بدستور
وجیہہ۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر ممتاز کھڑے ہیں"
مگر المیہ اس شادی کا یہ ہے کہ وہ نوجوان وجیہہ ہونے
کے باوجود بزدل تھا۔ اور اس بزدلی کا خود اُسے
بھی علم نہیں تھا۔

دراصل سارا قضیہ اسی علم کی لاعلمی کا ہے۔
میں ایک شاعر کو جانتا ہوں۔ جو بہت عالم و فاضل تھا۔
مگر اُسے زندگی بھر علم نہیں ہُوا کہ اُس نے جتنے بھی
اشعار لکھے ہیں ان میں اُس کا اپنا شعر ایک بھی نہیں ہے۔
وہ قیامت کا حافظہ رکھتا تھا۔ مختلف اچھے بڑے
شاعروں کے اُسے ہزاروں اشعار حفظ تھے۔ اس لئے
جب بھی وہ اپنا شعر لکھنے بیٹھتا تو اُسے یہ علم ہی نہ ہوتا
کہ اس شعر میں پہلا ٹکڑا کس شاعر کا گھس آیا ہے،
دُوسرا ٹکڑا کس کا اور تیسرا کس کا؟ — اُس کی غزل
میں سوائے اُس کے تخلص کے باقی اُس کے پاس اپنا کچھ
نہیں رہتا تھا۔ مگر میں نے کبھی اُسے یہ علم نہیں ہونے
دیا کہ تم لاعلم ہو۔ اور تمہاری لاعلمی کا واحد سبب تمہارا
وہی کم بخت عالمانہ حافظہ ہے۔ میں اُسے لاعلم کہہ کر
کیوں اُس سے اپنی بول چال بند کرواتا۔ جبکہ میں نے
اُس سے جب بھی پوچھا "شاعرِ اعظم! ڈاکٹر اقبال
کی بانگِ درا کے لاہور ایڈیشن میں صفحہ ایک سو پانچ
پر سب سے پہلا شعر کون سا تھا؟"
تو وہ فوراً نہ صرف وہ شعر سُنا دیتا بلکہ دوسرے
ایڈیشنوں کے بھی اُسی صفحہ کے دو چار شعر اور بھی سُنا
دیتا۔ حالانکہ اتنے بڑے حافظے کے باوجود اُس
بیچارے کو اتنا بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں نے صرف ایک
شعر کی فرمائش کی تھی۔ باقی اشعار سننے کی میری نہ
کوئی تمنا تھی نہ ضرورت۔

البتہ ایک دن میں نے اُس کی بیوی سے یہ
ضرور کہہ دیا (بیوی سو فی صدی اَن پڑھ تھی اگرچہ
سُگھڑ تھی) "بہن جی! معاف کرنا آپ کے خاوند کو
اتنا بھی علم نہیں کہ اُن کا اپنا شعر کونسا ہے؟"
وہ بولی "میں اپنے خاوند کے خلاف ایک
لفظ بھی نہیں سُننا چاہتی۔"
"مگر دیکھئے، آپ نہیں، لیکن لوگ تو سُننا
چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ شاعر ہیں۔"
"میرے لئے وہ شاعر نہیں ہیں، صرف خاوند
ہیں۔"

خاوند ہو یا بیوی دونوں ایک دُوسرے
کے لئے جانکاہ حادثہ ہوتے ہیں۔ جب کوئی کنوارا
آدمی بیوی کو ڈولی میں بیٹھا کر لے آتا ہے۔ تو وہ
گویا ایک جانکاہ حادثہ کو لے آتا ہے۔ بلکہ بیوی
جانکاہ حادثہ نہیں ہوتی۔ جانکاہ حادثوں کا آغاز
ہوتی ہے۔ اگرچہ بیوی کہتی ہے کہ آغاز خاوند سے ہی
ہوتا ہے۔ مگر تجربہ مختلف ہے کہ بیوی کے آتے ہی خاوند
غیر ضروری چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی وہ طیش
میں آتا ہے تو ہر دس منٹ بعد اُس کے اندر اُبال
اُٹھتا ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ ایسی زبردست خانہ
جنگی کرے۔ جس میں تہذیبیں فنا ہو جاتی ہیں مگر خانہ جنگی
کر نہیں سکتا۔ اور اسے وہ اپنی رواداری کہتا ہے۔
کئی مرتبہ میرے اندر بھی خاوند اُبل اُٹھتا ہے
مگر پھر سوچتا ہوں یہ تلملاہٹ اور اُبال صرف ضمنی
چیزیں ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ میں خاوند
نہ رہوں، سپرمین بن جاؤں۔ مگر ایک مصیبت یہ ہے

کہ اس لفظ سپر مین کا اتنا زیادہ پروپیگنڈہ ہوچکا
ہے کہ سپر مین بننا اب کوئی خاص دانائی نہیں لگتی
خطرہ یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی نہ کوئی سپر مین ضرور پیدا
ہوچکا ہوگا۔ ایک دوست سے پوچھا تو وُہ بولا کہ
واقعی ایک سپر مین پیدا ہُوا بھی تھا اور مرتے مرتے
یہ بھی کہہ گیا تھا کہ میرے بعد ایک اور سپر مین ضرور
پیدا ہوگا۔

مگر صدیاں گذر گئیں۔ پروپیگنڈہ زیادہ مگر
سُپر مین معدوم۔ "مین" تو پیدا ہوتے رہے مگر سُپر مین
کوئی بھی پیدا نہیں ہوا ــــ چنانچہ ایک رات تنگ
آکر میں نے سوچا۔ "کیوں نہ میں بھی سُپر مین بن
جاؤں؟"

اور پھر میں نے اپنے آپ کو ہی وارننگ دی ــــ
"سپر مین بننا ہے تو گھر کی اس چاردیواری سے باہر
نکلنا پڑے گا"

اور خود ہی تصدیق کی۔ "ہاں، گھر کے جھنجھٹ سے
نبرد آزما ہونے کے لئے ہی تو سُپر مین بننا چاہتا ہوں۔"

"گویا کہ تم بدھ بننا چاہتے ہو؟"

"ہاں، اگر تم بدھ کی بلندیوں پر پہنچ کر ہی آدمی سُپر مین
بن سکتا ہے۔"

"تو پھر بن جاؤ، سُپر مین ثانی"

چنانچہ رات کی اتھاہ تاریکی میں بستر سے
اُٹھا، بیوی بچوں پر آخری نگاہ ڈالی، نگاہ کچھ زیادہ کام
نہ کرسکی۔ کیونکہ اُسی دن عینک کا نمبر بدلوایا تھا۔ کم بخت
آئی سپیشلسٹ نے غلط نمبر بدل دیا تھا۔ بہرکیف بغیر کسی
کو دیکھے سنبھلے آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک چارپائی
کے پائے سے ٹھوکر لگی تو بیوی کی پائینتی پر جاگرا۔ بیوی
کی آنکھ ہڑبڑا کر کھل گئی۔ اُس کی آواز سنائی دی "چور!
چور!"

میں نے کہا "خاوند! خاوند!"

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، نیند نہیں آرہی تھی۔ مچھر کاٹ رہے تھے"

"کئی بار آپ سے کہا ہے، مچھر دانی لگا کر سویا کیجئے۔
مگر آپ کی پرلے درجے کی سستی، غفلت شعاری......"

میں نے کہا۔ "تم لیٹی رہو، میں خود مچھر دانی نکال
لاتا ہوں"

میں اُس کی بات نہیں مانتا تھا۔ اُس نے میری
بات نہیں مانی۔ مجھ سے پہلے لپک کر مچھر دانی نکال لائی۔
اور آراستہ کرکے حکم دیا۔ "اب اس کے اندر آرام سے
لیٹے جایئے"

تین منٹ گذرے تو بیوی کی آواز آئی "اب کیسے
لگ رہے ہو؟"

"سُپر مین"

"وہ کیا ہوتا ہے۔"

"بس مچھروں سے ایک آدھ انچ بلند ہوتا ہے۔
بالکل خاوند لگتا ہے، جیسے میں اس وقت لگ رہا ہوں"

میرا خیال ہے، جو آدمی بھی سپر مین بننے کے لئے
گھر سے نکلے وہ ایک مچھر دانی ضرور لے کر نکلے۔ مچھر دانی
سے ہی سپر مین قدرے مکمل ہو سکتا ہے اکیلے نہیں۔

میرے ایک دوست ہیں، میں دوست کم اور غیر جانبدار
زیادہ ہوں۔ اگر اُن کی اہلیہ جاذب نظر نہ ہوتیں تو میری
غیر جانبداری کا بھی اللہ ہی حافظ تھا۔ بہرکیف وہ دوست
ایک لٹل قسم کے سُپر مین ہیں جن سے بھی ملتے ہیں اُسے
اطلاع دیتے ہیں کہ آپ کا مستقبل روشن ہے۔ میں نے کئی
مرتبہ اُن سے کہا کہ بھائی! دنیا میں اتنی روشنی ہے ہی کہاں
کہ تم ملک کے ہر انسان کا مستقبل روشن کرنے پر تلے ہوئے

ہو۔

وہ بولے "روشنی موجود ہے، دیکھنے والی نگاہ چاہیئے۔"

"مگر وہ ایک نگاہ صرف تمہارے پاس کیوں؟"

مسکرا دیئے، بولے "یہ پُر اسرار مسئلہ ہے، زیادہ زبان مت کھلواؤ۔"

مگر میرا خیال ہے، دراصل وہ اپنا مستقبل روشن کرنا چاہتا ہے۔ ٹیلی فون ایڈوائزری کمیٹی کے ایک ممبر سے جب اس نے کہا کہ کمیونی کیشن منسٹر کا پی۔ اے آپ کی شاعری کا بڑا مداح ہے

تو اُس نے اپنے لئے ایک عارضی ٹیلی فون کنکشن حاصل کرلیا۔ چند دن ہوئے وہ ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ آپ کی آواز میں جو طلسمی غنائیت ہے۔ اُس پر تو فلم ڈائرکٹر بی۔ آر۔ چوپڑہ بر فدا ہو چکا ہے بلکہ یہ تو فیصلہ ہی ہو چکا ہے کہ وہ اپنی تازہ فلم میں آپ سے ہی سارے گانے گوائے گا۔ اُن کا خیال ہے کہ محمد رفیع مرحوم کی جگہ کافی عرصہ سے خالی پڑی تھی۔ آپ کی غنائیت ہی اُسے پُر کر دے گی۔

ایک حسین لڑکی کے رُخسار پہ ایک تِل ہے۔ میرا دوست اُسے کہنے لگا۔ سیٹھ ڈالمیا کا سب سے چھوٹا بیٹا کل ایک محفل میں کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی تواریخ میں ایسا ساحرانہ تِل تین صدیوں کے بعد پیدا ہوُا ہے۔

گذشتہ دنوں، ہر نوجوان لڑکی کے تِل کو وزیر یا رئیس کے بیٹے سے رابطہ پیدا کرنے والا وہ دوست میرے گھر آ گیا۔ نہایت خفگی مانندی کیفیت کہ اگر میں اُسے بیٹھنے کے لیے کہوں تو وہ گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "فکر صاحب! کنیڈا جانا پسند کریں گے آپ؟ وہاں کے اہلِ ذوق آپ کو مدعو کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "کہیں وہاں جا کر میرا مستقبل تو روشن نہیں ہو جائے گا۔"

بولے "آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ آپ تو افریقہ کے بیابانوں میں چلے جائیں، وہاں بھی آپ کا مستقبل روشن ہو جائے گا، دراصل آپ نے اپنے آپ کو ابھی پہچانا نہیں۔"

"پہچانا نہیں، جبھی تو میرا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔ اچھا بتاؤ، کیا پیوگے؟ وہسکی کے ایک دو پیگ حاضر کروں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، حالانکہ۔۔۔۔۔"

میں نے انھیں شرمندہ کرنے کے لئے دو پیگ اُن کے حلق میں انڈیل دئے۔ اور پھر پوچھا "بتاؤ، آپ کا مستقبل۔"

"روشن! ۔۔۔ میں تو جانتا ہوں کہ کس کا مستقبل کہاں جا کر روشن ہو گا۔"

جوں جوں میری عمر معقول حد سے تجاوز کر کے بڑھتی جا رہی ہے، میرے دوستوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور یوں بھی دوستوں کی تعداد کا کم سے کم ہونا کوئی معیوب نہیں۔ اگر کسی انسان میں دانائی ہو اور دنیا کے ساڑھے ننانوے فی صدی انسان اپنی دانائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ (باقی آدھ فی صدی کو استثنا سمجھا جائے) تو ایک انسان کے زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی دوست ہونے چاہئیں باقیوں کو صرف دوستی کا ایوارڈ دینا چاہیئے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے ایک دوست سے گستاخانہ عرض کیا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دوست کہہ کہہ کر دوستی کی توہین کر رہے ہیں۔"

وہ ظالم مجھ سے بھی زیادہ صاف گو نکلا "توہین؟"

(باقی صلا پر)

جوگندر پال

اے ھوشمندو

ایک دفعہ میرا ایک دوست اور میں کسی شاہراہ کے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے کہ اُس نے بے اختیار ہنستے ہوئے مجھے کہنی ماری اور پہلو میں ایک راہگیر کی طرف اشارہ کیا، جو نہایت سنجیدگی سے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی ہلا ہلا کر بائیں ہتھیلی کو کچھ سمجھائے جا رہا تھا ——— اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ ——— میں نے اپنے دوست سے کہا ——— اپنے اندر ہی اندر ہم سبھی یہی کچھ تو کرتے رہتے ہیں۔

تو پھر کیا ہر نارمل شخص پاگل ہے؟ ——— آپ کے اس سوال کا جواب دینے کے لئے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا، کیا یہ پاگل پن نہیں کہ اپنے نارمل ہونے کا بھرم بنائے رکھنے کے لئے کوئی خواہ مخواہ پاگل ہوتا پھرے؟ اور تو اور، جنھیں آپ پاگل سمجھ کر پاگل خانوں میں بند کر دیتے ہیں اُن کے روبرو کبھی کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ پاگل نہیں تو اپنی نہایت زرخیز چھٹی حس کے باعث اُن کی سمجھ میں فوراً یہ بات آ جاتی ہے کہ اُن سبھوں میں سے ایک صرف وہی ہے جو پاگل ہے ——— نہیں، اس ضمن میں آپ کا خیال کہ پاگلوں کو ہوشمند ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں، بجا نہیں ——— یہ اس لئے، کہ دونوں ایک دوسرے کو یکساں طور پر پاگل معلوم ہوتے ہیں، پھر کون پاگل اور کون ہوشمند؟

باہوش آدمی کی شناخت کو عام طور پر اُس کی ٹھہراؤ کی مہذب عادت سے وابستہ کیا جاتا ہے، یعنی وہ اپنے گھر کو آگ لگنے کی اطلاع پا کر پہلے تو نہایت تحمل سے آپ کا شکریہ ادا کرے اور پھر بڑی خوش خلقی سے آپ کو چائے پینے کی دعوت دے اور اتنی دیر میں آپ کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاع کو بھول کر آپ سے پوچھے آپ اتنے حواس باختہ کیوں نظر آتے ہیں؟ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ ——— خیر یہ ذی ہوش تو آپ کی خدمت بجا لانے کے آداب کی خاطر اپنا ہی گھر پھنکنے کا منظر آنکھوں میں نہیں لا پاتے، آپ اس قماش کے لوگوں کا کیا کیجئے گا جو آپ کا گھر پھنکنے کی خبر پا کر بڑے سہج قدموں سے موقع واردات پر قدم رنجہ فرماتے ہیں اور جن کا چین و اطمینان دیکھ کر آپ کو اپنی آگ بجھانے کی بے چینی مضحکہ خیز لگنے لگتی ہے اور پھر آپ بھی اُن کے ساتھ بڑی پُر چین ہوشمندی سے اپنی تباہی کا تماشہ کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی تباہی کا تماشہ کئے جانے سے صرف آپ ہی تباہ ہو رہے

ہوتے ہیں اور آپ کو اپنی نجی حماقتوں کے تمام تر جمہوری حقوق حاصل ہیں، لہٰذا ہم آپ کو بھی نظر انداز کیے دیتے ہیں، مگر آپ اُن ہوشمندوں کا کیا کیجیئے گا جو ہمہ گیر تباہی کو بھی نہ صرف سکون سے دیکھتے چلے جاتے ہیں بلکہ اس صورتِ حال پر واقعتاً سکون محسوس بھی کرتے ہیں اور اپنے سکون کے احساس کو بنائے رکھنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

پرانے لوگوں کی بے خبری اور رسا دگی کو آج ہم اُن کی پسماندگی سے تعبیر کرتے ہیں، مگر کُل عالم کی خبروں کی لَوٹ پا پا کر کیا ہم زندگی کے اس موڑ پہ نہیں آ کھڑے ہوتے جہاں ہر لحظہ ہم اس دہشت میں مبتلا ہیں کہ اگلی خبر سے نا معلوم کس نوعیت کی ہلاکت کا باب کھُل جائے!۔ اِس دہشت کے تدارک کے لیے ہمیں یہ ایکسپرٹ رائے فراہم کی جاتی ہے کہ جو بھی بیت جائے، یہی سمجھو، کچھ ہوا ہی نہیں۔ بُری سے بُری خبر پا کر بھی لا پروا رہو۔ بلکہ خبر جتنی زیادہ بُری ہو اتنے ہی زیادہ خوش نظر آؤ، سو جب مجھے کوئی نہایت خوش معلوم ہوتا ہے تو میں گھبرا سا جاتا ہوں کہ بے چارہ کہیں دہشت زدہ تو نہیں۔ ہمیں خبردار کیا گیا ہے کہ انسان کا دل اُس کا خون صاف کرنے کی نہایت نازک مشین ہے، اِس مشین کو احتیاط سے نہ برتنا غیر ذمہ داری کے مترادف ہے۔ مفت ایکسپرٹ ایڈوائس کی یہ سہولتیں اگلے وقتوں میں عوام کو کہاں نصیب تھیں؟ —— مگر اپنی اس مشین کو نہایت احتیاط سے برت برت کر ہم نے اپنے جذبوں کو بے مقام کر دیا ہے —— تو کیا ہوا؟ جذبوں سے

لیس ہو کر ہم نے بڑے طمطراق سے جہنمی منزلیں تسخیر کرنے کی ٹھان رکھی ہے —— نہیں، شیطان کی کیا ہمت، کہ ہماری سائنسی قوت کے سامنے دم مار سکے؟ اپنے بچاؤ کے لیے وہ جہنم کی سرحدیں پھلانگ کر ہماری مہذب دنیا میں ہی آ چھپا ہے۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ حالات بہتر ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا مگر انسانی ترغیبوں کی تاب نہ لا کر اب وہ مستقلاً یہیں بس گیا ہے۔ ہماری انٹلی جنس کی پکی خبر ہے کہ وہ یہیں ہماری دنیا میں ہے۔ ہم اُسے پکڑ تو لیں مگر ہماری اطلاع کے مطابق وہ اب اتنا جنٹلمین دِکھتا ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہیں اُس کے دھوکے میں ہم اپنے ہی معززین میں سے کسی کو نہ دھر لیں۔

ہمارے دور میں طوفانوں، بھونچالوں اور وباؤں سے کوئی خطرہ در پیش نہیں رہا۔ انسانی تدبر اور تربیت اِس طرح کے قدرتی خطرات کے اسباب پر حاوی ہو چکے ہیں: آج انسان کو اپنے ایک ہی دشمن سے سارے خطرے لاحق ہیں، اُس کا تدبر، جسے کام میں لا کے وہ کیا پتہ کب چشم زدن میں قیامت بپا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دنیا کی دو سب سے ہوشمند قومیں ایک دوسرے کے خوف سے پاگل ہیں اور اُن کے نمائندے کسی صلح جُو مہم کے دوران جب گلے ملتے ہیں تو بیک وقت اپنی اپنی پیٹھ پر خنجر کی چبھن محسوس کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ وہ ایسے ایسے سائنسی کرتب کر جاتے ہیں کہ اپنی بڑی میٹھی مسکراہٹوں کے راستے ہی اپنا سارا زہر ایک دوسرے کے بدن میں اتارتے چلے جائیں۔ دونوں قوموں کا دعویٰ ہے کہ جب تک وہ ہمہ وقت جنگ کے لیے تیار رہیں گے، اُن کے درمیان امن بنا رہے گا۔ اپنے اس دعویٰ کے جواز

میں دونوں کے پاس اتنے مہلک ہتھیار جمع ہیں کہ وہ ایک ذرا بٹن دبا کر دو جہاں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔ ہر دو نے اپنی حفاظت کے لئے ایسے غار بنا رکھے ہیں کہ نیوکلیائی ہلاکت کے پرزوں کے حرکت میں آجانے سے جب سانپ اور بچھو تڑپتے ہوئے اپنے بلوں سے باہر آجائیں تو یہ اُن کے مانند زمین دوز زندگی اختیار کر لیں اور جنگ کے سائے چھٹ جانے کے بعد مزے سے رینگ رینگ کر جئیں۔

ان دو بڑی قوموں کی دیکھا دیکھی اقتصادی طور پر کمزور قومیں بھی اسی طرح اپنی ہوشمندی کی تدبیروں میں ہمہ تن جٹی ہوئی ہیں۔ آپ اُن سے پوچھیئے آپ کے پاس بیماروں کی طبی امداد کا کیا انتظام ہے ؟ —— وہ بڑے فخر سے جواب دیں گی، موجودہ سال میں ہماری بری فوج میں سو فی صد، بحری میں دو سو فی صد اور فضائیہ میں ڈھائی سو فی صد اضافہ ہوا ہے۔ تیسری دنیا کے تقریبًا سبھی ممالک نے اپنی اولین ضروریات کی نشاندہی میں اتنی مضحکہ خیز مستعدی سے کام لیا ہے گویا وہ مستعد تو ہوں مگر اُنھیں یاد ہی نہ رہا ہو کہ وہ کیوں مستعد ہیں —— اپنی آزادی کے لئے ؟ —— آزادی کیا ہوتی ہے ؟۔ بھوک، بیماری اور لاچاری کو گاڑھا کئے جانے کی آزادی ؟ —— سیدھی سی بات ہے کہ کسی ملک کو باہر سے خطرہ درپیش ہو یا اندر سے، اُس خطرے کے اسباب بہر صورت خارجی ہوتے ہیں اور اُن کی مدافعت میں یکساں طور پر وہی جذبہ کارفرما ہونا چاہیئے جس کی تحریک کسی خارجی حملے پر ہوتی ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کا قریبی مطالعہ کریں تو اتنے لوگ کسی خارجی قوت سے جنگ کرتے ہوئے کام نہیں آتے جتنے کسی باطنی بگاڑ سے۔ مجھے تو دنیا کے بیشتر لوگ اسی لئے بڑی بے چینی سے ہاتھ پیر مارتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ خارجی حوادث سے دوچار ہونے کی بجائے بے چارے پیٹ کی گڑبڑ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مسئلہ تو جلاب کی گولیوں سے حل ہونا ہے مگر وہ بدحواسی میں بندوق کی گولیاں کھانے یا کھلوانے کے لئے اپنی سرحدوں کی جانب بے تحاشہ دوڑے جا رہے ہیں۔

ہوشمند لوگ اپنی خود یا رسائی سے خوش ہو ہو کر اپنے آپ کو یقین دلاتے رہتے ہیں کہ وہ بڑے گہرے غور و فکر کے عادی ہیں، حالانکہ قومی سیمیناروں پر ذرا سے بھی مشاہدے سے آپ پر یہ بھید کھل جائے گا کہ اپنے غور و فکر کے پوز میں دراصل وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہے ہوتے، بس اپنے بولنے کی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ چلئے یہ بھی برا نہیں۔ کم سے کم کچھ بھی نہ سوچنے سے وہ کسی کے نقصان کی تو نہیں سوچ رہے ہوتے۔ مگر پرابلم اتنا سیدھا بھی نہیں۔ ہمارے عقلمندوں میں ایسے لوگ بھی بکثرت موجود ہیں جو اپنی بے جا طرفدار سوچوں سے عام فہم معاملات کو اس لئے انتہائی پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ اس سازگار کنفیوژن میں من مانی کے لئے زمین ہموار کر سکیں۔ پچھلے دنوں مجھے چند دانشوروں کی ایک میٹنگ میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ چند سیدھے سادے امور تھے جن تک نیک نیتی سے پہنچنا درکار ہوتا تو کسی دیہات کا چوپال بھی بہ آسانی پہنچ جاتا، مگر ان نامور دانشوروں نے اپنے مطلب کے نتائج تک پہنچنے کی خاطر نہایت صناعی سے جھوٹ بول بول کر موٹی سی بات کو اس قدر الجھا دیا کہ میں بڑی پریشانی سے سوچنے لگا، اس پرابلم کا تو

کوئی حل ممکن ہی نہیں — نہیں، ممکن کیوں نہیں ؟ ایک دانشور نے اپنی مدبرانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے مجھے ٹوکا — سنیئے! — مگر اسی اثنا میں میٹنگ کے ایک اور رکن نے سرجھٹک کر اپنے آپ کو دانشوروں کے طلسمانہ داؤ پیچ سے آزاد کیا اور بڑے سپاٹ لہجے میں سچ بول دیا۔ اس کا بیان سنتے ہی سبھی دانشور اس پر کچھ اس طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ اور لوگ تو درکنار، وہ رکن خود آپ بھی اپنے آپ کو کوئی مسخرہ سمجھنے لگا۔

اپنے جھوٹ بولنے اور سننے کی عادت کے باعث اچانک کبھی سچی بات سن کر ہمیں یونہی لگتا ہے جیسے کوئی بڑا جھوٹ بولا گیا ہو، یا کسی مسخرے نے کوئی لطیفہ سنایا ہو، یا پھر سچ بولنے والا واقعی پاگل ہو گیا ہو۔ خدا بے چارے کے بچوں پر ترس کھائے۔ باپ کے جیتے جی یتیم ہو کر رہ گئے ہیں — میری ایک اور واردات سنیئے۔ کائیاں جیوتشیوں کی باتوں میں آکر ایک دفعہ میں نے نہ صرف سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ واقعی ہمیشہ سچ بولنے لگا۔ نتیجہ ؟ ایک ایک کر کے سب دوست اور رشتہ دار مجھ سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہ تو ہوا مگر پھر یہ بھی ہونے لگا کہ مجھے اپنا آپ بھی کوئی غیر معلوم ہوتا، میں ایک نفسیاتی ملبہ سا ہو کر رہ گیا اور اپنی باتیں اپنے آپ سے بھی چھپانے لگا، کیا معلوم، کب میں اپنا بھانڈا ابھی پھوڑ دوں ؟ — اب اس طرح کوئی کیونکر جیئے جا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اپنے آپ سے بھی چھپاتا پھرے ؟ بالآخر میں آپ ہی دوڑا دوڑا اپنے شہر کے پاگل خانے میں آپہنچا اور میرے پیچھے پیچھے میری بیوی — مجھے بچاؤ! — بچاؤ! —

پاگل خانے کے مہتمم نے ہماری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور مجھ سے پوچھا، کس سے ؟

مجھ سے !

مہتمم میرا جواب غیر متوقع پا کر چڑ گیا، جاؤ بھائی، یہ پاگل خانہ ہے، کوئی سنیاس آشرم نہیں۔

سچ بولنے کے باعث مجھے پاگل خانے میں پناہ نہ ملی تو مجھے سچ بھی جھوٹ معلوم ہونے لگا اور یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی پر حقائق منکشف ہونے لگتے ہیں، یعنی وہ حقائق کے غیر حقیقی پن سے متعارف ہونے لگتا ہے۔

ہوشمندوں کا المیہ شاید یہی ہے کہ ان پر حقائق کا غیر حقیقی پن وا نہیں ہوتا، اور ہو بھی جائے تو وہ اس کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لیتے ہیں، یا پھر پاگل ہو جاتے ہیں، مگر اپنے پاگل پن میں جب ان کو ظاہری غیر حقیقی پن کے درون خانوں میں پہنچنا ہوتا ہے تو وہ یہاں ابرِ رحمت میں نہا دھو کے، نئے نویلے ہو کر باہر نکلتے ہیں اور کل جہان کو ایک نیا درس دینے کی دھن میں اتنے سرشار ہوتے ہیں کہ مقامی لوگ انھیں نہایت خطرناک پاگل سمجھ کر ان کے سامنے زہر کے پیالے رکھ دیتے ہیں جنھیں وہ مستقبل میٹھا پانی سمجھ کر بے تامل ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور یوں اپنی پیاس بجھا کر ملکِ عدم کی جانب ہو لیتے ہیں۔ اماوس کی راتوں میں جب چاند بھی اپنی کسی خیانت کے خیال سے منہ چھپائے ہوتا ہے تو یہی غیر ہوش مند درویش آکاش کی دور تر تاریکیوں میں جھلملا رہے ہوتے ہیں کہ کائنات کا لبا لبا منظر اوجھل نہ ہو جائے۔ یہ جیالے عمر بھر اپنے وجود کی چاردیواری میں پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں اور زہر کے پیالے پی کر کائناتی ربط میں رچ بس جاتے ہیں تاکہ ہم ہوشمند لوگ انھیں اپنے سانسوں سے

اندر اتار اتار کر وسیع تر ہوتے رہیں۔ وسیع تر ہو کے
پھیلنا سیکھ جائیں اور پھیلتا پھیلتا کے اِن کی لامحدودیت
میں شریک ہو جائیں۔

ہوشمندی کے کڑے پہروں میں گھرا آدمی اپنی
مٹی اور نام کو ہی اپنی ذات پر محمول کرنے لگتا ہے اور
اپنی فطری خوبیوں کو مصنوعی عادتوں میں گھٹاتے ہوئے
بھی سود و زیاں کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ مغرب نے
تو اِس قسم کی ہوشمندی پر اصرار کر کے برتر زندگی
کا موقع کھو یا ہی تھا، ہم بھی اُن کے تتبع میں اُن طبع زاد
قدروں کا خون کرنے پر تُل گئے جن کی بدولت ذات
کا کائنات پر کھلتے چلے جانا اور کائنات کا
ذات میں سمٹ آنا بعید از قیاس نہ تھا۔

ہماری نئی تہذیب نے ہمیں اپنے پیروں پہ کھڑا
تو کر دیا ہے مگر اِس ایستادگی میں کچھ یوں جکڑ دیا ہے
کہ اِک ذرا جھک کر سہارا لیٹنا نہیں ہو پاتا، بس کھڑے
کھڑے سوؤ اور سوتے میں بھی چوکس رہو، ورنہ کوئی گلا کاٹ
جائے گا ——— خبردار! ——— ہوشیار! ——— ہم بڑے
ہوشیار، ہو گئے ہیں۔ آنکھیں ترس جاتی ہیں کہ کوئی تو ایسا
ملے جو اتنا ہوشیار، اتنا عیار نہ ہو، ہم اُس پر ایک دم
بھروسہ کر لیں اور اُسے بے تحفظ، بے خوف اور بے تامل
گلے لگا لیں اور ہمارے پھٹتے ہوئے سینوں میں قرار
آ جائے — ارے، کوئی تو احمق ہو، کوئی دیوانہ، کوئی محبت کرنے والا۔
مُفت میں کون محبت کرے گا بابا؟ پہلے دام
نکالو۔

اندر سروپ دت نادان

آنگن

گاؤں کی مٹی
شہر میں آ کر لوٹ گئی تھی
اور وہ آنگن ڈھونڈ رہی تھی
جس کی خوشبو
اُس کے بوسیدہ آنچل میں بندھی ہوئی تھی
یہ زنجیر بھی رہ رہ کر اُس کے قدموں میں لوٹ رہی تھی
کون سا سُکھ ہے جو اِس گھر میں نہیں ہے ماں جی!
پھر یہ درد بھری آواز فضا میں گونجی
روک نہ مجھ کو میرے بیٹے
میرا رستہ دیکھ رہے ہیں تیرے پُرکھے
پل دو پل تو جی لینے دے مجھ کو اُس آنگن میں پگلے
جس کی لو میں بھٹک رہی ہے میری مٹی!

بشیر بدر

غزل

راتوں کے مسافر ہو اندھیروں میں رہو گے
جگنو کی طرح دن میں جلو گے نہ بجھو گے

سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو
تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہو گے

خوشبو کی حویلی ہے عجب دل کی زمیں پر
وعدہ کرو اک روز مرے ساتھ چلو گے

کیا ان کہی غزلوں کی کتابیں ہیں وہ آنکھیں
جب پڑھ نہیں سکتے ہو تو کیا خاک لکھو گے

دلّی ہو کہ لاہور کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے

انجم عرفانی

غزل

بند ہوتی کھلتی ریشم کھڑکیاں آنے لگیں
اب بصارت کی حدوں میں تتلیاں آنے لگیں

صبح چہرے، پھول باتیں، رنگ لہجہ، شہد لفظ
شاید ان اطراف میں اب لڑکیاں آنے لگیں

ہم ابھی دستِ خبر کی زد سے نکلے بھی نہ تھے
صفحۂ اوّل پہ کیسی سرخیاں آنے لگیں

میں محاذِ جنگ پر ہی چھوڑ آیا، کیا کروں
کس خوشی سے لیکے بہنیں راکھیاں آنے لگیں

میں سفیدی کو سیاہی میں چھپا لیتا مگر
اب تو انجمؔ آئینے میں جھرّیاں آنے لگیں

ڈاکٹر نشی

اردو شاعری میں برسات کا ذکر

قدرتی مناظر سے متاثر ہونا فطرتِ انسانی ہے۔ قدرت کے رنگا رنگ نظارے اسے مسرور و شاد کام بھی کرتے ہیں اور اس کے جذبات کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ شاعر چونکہ عام آدمی کی نسبت بہت زیادہ حساس طبع ہوتا ہے، اس لئے اس کی طبیعت قدرتی مناظر سے زیادہ اثر قبول کرتی ہے۔ اردو سے پہلے، ہندوستانی زبانوں کی شاعری میں، بالخصوص سنسکرت شاعری میں انسانی جذبات کی زوردار ترجمانی کے لئے قدرتی مناظر سے بہت مدد لی گئی ہے۔ کالیداس کا 'رتو سنگھار'، اس کی اعلیٰ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ رِتو ورنن یعنی موسموں کا بیان اردو شاعری میں بارہ ماسے کی صورت میں باقاعدہ طور سے داخل ہوتا ہے۔ اس سے قبل اگرچہ دکنی شعرا کے یہاں ہندوستانی موسموں کا ذکر با تفصیل موجود ہے لیکن ان کی زبان ٹکسالی اردو نہ ہونے کی وجہ سے، اردو کا عام قاری اس سے لطف اندوز ہونے سے معذور رہتا ہے۔ ابراہیم عادل دوم کی 'نورس' میں، سلطان قلی قطب شاہ کی نظموں میں، ملّا وجہی، مقیمی اور سراج کی مثنویوں میں ہندوستانی موسموں کا بھرپور بیان موجود ہے جسے ہم تاریخی اعتبار سے، اردو شاعری میں سرزمینِ ہند کی مہک کے آغاز کا نام دے سکتے ہیں۔ دکنی شعراء کے علاوہ شمالی ہند کے اردو شعراء کے یہاں بھی، ایک زمانے تک، ہندوستانی موسموں کے بیان کی روایت قائم رہی ہے۔ اس ضمن میں ہم میر تقی میرؔ کی اُن چار مثنویوں کا ذکر کر سکتے ہیں جن کا موضوع موسمِ برسات ہے۔

ہندوستانی موسموں میں برسات کا موسم سب سے حسین اور خوبصورت موسم مانا جاتا ہے۔ ہندُستانی زبانوں کی شاعری میں برسات کی رُت جہاں ایک طرف عاشق کی غیر موجودگی میں معشوق کے جذبات کو مشتعل کر کے اس کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہے، وہاں دوسری طرف عاشق اور محبوب کے ملن کے پر کیف لمحات کو برکھا رُت کا رہینِ منت بنا دیتی ہے۔ اردو شاعروں میں، برسات کے بیان میں جو قدرت نظیرؔ اکبرآبادی کو حاصل رہی ہے، وہ دوسرے شعراء کے مقابلے میں اُنھیں منفرد مقام کا حامل بنا دیتی ہے۔ مولانا حالیؔ کی نظم 'برکھا رُت'، سرورؔ جہاں آبادی کی 'فضائے برشگال'، افقؔ لکھنوی کی 'برسات کی بہار'، حسرتؔ موہانی کی 'برسات'، جوشؔ ملیح آبادی کی 'برسات کی پہلی گھٹا'، شمسؔ عظیم آبادی کی 'برسات'، ایسی نظمیں ہیں جن میں ہندوستان کے اس نہایت خوبصورت

موسم کا بھرپور بیان موجود ہے۔

برسات کا موسم ان عاشقوں کے لئے انتہائی کرب ناک موسم ہے جن کے محبوب ان کے پاس نہیں ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کی شاعری میں چونکہ عام طور پر عورت کو عاشق کا درجہ حاصل رہا ہے، اس لئے موسم برسات میں، پیا کے وجوگ میں تڑپنا ان کا مقدر ہو گیا ہے۔ سماجی اعتبار سے، کاروبار کے سلسلے میں دور دراز کے مقامات پر نکلے ہوئے آدمی جب برسات میں بھی اپنے گھر نہیں لوٹتے تو ان کی محبوب عورتیں، جن میں بعض کی بیویاں بھی شامل ہوتی ہیں، ان کے فراق میں آہ وزاری کرتی ہیں۔ ان عورتوں کا ہنسنا، کھیلنا، چہچہانا انھیں اور بھی ستاتا ہے، جن کے محبوب ان کے ساتھ ہیں۔ انسانی جذبات کی اس فطری کیفیت کا بیان افضل پانی پتی کے یہاں ملاحظہ کیجئے:۔

گھٹا کاری چہا روں اور چھائی
برہ کی فوج نے کیتی چڑھائی
ارے جب کوک کوئل نے سنائی
تمامی تن بدن میں آگ لائی
ہنڈولے چڑھ رہیں سب نار پیو سنگ
حسد کی آگ نے جارا مرا انگ
چلا ساون مگر ساجن نہ آئے
اری کن سوتیوں نے ٹونے چلائے

مگر برسات کا یہی موسم ان عاشقوں کے لیے انتہائی پُر کیف بن جاتا ہے جن کے محبوب ان کے پاس ہیں۔ ان کے لئے موسم برسات کے مناظر اور بھی سہانے ہو جاتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی زبان میں ایسے خوش نصیبوں کا ذکر ملاحظہ کیجئے۔

جو وصل میں ہیں ان کے جُوڑے مہک رہے ہیں
جھولوں میں جھولتے ہیں گہنے جھنک رہے ہیں

ملن اور وجوگ کے اس تضاد کو نظیر اکبر آبادی اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاٹے ہیں رات ساری
جو غم میں ہیں انھوں پر گذرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ رہی ہیں جو ہیں پیا کی پیاری
چھاتی پھٹے ہے ان کی جو ہیں برہ کی ماری
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

وصال اور فراق کے احساسات سے قطع نظر برسات کا موسم اپنے آپ میں بے انتہا حسین اور خوشگوار موسم ہوتا ہے۔ یہ وہ موسم ہے جب دھرتی سہاگن کی طرح کھل اٹھتی ہے، ندیاں پانی سے لبالب بھر کر اور اکثر اوقات کناروں کے قید وبند توڑ کر بدمست بہنے لگتی ہیں۔ جا بہ جا سبزہ کھل اٹھتا ہے، کوئل کی کوک اور مور کا رقص مستی دل و ذہن کو تازگی عطا کرنے لگتا ہے ـــــ دیکھئے میر تقی میر برسات کی اس چھٹا کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

رت رہے برسات کی بہت پیاری
موجزن جھیلیں ندّیاں ساری
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب
کر رہے ہیں نظر کی دلداری
سوندی سوندی زمین کی مٹّی
بھینی بھینی چمن کی بُو پیاری
کوکلا بگلا کوئلیں طاؤس
اپنی تانیں سناتے ہیں پیاری

موسم برسات کتنا ہی سہانا اور پیارا ہو مگر جب بہت دنوں تک بارش کا سلسلہ جاری رہتا ہے

تو عام آدمی اس سے عاجز بھی آجاتا ہے۔ زندگی کا کاروبار ٹھپ سا ہو جاتا ہے اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں مقید، اس بات کے منتظر ہونے لگتے ہیں کہ "تار بارش کا نو ٹوٹے کسی ساعت کسی پل"۔ دیکھئے برسات کے دنوں کی یہ بیزاری بھی میر کی نظروں سے اوجھل نہیں رہی ہے۔

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات
جوشِ باراں سے بہہ گئے ہیں پات
ابرِ رحمت ہے یا کہ زحمت ہے
ایک عالم غریقِ رحمت ہے
نہ ہے جلسہ نہ ربطِ یاراں ہے
شہر میں ہے تو بادو باراں ہے
لکھیے کیا میر مینھ کی طغیانی
ہو گئی ہے سیاہی بھی پانی

میر کے برعکس حالی نے برسات کو ایک دوسرے زاویہ سے دیکھا ہے۔ ان کے یہاں موسم برسات گرمی کی تپش بجھانے والا، سردی کا پیامبر، عارفوں کے لئے کتابِ عرفان اور خدا کے جلووں کا مظہر ہے۔ یہ وہ موسم ہے جسے حالی بہت سی دعاؤں اور التجاؤں کے بعد آیا ہوا موسم کہتے ہیں۔

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانے والی
وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کونِ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت سی دعاؤں کے بعد
اور سینکڑوں التجاؤں کے بعد

برسات کے ساتھ، ہندوستانی ادب میں، کرشن اور گوپیوں کی بہت سی داستانیں اور کرشن کی راس لیلا کے بہت سے مناظر بھی وابستہ ہیں۔ کرشن اور گوپیاں، خدا اور روحوں کی علامتیں بن کر ہندوستانی بھگتی ادب میں معرفت کی جو گرہیں کھولتے ہیں اور حیات و کائنات کے جن مسائل کو عارفانہ ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں، ان کی بازگشت کبھی اردو شاعری میں سنائی پڑتی ہے۔ منشی درگا سہائے سرور کے یہاں چمن میں ابرِ بہار کے جھوم کر اٹھتے ہی جب شگوفے چٹک پڑتے ہیں اور پھوار برسنے لگتی ہے تو:۔

سہی قدوں کا ہے جمگھٹ کنارِ آبِ رواں
کہ برج میں لبِ جمنا ہے گوپیوں کی قطار
ترانہ ریز ہے یوں شاخِ سرو پر قمری
کہ جیسے گاتی ہو مدھوبن میں کوئی سندر نار

برکھا کی یہ کالی کالی گھٹائیں اردو شاعری میں، کہیں بے نظیر شاہ کے کلام میں ابرِ رواں کی شوخ رفتاری کا پتہ دیتی ہیں، کہیں منشی دوارکا پرساد افق کے کلام میں ان کے پانی سے زمین کا غبارِ دل دھلتا ہے، کہیں حسرت موہانی کے کلام میں یہ گھٹائیں موجب سوز و سرور اور باعثِ عیش و نشاط بن کر ظاہر ہوتی ہیں تو کہیں جوش ملیح آبادی کے کلام میں برسات کی پہلی گھٹا یوں جھوم کر اٹھتی ہے کہ:۔

کیا جوانی ہے فضا میں مرحبا صد مرحبا
چل رہی ہے روح کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
آ رہی ہے دور سے کافر پپیہے کی صدا
حسن اٹھا ہے خاک سے انگڑائیاں لیتا ہوا
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

غرضیکہ اردو شاعروں نے موسموں کے بیان میں برسات کا ذکر بیانیہ اور علامتی دونوں انداز میں کیا ہے، اور برسات سے متعلق نظموں میں جہاں ایک طرف مناظرِ قدرت کی بھرپور عکاسی دستیاب ہوتی ہے، وہاں دوسری طرف برسات سے متعلق انسانی احساسات اور انسانی تاثرات کو بھی زبان عطا کی گئی ہے۔

علی عبّاس اُمیدؔ

آوازوں کا جشن

اور جب زرد سورج نے
ڈھلتے ہوئے
کالے آنچل سے منہ کو ڈھکا
چار سو جل اُٹھے تیرگی کے کنول
ایک محفل سجی
نیند کی جستجو میں بھٹکتی ہوئی
بُجھتی آوازوں کا جشن ہونے لگا

O

اور پھر یوں ہوا
تیرگی کی فصیلیں کچھ اونچی ہوئیں
گرم سانسوں کی خوشبو نے انگڑائی لی
بُت سنورنے لگے، رنگ گڈمڈ ہوئے
اور تب

سُرخ قطروں کی بارش ہوئی
اور برسات نے خامشی سے کہا
ان اندھیروں کا رُخ موڑ دو
بُجھتی آوازوں کے جشن کی سرحدیں توڑ دو

O

اور پھر یوں ہوا
چند آوارہ سائے
بکھرتے ہوئے خواب کے ننگے بازو پہ سر رکھ کے رونے لگے
اور پھر سُرخ قطروں کی چٹان سے
کھاری پانی کے چشمے اُبلنے لگے
بھیڑ کے اس سمندر میں لفظوں کا اک قافلہ
آ کے ٹھہرا فقط چند لمحوں کو اور اس کے آنسو لیے
بہہ چلا اس طرف
کھاری پانی کی موجیں جہاں
زندگی کا کنول لے کے اٹکھیلیاں
کرتی پھرتی ہیں از شام تا بہ سحر

O

اور میں بُجھتی آوازوں کے جشن کو
آج بھی دیکھ کر
سوچتا ہوں
مرے روبرو دکھ کا ساگر ہے
اس کی کوئی حد نہیں ہے ...... کوئی حد نہیں
پھر بھی میں عہد کرتا ہوں ــــــــــ
اس جشن کی آخری داستاں
مجھ کو لکھنی ہے ـــــ لکھوں گا ـــــ اب
خواہ اُس کے لئے پھر مجھے
زرد سورج کے چہرے سے آنچل ہٹانا پڑے ..

سیف الرحمٰن عبّاد

بوجھ

سب بھاگے جا رہے ہیں

تیز، حواس باختہ اور ایک دوسرے سے بے نیاز۔ سب کی نگاہیں دُور اُفق کی سرحدوں میں کہیں مرکوز ہیں۔ بھاگتے قدموں کے شور سے ماحول مرتعش ہے۔ ایک بھگدڑ سی مچی ہے۔ قدموں کی خاک غبار بن کر اُن کے سروں پر چھاتی جا رہی ہے۔

سب بھاگے جا رہے ہیں۔

سب کے ہونٹ خشک ہیں۔ ہونٹوں پر آڑی ترچھی اور گہری لکیریں نمایاں ہیں جن سے خون کی سُرخی جھانک رہی ہے۔ منہ کے اندر کسیلا ذائقہ گھُلا ہوا ہے۔ دانتوں کے بیچ دُھول کِرکِرا رہی ہے۔ چہروں پر وحشت ہے لیکن آنکھوں میں ایک جوت سی جل رہی ہے۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ اکیلا دوڑ رہا ہے لیکن جب کوئی دوسرا بھاگتا ہوا شخص اُس سے ٹکراتا ہے تو اُسے اپنے ساتھ کسی اور کے بھاگنے کا احساس ہوتا ہے۔ گردن کے ایک خم کے ساتھ وہ اپنی حیرت کا اظہار کرتا ہے اور اگلے ہی لمحہ اُس کی رفتار میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی آجاتی ہے۔ اُس کے سینے میں ایک نیا جوش اُبل آتا ہے اور وہ اپنے ساتھ بھاگتے ہوئے شخص سے بہت آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ دُھول کا غبار گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

سب بھاگے جا رہے ہیں —

زمین کہیں ہموار اور کہیں ناہموار ہے۔ توازن کا نقطہ متحرک ہوتا ہے تو کوئی لڑکھڑا جاتا ہے، کوئی گرنے سے پہلے ہاتھوں کو زمین پر ٹیک دیتا ہے اور کوئی منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ لیکن اگلے ہی پل گرنے والا شخص اُٹھ کر اتنی سُرعت سے بھاگنے لگتا جیسے گِر کر وہ زخمی اور نِڈھال ہونے کے بجائے تازہ دم ہو گیا ہو۔ کسی کے انگوٹھے کا ناخن اُتر گیا ہے تو کسی کے گھٹنے کے زخم سے بہتا خون پیر کی انگلیوں کے بیچ جمع ہو رہا ہے۔ کسی کی پیشانی کی کھال کٹ گئی ہے تو کسی کی ہاتھوں کی انگلیاں لہو لہان ہیں۔ سب کے کپڑے کہیں نہ کہیں سے پھٹ چکے ہیں اور جسم سے رِستا خون اُن پر گلکاریاں کر رہا ہے کسی کو اپنے زخموں کی پرواہ نہیں۔ درد کا احساس نہیں۔ جیسے احساس بیدار کرنے والی تمام نسیں ان کے جسموں سے نوچ نوچ کر پھینک دی گئی ہوں۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے ہیں اُن کی آنکھوں کی جوت

میں اور بھی چلا آتی جا رہی ہے۔ سب کی نگاہیں دُور اُفق کی سرحدوں میں دھنستی چلی جا رہی ہیں

سب بھاگے جا رہے ہیں ــــ

اس بھیڑ میں وہ بھی شامل ہے۔ اُس کے گلے کی جھلیاں خشک ہو کر آپس میں چپکنے لگی ہیں تو وہ تھوک نگلتے ہوئے سوچ رہا ہے کہ کیوں نہ وہ اپنی رفتار کم کر دے یا کچھ دیر کے لئے رُک ہی جائے۔ گردن اُونچی کر کے وہ آگے پیچھے دیکھنے لگا ہے۔ اُس کی نگاہوں کے دائرے میں سروں کا ایک قافلہ رواں دواں ہے۔ اُسے اپنا ارادہ بدلنا پڑا ہے۔ ایک شخص بالکل اُس کے شانہ بہ شانہ دوڑ رہا ہے۔ وہ پھولتی سانسوں کے درمیان اُس سے پوچھنے لگا ہے۔

"بھائی . . . . ہم . . . . . کہاں . . . . بھاگ . . . . رہے ہیں ؟"

دوسرے شخص نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا ہے۔ اُس کی آنکھیں متحیّر ہو اُٹھی ہیں۔ چہرے پر استہزا کا پرتو لہرا اُٹھا ہے۔

"ہُنھ . . . . . . پاگل ہے!" وہ شخص شدید غصّے میں اُسے گھور کر سامنے دیکھتے ہوئے پھر رفتار پکڑنے لگا ہے۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ اُس نے اُس شخص کی توجہ میں خلل ڈالنے کا جُرم کیا ہے۔ وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ شخص بھاگتی ہوئی بھیڑ میں آگے بڑھنے کے لئے جگہ بنا رہا ہے۔ اپنے اعضاء کے زاویئے بدل رہا ہے۔

سب بھاگے جا رہے ہیں ــــ

ایک اور شخص کا شانہ اُس کے شانے سے ٹکرایا ہے۔ اُس نے مُڑ کر اُسے دیکھا۔ اُس شخص کے چہرے پر وہ کرختگی نہیں جو پہلے شخص کے چہرے پر تھی۔ اُس کی ہمت نے سر اُبھارا ہے اور اُس نے وہ سوال اُس شخص سے بھی کر ڈالا ہے۔ اُس شخص نے بھویں سکوڑ کر اُسے ایسے دیکھا ہے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو لیکن اُسے شرمندہ ہونے سے بچا لیا ہے۔

"چہ . . . . . . عجیب آدمی ہو! . . . . . اتنا بھی نہیں جانتے !؟ . . . . ہم سب ترقی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔"

"او . . . . . . اچھا!" اُسے جیسے معًا یاد آ گیا ہے

وہ شخص اپنا شانہ اُس کے شانے سے آگے لے جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اُس کے جواب کی شہہ پر اُس نے اُس شخص سے ایک اور سوال کر ڈالا ہے۔

"ہم اتنا تیز . . . . کیوں بھاگ رہے ہیں . . . . آہستہ بھی تو چل سکتے ہیں ؟!"

اُس شخص کی آنکھیں پھٹ پڑی ہیں۔ اُس نے سر جھٹک کر اپنی اُکتاہٹ کا اظہار کیا ہے لیکن اس بار بھی اُسے شرمندہ ہونے سے بچا لیا ہے۔

"چہ . . . . . اُف! عجیب احمق آدمی ہو . . . . آہستہ چلیں گے تو پیچھے نہ رہ جائیں گے!"

"اوہ . . . . . اچھا!" اُسے پھر اچانک یاد آ گیا ہے۔

وہ شخص بھی بھاگتی بھیڑ میں آگے بڑھنے کے لئے جگہ بنانے لگا ہے۔

سب بھاگے جا رہے ہیں ــــ

راستہ دائیں طرف مڑ کر پھر آگے جاتا ہے۔ سامنے ایک مکان ہے۔ مڑنے کے لئے ناچار سب

اپنی رفتار میں کمی کر رہے ہیں۔ پیچھے سے چیختی آوازیں ابھرتی ہیں۔

"سیدھے چلو.......... سیدھے چلو!"

"سامنے تو مکان ہے......... راستہ دائیں طرف مڑ کر ہی آگے جاتا ہے" آگے سے جواب دیا جاتا ہے۔

مڑنے میں ہمارا ایک منٹ ضائع ہوگا......

سیدھے چلو" عقب سے پھر چیختی آوازیں ابھرتی ہیں۔

سب دھڑا دھڑاتے ہوئے مکان میں گھس جاتے ہیں۔ مکین ہراساں ہیں۔ بچے کونوں میں چھپ گئے ہیں۔ عورتوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ وہ سہمی اور بوکھلائی ہوئی سی ادھر اُدھر پناہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ ایک معمر شخص خوف اور غصے کے ملے جلے لہجے میں چیخ رہا ہے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم لوگ گھر میں کیوں گھسے آ رہے ہو؟!"

سب اُس کے اعتراض سے قطع نظر اُسے یوں گھور رہے ہیں جیسے وہ دُنیا کا سب سے بڑا احمق ہو۔ سب بھاگتے ہوئے صحن میں پہنچ رہے ہیں اور دوسرے دروازے سے ہو کر باہر نکل رہے ہیں۔ اب سب کے سب پھر سے مطلوبہ راستے پر آ پہنچے ہیں۔

سب بھاگے جا رہے ہیں ـــــ

اب ایک معروف بازار آ رہا ہے۔ سامنے ایک بورڈ لگا ہے "فٹ پاتھ پر چلئے"۔ بھیڑ کا ریلا جھومتے ہاتھی کی طرح آگے بڑھ رہا ہے۔ سڑک کے کنارے لگا وہ بورڈ ٹیڑھا ہو کر زمین چاٹنے لگا ہے۔ بھیڑ دشمن کی فوج کی طرح یلغار کر رہی ہے۔ بازار کے ماحول میں انتشار بپا ہے۔ لوگ اس دیوانی بھیڑ کی زد سے بچنے کے لئے گلیوں اور دکانوں میں بھاگ رہے ہیں۔ ٹریفک تھم گیا ہے۔ بے شمار متفکر چہرے گاڑیوں کی کھڑکیوں سے نکلے اس بھگدڑ کو دیکھ رہے ہیں۔ ٹریفک پولیس مین بدحواس اور بوکھلایا ہوا ہے۔ وسل بجاتے ہوئے اُس کے گال تیزی سے پھول پچک رہے ہیں۔ وہ متواتر وسل بجا رہا ہے اور ہاتھ کو میکانکی انداز میں جھٹکا دے دے کر بھیڑ کو ایک طرف ہونے کا اشارہ کر رہا ہے۔ لیکن ہر شخص کی نگاہیں پولیس مین کے سر کے اوپر میلوں دُور دیکھ رہی ہیں۔ بازار میں کارزار کا سا شور ہے۔ ٹریفک پولیس مین کی گردن کی رگیں وسل بجاتے بجاتے پھول گئی ہیں۔ گاڑیوں کے ہارن اپنی اپنی آوازیں چیخ رہے ہیں۔ اب بھیڑ سڑک پر اِدھر اُدھر بٹ گئی ہے اور گاڑیوں کے بیچ راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔

سب بھاگے جا رہے ہیں ـــــ

بازار کا اب قدرے غیر معروف حصہ آ پہنچا ہے۔ بھیڑ بھاڑ کم ہے۔ ٹریفک یہاں رکشوں، ٹھیلوں اور سائیکلوں تک محدود ہے۔ چند ہوٹل بھی ہیں۔ بھاگتی ہوئی بھیڑ یہاں آ پہنچی ہے۔ ہوٹلوں سے اُٹھتی کھانے کی خوشبو بھاگتے لوگوں کے نتھنوں سے ٹکرائی ہے تو اُن کے معدے اُن کے کانوں کے پاس سرگوشی کرنے لگے ہیں۔

"رُک جاؤ...... رُک جاؤ......

چند منٹوں میں ہم کھانا کھا لیں گے!" ہر شخص نے چیخ کر ایک دوسرے کو مخاطب کیا ہے۔

قدموں نے یک لخت زاویے بدل دیئے

ہیں۔ سب ایسے ہوٹلوں میں گھس پڑے ہیں۔ روٹیاں اُڑن طشتریوں کی طرح اُڑ رہی ہیں اور لوگ کٹی ہوئی پتنگوں کی طرح اُنھیں لُوٹ رہے ہیں۔ سالن کی دیگ بیچ میں رکھ دی گئی۔ سب اپنے معدے کی خندق کو بڑے بڑے نوالوں سے پُر کر رہے ہیں۔ کسی نے پانی پینا ضروری سمجھا ہے اور کسی نے نہیں۔ قدم پھر سے متحرک ہو گئے ہیں، سب دوبارہ سڑک پر آچکے ہیں۔

سب بھاگے جا رہے ہیں ـــ

ایک صدا گونج رہی ہے۔

"بھاگتے رہو.... بھاگتے رہو۔"

چیخوں کی آوازوں کے بیچ مؤذن کی آواز

طوطی کی آواز بن کر رہ گئی ہے۔

"ٹوں ں ں ں...... ٹن ٹن ٹن"

مندر سے شنکھ کی آواز اُبھر رہی ہے۔

"بھاگتے رہو.... بھاگتے رہو۔"

چیخوں نے شنکھ کی آواز کو بھی نگل لیا ہے۔ آبادیاں پیچھے چھوٹتی جا رہی ہیں۔ شہر بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اب بھیڑ ایک ویرانے میں بھاگ رہی ہے۔ سورج کی تیز شعاؤں سے فضا گرم ہوا اُٹھتی ہے۔ سیاہ ہوتے چہروں نے اُن پر بہتے پسینے کا رنگ بھی سیاہ کر دیا ہے۔ سب کتّوں کی طرح ہانپ رہے ہیں لیکن اُن کے حوصلوں میں گھوڑوں کی طرح بھاگنے کی کی ہمت اور جوش باقی ہے۔ سامنے ریتیلا میدان شروع ہو رہا ہے۔ توے کی طرح گرم۔ سورج نے جیسے اپنی ساری حدّت یہیں خارج کر دی ہے۔ سب بے خوف و خطر ریتیلے میدان میں اُتر پڑے ہیں۔ پیر سلگ اُٹھے ہیں۔ ذہن کی رگیں کھنچنے لگی ہیں۔ چہرے ٹیڑھے میڑھے ہو رہے ہیں۔ لیکن کوئی بھی بھاگنے کا ارادہ ترک کرنے کے لئے تیار نہیں۔

سب بھاگے جا رہے ہیں ـــ

اب ایک پتھریلا ٹیلا آ پہنچا ہے۔

"بس اب منزل دُور نہیں......

بھاگتے رہو...... بھاگتے رہو!"

خوشی سے چیختی آوازیں پتھریلے ٹیلے سے ٹکرا ٹکرا کر بازگشت میں تبدیل ہو رہی ہیں سب پتھریلے ٹیلے پر قدم رکھتے ہیں اور زقند بھر بھر کر اُوپر چڑھنے لگتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکتے ہوئے ٹیلے سے نیچے گر رہے ہیں۔

ٹیلے کے پار اُترتے ہی سب اچانک ٹھٹک کر رُک گئے ہیں۔ سب کے چہرے مسرت سے دمک اُٹھے ہیں۔ خشک اور پھٹے ہوئے ہونٹوں پر کلیاں سی چٹخ رہی ہیں۔ اجتماعی چیخوں کا شور گونج اُٹھا ہے۔

"یہی ہے..... یہی ہے.....

یہی ہے ترقی کا مینارہ"

اُس نے بھی سامنے دیکھا ہے۔ وسیع میدان کے بیچوں بیچ واقعی ایک انتہائی خوبصورت، بلند و بالا اور پُر شکوہ مینار کھڑا ہے۔ سب دیوانوں کی طرح مینار کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔ اب سب اس بات کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کون اُن سے آگے ہے اور کون پیچھے۔ حوصلوں میں طوفانوں کی سرکشی آگئی ہے۔

سب مینار کی طرف ہاتھ اُٹھائے بے تحاشا بھاگے جا رہے ہیں۔

لیکن وہ رُک گیا ہے۔ اب اُس میں آگے دوڑنے کی قوت ہے نہ ہمت۔ وہ اپنی دُکھتی ٹانگوں پر جھکا پاگلوں کی طرح بھاگتے لوگوں کو دیکھ رہا ہے۔ اب سب مینار کے قریب پہنچ چکے ہیں اور چاروں طرف سے اس پر چڑھنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی قدم جما رہا ہے، کوئی تھوڑا سا چڑھ کر پھسلا جا رہا ہے اور واپس زمین پر آ رہا ہے اور کوئی واقعی چڑھنے کی کوشش میں کامیاب ہو رہا ہے۔

وہ ایک ٹک ان کی حرکات دیکھ رہا ہے۔ اب سب مینار پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور پھسلتے سنبھلتے آہستہ آہستہ اُوپر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

وہ اپنے تلوؤں کو دیکھنے لگا ہے۔ ایک تلوے کی کھال پھٹ گئی ہے اور دوسرے تلوے کی کھال آدھی اُتر کر راستے میں کہیں چھوٹ گئی ہے درد کی شدت سے اُس کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں۔ زمین پر بیٹھنے سے پہلے اُس نے پھر مینار اور اُس پر چڑھتے لوگوں کو دیکھا ہے۔ معاً مینار پر سے بہت ساری آوازیں گونج اُٹھی ہیں۔

"اپنے اپنے جسم کا بوجھ کم کرو۔۔۔۔۔۔ ہمیں اوپر چڑھنے میں دشواری ہو رہی ہے!"

اگلے ہی لمحے سب نے کوئی چیز جلدی جلدی نیچے پھینکنا شروع کر دی ہے۔ یہ چیزیں فضا میں لہراتی ہوئی مینار کے چاروں طرف گر رہی ہیں۔

وہ ایک تجسس لئے لنگڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ قریب پہنچ کر اُسے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگوں کے کپڑے ہیں جو اُنھوں نے اپنے جسموں سے نوچ نوچ کر نیچے پھینک دئے ہیں۔ نگاہ اُٹھا کر اُس نے مینار کی اونچائی کی طرف دیکھا ہے۔ سب ننگ دھڑنگ بڑی سُرعت سے مینار پر اُوپر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

سر جھکا کر وہ نیچے بکھرے کپڑوں کو تک رہا ہے اور انگشت بدنداں سا سوچ رہا ہے کہ کیا کپڑے اُتار دینے سے جسم کے بوجھ میں اتنی کمی آجائے گی کہ اُوپر چڑھنے میں آسانی ہو۔۔۔!؟؟

رام ناتھ اسیر

غزل

جب سے بچھڑا ہوں اُس ستمگر سے
رات دن ہو گئے برابر سے

اجنبی شہر ہے، کہاں جائیں
گھر میں بیٹھے ہیں، اپنے بے گھر سے

دُشمنوں سے پناہ مانگی ہے
دوستوں کے خُلوص کے ڈر سے

اُس کو کیا دے دیا ہے قسمت نے؟
مجھ کو کیا مل گیا مقدّر سے؟

مُسکراہٹ رہی ہے چہرے پر
ہم سلگتے رہے ہیں اندر سے

کُل زمانے سے دُشمنی ہے اسیرؔ
دوستی اک حسین پیکر سے

ڈاکٹر محمد حنیف

تنقید کا معلم اوّل

ارسطو تنقید کا معلم اوّل ہے بھی اور نہیں بھی۔ عمومی طور سے ارسطو کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت زیادہ ہے کیونکہ اس کے تنقیدی خیالات، فن، فنون لطیفہ اور شاعری کی موافقت میں ہیں۔ لیکن تواریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے تنقید کا معلّم اوّل ارسطو نہیں بلکہ افلاطون ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ اس کے تنقیدی خیالات آرٹ یا شاعری کی مخالفت میں ہیں۔ اُسے برتری نہ ہو لیکن افلاطون کو تنقید کی دنیا میں اولیت کا حق حاصل ہے۔ درحقیقت افلاطون ہی تنقید کا معلّم اول اور محرک ہے۔ عالم تنقید افلاطون کا ممنون ہے کیونکہ ارسطو کے اچھوتے نادر تنقیدی خیالات افلاطون کے خیالات کے ردّعمل میں قلم بند کئے گئے ہیں۔ ارسطو نے اپنی پوری تنقید افلاطون کے اعتراضات کو اپنے ذہن میں رکھ کر جواباً لکھی ہے۔ افلاطون کے پہلے بھی کچھ تنقیدی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مثلاً ہومر اپنی شاعری لکھتے وقت اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی شعری تخلیق الہامی وجدان یا روحانی تاثیر سے عمل میں آتی ہے۔ اس خیال کی بازگشت بعد کی تنقید میں ملتی رہی۔ ARISTOPHANES کے Frogs میں ایک مباحثہ ہے۔ جہاں تنقیدی روشنی ملتی ہے۔ لیکن نمایاں اور قابلِ ذکر طور پر تنقید کا آغاز افلاطون ہی سے ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ افلاطون شاعری اور شاعر کا شدید مخالف بلکہ کٹر دشمن ہے اور اس کے تنقیدی خیالات سے عام قارئین متنفر اور خائف ہیں کیونکہ افلاطون اپنے Republic سے شاعر کو شہر بدر کر دینا چاہتا ہے اور اپنے اس خیال کی تائید میں افلاطون جو وضاحت یا تشریح پیش کرتا ہے وہ عجیب و غریب، ناقابل قبول، سطحی، غیر تنقیدی اور غیر منطقی ہے۔ افلاطون کی تنقید منفی اور تخریبی ہے اور یہ شاعری سے ایک کھلی ہوئی جنگ ہے۔ لیکن اس کی شدید مخالفت سے اس بات کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ افلاطون کو باطنی طور پر شاعر کی طاقت، سحر انگیزی اور اثر انگیزی کا بھر پور احساس اور اعتراف ضرور تھا، تب ہی تو اپنی آئیڈیل ریاست میں شاعر کی موجودگی اور قربت سے خوف کھاتا تھا۔

افلاطون نے Ion میں نظریۂ شاعری پیش کیا ہے لیکن یہ بات بھی بہت ہی مضحکہ خیز اور دلچسپ ہے کہ افلاطون نے شاعر کے خلاف جو دلیلیں دی ہیں وہ دراصل شاعری کی حمایت میں آجاتی ہیں اور اس کی

خوبیوں کو اجاگر کرتی ہیں ۔ افلاطون نے تکنیک کے مقصد
سے کچھ الفاظ کا استعمال کیا ہے جو درحقیقت شاعری
کی تحسین اور تعریف میں تبدیل ہو جاتے ہیں جیسے
افلاطون شاعر کے بارے میں لکھتا ہے ۔

'Not by art does the poet
sing but by power divine'

یعنی شاعر اپنی تخلیق استادی اور مکاری
کے سہارے نہیں کرتا بلکہ ایک روحانی تاثیر یا لطافت
یا الہامی وجدان کے نتیجہ میں کرتا ہے ۔ لیکن یہ بات شاعری
کی مخالفت میں نہیں بلکہ موافقت میں بنتی ہے ۔ افلاطون مزید
یہ بھی لکھتا ہے کہ شاعر کوئی نمایاں شعری کارکردگی نہیں
دکھاتا جب تک کہ وہ تاثر یا وجدان میں نہ ہو یا جب تک
اپنے ہوش وحواس کو نہ کھو بیٹھا ہو یا بالکل پاگل نہ ہو
چکا ہو ۔ افلاطون کی اس تنقید میں تضاد روز روشن کی
طرح عیاں ہے ۔ ظاہر بات ہے کہ شاعر جب تخلیق کرتا
ہے تو اپنے ہوش وحواس میں رہ کر ہی کر سکتا ہے ۔ اگر
شاعر اپنے ہوش وحواس میں نہ رہے تو وہ کوئی تخلیق
نہیں کرسکتا ۔

افلاطون آگے لکھتا ہے کہ شاعر جانکاری یا
واقفیت سے نہیں بلکہ الہام یا وجدان سے شعری تخلیق
کرتا ہے اس لئے بحیثیت مخبر یا معلم قابل اعتماد
نہیں ہو سکتا ۔

افلاطون کی رائے یا تنقید منفی یا غلط ہی سہی لیکن
یہ کچھ نہ کچھ منزلِ تنقید کی طرف نشانِ راہ ضرور بناتی ہے ۔
اس کی تنقید سائنس داں کے اس Experiment
کی طرح ہے ۔ جو خود کامیاب انکشاف یا ایجاد تک نہ پہنچا
ہو ۔ لیکن دوسروں کی کامیابی کے لئے سبب یا بنیاد بن
جاتا ہے ۔ افلاطون کی تنقیدی رایوں میں تشنگی، تضاد،
جھول، سطحیت اور تنگ نظری ہے ۔ افلاطون کے غلط
طریقۂ فکر سے دوسروں کو اس سے بچنے کی تلقین ملتی
ہے ۔ افلاطون نے ادب، تنقید اور دوسرے علوم کے
درمیان بنیادی فرق کو نہ سمجھا تھا ورنہ وہ شاعر کے
معلم ہونے پر مصر نہ ہوتا اور اس بات کا رونا نہ روتا کہ
شاعر اخلاقیات نہیں سکھاتا یا کسی اُپدیشک کی طرح
اُپدیش نہیں دیتا اور لوگوں کو اچھا شہری نہیں بناتا ۔
افلاطون کا ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ شعری تخلیق
حقیقت سے دو درجہ دور ہوتی ہے ۔ کیونکہ شاعر نقلی
چیزوں کی نقل یا تقلید کرتا ہے ۔ بقول افلاطون اصلی
یا ابدی حقیقت مادی اشیاء میں نہیں رہتی بلکہ
اشیاء کی اصل عالمِ مثال میں موجود ہے ۔ جس کی
ناقص نقلیں اس دنیا میں موجود ہیں اور افلاطون
کے خیال میں شاعر انہیں نقلوں کی نقل کرتا رہتا ہے ۔
لہٰذا افلاطون لکھتا ہے :

The poet's art is an inferior
who marries an inferior and
has an inferior offspring."

اور وہ مزید یہ کہتا ہے کہ شاعر دروغ گو ہے وہ
وہ ایسی تصویریں اور ایسی حکایتیں پیش کرتا ہے ۔
جس سے عام Morale میں پستی یا گراوٹ
آتی ہے ۔ جیسے وہ مجسٹریٹ کو رشوت لیتے دکھاتا ہے
اور ہیرو اور مجاہدوں کو میدان کارزار سے دُم دبا کر
بھاگتے ہوئے پیش کرتا ہے ۔ افلاطون کے مطابق اس
طرح کی تصویروں سے جوش، ہمت اور مردانگی کی نفی
ہوتی ہے ۔ اب افلاطون کو کون سمجھائے کہ شاعر یا فنکار
اتنا باہمت اور حقیقت پسند ہوتا ہے کہ وہ حقیقت

خواہ کیسی ہی ہو۔ بھدی، خوبصورت، ملیح یا شیریں۔ اس سے چشم پوشی نہیں کرتا ہے۔ کسی مجسٹریٹ کو رشوت لیتے یا کسی سپہ سالار کو میدان جنگ سے فرار ہوتے دیکھتا ہے تو وہ اس واقعہ، تجربہ یا سانحہ کو ضرور بالضرور پیش کرتا ہے خواہ یہ افلاطون جیسے تنگ نظر پارساؤں کے لئے یہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو یہ تو اور قابل تعریف بات ہے کہ شاعر یا فن کار کھری حقیقت پر جھوٹے آئیڈیل کا ملمع نہیں چڑھاتا اور مجرم اور سیہ کار کو مجرم ہی پیش کرتا ہے نہ کہ اسے معصوم اور فرشتہ صفت۔

شاعری کے سلسلے میں افلاطون کا ایک دوسرا سخت اعتراض یہ ہے کہ شاعری ایسے جذبات کی ہمت افزائی یا آبیاری کرتی ہے جن کا خشک ہو جانا یا ماند پڑ جانا ہی بہتر ہے، اگر انسان مسرت اور نیکی میں اضافہ کا خواہاں ہے۔ اس طرح ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ افلاطون شاعری یا ادب کو تنگ نظر، دقیانوس، رجعت پسند پارسا کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی بھرپور زندگی، مہک، سحر آگیں پیچیدگی کو محسوس کرنے اور سمجھنے سے قاصر ہے اور شاعری پر ایسی ضرب کاری لگاتا ہے جو بجا نہیں ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے افلاطون تنقید کا معلم اول ضرور ہے لیکن حقیقی طور پر تنقید کا معلم اول ارسطو ہے نہ کہ افلاطون یا کوئی دوسرا۔

افلاطون کا نظریۂ شاعری منفی، ناقابلِ قبول اور قابلِ نفرت ہے اس لئے کہ اس سے آمرانہ (Dictatorial) یا فسطائی نظامِ حکومت کی بو آتی ہے۔ افلاطون کے لئے کچھ گیت اور اشعار کچھ خاص شرائط کے ساتھ قابلِ قبول ہیں۔ اگر یہ سپہ سالار اور فوجیوں کو بڑھاوا اور انھیں پُر جوش اور باعمل رکھنے کے مقصد سے سرکاری طور پر تسلیم شدہ معتبر اور معترف اشخاص کے ذریعہ لکھے گئے ہوں اور جنھوں نے اپنی زندگی میں کچھ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں۔ اور جن کی نجی زندگی پاک صاف اور زاہدانہ اور مثالی رہی ہو۔ بلا سے ان میں فنی یا شاعرانہ صلاحیتوں کا فقدان ہو۔ اس طرح ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ افلاطون نے شاعری کی بحث یا اس کی تنقید صرف موضوع کے نقطۂ نظر سے یا صرف موضوع کی بنیاد پر کی ہے۔ فنی نقطۂ نظر، جمالیاتی نقطۂ نظر یا شعر کی نغمگی یا موسیقیت سے افلاطون کو دور کا بھی واسطہ نظر نہیں آتا یا وہ ان پہلوؤں سے نابلد، ناواقف اور کورا ہے۔

اس لئے صحیح طور پر دنیائے ادب میں سب سے پہلے ارسطو ہی تنقید کا معلم یا راہبر ہے۔ اس کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ پہلے سے تعمیر شدہ قیاس خیال یا کسی تعصب یا جانبداری کی عینک پہن کر تنقید نہیں کرتا۔ وہ افلاطون کی طرح تنگ نظر نہیں بلکہ وسیع القلب اور وسیع النظر ہے۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ شاعر فطری طور پر انسان اور کائنات کی چیزوں کی نقل اتارتا (Imitate) ہے یا انھیں اپنی شعری تخلیق میں پیش کرتا ہے یا ان کی تصویریں بناتا ہے اور وہ ان کی پیش کش اور تشکیل میں بے پناہ لذت اور مسرت محسوس کرتا ہے اس طرح ارسطو کا نظریہ شاعری افلاطون کے نظریہ سے مختلف ہے کیونکہ یہ اس بات پر زور نہیں دیتا کہ شاعری بھونڈے طور پر پند و نصیحت، اخلاقیات اور پارسائی کی پرچارک ہے۔ افلاطون کا ایک سخت اعتراض یہ ہے کہ شاعری قارئین کو زیادہ جذباتی اور کم ہوش بناتی ہے۔ اس کے مطابق شاعر جذباتیت، وجدان، الہام یا غیبی فیضان

سے زیادہ مخمور اور مسحور ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی گرفت حقیقت پر نہیں ہو پاتی کیونکہ حقیقت کا ادراک جوش و جذبہ یا تاثر سے نہیں ہو سکتا۔ افلاطون کے اس اعتراض کا بہت ہی معقول جواب ارسطو نے ٹریجڈی کی تعریف کے سلسلہ میں دیا ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ ٹریجڈی رحم و خوف کا طریقہ کار استعمال کرکے ناظرین اور قارئین کے آلودہ، خود غرض، پست ذلیل ذہنیت اور جذبات کو پاک و صاف (Purge) منور تشفات، اعلیٰ، ارفع اور زیادہ انسانی بناتی ہے۔ اس طرح شاعری انسان کے غلط، ہوس پذیر جذبات کی آبیاری نہیں کرتی بلکہ ان کی صفائی کرتی ہے اور جذباتیت پر کنٹرول لاکر انھیں متوازن اور قابلِ قبول بناتی ہے اور اپنے لحن و آہنگ کے ذریعہ انھیں دل خوش کن کرتی ہے افلاطون کے بموجب شاعری سے پیدا شدہ مسرّت بانغمگی سماجی اور اخلاقی طور پر ضرر رساں یا خطرناک ہے لیکن ارسطو کے مطابق یہ مزید صحت یابی اور توازن اور انبساط کا ذریعہ ہے۔

ارسطو نے افلاطون کی طرح صرف موضوع پر زور نہیں دیا ہے بلکہ آرٹ کے فنی، ہیئتی اور تشکیلی پہلوؤں کی بھرپور روشنی ڈال کر انھیں قابلِ توجہ بنایا ہے۔ ارسطو کے مطابق کسی ٹریجڈی میں ابتداء، عروج اور انتہا ہوتے ہیں۔ اس کی ایک ترتیب، تشکیل اور خارجی تزئین ہوتی ہے۔ ارسطو کا یہ نکتہ دنیا ئے تنقید میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ارسطو کا قول ہے کہ تواریخ کسی گزرے واقعہ کو ریکارڈ کرتی ہے اور شاعری ایسے واقعات کو پیش کرتی ہے جو ممکنات میں ہیں۔ افلاطون نے شاعروں پر دروغ گوئی اور بے بنیاد قلعہ بندی کا الزام لگایا ہے، جس کی کاٹ ارسطو نے بہت ہی یقین آور طور پر کی ہے۔ شاعری اور تواریخ میں فرق بتاتے ہوئے ارسطو نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ شاعر اول تو کسی LITERAL حقیقت کی پیش کش پر قناعت نہیں کرتا بلکہ وہ ایسے ممکن واقعہ کا حال بیان کرتا ہے جو زیادہ قرینِ صحت یا قرینِ حقیقت ہے بہ نسبت اس غیر یقین آور یا ناقابلِ یقین عدم امکان سے جو عام طور سے ہمیں تواریخ کے اوراق میں ملتے ہیں ——— ارسطو لکھتا ہے:

" Poetry therefore is more universal and a higher thing than history for poetry tends to express the universal, history the particular---------- Historian writes of what has already happened, the poet writes of what could happen."

اس طرح ارسطو مورخ اور شاعر کے درمیان نمایاں فرق پر روشنی ڈالتا ہے اور شاعر کی افضلیت کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

It is not the function of the poet to relate what has happened, but what may happen--- what is possible according to the law of probability or necessity. Thus it is that in poetry a probable impossibility is more acceptable than an incredible impossibility."

بجا، بصیرت افروز، قابلِ قبول اور مثبت

(بقیہ صفحہ ۳۳ پر)

سیّدہ شانِ معراج

غزل

ماضی کے جلتے بُجھتے چراغوں کے سلسلے
دل میں ہیں داغ داغ اُجالوں کے سلسلے

ہیں پیاس کے ندیم سفر کے شریک ہیں
صحرا میں ساتھ چلتے سرابوں کے سلسلے

جوڑے میں قید ہو تو گیا اُنگلیوں کا لمس
رُخصت مگر ہوئے وہ گلابوں کے سلسلے

مجھ کو مری نظر کے زیاں کا حساب دیں
بے رنگ و نور و آب نظاروں کے سلسلے

یادوں کا دشت برف کے خیموں میں چھپ گیا
روشن کہیں کہیں ہیں چناروں کے سلسلے

رضا امروہوی

غزل

مجھ سے کہتے ہیں کہ آ تجھ کو کھلونے دیں گے
کیا یہ ممکن ہے خریدار بھی ہونے دیں گے

اب سرِ عام یہ داغوں کی نمائش کیوں ہے
یوں ہی کہتے تھے کہ داغوں کو نہ دھونے دیں گے

برف کے ٹکڑوں میں لپٹا ہوا صندل سا بدن
دیوتا کیا اِسے خوشبو کے کھلونے دیں گے

شیش محلوں کی فصیلوں سے اُجالا کر دو
وقت کے مارے اندھیرا نہیں ہونے دیں گے

اُن کی زلفوں کے پریشاں سے مہکتے سائے
کون جانے کہ رضاؔ چین سے سونے دیں گے

آر۔ڈی۔شرما۔تاثیر

رِشتہ

رات کے دس بج چکے تھے۔ گھر کے باقی سبھی افراد بتیاں بجھا کر اپنی چارپائیوں پر جا لیٹے تھے نیند کی آغوش میں عارضی سکون کی تلاش میں لیکن لالہ دھنپت رائے، اس چھوٹے سے کُنبے کے سربراہ اب بھی مکان کے اندر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے بے حد مُضطرب و مایوس!! دِن کے واقعات نے اُن پر شدید اثر کیا تھا وہ بے انتہا پریشان تھے بلکہ اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا وُہ سوچ رہے تھے:

"لڑکی کے باپ کی بھی کوئی زندگی ہے، یہ تو وہی مُعاملہ ہے کہ چھُری خربوزے پر پڑے یا خربوزہ چھُری پر نتیجہ ایک ہی ہے۔ وہ بے حد رنجیدہ ہو گئے اُن کا دل بھر آیا اور وہ کہہ اُٹھے: "اُف! ہمارے سماج کا ڈھانچہ کیسی غلط اقدار پر مبنی ہے لڑکیاں، ماں باپ بھائی بہنوں کی بے لوث اور لگاتار خدمت کرتی ہیں لیکن سُسرال والوں کو اُن کے جذبات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہوتی لڑکی کے باپ کے ساتھ اِس طرح کا سُلوک کیا جاتا ہے جیسے اُس نے کوئی گُناہِ کبیرہ کیا ہو"

آج چوتھی بار سُشما کو دیکھنے کے لئے کچھ لوگ آئے تھے کئی دن سے لالہ جی اسی دوڑ دھوپ میں لگے رہے تھے کہ کسی طرح یہ رشتہ طے پا جائے اور اس بار اُنھیں یقین بھی تھا۔ لڑکے کی شکل وصُورت بس گوارا سی تھی تعلیم کے معاملہ میں وہ سُشما سے بہت پیچھے تھا اور اُس کی نوکری بھی معمولی سی تھی اُس کے والد کی حیثیت بھی اُن کے برابر کی ہی تھی سوائے اس کے اُنھوں نے بھگوان کی کرپا سے ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کروا لی تھی "بھگوان کی کرپا" کا قصّہ بھی خوب تھا۔ اور لڑکے کے والد نے اس کا ذکر کتنے طمطراق سے کیا تھا بغیر کسی جھجک کے مکمل ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ اُنھوں نے یوں بات کی تھی جیسے یہ اُن کی زندگی کا کوئی نہایت شاندار کارنامہ ہو۔ اُن حضرات کے الفاظ اب بھی اُن کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"لالہ جی! آپ سے کیا چھُپانا ہے تنخواہ میں تو مُشکل سے گذارہ ہوتا رہا ہے" بھگوان کی کرپا سے مجھے دس سال پہلے ایک بڑے ڈیم پر نوکری کا سُنہرہ موقع ہاتھ لگ گیا اور میں نے بھی چار پیسے کما لئے اور آپ کی دُعا سے یہ کوٹھی تعمیر کروائی ہے جس کا ماہانہ کرایہ مبلغ -/۱۲۰ روپیہ مل رہا ہے۔ کرایہ مناسب تو نہیں کوٹھی

پھر بھی دو ڈھائی لاکھ سے کم نہیں لگے۔ خیر!!"

لالہ دھنپت رائے جانتے تھے کہ وہ اشارتاً انھیں یہ ذہن نشین کروانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ لکھ پتی ہیں اور ایسی کے شایانِ شان سلوک کی توقع رکھتے ہیں اور اس کے بعد انھوں نے جو بھی باتیں کیں وہ دل شکن حد تک گھٹیا یعنی عامیانہ۔ انھوں نے ڈھنگ سے جہیز کے بارے میں اپنے ارادے، بھی بے نقاب کر دیئے تھے لالہ جی اور اُن کے پریوار کے لوگ دم بخود سنتے رہے تھے حواس باختہ لاجواب سے جب وہ لوگ رخصت ہوئے تو لالہ جی نے التجا بھرے لہجے اور لڑکھڑاتی زبان میں پوچھا۔

"بھائی صاحب! ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

اُن صاحب کے جواب سے اُن کا دل ٹوٹ گیا وہی ہوا جو پہلے تین بار ہو چکا تھا وہی جواب۔ "ہم لوگ سوچ کر بتائیں گے"، لیکن ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں تھا کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہیں تھا۔

چوتھی بار ایسا ہو رہا تھا۔ بلاوجہ اخراجات کے علاوہ اُن کی معصوم سی بیٹی کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ جتنے بھی لڑکے انھوں نے دیکھے تھے۔ جن میں سے کسی کے ساتھ بھی وہ ششما کا رشتہ طے کر دیتے اگر دوسری طرف سے رضامندی ظاہر کی جاتی اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو کسی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہو بلکہ اگر انصاف اور غیر جانبداری سے فیصلہ کیا جاتا تو اُن میں سے کوئی بھی لڑکا ششما کے قابل نہ تھا اور یہی بات اُنھیں سب سے زیادہ دُکھ دے رہی تھی ایک ناقابلِ بیان ذہنی اذیت۔ ششما میں کونسی خوبی نہ تھی۔ بے حد جاذبِ النظر خدوخال اور پھر اُس کی سیرت!! پرماتما گواہ ہے اس لڑکی نے آج تک اپنے ماں باپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ اُن کے بس میں ہوتا اس بچی کو اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے سے بچھڑنے ہی نہ دیتے لیکن وہ تو اُسے گھر سے نکالنے پر تا دلے ہو رہے تھے۔ وہ بھی سچے تھے۔ لڑکی کی عمر ۲۷ کے لگ بھگ تھی۔ اُس نے ڈبل ایم اے کیا تھا صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر۔ لیکن اب اُسے قبول والا کوئی نہ تھا اُن کا کارن بھی وہ جانتے تھے اُس کا کارن وہ خود ہی تو تھے ایک کلرک کی اوقات لوگ جانتے ہیں، آج لوگ لڑکی کی شخصیت یا اُس کے اوصاف کی بنا پر فیصلے نہیں کرتے بلکہ اس کے باپ کی مالی پوزیشن فیصلہ کن ہوتی ہے شادی میں کتنا جہیز دینے کی توفیق رکھتا ہے یہ ہے لوگوں کا لڑکی کو پرکھنے کا پیمانہ یا کسوٹی وہ چار بار اسی وجہ سے ناکام ہو گئے تھے۔

اس طرح سوچتے سوچتے وہ چارپائی پر جا لیٹے لیکن نیند اُن کے نصیب میں کہاں وہ سوچتے رہے۔ پچھلے پندرہ برس میں مملک میں کتنی حیرت انگیز ترقی ہوئی ہمارے دیش کا شمار دُنیا کے دس بڑے بڑے صنعتی ممالک میں ہوتا ہے زراعتی انقلاب نے دیہات کی کایا کلپ کر کے رکھ دی ہے سارے ملک میں نہروں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا آپ کسی بڑے شہر میں چلے جائیں بے شمار نئی بستیاں جن کا کچھ عرصہ پہلے وجود نہ تھا دکھائی دیں گی اور ان بستیوں میں قطار اندر قطار عالی شان کوٹھیوں کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں جیسے مالکان میں ایک دوسرے پہ بازی لے جانے کا مقابلہ ہو لیکن اس دور میں ملک کی اخلاقی ترقی بھی ہوئی؟ سماج کے بوسیدہ رسم و رواج میں کبھی کوئی تبدیلی آئی ہے؟ لالہ جی کے مطابق اس کا جواب نفی میں تھا بلکہ اس معاملے میں ہم تنزل کا شکار

ہوئے ہیں اُن کا ذاتی تجربہ شاہد ہے۔

اُنھیں اپنی بڑی لڑکی کی سگائی کا منظر یاد آیا لڑکی نے دسویں پاس کیا تھا۔ سترہ برس کی عمر میں۔ اُن کے ایک دوست نے لالہ گوردھن داس کے لڑکے سے رشتہ کی تجویز رکھی وہ لالہ جی سے ملنے گئے اُن کے بات کرنے کی دیر تھی کہ لالہ جی خوشی سے جھوم اُٹھے۔ انھوں نے لالہ دھنپت رائے کو گلے لگا لیا۔

"یہ رشتے بھگوان کی رضا سے طے ہوتے ہیں بھائی صاحب ہم لوگ تو محض ایک وسیلہ ہیں آپ میرے گھر آئے میرے دھنیہ بھاگ"

اور آج تک کبھی بھی لالہ گوردھن یا اُن کے خاندان کے کسی فرد نے اُن سے کسی بات کا تقاضا نہیں کیا اور جہیز کے بارے میں لالہ گوردھن داس کے وہ یادگار الفاظ، زریں خیالات!!

"بھائی صاحب جس نے بیٹی دے دی اُس نے پیچھے کیا رکھا۔"

آج اس طرح کے خیالات ناپید ہوگئے ہیں اور لالہ گوردھن داس جیسے لوگ کسی قصّہ یا رینہ کے کردار۔ آج تو لوگ بیانگِ دہل اپنی مانگیں اور مطالبات پیش کرتے ہیں۔ اور اس چکی میں لڑکیاں پس رہی ہیں وہی لڑکیاں بے چاری بے زبان بے بس، جن کے بارے میں یہ عالمگیر رائے ہے کہ اُن سے بڑھ کر ماں باپ کا خیر خواہ کوئی نہیں۔

لالہ جی اس طرح کے خیالات کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے اور وقت جو کسی کا انتظار نہیں کرتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک اور بات پھر لالہ جی کے ذہن میں سوئیاں چبھو رہی تھیں۔ وہ آج اپنے اکلوتے بیٹے نریش پر بلاوجہ برس پڑے تھے وہ جانتے تھے کہ یہ چڑچڑاپن اور بات بات پر آپے سے باہر ہوجانا اُن کی عادت بنتی جارہی تھی ستم بالائے ستم، اس غصّے اور چڑچڑے پن کا شکار اُن کے بچے ہو رہے تھے۔ بے قصور بچے۔ باہر تو وہ خیر سے اب بھی ایک انتہائی حلیم اور خوش طبع انسان تھے۔ باہر کسی بھی بے انصافی یا ظلم کے خلاف اُن کی زبان نہیں کھلتی تھی لیکن گھر آکر شاید کسی نفسیاتی ضرورت سے مجبور اُن کے ضبط کا بند موقع بے موقع ٹوٹ جاتا تھا! اکثر بے موقع!! اور جب وہ ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا شدید احساس جس سے اُن کی ذہنی کوفت میں بے اندازہ اضافہ ہوجاتا وہ اپنے آپ کو کوستے لیکن پھر دو چار روز بعد وہی چکر۔ اُف!

آج ہی کو لیجیے۔ وہ لوگ رخصت ہوگئے رشتے کے بارے میں کام نہیں بنا تھا۔ سب لوگ چپ چاپ تھے شکست خوردہ سے۔ تبھی نریش نے کہہ دیا تھا۔

"پتاجی! معاف کرنا۔ آپ نے کوشش کرکے دیکھ لی ایک بار نہیں چار بار یہ دیکھنے دکھانے کا چکر چلا آپ ناکام رہے۔ کم سے کم مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ آج والا رشتہ سرے نہیں چڑھا بلکہ میں تو دعا کر رہا تھا کہ وہ لوگ کہیں ہاں نہ کہہ دیں۔ ششما کے قابل تھا وہ لڑکا؟ ہرگز نہیں۔ اب آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں اپنے بچوں پر اعتماد کرنا سیکھیں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ششما میری بہن ہے اُس کی شادی کی فکر آپ مجھ پر چھوڑ دیں میری بہن کوئی لولی لنگڑی تو نہیں۔۔۔۔"

بس ان الفاظ سے لالہ جی کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا:

"بہت خوب! میں سشما کی شادی کی فکر چھوڑ دوں۔ برخوردار کہیں سے خود ہی اپنی لاڈلی بہن کے لئے کوئی راجکمار ڈھونڈ لائے گا۔ میں نہ جانتا تھا کہ تمہیں بھی زمانے کی ہوا لگ چکی ہے اسی بے راہروی نے تو بیڑا غرق کیا ہے لڑکے لڑکیوں کو اعتماد میں لینے کے چکر سے ہی تو یہ سب پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں"

اور اسی طرح نہ جانے کیا کچھ کہہ گئے تھے اور اب رات کے دو بجے اپنی چارپائی پر پچھتاوے کی کروٹیں لیتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

نریش نے آخر غلط بات بھی کونسی کہی تھی اور پھر مجھے ڈھنگ سے بولنا چاہیئے تھا مجھ سے حسب معمول غلطی ہوئی۔ انھیں یاد آیا کہ نریش جب بات کر رہا تھا تو اس کے چہرے پر مکمل خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ ایک اندرونی یقین کی چمک تھی نریش کے بارے میں لوگ مجھے مبارکباد دیتے ہیں اور میں۔۔۔۔ شاید اس کی نظر میں کوئی لڑکا ہو اگر ایسا ہوا تو اس نے اپنی ماں سے ضرور ذکر کیا ہوگا خیر صبح دیکھا جائے گا انھوں نے جھجکتے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھا ساڑھے چار بج چکے تھے صبح کے۔ ان کے جسم کا انگ انگ درد کر رہا تھا وہ اٹھے اور باہر برآمدے میں ٹہلنے لگے ابھی جھٹپٹا تھا گھنٹہ پون گھنٹہ بعد سورج کی روشنی افق پر نمایاں ہوگی وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے کہ اس کمرے میں بتی جلی جس میں اس کی اہلیہ اور سشما سوتی تھیں اور پھر ایک گفتگو کے الفاظ ان کے کانوں سے ٹکرائے انھوں نے کمرے کی کھڑکی سے کان لگا دیئے نریش اور اس کی ماتا جی محو گفتگو تھیں موضوع وہی تھا جس نے گھر بھر کو ذہنی اذیت کی سولی پر ٹانگ رکھا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کا اس بات چیت میں قطعاً کوئی دخل نہیں تھا جس کے متعلق یہ سب بات چیت ہو رہی تھی۔ سناٹے کی وجہ سے سرگوشیوں میں ہو رہی گفتگو بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ماتا جی! آپ مان جایئے آپ کی ضد کی وجہ سے ہمیں کل ذلیل و خوار ہونا پڑا۔ پتا جی آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔ میں نے ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی تمہیں ہریش کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن آپ لوگوں نے ایک نہیں سنی خیر جو ہوا سو ہوا۔ کیا خرابی ہے اس لڑکے میں وہ میرا دوست ہے برسر روزگار ہے، جہیز میں ایک کوڑی لینے کا طلب گار نہیں اور ہریش و سشما ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔"

آخری فقرے پر ماں خفا ہو گئیں لیکن پھر سنبھلیں اپنے بیٹے کی مکمل صدق دلی نے ان کا دل جیت لیا اور انھوں نے کہا۔

"بیٹے! میں مانتی ہوں وہ لڑکا ہیرا ہے۔ لیکن بیٹے میں مان بھی جاؤں تو تمہارے والد کہاں مانیں گے اس کی ذات؟ ہم لوگ برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے خیر اگر تمہارے پتا جی مان جائیں تو میرا کیا ہے۔ میری ہاں ہی سمجھو لڑکے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ یہ جوڑی تو ایک آدرش جوڑی ہوگی۔ ہے بھگوان! تو ہی کوئی راستہ دکھا!!

لالہ دھنپت رائے کے لیئے یہی کافی تھا۔ وہ بغیر آواز کیئے اپنے کمرے میں لوٹ گئے سارے

معاملہ پر غور کیا تمام تر تعصبات سے اُوپر اُٹھ کر معاملہ پر غور کیا بات سمجھ میں آ گئی جی میں آیا کہ ابھی جا کے نریش اور اُس کی ماتا جی سے کہہ دیں۔

"میں نے تمہاری اور نریش کی باتیں سُن لی ہیں مجھے ہریش اور سُشما کا رشتہ منظور ہے پُوری طرح منظور ہے۔ نریش! کاش تم نے کل صبح بات کی ہوتی تو میں اُن نئے رئیسوں سے یہ تو کہہ سکتا ایک چپت تو اُن کے چہرے پر رسید کر سکتا اُنھیں یہ تو بتا سکتا کہ اُن کا لڑکا ہماری بیٹی کے قابل نہیں"

لیکن انھوں نے اپنے پر ضبط رکھا جلد بازی سے وہ ہمیشہ خائف رہے تھے عمر بھر!!

باہر سُورج کی کرنیں ماحول میں سونا بکھیر رہی تھیں لالہ جی اپنی چھڑی اُٹھا کر حسبِ معمول صبح کی سیر پر روانہ ہو گئے آج اُن کی چال میں ایک عجیب سا ہلکاپن تھا وہ معمول سے کہیں تیز چل رہے تھے اپنے ہم عمر ساتھیوں سے ساتھی آگے آگے جیسے ان بوڑھے بوسیدہ خیالات کے لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے خواہاں ہوں۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ گھر واپس پہنچے غالباً غیر متوقع طور پر شاید وہ کچھ جلدی لوٹ آئے تھے خیر انھوں نے ہریش سُشما اور نریش کو ایک ہی کمرے میں اکٹھے دیکھ لیا تھا ہزار کوشش کے باوجود راز راز نہ رہا کہ سُشما چند لمحے پہلے اُسی کمرے میں موجود تھی جہاں سے صرف اس لئے بھاگ گئی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کے قدموں کی آہٹ سُن لی تھی۔

بہت خوب!! یہ سازشیں یہ منصوبہ بندیاں!! اپنے ہی ماں باپ سے یہ دھوکہ بازی اور اچانک لالہ جی کو پہلے تمام رشتوں کے بگڑنے کا راز سمجھ میں آ گیا۔ ہماری لڑکی ہی اس قابل نہ تھی اس کے من میں تو کچھ اور ہی تھا خیر۔ وہ اُبل پڑے۔ وہ ہریش سے مخاطب تھے۔

" دیکھو برخوردار! آج کے بعد اس گھر میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔ میں ابھی زندہ ہوں اس گھر کا مالک ہوں۔ میرے جیتے جی اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔ سمجھے!!"

چاروں طرف سناٹا تھا سبھی لاجواب تھے۔ یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر کہ کس سے کہاں بھول ہوئی۔ سُشما کی حالت عجیب تھی جس کے لئے نہ زمین پر کہیں ٹھکانہ تھا اور نہ آسمان پر وہ ہمیشہ کی طرح چپ چاپ بے بس و لاچار اپنے بسنے اور اُجڑنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ دیکھے جا رہی تھی سالہا سال سے! صدیوں سے!!

●

دُوسرا سرورق : کرن جھیل — کرنال
تیسرا سرورق : تلیر سیاحی مرکز — روہتک
چوتھا سرورق : بھگوان کپل کی مورتی — کلایت

ص ۲۷ سے آگے

تنقید، سب سے پہلے ارسطو کے یہاں ہی نظر آتی ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ارسطو ہی تنقید کا معلم اوّل ہے●

ڈاکٹر کے۔ رِشیؔ

پیاس کیا بجھاؤ گے آس کی چھبیلوں سے
دِل بہل نہیں سکتے کھوکھلی دلیلوں سے

عشق چھُپ گیا ہے کیوں بے کسی کی غاروں میں
حُسن کب بری ہوگا آہنی فصیلوں سے

سچ کی جیت ہونی ہے سچ کی جیت لازم ہے
بحث گو نہیں ممکن جھوٹ کے وکیلوں سے

دائمی رفاقت کو زندگی میں اپناؤ
دِن گزر نہیں سکتے عارضی وسیلوں سے

اے رِشیؔ تدبّر سے قسمتیں بدلتی ہیں
اُلجھنیں سُلجھتی ہیں اے ندیم حیلوں سے

صادقؔ گیاوی

لہُو لہُو ہر منظر لکھ
گھر کے اندر باہر لکھ
لفظوں کی دیوار اُٹھا
نغموں کا پس منظر لکھ
کہنا میرا مان بھی لے
آئینے کو پتھر لکھ
چلتے پھرتے سائے کو
خوابوں کا سوداگر لکھ
چہرے سے لپٹی ہے کیوں
مایوسی کی چادر لکھ
گھر آنگن کے باہر آ
دھوپ ہے کس کے سر پر لکھ
بچے تالی پیٹیں گے
باتیں سوچ سمجھ کر لکھ
دنیا سے کیوں ڈرتا ہے
جو ہے اندر باہر لکھ
صادقؔ اپنی قسمت ہے
تنہائی کا بستر لکھ

عفت موہانی

عورت — علامہ اقبال کی نظر میں

یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی قوم کی ترقی یا تنزلی کا صنفِ نازک سے گہرا اور ناگزیر تعلق رہا ہے۔ عورت ملک اور قوم پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ بات بھی محتاجِ بیان نہیں کہ ہمارے معاشرے میں اس کا کیا مقام ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کی ہستی معاشرے میں یکساں اہمیت کی حامل نہیں رہی۔ کبھی عورت کو انتہائی بلند درجہ ملا۔ اور کبھی اس قدر پست کہ بڑے بڑے مفکرین یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آیا عورت انسان بھی ہے؟ ایام جاہلیت میں عورت کا جو مقام تھا آج اس پر غور کرنے سے عقل انسانی کانپ جاتی ہے۔

لیکن رفتہ رفتہ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ عورت کو اس کا صحیح مقام ملا۔ آج وہ ہر میدان میں بہ اصطلاح عام و بزعم خود ترقی کر رہی ہے۔ نہ صرف اس کی حیثیت جداگانہ رہی بلکہ ہر شاعر، فلسفی، مفکر اور حکیم نے اس کے متعلق تمدن کے مختلف مدارج میں مختلف رائے دی۔

علامہ اقبال نے بھی صنفِ نازک کے لئے انتہائی بصیرت افروز نفسیاتی کلام چھوڑا ہے۔ اقبال ایک فلسفی اور شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ حکیم بھی تھے۔ اس وقت مسلمان جب کسی مطمحِ نظر کے بغیر سیاست کے بیکراں میدان میں بھٹک رہے تھے اقبال نے ان کے سامنے ایک جادۂ مستقیم پیش کیا۔ انھوں نے شوکتِ ماضی کی زبوں حالی پر ماتم ہی نہیں کیا بلکہ مستقبل کے لئے ایک عظیم اور قابلِ تقلید لائحۂ عمل بھی پیش کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا پیغام ایک ایسے مکمل منشور کا حامل ہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے سے کامیابی یقینی ہے۔

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
ز سودایم متاعِ او گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت
ز آواز درایم کارواں شد

اقبال نے اس حقیقت کو پوری طرح ثابت کیا ہے کہ زندگی میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا تعاون لازمی اور ضروری ہے۔ ان کے اشتراک کے بغیر تنظیم عالم مکمل نہیں ہو سکتی ان دونوں کی یکساں اہمیت کو وہ یوں واضح کرتے ہیں۔

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند
کائنات شوق را صورت گر اند

جہاں انھوں نے مرد کے لئے بیش بہا پیغامات

ہے۔ وہاں عورت کو بھی فراموش نہیں کیا۔ جابجا
عورت کی عظمت کی صراحت کی ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں

اقبال کے قلم سے عورت کے لئے پاکیزہ خیالات اور مقدس جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ عورت کا لفظ اتنے عمدہ الفاظ میں اور اس کے بارے میں اس قدر ہمدردانہ خیالات اور احساسات اقبال کے سوا کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملیں گے۔ کئی مقامات پر عورت کی اہمیت کو مختلف پیرایوں میں اقبال نے واضح کیا ہے۔ خاص کر ان کے فارسی اشعار ان خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ اپنی مثنوی "رموزِ بےخودی" کے آخر میں انھوں نے عورت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

نغمہ خیزد از زخمۂ زن سازِ مرد
از نیازِ او دوبالا نازِ مرد
پوششِ عریانیِ مرداں زن است
حسنِ دلجو عشق را پیراہن است
عشقِ حق پروردۂ آغوشِ او
ایں نوا از زخمۂ خاموشِ او
آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکرِ او فرمود با طیب و صلوات

اور آگے چل کر فرماتے ہیں۔

شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است
سیرتِ اقوام را صورتگر است
از امومت پختہ تر تعمیرِ ما
در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

ان اشعار میں انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ مرد ایک ساز ہے جو عورت کے مضراب سے بیدار ہوتا ہے۔ اور کہا ہے کہ عورت ہی وہ پاکیزہ ہستی ہے جو عشقِ حقیقی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو عورت خدا کی رحمت ہے۔ اس کی محبت و شفقت پیغمبرانہ رحمت وراثت ہے۔ اس پر قوم کی تشکیل و تعمیر کا دارومدار ہے۔ مثنوی کے اختتام پر اقبال عورت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیری چادر ہماری عزت کی محافظ اور تیرا ہی شعلہ ہمارے فانوس کی روح رواں، تیری پاک طینتی ہمارے لئے رحمت اور تیرا ہی وجود ہمارے لئے دین اور سیاست کی بنیادیں مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔

کسی قوم کی تہذیب و تمدن صحیح معنوں میں اس وقت تک ترقی سے روشناس نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس قوم کی خواتین بیدار مغز، جانفشاں اور تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ قوم کی ترقی کا دارومدار دولت پر نہیں بلکہ حق گو، صداقت شعار، اور دلیر نوجوانوں پر ہوتا ہے جو ایک دانشمند اور تعلیم یافتہ عورت کی آغوش میں پل کر مرد بنتے ہیں۔ اقبال کو عورت کی قوت و ندرت پر اعتماد ہے۔ وہ اس کی اُن طاقتوں سے آگاہ ہیں۔ جن سے اقوام کی تقدیریں بنتی اور بدلتی ہیں۔ کہتے ہیں۔

ز شام ما بروں آور سحر را
کہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قراءت تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

وہ عورت ہی کا سوز تھا۔ جس نے حضرت عمرؓ
کے سے باجبروت وجلیل القدر انسان کے دل کو موم کر
دیا۔ تاریخ اسلام میں حضرت عمرؓ کا قبول اسلام
بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمان ہونے سے قبل وہ مذہب
اسلام کے سخت مخالفوں میں سے تھے۔ نہ صرف خود
مخالف تھے بلکہ جو شخص اسلام کی راہ پر گامزن نظر
آتا۔ اس کے بھی دشمن ہو جاتے۔ لیکن جب انھیں اپنے
بہن بہنوئی کے مسلمان ہو جانے کا علم ہوا تو ان کے
غیظ و قہر کی انتہا نہ رہی۔ وہ شمشیر بکف ان کے یہاں
پہنچے اس وقت آپ کے بہن بہنوئی بیٹھے قرآنِ پاک کی
تلاوت کر رہے تھے۔ آپ کی آواز سن کر کلامِ پاک کے
اوراق چھپا دیئے۔ لیکن حضرت عمرؓ تلاوت سن چکے تھے۔
وہ بہنوئی سے اُلجھ گئے۔ بہن بچانے آئیں تو انھیں بھی
زدوکوب کر کے لہو لہان کر دیا اس وقت بہن کی زبان سے
بے ساختہ نکلا۔

"عمرؓ! جو دل میں آئے کرو۔ مگر اسلام اب
دل سے نہیں نکل سکتا۔"

بہن کی ایسی حالت میں یہ کلام سُن کر آپ پر
رقّت طاری ہو گئی۔ اور پھر بعد کو قرآن پاک کی آیات کا
آپ پر ایسا اثر ہوا کہ آپ ایمان لے آئے۔ انھوں نے
جو کارنامے انجام دیئے وہ سوزِ فاطمہ ہی کے شرمندۂ احسان
تھے۔

اقبالؔ عورت کی عظمت و تقدیس کو قبول کرتے
ہیں۔ اس کا درجہ انتہائی بلند گردانتے ہیں لیکن فلسفۂ تمدّن
کی بنیادیں احکام اسلامی پر استوار کی ہیں۔ اس لیے وہ اس
درجۂ مساوات کے قائل نہیں جو قانون قدرت و منشائے
الٰہی کے خلاف ہو۔ ارشاد قرآنی ہے۔

(مرد عورتوں پر غالب ہیں۔ اس فضیلت کی
بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک دوسرے کو عطا کی۔)
ایک جگہ کہتے ہیں۔

"میں مرد اور عورت کی مساواتِ مطلق
کا حامی نہیں ہوں قدرت نے ان دونوں
کے تفویض جُدا جُدا خدمتیں کی ہیں ان
فرائضِ جُداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام
دہی خانوادۂ انسانی کی صحت اور فلاح
کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں
جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور
غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص
پریشان کن قسم کی بحرانی حالت پیدا
کر دی ہے۔ عورت کا آزاد کر دیا جانا
ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست
میں بجائے کامیاب ہونے کے اُلٹا
نقصان رساں ثابت ہوگا۔ اور نظام
معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں
واقع ہو جائیں گی۔"

اقبال عورتوں کی بے جا آزادی کے انتہائی مخالف
ہیں۔ اور مغربی تہذیب و معاشرت کو پسندیدہ نگاہوں سے
نہیں دیکھتے۔ یہاں تک کہ اپنے ظریفانہ کلام میں بھی اس
امر کی طرف ہلکا سا طنزیہ اشارہ کرتے ہیں ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اکثر جگہ انھوں نے واضح کیا ہے کہ بے جا
نامناسب آزادی عورتوں کے حق میں مفید و بہتر نہیں
ہے۔ وہ عورتوں کی بے حجابی اور بے باکی کی مذمت

کرتے ہیں۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

آزادیٔ نسواں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
(ق) اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند؟

وہ اس قسم کی تعلیم کے مخالف ہیں جس سے عورت اپنی نسائیت اس حد تک فراموش کر دے کہ اپنے فرائض سے بھی بے خبر و لاپرواہ ہو جائے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اقبالؔ ان ناعاقبت اندیش مردوں سے بھی نالاں ہیں جو مغرب کی عریاں تہذیب سے متاثر ہو کر عورت کے اصلی روپ، اس کے اوصاف، اور حقیقی مقام کو پہچان نہیں سکتے۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت کے ہیں مہ و پروین
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بےچارہ زن شناس نہیں

اقبالؔ نے عورت کو اس کا صحیح مقام بتانے کے بعد اسے تاکید بھی کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو انقلابِ تہذیبِ نو سے محفوظ رکھے، اور اپنے نونہالوں کو بھی اس سیلابِ فنا سے بچائے۔

آبِ بندِ نخلِ جمعیت توئی
حافظِ سرمایۂ ملت توئی
از سرِ سود و زیاں سودا مکن
گام جز بر ملتِ آبا مزن
ہوشیار از دستبردِ روزگار
گیر فرزندانِ خود را در کنار

اقبالؔ نے مغربی تقلید کی مخالفت کرتے ہوئے اسلامی اصولوں پر کاربند رہنے کی تعلیم دی۔ "جاوید نامہ" میں ہفت افلاک کی سیر کرتے ہوئے ان کا گزر مریخ سے ہوتا ہے۔ وہاں کی ایک دوشیزہ "مبینہ" کی زبانی انھوں نے آزادی کی نعمتوں اور راحتوں کو بیان کیا ہے۔ لیکن وہ اس کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو قابلِ ستائش نہیں پاتے۔ ایسی زندگی پر نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

اقبالؔ نے عورتوں کے لئے جو نظامِ زندگی مرتب کیا ہے۔ اس کی مثال حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی مقدس اور مطہر زندگی سے دیتے ہیں۔ اس زندگی کو عورتوں کے لئے چراغِ راہ بتاتے ہیں۔ کیونکہ یہ افضل و اعلیٰ ترین زندگی کی بہتر و برتر مثال ہے نمونہ ہے۔ آپؓ کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

آں ادب پرورِ دہ تسلیم و رضا
آسیہ گرداں ولب قرآں سرا

اقبال نے جناب خاتونؓ جنت کی سیرت کو عورتوں کے لئے بطور نصب العین پیش کیا ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے، بہن کی حیثیت سے، اور بیوی اور ماں کی حیثیت سے، جناب سیدہؓ کی حیاتِ قدسی صفات دنیا کی تمام عورتوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ کثرت تعلیم کا یہ انجام ہے کہ عورت منصب امومت سے کترانے اور گریزاں رہنے لگی ہے۔ انفرادی عیش کوشیوں میں گھر کر وہ امورِ خانہ داری سے پہلو تہی کرنے لگی ہے اس سے نسل انسانی میں انحطاط آتا ہے۔ وہ ایسے گلوں کے ارتقا پذیری مشام آفرینی اور گلستانِ حیات کے لئے آرائش وزیبائش نہیں بناتے!

علم او بار امومت برنتافت
بر سر شاخش یکے اختر نیافت
ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

اقبال کی "تعبیر خودی" مردوں کے لئے ہے۔ عورتوں کے لئے نہیں، عورتوں کی خودی فرائضِ امومت کی صحیح انجام دہی میں پوشیدہ ہے۔ امومت اقبال کے نزدیک نبوّت ہے۔

عورت تخلیق کی لذت کا مجسم پیکر ہے۔ اس کی ذات فرضِ امومت کو پورا کر کے مستحکم ہوتی ہے۔ وہ اس شاہراہ کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چلے گی تو ناکامیوں اور تباہیوں کی گھاٹیوں میں جا پڑے گی۔ فطرت کا مقصد تخلیقِ زن سے یہی ہے کہ وہ اپنے سوزِ دروں سے اسرارِ حیات کی حفاظت کرے۔ اپنے ذاتی جوہر ابھارے، وہ تلقین کرتے ہیں۔

اگر پندے ز درویشے بگیری
ہزار امت بمیرد تو نمیری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر

عورت کو اقبال نے "جنت کی کلید" کہا ہے۔ وہ عورت کی عظمت و تقدیس کے ترانے گاتے ہیں۔

آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود با طیب و صلوات
گفت آں مقصود حرف کن فکاں
زیر پائے اُمہات آمد جناں

اُمِّ ہانی

غزل

اے کشتیٔ مراد! تو غرقاب ہو نہ جا
غوطہ زنی میں گوہرِ نایاب ہو نہ جا

جو دوسروں کے نور سے روشن ہوا ہو خود
اُس مہ کی جستجو میں تہہِ آب ہو نہ جا

وحدت کے وصف کو کبھی ذرا غور سے سمجھ
یکتائی کھو کے شاملِ احباب ہو نہ جا

رُخ پھیر کر کبھی آئینہ سے دیکھ لے ذرا
اپنا ہی عکس دیکھ کے بیتاب ہو نہ جا

ہانی قریب و دور کی ہر شے ہے بیقرار!
تو بھی اکھنیں کی طرح سے بیماب ہو نہ جا

مطبوعات

محفلِ سخن ——————— مرتب ——— ڈاکٹر جاوید وششٹ
ناشر ——————— ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ
قیمت ——————— ۳۲ روپے

محفلِ سخن میں ۵۶ ہریانوی اردو شعراء کا کلام شامل اشاعت ہے۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جو کلاسیکل اردو شاعری کے پرستار ہیں اور ان کی تعداد ایک امتیازی شان رکھتی ہے اور وہ شعراء بھی شریک محفل سخن ہیں جن سے جدید اردو شاعری کا چراغ مستحکم طور پر روشن ہے۔ اول الذکر میں جیمنی سرشار، زخمی حصاری، زار علامی، کنول انبالوی اور خود مرتب جاوید وششٹ قابلِ قدر ہیں جبکہ جدید اردو شاعری کا علم بلند کرنے والوں میں منصور سبزواری، ست نام سنگھ خمار، ریاض شیرازی، اوم کرشن راحت وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔

قدیم اردو شاعری کی سب سے بڑی اور واضح خامی یہ رہی ہے کہ اس کے بیشتر شاعروں نے بہت سے فرضی تاثرات کو پیمانہ بنا کر شعر تخلیق کئے ہیں اور کم و بیش یہی رویہ ہمارے بعض نئے شاعروں نے بھی اپنایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے گل و بلبل، جام و مینا، شراب و شباب، واعظ و رند وغیرہ وغیرہ کی بندھی ٹکی ترکیبوں کا استعمال ہوا ہے تو نئے شاعروں نے بھی سہل پسندی کو اپناتے ہوئے ایسی علامتوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے جن سے ان کی ذات کبھی بھی اور کسی بھی سطح پر نبرد آزما نہیں رہی۔ یہ نہیں کہ نئی اور پرانی شاعری میں بیشتر جگہ ذاتی اور نئی علامتوں کا شاندار استعمال نہیں ہوا، میر غالب، مومن، مصحفی متقدمین میں اور رمل کرشن اشک، بانی، زیب غوری عادل منصوری، شمس الرحمٰن فاروقی ادھر کے دور کے تقریباً ایسے کچھ نام ہیں جو اس ضمن میں وثوق اور اعتبار کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں، مسرت کی بات ہے کہ محفلِ سخن کے بہت سے نئے اور پرانے شعرا کی تخلیقات بنے بنائے سانچوں کے خول سے نکل کر کھلی اور تازہ ہواؤں میں سانس لینے بلکہ بھرپور سانس لینے کی ایک دل پذیر مگر متبرک کوشش ہے۔

مثال کے طور پر چند اشعار رقم ہیں۔

جس سے جل تھل تھیں یہ آنکھیں
وہ دریا اب سوکھ گیا ہے

صابر ابوہری

سب کے گھر جاتا ہوں میں بھیس بدل کر کتنے
اور بہروپئے آتے ہیں مرے گھر کتنے

اوم کرشن راحت

ہائے وہ منزلِ الفت کہ جہاں
جرأت عرضِ تمنا بھی حرام

رئیس نیازی

سلسلہ کرنے زخموں کا نئے لوگوں سے
ڈال دے جاتی ہوئی رت کے حسابوں میں ہمیں
معصوّر سبزواری

عشق کی یہ کون سی منزل پہ ہوں
اب تمہارا بھی خیال آتا نہیں
ڈاکٹر بیتاب علی پوری

میری غزلیں، ان کے افسانے، مراسم کا سبب
دل سے دل کا رابطہ قائم ہوا اخبار سے
ریاض شیرازی

ایک مدت سے مجھے آپ ہے خود اپنی تلاش
اب بھلا اپنا پتہ آپ میں کس سے پوچھوں

اے، سی۔ بہار
چلے تو سیکڑوں تھے ساتھ اپنے
مڑے اک موڑ تو دیکھا ہمیں تھے
ساگر فرید آبادی

ڈاکٹر جاوید وششٹ حرفِ آغاز میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے ان شعراء کو محفلِ سخن میں دعوتِ سخن نہیں دی جن کے کلام میں ایک آنچ کی کسر محسوس کی گئی تھی۔ بلکہ انھوں نے اس میں اپنے ایک عزیز کو بھی شامل نہیں کیا تاکہ ان کی غیر جانبداری پہ حرف نہ آسکے۔ لیکن محفلِ سخن کے شعرا کے کلام کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس محفل میں بہت سے ایسے شعرا اپنا کلام چھپوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن کی شاعری کو ابھی ایک نہیں بلکہ متعدد آنچوں کی ضرورت ہے۔ ایسا دانستہ ہوا یا نادانستہ یہ اب ڈاکٹر جاوید وششٹ جانیں۔ باقی رہی اپنے کسی عزیز کو شامل کرنے یا نہ کرنے کی بات تو اگر ان صاحب کا کلام اس بات کا متقاضی تھا کہ ان کے کلام کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو محفلِ سخن میں شامل نہ کر کے بڑی زیادتی کی ہے اور اگر ان کا کلام اس قابل نہیں تھا کہ صاحبِ مرتب کی نظر اس پہ پڑتی تو اس بات کا ذکر کرنا ہی فضول تھا۔

بہر کیف ۷۶۳ نظموں، ۱۴۹ غزلوں، ۹۳ رباعیوں اور ۸۱ قطعات پر مشتمل یہ کتاب ہریانہ کے اردو شعرا کو از سرِ نو دریافت کرنے اور ان کی شناخت ادبی دنیا میں منوانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی جس کے لئے ہریانہ ساہتیہ اکادمی نہ صرف مبارک باد کی مستحق ہے بلکہ تمام اردو دنیا کے لئے باعثِ فخر بھی ہے۔

آخر میں میں اکادمی کو ایک رائے دینا چاہوں گا کہ وہ آئندہ اپنی تمام مطبوعات قدیم لیتھو طرزِ طباعت پر چھپوانے کی بجائے بے حد خوبصورت آفسیٹ پر چھپوائے تاکہ کتاب کی باطنی خوبصورتی ظاہری حسن کے ساتھ میل کھا سکے۔

کرشن کمار طور

بقیہ: ایک بے ربط مضمون
صہ ۸ سے آگے

تو ہیں تو اس شے کی ہوتی ہے، جس کا کوئی وجود ہو، اور دوستی کا تو دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ ہر آدمی اپنی ذات کے ارد گرد ایک نفیس جال بُن لیتا ہے اور اس جال کو دوستی کہہ کر عمر بھر اس میں پھنسا رہتا ہے؟
میں نے پوچھا "گویا آپ کا زندگی میں کوئی دوست نہیں بنا ہے؟"
وہ ہنس کر بولا "بنا تھا ایک شخص فکر تونسوی نام کا۔ مگر اب وہ بے ربط باتیں کرنے لگا ہے۔"

قارئین کی نظر میں

"تعمیر ہریانہ" ماہ مئی ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں
شائع ہوئی میری غزل کے ایک مصرع میں "تعیش" کی جگہ
"تعشر" چھپ گیا ہے۔ اس شمارے میں فضا ابن فیضی
کی غزل بہت پسند آئی۔ ستیہ پال آنند کا افسانہ "ممی اور
ماں" اچھا ہے۔ عشرت ابیر کی کہانی "واپسی" خوب ہے۔
جس میں کہ معاشرے کا کرب پوشیدہ ہے اور جس میں دیہی
و شہری زندگی کی اصلاحات کی نشاندہی ہے۔

محمد قاصر مجیبی

ماہ مئی ۱۹۸۵ء کا شمارہ نظر سے گذرا۔ سرورق
جاذب نظر ہے۔ ہر ماہ تاریخی عمارتوں کی تصاویر کا
سلسلہ نہایت مفید اور کارآمد ہے اور ہریانہ کی عظمت رفتہ
کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ستیہ پال آنند کی کہانی "ممی اور
ماں"، عشرت ابیر کی "واپسی" پسند آئی۔ منظوم حصہ
میں فضا ابن فیضی، بہار صدیقی اور محبوب راہی کی تخلیقات
متاثر کرتی ہیں۔

حباب ہاشمی —— الہ آباد

مئی کا "تعمیر" موصول ہوا۔ عنوان چشتی، اختر
حسین اختر کی غزلیات خوب ہیں۔ پروینہ باغی کی غزل کا یہ شعر
تو بہت ہی خوب ہے اور شاید حاصل غزل
بھی ہے

بزم میں ہے چراغوں کی کثرت مگر
میرے دل کی طرح کوئی جلتا نہیں

اور اختر شاہجہاں پوری کی نظم "بیس نکاتی پروگرام"
بھی پسند آئی۔ عشرت ابیر، ستیہ پال آنند کے افسانے بھی
اچھے ہیں۔

بہار صدیقی —— بدایوں

مئی کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ پسند آیا۔
سلطانہ حجاب کی غزل بے حد اچھی لگی۔ افسانوں میں
عشرت ابیر کی تحریر "واپسی" قابل تعریف ہے۔

تنویر صدیقی —— گیا

"تعمیر ہریانہ" بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔
خوشی کی بات یہ ہے کہ ہریانہ جیسی ریاست سے اردو کا
ایک ماہنامہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

مہتاب بے مثال —— مونگیر

"تعمیر" حقیقت میں اردو ادب اور ہم جیسے نادار
طلبا کی تعمیر کر رہا ہے۔ مئی کے شمارے میں شامل ڈاکٹر
حسن امام کا مقالہ "جوش ملیح آبادی" کی شاعری کے علاوہ
بہار صدیقی، اور اختر حسین اختر کی غزلیں بھی پسند آئیں۔

اظہر الہدیٰ —— بیگو سرائے

اپریل ۸۵ء کا شمارہ دیکھا۔ بہت خوب ہے۔ صالحہ عابد حسین
کی افسانہ نگاری پر مضمون اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ شفیقہ
فرحت اور اوم کرشن راحت کی تحریریں معیاری ہیں۔

نثار احمد

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے ہریانہ
سرکار کے لئے محکمۂ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔
سی۔ او۔ ۱۸۹، ۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی۔
چنڈی گڑھ سے جولائی ۱۹۸۵ء کے لئے شائع کیا۔
طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ ٹی۔ چنڈی گڑھ۔

Photo : Vipin Bawa

تعمیر

Darbar-e-Aam, Hisar

Photo : Raj Kishan Nain

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ
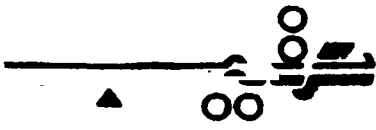
اگست ۱۹۸۵ء | شمارہ ۸ | جلد ۱۳

مدیر اعلیٰ:
رنجیت ایس

مدیر:
سلطان انجم

سرپرست: اے۔ پی۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدیر "تعمیر ہریانہ" ایس۔ سی۔ او ۱۸۹۔۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں

فہرست

آنرل دگلاٹی

اے زمینِ وطن! سرزمینِ وطن!!
تیرے باغوں میں پیڑوں پہ پنچھی ہمیشہ چہکتے
رہیں
تیرے گاؤں کی گلیوں میں معصوم بچوں کے
چہروں پہ غنچے چٹکتے رہیں
تیرے شہروں کی مصروف سڑکوں کے سینے
دھڑکتے رہیں
تیرے کھیتوں کی مٹی ہرے موسموں میں نکھرتی
رہے
تیرے صنعت گھروں سے نئی زندگی لمحہ لمحہ سنور
کر نکلتی رہے
اے زمینِ وطن! سرزمینِ وطن!!

اے زمینِ وطن! سرزمینِ وطن!!
اپنی تاریخ کے خشک و شاداب ادوار میں
پت جھڑوں کے عذابوں، بہاروں کی مہکار
میں
تیری شفقت کا سایا سدا
تیری گودی میں کھلتے ہوئے پھول کانٹوں پہ
یکساں رہا
ایک ماں کی طرح

تُو نے بچوں کے لطف و کرم، اُن کے جور و ستم
کو سہا
مُسکراہٹ میں آنسو چھپاتی رہی
آنسوؤں میں کبھی مُسکراتی رہی
مگر اپنی پلکوں سے
بچوں کی راہوں سے نفرت کے کنکر اُٹھاتی رہی
اُن کے سینے میں ہر پل نئے عزم کی لَو جلاتی رہی

اے زمینِ وطن! سرزمینِ وطن!!
تیرے آنگن میں صدیوں سے کِھلتے رہے
مذہبوں، فلسفوں کے چمن در چمن
تیرے ہر خطّے میں، ہر کڑی دھوپ میں
پیار کے سائباں ہیں ازل ہی سے سایہ فگن
کتنے ہی پیر، سادھو، مہنت،
انبیاء، اولیاء
کتنے ہی راہبر، کتنے ہی رہنما
نفرتوں کے اندھیروں میں اُلفت کی
شمعیں جلاتے رہے
تیری مٹّی سے مہکی محبت کی سوگند کھاتے
رہے
آتے جاتے رہے
نفرتوں کے جہنم میں جُھلسے ہوئے آدمیت
کے چہرے پہ
اِنسانیت کی، محبت کی، مرہم لگاتے رہے
زخم کھاتے رہے
مُسکراتے رہے
اے زمینِ وطن! سرزمینِ وطن!!
تیری تقدیس کے گیت گاتے رہے

اے زمینِ وطن! سرزمینِ وطن!!
تیری تقدیس کی آج کھا کے قسم
عہد کرتے ہیں ہم
ہم کہ ہیں انبیاء، نہ کوئی اولیاء
پر ہمیں فخر ہے
تیری مٹّی سے ڈھالے گئے اپنے تن
تیری دانش کا ہے رُوح میں بانکپن
عہد کرتے ہیں ہم ——
نفرتوں کے اندھیروں کے مکروہ چہروں
کے منحوس سائے
نئی نسل کے جگمگاتے ہوئے
جھلملاتے ہوئے
خواب زاروں پہ پڑنے نہ دیں گے کبھی
اس کے ارماں اُجڑنے نہ دیں گے کبھی
اے زمینِ وطن! سرزمینِ وطن!!

پیغام

سیّد مظفر حسین برنی
گورنر ہریانہ

یوم آزادی کی ۳۸ ویں سالگرہ کے موقع پر ہریانہ واسیوں کو دلی مبارک باد دیتے ہوئے اور اُن کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بہت مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ آج کے دن ہم اُن عظیم محب الوطنوں اور شہیدوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں جن کی قربانیوں کے بغیر ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

ہریانہ کو ایک الگ ریاست کے طور پر وجود میں آئے ابھی صرف ۱۹ سال ہی ہوئے ہیں، لیکن اس قلیل سے عرصے میں ریاست نے ترقی اور خوشحالی کے میدانوں میں جو شاندار کامیابی حاصل کی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ہریانہ میں غذائی اجناس کی کمی تھی، لیکن اناج کے معاملے میں اب یہ ریاست خود کفیل ہونے کے علاوہ مرکزی ذخیرہ کے لئے بھی وافر مقدار میں اناج فراہم کرتی ہے۔ اناج کی پیداوار جو ۱۹۶۶ء میں تقریباً ۲۶ لاکھ ٹن تھی اب بڑھ کر ۷۰ لاکھ ٹن ہوگئی ہے۔

ہریانہ بننے کے وقت یہاں صنعتوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن اب صنعتی میدان میں ہوئی ترقی پر ہم فخر کرسکتے ہیں۔ اس وقت ریاست میں ۴۳,۰۰۰ سے زیادہ چھوٹی صنعتی اکائیاں ہیں جبکہ ۱۹۶۶ء میں ان چھوٹے صنعتی یونٹوں کی تعداد صرف ۴,۵۱۹ تھی۔ اب ہم مختلف قسموں کی اشیاء برآمد کرتے ہیں۔ جن سے ہمیں ہر سال ۱۵۲ کروڑ روپے بطور زرمبادلہ حاصل ہوتے ہیں، جبکہ ۱۹۶۶ء میں محض ۴.۵۵ کروڑ روپے کا سامان ہی برآمد کیا جاتا تھا۔

ریاستی سرکار صحت اور تعلیم جیسی سماجی خدمات پر بھی خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران دیہی علاقوں میں طبّی سہولیات کو فروغ دیا گیا ہے۔ اور دیہات میں کسی بھی دیہاتی کو مذکورہ سہولیات سے مستفید ہونے کے لئے پانچ یا چھ کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں جانا پڑتا۔ ہریانہ کے تقریباً سبھی بڑے ہسپتالوں میں طبّی ماہرین کی خدمات میسّر ہیں۔ اسی طرح تعلیمی سہولیات میں بھی قابل ذکر توسیع ہوئی ہے۔ ریاست میں ہر ایک کلومیٹر کے دائرے میں پرائمری اسکول، ۷، ۳ و ۲ کلومیٹر کے دائرے میں مڈل اسکول، اور ۵ و ۲ کلومیٹر کے دائرے میں ہائی اسکول قائم ہے۔ ریاستی سرکار خواتین کی تعلیم پر خاص توجہ دے رہی ہے اور دیہی علاقوں میں "ڈراپ آؤٹ" کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے کوشاں ہے۔

دیہات میں رہنے والوں کو پینے کے پانی کی جو مشکلات درپیش ہیں اُن سے سرکار پوری طرح واقف ہے۔ پینے کے پانی کی دقّت والے کل ۴،۹۶۰ گاؤں میں سے ۳۵۲۶ گاؤں میں پائپوں کے ذریعے پینے کے پانی کی سہولت میسّر کرائی جا چکی ہے۔ اُمید ہے کہ عالمی بنک کے تعاون سے ۱۹۸۷ تک باقی سبھی گاؤں کو بھی یہ سہولت مہیّا کرا دی جائیگی۔

ریاستی سرکار آلودگی سے پاک وصاف فضا کی ضرورت سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ ماحولیاتی کنٹرول بورڈ کے قیام کے علاوہ وسیع پیمانے پر شجرکاری مہم شروع کی گئی ہے۔ گذشتہ سال تقریباً ۱ کروڑ پودے لگائے گئے۔ سالِ رواں کے دوران ۹ کروڑ پودے لگانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

غربت کا قلع قمع کرنے کے لئے ریاست میں متعدّد پروگرام شروع کئے گئے ہیں۔ اور ۳۵ء۴ لاکھ کنبوں کو غریبی کی سطح سے اُوپر اٹھانے کے لئے امداد فراہم کی جا چکی ہے۔ تقریباً ۳ لاکھ بے گھر افراد کو رہائشی پلاٹ دیئے گئے ہیں۔ سبھی ہریجن بستیوں میں بجلی پہنچا دی گئی ہے۔ ۴۰۰ دیہات کی گلیوں کو بجلی کی روشنی سے منوّر کر دیا گیا ہے۔ ہریانہ روڈویز کی ۲،۹۰۰ سے بھی زائد بسوں میں روزانہ تقریباً ۱۱ لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں۔

ہریانہ روڈویز ملک کے کامیاب ترین ٹرانسپورٹ اداروں میں سے ایک تسلیم کی گئی ہے۔ ہریانہ ٹورزم بھی اپنی اعلیٰ خدمات کے لئے معروف ہے۔ ریاست میں ۳۱ خوبصورت سیاحتی مراکز ہیں۔

ریاستی سرکار نے میوات کے پچھڑے علاقے کے سبھی ۶ بلاکوں میں ترقی کی رفتار کو اور تیز کرنے کے لئے ایک اعلیٰ اختیاراتی میوات ترقیاتی بورڈ قائم کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ۲ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

ریاست کے محنت کش مردوں اور خواتین کے عملی تعاون سے ہریانہ میں ہوئی ترقی کی میں نے ایک جھلک ہی پیش کی ہے۔ میں ایک بار پھر اس موقع پر آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ریاستی سرکار اور عوام ہر میدان میں خوشحالی کی رفتار تیز کرنے کے لئے سخت محنت کرتے رہیں گے۔

یومِ آزادی

بھجن لال
وزیر اعلیٰ ہریانہ

خود شناسی کا دن

بھارت نے آج سے ۳۸ سال قبل آزادی حاصل کی۔ آج کا دن ہمیں دیش بھگتوں کی بے مثال قربانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں اپنا جائزہ بھی لینا چاہیئے کہ ہم ہر ہندوستانی کو غریبی اور ناخواندگی سے نجات دلانے کے لئے سرگرم عمل ہیں تاکہ ہر ہندوستانی آزادی کی برکتوں سے مستفید ہو سکے۔

ہریانہ سورگیہ پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی کے نئے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ملک کی تعمیرِ نو میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ہریانہ نے ۱۹۶۶ء میں اپنے وجود میں آنے کے بعد اقتصادی اور صنعتی شعبوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ریاست نے صنعتی انقلاب کی طرف گامزن ہے اب ہم اپنے جواں سال اور بلند حوصلہ پردھان منتری شری راجیو گاندھی کی رہنمائی میں الیکٹرانک دور میں داخل ہو رہے ہیں۔

زراعت: چونکہ ریاست بنیادی طور پر زراعت پر انحصار رکھتی ہے اسی لئے ہمارا اقتصادی ڈھانچہ زراعت پر منحصر ہے۔ جدید سائنسی طریقوں، اعلیٰ قسم کے بیجوں کا استعمال، کیمیاوی کھادوں کا متوازن استعمال، کھڑی فصل کی حفاظتی تدابیر، فصل پیداوار طریقوں، قرضہ جات کی بآسانی فراہمی اور آبپاشی سہولیات، کسانوں کو تکنیکی معلومات اور مشینوں کے استعمال میں توسیع کے سبب ہی غیر زرعی علاقوں میں بھی فصلیں لہرانے لگی ہیں۔ ہریانہ جو اپنے قیام کے وقت اپنی ضرورت کے مطابق اناج پیدا کرنے کے بھی قابل نہیں تھا، اب مرکزی ذخیرہ کے لئے اناج دینے والے صوبوں میں سے ایک ہے۔ ہریانہ میں ۸۵ ــــ ۱۹۸۴ میں ۷۰ لاکھ ٹن اجناس کی پیداوار ہوئی جبکہ ۱۹۶۶ میں یہ پیداوار محض ۲۶ لاکھ ٹن تھی۔ لمبے عرصے سے منتظر راوی بیاس کا پانی حاصل ہو جانے پر امید ہے کہ پیداوار میں مزید اضافہ ہو گا۔

بجلی سبھی ترقیاتی سکیمیں کافی حد تک بجلی پر منحصر ہیں۔ بجلی ذرائع میں توسیع کی غرض سے تھرمل اور ہائیڈل پاور پراجیکٹوں جیسی کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ فرید آباد اور پانی پت میں تھرمل پاور اسٹیشن قائم کئے گئے ہیں۔ فرید آباد تھرمل پاور پراجیکٹ کی کل صلاحیت ۱۹۵ میگاواٹ ہے۔ ۶۵۰ میگاواٹ کا پانی پت تھرمل پاور پراجیکٹ جس کی صلاحیت سبھی صوبائی پراجیکٹوں سے زیادہ ہے، تین مرحلوں میں مکمل کیا جائیگا اسی کے ۱۱۰-۱۱۰ میگاواٹ کے دو یونٹ پہلے ہی مکمل ہو چکے ہیں۔ ۱۱۰-۱۱۰ میگاواٹ کے دو یونٹ اور ۲۱۰ میگاواٹ کے ایک یونٹ پر کام جاری ہے۔ مغربی یمنا نہر پر ۶۴ میگاواٹ کا ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ زیر تعمیر ہے۔ اضافی بجلی کی پیداوار کے لئے ۸۴۰ میگاواٹ کا تھرمل پاور اسٹیشن جمنانگر کے پاس قائم کرنے کی سکیم ہے۔ ۱۹۶۶ میں محض ۳۴۳ میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی۔ اب یہ صلاحیت ۱،۲۴۵ میگاواٹ ہے۔ پانی پت تھرمل پاور پراجیکٹ، جمنانگر تھرمل پاور پراجیکٹ اور رمنی ہائیڈل پراجیکٹ دادوپور کے مکمل ہونے پر بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت میں مزید اضافہ ہوگا۔

آبپاشی:- پانی اور بجلی کی دستیابی زراعت اور صنعت کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں جنہیں ہم عالمی بنک کی امداد سے پورا کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ نہریں اور کھالیں پختہ اور جدید ڈھنگ سے بنائی جا رہی ہیں تاکہ رسنے سے ضائع ہونے والے پانی کو بچایا جاسکے۔ لفٹ اور چھڑکاؤ آبپاشی سکیموں سے خشک اور ناہموار اراضی کو سیراب کیا جا رہا ہے۔ اب بارش کی کمی والے علاقوں میں خشک اراضی زراعت کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ پانی کی ایک ایک بوند کو استعمال میں لانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ۳۱ کروڑ ۸ لاکھ مربع فٹ کھالوں کو پختہ کرنے سے ۱،۶۰۰ کیوسک قیمتی پانی کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکا ہے۔ ان تمام تر کوششوں سے زیر سیراب رقبہ ۳۶ لاکھ ہیکٹر تک ہوگیا ہے جبکہ ۱۹۶۶ میں یہ صرف ۱۷ لاکھ ۳۶ ہزار ہیکٹر تھا۔ جب ۱۵ اگست ۱۹۸۶ء کو ستلج یمنا لنک نہر سے ہریانہ میں پانی آجائے گا تو مزید رقبہ کو سیراب کیا جاسکے گا۔

صنعت:- حالانکہ ہریانہ کے پاس صنعتوں کے لئے معقول قدرتی وسائل نہیں ہیں پھر بھی اس نے مختصر عرصے میں مستحکم صنعتی ڈھانچہ تیار کرلیا ہے۔ اس وقت ریاست بھر میں ۶۳،۰۰۰ چھوٹی صنعتی اکائیاں قائم ہیں۔ ہماری صنعت زرمبادلہ کمانے کا اہم وسیلہ ہے۔ ہماری سالانہ برآمدات ۱۵۲ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہیں جبکہ ۱۹۶۶ میں محض ۴۵ء۵ کروڑ روپے کا سامان ہی برآمد کیا جاتا تھا۔

صنعتی امدادی گروپ آئی، اے۔ جی (I.A.G) اراضی بجلی اور اقتصادی سہولت ایک ہی مقام پر مہیا کراتا ہے۔ غیر ممالک میں آباد ہندوستانیوں کو ہریانہ میں سرمایہ کاری کرکے صنعتیں قائم کرنے کی طرف راغب کرنے کے لئے ان کو رعایتیں، سہولیات اور جدید تکنیکی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ کرنال کے مقام پر ۱،۳۰۰ کروڑ روپے کی لاگت سے تیل صاف کرنے کا کارخانہ اور بھارت الیکٹرانک لمیٹڈ کا پنچکولہ میں قائم ہونے والا ۱۲ کروڑ روپے کا مواصلاتی پراجیکٹ ریاست میں لگنے والے بڑے پراجیکٹوں میں سے ایک ہے۔

دیہی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار مہیا کرانے اور شہروں کی طرف جانے کے رجحان کے سدباب کی غرض سے ہریانہ سرکار نے وسیع پیمانے پر دیہی صنعتی سکیم شروع کی ہے۔ اس سکیم کے تحت قائم ۲۰،۵۰۰ دیہی صنعتی اکائیوں میں ۵۵،۰۰۰ افراد کام کرتے ہیں جن میں سے ۶۰ فی صد کا تعلق کمزور طبقوں سے ہے۔

الیکٹرانک کے فروغ کی طرف ہم خاص طور پر توجہ دے رہے ہیں۔ ہریانہ اسٹیٹ الیکٹرانک کارپوریشن (ہرٹرون) نے صنعت کی منظم توسیع کے لئے مستحکم بنیاد تیار کی ہے۔ لگ بھگ ۵۰ الیکٹرانک اور متعلقہ اکائیوں کا ایک الیکٹرانک کمپلیکس گوڑگاؤں میں بن رہا ہے۔ الیکٹرانکس اشیاء کی سالانہ پیداوار ساتویں منصوبے کے اختتام تک ۶۰۰ کروڑ تک بڑھ جانے کی امید ہے۔

تعلیم :- آج کی ترقی پذیر دنیا میں تعلیم کی اہمیت سے ہم پوری طرح باخبر ہیں۔ اور اسکولوں، کالجوں کے ذریعہ عام آدمی کو تعلیمی سہولیات مہیا کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۴،۹۲۸ پرائمری اسکول، ۱،۰۵۱ مڈل اسکول ۱،۸۰۱ ہائی اور ہائر سیکنڈری اسکول، ۱۲۸ کالج اور تین یونیورسٹیاں مستقبل کے شہریوں کی ذہنی قابلیت کو بڑھانے میں مصروف ہیں۔ ہریانہ میں پرائمری تعلیم مفت ہے۔ لڑکیوں، پچھڑے طبقوں اور شیڈولڈ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں تعلیم کو مقبول بنانے کے لئے کئی طرح کی سہولتیں اور مراعات دیکر ان میں تعلیم کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔

صحت :- فلاحی ریاست کے لئے حفظانِ صحت انتہائی اہم ہے۔ ۸۷ ہسپتال، ۲۳۴ ڈسپنسریاں، ۹۳ ہیلتھ سینٹر اور تقریباً ۱،۶۰۰ سب سینٹر عوام کی طبی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں۔ آج سرکار صحت سے متعلق ان سہولیات پر فی کس ۴۹ روپے ۹۲ پیسے صرف کر رہی ہے۔ جبکہ ۱۹۶۶ میں اس مد پر صرف ایک روپیہ ۳۳ پیسے خرچ کئے جاتے تھے۔

خاندانی منصوبہ بندی صحت مند اولاد کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ہریانہ میں خاندانی بہبود پروگرام رضاکارانہ طور پر مقبول ہوا ہے۔ اولاد پیدا کرنے کے اہل جوڑے کنبہ کو محدود رکھنے کے مختلف طریقوں پر عمل پیرا ہیں۔ سرکار خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اپنانے والوں کو مراعات دیتی ہے۔
۱۹۸۲-۸۳ میں پریوار کلیان پروگرام کی کامیابی کیلئے ہریانہ کو دوسرا مقام حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۸۳-۸۴ میں بھی شاندار کامیابی پر دوسری بار یہ فخر حاصل ہوا۔

پینے کا پانی :- صحت کے لئے پینے کا صاف پانی ضروری ہے۔ سبھی دقت والے گاؤں میں نلوں کے ذریعہ پانی پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سکیم کے تحت ۳،۵۲۶ دقت والے گاؤں کو یہ سہولت مہیا کرائی جا چکی ہے۔ اور ۱۹۸۷ کے اختتام تک باقی سبھی گاؤں کو یہ سہولت مہیا کرائے جانے کی اُمید ہے۔

جنگلات :-

جنگلات قدیم زمانے سے ہی انسان کے مددگار رہے ہیں۔ ہم ایندھن، چارہ اور عمارتی لکڑی جیسی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جنگلات پر انحصار رکھتے ہیں۔ یہ تحفظِ اراضی کے علاوہ ریگستان کی توسیع کو بھی روکتے ہیں۔ اپنی جنگلاتی دولت کی حفاظت اور اسے فروغ دینے کے خیال سے ریاست میں سوشل فارم فاریسٹری کو مقبول بنایا جا رہا ہے۔ ۳۴ کروڑ روپے کی عالمی بنک کی امداد سے سماجی جنگل بانی پروگرام کے تحت عوام کیلئے عملی تعاون سے ۴۷،۰۰۰ ہیکٹر اراضی میں شجرکاری کی جا رہی ہے۔
ہریانہ کو شجرکاری پروگرام میں فی ہیکٹر کی بنیاد پر اول مقام حاصل ہے۔ ریاست میں گزشتہ چھ برسوں میں لگ بھگ ۳۱ کروڑ ۵۷ لاکھ پودے لگائے گئے اور ۱۹۸۵-۸۶ کے دوران ۹ کروڑ پودے لگائے جانے کی اُمید ہے۔

سماجی بہبود :-

پچھڑے طبقوں، شیڈولڈ ذاتوں اور سماج کے کمزور طبقوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے کئی طریقے اپنائے گئے ہیں۔ اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کو اپنا کاروبار شروع کرنے اور غریبی کی سطح سے اُن کو اوپر اٹھانے کے مالی امداد دی جا رہی ہے۔ ابتک لگ بھگ ۴ لاکھ ۲۵ ہزار کنبوں کو غریبی کی سطح سے اُوپر اٹھانے کے امداد دی جا چکی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ ۳۵ ہزار ایکڑ فاضل اراضی کمزور طبقوں کے ۱،۴۱،۹۲۷ افراد کو الاٹ کی جا چکی ہے۔ اس طرح لگ بھگ تین لاکھ بے گھر لوگوں کو رہائشی مکان بنانے کے لئے ۱۰۰-۱۰۰ مربع گز کے پلاٹ مفت دئے گئے ہیں۔

ہریانہ ہاؤسنگ بورڈ کے ذریعہ تعمیر کئے گئے ۵۰۰ر۲۳ مکانوں میں سے ۷۵ فی صد سے زیادہ مکان سماج کے اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کو الاٹ کئے گئے ہیں۔

ہریانہ نے شیڈولڈ ذاتوں کے معیار زندگی کو سدھارنے کے لئے سبھی ۴۳ ۶ ؍ ۵ ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی ہے۔ ۰۰۰ر۴ گاؤں کی گلیوں میں سبھی بجلی کی روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔ ۵۰ ۸ر۴۵ ہریجن گھروں کو رعایتی شرح پر ایک ایک پوائنٹ کے بجلی کے کنکشن دئے گئے ہیں۔ ہر سال لگ بھگ ۰۰۰ر۲ ہریجنوں کو مکان بنانے کے لئے ۰۰۰ر۲ روپے فی کس کے حساب سے سبسڈی دی جاتی ہے۔

میوات ترقیاتی بورڈ اس پسماندہ خطہ کے غریب باشندوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ فائدہ مند اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے پر ۸ کروڑ ۸۲ لاکھ روپے خرچ کئے گئے ہیں۔

بہبودئ اطفال کا پروگرام ریاست کے ۳۶ بلاکوں میں شروع کیا جا رہا ہے۔ جہاں ۵۲ ۳ر۸۶ر۱ بچوں اور ۳۳ر۴۹ حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کو سہولیات مہیا کرائی جاتی ہیں۔ ان خدمات میں حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں اور ۱۴ سے ۴۴ سال عمر کے زمرے میں آنے والی خواتین کی طبی جانچ، صلاح مشورہ اور بچوں کے لئے اسکول سے پہلے کی تعلیم وغیرہ شامل ہیں۔

سڑکیں

سڑکیں ترقی کی بنیاد ہیں۔ ہریانہ اپنے سبھی گاؤں کو پکی سڑکوں سے جوڑنے والی ملک بھر میں پہلی ریاست ہے۔ پکی سڑکیں بننے سے آمدورفت میں سہولت ہو گئی ہے۔ پکی سڑکوں کی لمبائی بڑھ کر ۹۹۲ر۱۹ کلومیٹر ہو گئی ہے جبکہ ہریانہ بننے کے وقت یہ صرف ۰۰ ۱ر۵ کلومیٹر تھی۔ ہریانہ روڈویز کی ۹۱۷ر۲ بسیں روزانہ ۸ لاکھ ۴۴ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں اور ان میں ۱۰ لاکھ ۴۲ ہزار مسافر سفر کرتے ہیں۔

سیاحت:

سال ۱۹۶۶ء میں الگ ریاست بننے کے بعد ہریانہ ٹورزم نے خاص طور پر ترقی کی ہے۔ ریاست بھر میں ۴۱ سیاحی مراکز قائم کرنے سے سیاحت کو فروغ ملا ہے۔ ان مراکز میں کھانے پینے، رہائش پیٹرول پمپوں، جھیلوں و باتھ کمپلیکسوں، جیسی مختلف سہولیات دستیاب ہیں۔

ہریانہ ٹورزم کا صلاح کار شعبہ عوام اور ریاستی سرکاروں کے لئے فن تعمیر، انجینیرنگ، داخلی آرائش و زیبائش، تشہیر اور مارکیٹنگ ذمہ داریوں کو نبھانے میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ پانی پت میں کیٹرنگ انسٹی ٹیوٹ، نیوٹریشن اور ہوٹل مینجمنٹ کا ایک ادارہ، ہوٹل مینجمنٹ، کھانے پینے، نیوٹریشن، ہوٹل ریسپشن، حساب کتاب، کاؤنٹر سہولت اور کوکنگ میں تربیت دے رہا ہے۔

چالو مالی سال کے دوران چلائی جا رہی نئی اسکیموں میں انبالہ کا کنگ فشر، نروانہ کا نیل کنٹھ، بڑکھل کا ڈرائیو ان وَن تھیٹر، جس میں ۷۵۰ واک اِن پیٹرن سپیس اور ۵۰۰ کاروں کے لئے سٹینڈ ہوگا شامل ہیں۔

ہمیں قومی اتحاد کو کمزور کرنے والی فرقہ پرست علاقہ پرست اور علاحدگی پسندانہ طاقتوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ہم جمہوریت کی بنیاد کو مستحکم کرنے اور عوام میں جذباتی اور قومی یک جہتی کو فروغ دے کر مشکل سے حاصل کی گئی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کے لئے پرعزم ہیں۔

آیئے! آج اس مبارک موقع پر ہم ترقی کی نئی منزلیں طے کرنے اور ملک میں سماجی، اقتصادی تبدیلی کے مطابق امن، بھائی چارہ اور قومی اتحاد کے ماحول کو قائم کرنے کا عہد کریں۔

آج ہم آزادی کی ۳۸ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ آج کا دن ہمیں اُن لاکھوں محبُ الوطنوں کی یاد دلاتا ہے۔ جنھوں نے مادرِ وطن کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے عظیم قربانیاں دیں۔ اس دن سے ہم اپنی قسمت کے خود معمار بنے۔ غریبی، ناخواندگی، تعصّب اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد اب شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر ایک طویل سفر طے کیا ہے۔

ہریانہ سماجی اور اقتصادی انقلاب کی کوششیں کرکے جمہوریت کی بنیاد کو مستحکم کرنے میں خصوصی تعاون دے رہا ہے تاکہ ترقی کا فائدہ سماج کے کمزور سے کمزور طبقے تک پہنچ سکے۔ ہم اپنے جواں سال وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی رہنمائی میں بھارت کو ۲۱ ویں صدی میں عالمی قائد بنانے کے لئے پُرعزم ہیں۔

ہریانہ نے زراعت، بجلی، صنعت، تعلیم، صحت، سماجی بہبود اور جنگلات کے شعبوں میں ترقی کی ہے۔

- ہریانہ نے جو کسی وقت اناج کی کمی والی ریاست تھی، اس برس مرکزی ذخیرے میں ۳۰ لاکھ ٹن اناج دیا ہے۔
- اس وقت نہری آبپاشی کے تحت رقبہ ۴۸ لاکھ ہیکٹر ہے۔ پندرہ اگست ۱۹۸۶ء کو ستلج یمنا لنک نہر کا پانی ہریانہ کو مل جانے پر مزید ۷ لاکھ ہیکٹر رقبہ سیراب ہو سکے گا۔
- زراعت اور پشو پالن جیسے شعبوں میں انقلاب کے بعد اب صنعتی انقلاب آرہا ہے۔ ۶۳٬۰۰۰ سے زیادہ صنعتی اکائیاں سوئی سے لے کر ٹریکٹر اور ٹی۔وی سیٹ، کمپیوٹر تک بناتی ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں ہریانہ میں محض ۴۵۱۹ صنعتی اکائیاں تھیں۔ اب ۲۰٬۵۰۰ دیہی صنعتیں ۵۵٬۰۰۰ افراد کو روزگار مہیا کراتی ہیں۔ ان میں ۶۰ فی صد لوگ سماج کے کمزور طبقوں سے ہیں۔
- ہریانہ میں تیار شدہ مال دُنیا بھر میں مقبول ہو رہا ہے۔ صنعتی اشیاء کی برآمدات سے ۵۲ کروڑ روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ جبکہ ہریانہ بننے کے وقت یہ آمدنی ۴٫۵۵ کروڑ روپے تھی۔
- کوروکشیتر میں لکھے گئے دھارمک گرنتھ، جن کی یہاں تبلیغ کی گئی، صدیوں سے عقیدت سے پڑھے جا رہے ہیں۔ ایسی مستحکم بنیادوں سے استفادہ کرنے والے ہمارے ۴٬۹۲۸ پرائمری اسکول، ۱٬۱۰۵ مڈل اسکول، ۱٬۰۸۱ ہائی اور ہائر سیکنڈری اسکول، ۱۲۸ کالج اور تین یونیورسٹیاں

آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

- وقت والے ۳۵۲۶ گاؤں کو پینے کے صاف پانی کی سہولت مہیا ہے۔ اور امید ہے کہ ۸۷ ۱۹ء کے آخر تک ایسے سبھی دیہات میں یہ سہولت مہیا کرا دی جائے گی۔
- ۸۲۵ و ۴۴ ہریجن گھروں کو رعایتی شرح پر ایک ایک پوائنٹ کے کنکشن دیے گئے ہیں۔ ۴۰۰ گاؤں کی گلیوں میں بھی بجلی لگا دی گئی ہے۔
- ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام موثر ڈھنگ سے لاگو کیا جا رہا ہے۔ چار لاکھ ۳۵ ہزار سے زائد کنبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے میں مدد دی گئی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ ۳۵ ہزار ایکڑ فالتو اراضی کمزور طبقوں کے ۶۲،۷۴۱ افراد میں تقسیم کی گئی ہے۔ لگ بھگ ۳ لاکھ بے گھر لوگوں کو مکان بنانے کے لیے ۱۰۰۔۱۰۰ مربع گز کے پلاٹ مفت دیے گئے ہیں۔
- ہریانہ کو سبزہ زار بنا کر ماحولیاتی توازن کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔ گذشتہ چھ برسوں میں ریاست میں لگ بھگ ۳۷ کروڑ ۵۷ لاکھ پودے لگائے گئے۔ اس سال ہم ۹ کروڑ پودے لگائیں گے۔ اس طرح ہریانہ کے ہر شہری کے لیے لگ بھگ آٹھ شجر لگائے جائیں گے۔

ہم عام انسان کی توقعات اور اپنی حصولیابیوں کی درمیانی خلیج کو کم کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ آیئے! آج کے یوم مبارک پر ہم ملک کو تباہ کرنے والی اور علیحدگی پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کا عہد لیں اور ملک کے اتحاد و سالمیت کے تحفظ کے لیے سخت محنت کرنے کا عزم کریں۔

بھجن لال

وزیر اعلیٰ ہریانہ

مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

باوا کرشن گوپال مغموم

تعصّب ہی ہنگامہ زا ہو رہا ہے
نیا روزِ فتنہ بپا ہو رہا ہے
ہر اک شخص وقفِ بلا ہو رہا ہے
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

خُدایا! دلوں میں یہ کیسی سمائی؟
خفا ہو گیا آہ! بھائی سے بھائی
کسی کو نہیں سوجھتی اب بھلائی
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

مذاہب بنے ہیں سیاست کا آلہ
وطن دشمنی کا، عداوت کا آلہ
تباہی کا آلہ، ہلاکت کا آلہ
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

بپا ہے کہیں محشرِ فرقہ بندی
کہیں آتش افروز صوبہ پرستی
ہلاکت کا ساماں کہیں خانہ جنگی
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

کہیں خُون میں شیطنت کی حرارت
کہیں غنڈہ گردی، کہیں ہے شرارت
کہیں گرم بازارِ قتل و غارت
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

کہیں بس اور کاریں جلاتے ہو یارو!
کہیں ریل گاڑی اُڑاتے ہو، یارو!
مکانوں کو ایندھن بناتے ہو، یارو!
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

یہ سوچو، وطن ہی کا نُقصان ہے یہ
سراسر تباہی کا سامان ہے یہ
ڈبوئے گا سب کو، وہ طُوفان ہے یہ
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

کسی ذہن میں ہے خیالِ وطن بھی؟
کسی دل میں ہے قوم کی کچھ لگن بھی؟
کسی کو ہے درد و ملالِ چمن بھی؟
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

زمانے کو کیا مُنہ دکھاؤ گے؟ لوگو!
نظر غیر سے کیا ملاؤ گے؟ لوگو!
سبق امن کا کیا پڑھاؤ گے؟ لوگو!
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

شرافت کا پھر دَور آئے، خُدایا!
محبّت کا پھر دَور آئے، خُدایا!
رفاقت کا پھر دَور آئے، خُدایا!
مرے دیش میں آج کیا ہو رہا ہے؟

یوسف ناظم

کھیل دُنیا میں بہت ہیں لیکن بہت سے کھیل ایسے ہیں جن میں جان کا خطرہ ہے۔ ایک کھیل تو ایسا بھی ہے جس میں ریفری دس تک گنتا رہتا ہے اور کھلاڑی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ کیونکہ یہ اُن لوگوں میں جا ملتا ہے جن کے بارے میں گرے نے اپنی مشہور نظم "گورِ غریباں" میں کہا ہے کہ اب کوئی صدا ان کے کانوں تک نہیں جا سکتی۔ اِس کھیل کا نام مکّہ بازی ہے۔ کچھ کھیل ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں صرف کھلاڑیوں ہی کی جان کو خطرہ نہیں ہوتا ریفری بھی موت کے مُنہ میں تشریف لے جا سکتا ہے اور کچھ عوام بھی مارے جاتے ہیں۔ (عوام کی زندگی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے) اِس لئے اگر جان کی سلامتی کو ملحوظ رکھنا ہے تو صرف جُوا ایسا کھیل ہے جس میں خطرہ مال کا ہے جان کا نہیں۔ یہ دُنیا کا آسان ترین کھیل ہے۔ اس کے لئے نہ تو کوئی میدان درکار ہے نہ کوئی سامان۔ اِس کھیل میں عقل کا بھی دخل نہیں ہے اِس لئے پچھلے زمانے میں راجے مہا راجے جُوا ہی کھیلا کرتے تھے۔ جُوا دُو راہ گیر بھی کھیل سکتے ہیں اس وقت تو اِس میں سِکّہ اچھالنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کسی درخت پر دُو پرندے قریب قریب بیٹھے ہوں (پرندوں میں یہ دستور ازل سے چلا آرہا ہے کہ جب دو پرندے کسی درخت یا ٹیلی فون کے کھمبے پر بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے سے لگ کر ہی بیٹھتے ہیں) تو دو راہ گیر اس پر جُوا کھیل سکتے ہیں کہ ان دونوں پرندوں میں سے کونسا پرندہ پہلے اُڑے گا۔ اِس طرح ایک راہ گیر کی دولت دوسرے راہ گیر کی جیب میں منتقل ہو سکتی ہے۔ یہ سچّا جُوا ہوتا ہے۔ اس میں بے ایمانی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ فیصلہ یقینی ہوتا ہے کیونکہ دونوں پرندے ایک ساتھ نہیں اُڑتے (اُن میں آدمیوں کی طرح تین ٹانگوں کی پرواز نہیں ہوا کرتی)۔ جُوئے کی رقم ایک روپے سے لے کر ایک لاکھ روپے تک بھی ہو سکتی ہے۔ ایک لاکھ تک اس لئے کہ آج کل ایک لاکھ روپیہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ روپے کی اتنی بے عزتی اور بدنامی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

جُوا فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے اس لئے عوام پر پابندی ہے کہ وہ جُوا نہ کھیلیں۔ پانچ ستاروں والے ہوٹلوں اور کئی ستاروں والے کلبوں میں البتّہ اس کی مخالفت نہیں ہے۔ عوام کی خوشنودی کی خاطر اعلیٰ پیمانے پر لاٹریوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ لاٹری

میں عوام کی بہبودی کا بھی راز مضمر ہے اس لئے اس کے
باضابطہ بروشر بھی چھپتے ہیں ریڈیو پر خوش آواز اور ٹیلیویژن
پر ہنس مکھ خواتین لاٹری کے بارے میں کچھ نثری نظمیں پیش
کرتی ہیں جو ترنم میں بھی ہوتی ہیں حالانکہ نثری نظم اور ترنم کا
معاملہ ایسا ہی ہے جیسے ببول کی ٹہنیوں سے گلدستہ بنانا۔
لاٹری کو قبولِ عام بنانے کے لئے ٹیلی ویژن پر کسی گھر
کے افرادِ خاندان کو بے حد مسرور حالت میں ملاحظے کے لئے
پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ سب لوگ اس لئے مسکراتے اور
کھلکھلاتے ہیں کہ صاحبِ خانہ لاٹری کے ٹکٹ کے ساتھ گھر
میں داخل ہوتے ہیں۔ لاٹری کے ٹکٹوں کی فروخت کے سلسلے
میں شاید ایک ہاتھی کو بھی زحمتِ سخن دی جاتی ہے۔ لیکن
لاٹری جوا نہیں ہے۔ جوئے میں تو آدمی پکڑا جاتا ہے۔ گرفتار
ہوتا ہے۔ عدالت میں پیش ہوتا ہے اور کئی دن سرکاری
مہمان رہتا ہے۔ سرکاری مہمانوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔
کچھ تو وہ مہمان ہوتے ہیں جو خصوصی طیاروں کے ذریعے
خیر سگالی کا پیغام لے کر آتے ہیں اور جاتے وقت کچھ
"معلومات" ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ معلومات انھیں وہ لوگ
فراہم کرتے ہیں جنھیں ان معلومات کو سب سے چھپانے کی
تنخواہ دی جاتی ہے۔ (لیکن صرف تنخواہ سے کیا ہوتا ہے)

جوا ہماری تہذیب اور تاریخ کا حصہ ہے اور اس
حصے میں کئی روشن باب ہیں جن کے مطالعے سے ہمیں اس
بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے اس کھیل
میں اپنا بڑا نام پیدا کیا اور ہمارا نام روشن کیا تھا (اسلاف
کے معاملے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا شجرہ ان سے
ملتا ہو۔ اسلاف تاریخ میں انھیں بھی کہا جاتا ہے جو ہم
سے بہت پہلے پیدا ہوئے ہوں، لاولد مرے ہوں اور
جنھوں نے حکمراں ہونے کی صورت میں آدھی سلطنت
جوئے میں ہاری ہو۔ جوئے کی تاریخ کا ایک دلچسپ لیکن
انوکھا پہلو یہ ہے کہ اس میں شہرت صرف ہارنے والے کی ہوا
کرتی ہے جیتنے والے کے نام کا دُور دُور تک پتہ نہیں
چلتا۔ (یہ فلسفہ ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہا ہے) جوئے
یعنی اعلیٰ درجہ کے جوئے کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس میں
صرف ایسی چیزیں داؤ پر لگائی جائیں جن کا کوئی مصرف
ہو ــــ خواہ ویسے جو چاہیں کریں ــ جوئے میں
دھوکا نہیں دیتے۔ وہاں جوا اس بات پر بھی کھیلا جاتا ہے
کہ اس سال ویمبلڈن چیمپئن کون ہوگا۔

یہ تفریحی جوا ہوتا ہے اور اس میں ہر وہ شخص حصہ لے سکتا ہے
جس کے پاس گرین کارڈ ہو یا نہ ہو۔ جوئے میں شہرت
نہیں دیکھی جاتی اور نہ پوچھا جاتا ہے کہ پچھلے پندرہ سال
سے آپ یہاں ہیں یا نہیں۔ کسی بھی ملک میں جوئے کو
ڈومی سائل سے ملوث نہیں کیا گیا۔

اپنی اپنی سوچ کے مطابق ہر شخص کی ایک
تمنا ہوتی ہے۔ جوئے کے شوقین لوگ اپنے دل میں یہ تمنا
رکھتے ہیں کہ وہ دن کب آئے گا جب وہ مانٹی کارلو میں
جا کر جوا کھیلیں گے۔ مانٹی کارلو، قمار پرستوں کے لئے
ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ یہ تنہا مقام
ہے جہاں جوا کھیلنے والوں کی آخری رسوم کا بھی شاندار
انتظام ہے۔ سارے اخراجات کلب کے ذمے ہوتے ہیں۔
دنیا ابھی نیک لوگوں سے خالی نہیں ہوتی ہے۔

مہذب جوئے کی ایک شاخ گھوڑدوڑ کے نام
سے مشہور رہی ہے۔ جوا اتنا مقبول ہوا ہے کہ اس

کیلئے اعلیٰ درجے کے ریس کورس بنائے جاتے ہیں (ایک
ریس کورس پر کافی زمین خرچ ہو جاتی ہے) گھوڑوں کا

عالمی مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں تمام ملکوں کے مندوبین حصّہ لے سکتے ہیں۔ یہی جُوا ایک ایسا ہے جس میں آدمی کو کافی مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ریس میں شریک ہونے والے گھوڑوں کے خاندانی حالات اور پس منظر سے پوری واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اچھے اور تجربہ کار کھلاڑیوں کو مقابلہ کنندہ گھوڑوں کا بایوڈاٹا زبانی یاد رہتا ہے۔ گھوڑ دوڑ میں سب سے اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں زنانہ اور مردانہ دوڑیں الگ الگ نہیں ہوتیں جبکہ آدمی جو ہمیشہ مساوات کی بات کرتے ہیں، ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ کچھ کھیلوں میں اس میں شک نہیں مکسڈ ڈبلز کے نام سے مقابلے ضرور ہوتے ہیں لیکن گھوڑ دوڑ کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اِس دوڑ میں کسی تخصیص کا ذکر تو الگ رہا اس کا احساس تک نہیں ہوتا نہ شرکاء کو نہ ناظرین کو۔ یہ جُوا ہمیں بہت پسند ہے۔ ہر کھلاڑی کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک، ایک پنسل اور ساتھ میں ایک "ہم سفر" ہوتی ہے۔ اور کھلاڑی کے حرکات و سکنات سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص صرف جُوا نہیں کھیل رہا ہے کوئی اہم کارنامہ انجام دے رہا ہے جس کے نتائج دور رس ہوں گے۔ کس گھوڑے پر کتنا روپیہ ضائع کرنا چاہیئے یہ بات صرف کھلاڑی جانتا ہے۔ کھلاڑی کی ہم سفر اس سے بے تعلق رہتی ہے۔ (وہ بھی آخر کس کس سے تعلق رکھے) یوں وہ چاہتی ضرور ہے کہ جس گھوڑے پر بھی یہ روپیہ لگایا گیا ہے وہ جیت جائے (خواہ وہ کتنا ہی ناکارہ کیوں نہ ہو) اِس جیت میں ضمناً اس کا بھی فائدہ ہے۔ جب سب گھوڑے دوڑنے لگتے ہیں تو کھلاڑی ان کی ہمّت اَفزائی کے لئے نعرے لگاتے اور تالیاں بجاتے ہیں لیکن گھوڑوں کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ کون کس کے لئے تالیاں بجا رہا ہے۔ اسی کنفیوژن میں اکثر گھوڑے جنھیں پیچھے رہنا چاہیئے آگے نکل جاتے ہیں (آج کل آدمیوں کے معاملے میں بھی یہی ہو رہا ہے) لیکن گھوڑوں میں ایک بات بہت اچھی ہے کہ انھیں ہارنے جیتنے کا نہ تو کوئی غم ہوتا ہے نہ خوشی۔ کم سے کم اُن کے چہروں سے کسی خاص تاثر کا اظہار نہیں ہوتا۔ گھوڑوں کا یہ رویّہ کچھ اچھا نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے۔ گھوڑے صرف حیوان ہوتے ہیں حیوانِ ظریف نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ خاندانی گھوڑوں میں کچھ فطری بے نیازی بھی ہوتی ہے۔ ریس جیتنے پر وہ اپنے مالک اور اتالیق کے ساتھ، مہمانِ خصوصی کے سامنے جاتے ضرور ہیں لیکن یہ صرف ازراہِ اخلاق ہوتا ہے ورنہ اُن کا کام تو حسبِ استعداد دوڑنا ہوتا ہے۔ مہمانِ خصوصی سے مصافحہ تو ان کے مالک ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ اِس جُوئے میں بس ایک ہی خرابی ہے وہ یہ کہ گھوڑے کا حسب نسب تو دیکھا جاتا ہے لیکن اس جاکی کے بارے میں کوئی تحقیق یا تفتیش نہیں کی جاتی جس کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام ہوتی ہے۔ (اسے یکطرفہ کارروائی کہا جا سکتا ہے)

ریس کورس میں کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو صرف ریس دیکھنے آتے ہیں ریس کھیلنے نہیں آتے۔ ان کے گلے میں ایک دوربین بھی لٹکی ہوتی ہے۔ ان لوگوں سے آج تک کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیوں آتے ہیں اور اس لیے نہیں پوچھا کہ خود انھیں اس کی وجہ معلوم نہیں ہوا کرتی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہر کام سمجھداری ہی کا کرے۔

جُوا چونکہ ہماری سرشت میں داخل ہے اس لئے لوگ شادی کو بھی جوا ہی کہتے ہیں۔ ہم بہرحال اسے جُوا نہیں مانتے کیونکہ جُوئے میں صرف ایک فریق ہارتا ہے۔ شادی میں تو دونوں فریق ہارتے ہیں اور وہ بھی بُری طرح۔ یہ جُوا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں شادی کو اِس جُوئے سے ضرور تشبیہ دی جا سکتی ہے جو بیلوں کی گردن پر رکھا جاتا ہے۔

ایک مرحوم دوست کے نام

جگن ناتھ آزاد

(۱)

عزیز دوست! مرے دل میں بسنے والے دوست
پھر آج میری نظر ہے تری تماشائی
جو دور بیت چکا تھا وہ پھر سے لوٹ آیا
وطن سے دور بہت دور تیری یاد آئی

(۲)

وہ پھول تیرے چمن کے وہ میرے نورِ نظر
نسیم سرور و نسرین و افتخار نسیم
پھر آج میری نگاہوں نے ان کو دیکھا ہے
کروں ادا بھی تو کس طرح شکرِ ذاتِ کریم

(۳)

چھٹے ہیں جب سے چمن زارِ پنڈی و لاہور
حیات اپنی بسر ہو گئی بگولوں میں
اور اب شکاگو میں آ کر ہوا ہے یوں محسوس
ترے مزاج کی خوشبو ہے تیرے پھولوں میں

(۴)

ترے مزاج پہ مجھ کو ہمیشہ رشک آیا
مزاج تجھ کو دیا تھا وہ دینے والے نے
تری حیات کو چمکا دیا مثالِ سحر
ترے خیال، تری روح کے اجالے نے

(۵)

یہ دورِ حرص دلِ بے نیاز تجھ کو ملا
عجب متاع تھی تیری وہ بے نیازیِ دل
یہ بے نیازیِ دل ہے خدا کی خاص عطا
اسی سے پائی ترے دل نے سرفرازیِ دل

(۶)

نگاہِ دل تھی تری منزلِ حقیقت پر
منارِ نور کا گویا تھی زندگی تیری
مجھے ہمیشہ رہا فخر و ناز اس پہ کہ تھی
بہت بڑا مرا سرمایہ دوستی تیری

(۷)

عزیز دوست! مرے دل میں بسنے والے دوست
تری متاعِ دل و جاں ہے تیری یادِ عزیز
مرے جہاں میں، مری زندگی کے جادے پر
مثالِ مشعلِ تاباں ہے تیری یادِ عزیز

پیاری سہیلی۔

زندگی حسین بہار کا نام ہی تو نہیں۔ خزاں بھی تو اس جہانِ رنگ و بو کا ایک حصہ ہے۔ خوبصورتی اپنی جگہ۔ حسین اور تیز گام سواروں سے ہی تو کاروانِ زندگی کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ بدصورتی بھی اہم فریضہ ادا کرتی ہے۔ گو موازنہ کیلئے ہی سہی۔

آج میں تمہارے خط کا جواب کسی اور ڈھنگ سے دینے جا رہی ہوں۔ تم حیران بھی ہوگی شاید۔ طویل خط لکھنا میری عادت نہیں تم جانتی ہی ہو۔ مگر کیا کروں ؟ تمہیں یہ بھی دیکھ کر تعجب تو ہوا ہوگا کہ جب تم نے یہ لفافہ کھولا تو ان کاغذات کے ساتھ جن پر میں تم سے مخاطب ہوں، ایک فوٹو نے بھی تمہاری طرف جھانکا۔ ایک نوجوان لڑکے کی فوٹو۔ ظاہر ہے کہ تم نے خط پڑھنے سے پہلے اس فوٹو کو دیکھا ہے۔ اس فوٹو میں جو لڑکا ہے اس کا چہرہ ٹیڑھا ہے۔ یہ تم نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا ہوگا۔ یہ فوٹو ٹرک نہیں حقیقت ہے۔ اگر تم اس فوٹو کو ذرا اور غور سے دیکھو گی تو تمہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس نوجوان کی ایک ٹانگ بھی ٹیڑھی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد تم سوچ رہی ہوگی کہ میں نے یہ فوٹو تمہیں کیوں بھیجی ہے۔ کیا میں تمہیں ششش و پنج میں رکھوں ؟ سسپنس کبھی تو ہونا چاہیئے،

زندگی میں ؟ تم ہی تو کہا کرتی ہو۔ خدا سب سے بڑا افسانہ نویس ہے، اُس نے کبھی کسی کردار کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ آنے والا پل اُس کے لئے اپنے پہلو میں کیا لائے گا۔ مگر مجھے ایسا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ میں اس نوجوان سے شادی کر رہی ہوں۔

”ہیں ؟“ میں جانتی ہوں کہ تم نے اپنی عادت کے مطابق حیرانی ظاہر کی ہوگی۔ ایک خوبصورت، متوازن اعضاء والی، لمبے گھنگھریالے بالوں اور آہو چشم، صراحی دار گردن والی لڑکی۔ اس لڑکے سے شادی کرے گی ؟ تم نے استفساریہ انداز سے سوچا ہوگا۔ پھر تمہارے ذہن میں یکلخت یہ خیال ابھرا ہوگا کہ شاید میرے شرابی اور جواری باپ نے یا میری مجبور نرس ماں نے یہ رشتہ طے کیا ہو۔ مگر ایسا نہیں۔

یہ لڑکا میرے ہی دفتر میں، میرے ساتھ والی سیٹ پر کام کر رہا ہے۔ یہ جانکاری ملنے پر شاید یہ اندازہ لگاتے ہوئے چہک اٹھو گی تو یہ بات ہے • بی مینڈکی کو عشق کا زکام ہو گیا ہے۔“

یہ سوچ کر تمہاری بی بی مینڈکی قہقہہ لگا کر ہنسنا چاہ رہی ہے۔ اری، میری پیاری۔ پیاری سہیلی۔ ایسا نہیں۔ اور یہ بھی سن لو، کہ یوں بھی نہیں کہ میں نے اس لڑکے پر

تیمور ہریانہ

ترس کھایا ہو۔ ؟ اری رحم کرنا تو رب کریم کا کام ہے ہم دوزخیوں کا کہاں ؟

دراصل تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں تو اس لئے کہ جب کبھی ملیں گے تو تم یہ ڈھیر سارے سوال مجھے ایک بار حل کرنے کو کہو گی اور حکیمانہ انداز سے فوراً جواب مانگو گی ۔ جانتی ہی ہو ۔حاکم ،حکام ۔ رعب ، دبدبہ ، میں ان سبھی سے ڈرتی ہوں ۔ اپنے اس شادی کے فیصلے کے بارے میں ،تمہیں سب سے پہلے بتا رہی ہوں ، اپنے والدین کو اس ''خوبصورت خبر'' کو سننے کے لائق میں نہیں سمجھ پا رہی ۔ بہت کوشش کرنے پر بھی ۔مگر کیوں ؟

اس کیوں کا جواب ،کچھ تم جانتی ہو اور باقی کا میں بتلائے دے رہی ہوں (کوئی ضروری کام تو نہیں کرنا تم نے اگر ایسا ہے تو فرصت میں پڑھ لینا اسے میں تو اب اس خط کو مکمل کر کے دم لوں گی)

تم نے میرے والد کو دیکھا ہے ؟ اونچے قد کا ،بھرے جسم کا ، بارعب چہرہ ، وجیہہ شخص رہا ہوگا اپنی جوانی کے دنوں میں ۔ اور شاید اسی خوبصورت آدمی کے لئے چھریرے بدن ۔ بیضوی چہرے اور موٹی موٹی آنکھوں والی (جن پر آج کل عینکیں سوار ہیں) میری نرس ماں ، جو خود بھی کسی طرح کم حسین نہیں رہی ہو گی ، کے دل میں کوئی ''یوں ۔یوں'' کا جذبہ ابھرا ہو گا ۔میرا باپ سرکاری ہسپتال میں کلرک تھا ۔ (اب ترقی کر کے سول سرجن کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں صاحب) اور میری ماں اسی ہسپتال میں نئی نئی ٹریننگ کرکے نرس لگی تھی ۔ غریب گھر کی یہ لڑکی کسی نہ کسی طرح نرسنگ کا کورس تو پاس کر گئی تھی مگر نوکری کے لئے اُن کے ماں باپ کو آسرے کی ضرورت محسوس ہوئی اور تبھی پڑوس کے اس کلرک نے مدد کر کے اسے نوکر کروا دیا تھا ۔یہ احسان اور پھر اس پر جوان عمر ،میرے باپ نے غالباً میری ماں پر ڈورے ڈالے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ میری ماں کو بھی وہ کچھ اچھا اچھا سا لگا ہو ۔ پڑوس ، صبح ہسپتال کے ایک سے اوقات ،تنخواہ کے بلوں ،ڈیوٹیوں کے لئے بھاگ دوڑ ،سبھی کچھ رہا ہوگا ۔ پوری تفصیلات تو مجھے کسی نے بتائی نہیں ۔ مگر اتنا معلوم ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہمارے گھر میں تین لڑکیاں اور ایک چھوٹا بھائی تھا ۔ مجھ سے میرا بھائی چھوٹا تھا ۔

اسے شاید تم لو میرج (پیار کی شادی) کا نام دو ۔ مگر میں اسے کیا نام دوں ۔کچھ سمجھ نہیں پا رہی ۔ ہاں مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی ہی دن شاید ایسا گذرا ہو جب میرے باپ اور میری ماں کے درمیان کسی نہ کسی بات پر تنازعہ نہ ہوا ہو ۔ باپ نے شراب پینی شروع کر دی تھی ۔ وجہ جواز ماں کو دیئے جانے والے طعنوں میں ڈھونڈی تھی ''ہم نے رات رات بھر ہسپتال میں ڈیوٹی کے بہانے نہ جانے کیا کیا کرتی رہتی ہے'' جب ہم بہنوں نے کچھ ہوش سنبھالا تو بات سمجھ آنے لگی ۔ ہماری ماں کبھی تو ترکی بہ ترکی جواب دیتی اور کبھی خاموش رہتی ۔ اگر شراب کے لئے روپے مانگنے پر میری ماں آنا کانی کرتی تو وہ اُسے پیٹ ڈالتا ۔ ایسے وقت کئی بار بیچ بچاؤ کرتے ہم بھی پٹ جاتی تھیں ۔ ماں روتی رہتی اور پھر رو پیٹ کر چُپ ہو جاتی ۔

ہمیں پڑھایا تو جا رہا تھا مگر ہم ہی جانتی ہیں کہ ہم نے پڑھائی کے مختلف مراحل کیسے طے کئے جونہی بڑی بہن نے میٹرک پاس کیا ۔ اُسے میری ماں نے کسی کی منت سماجت کر کے نوکر کروا دیا تھا ۔ اگلے سال دوسری بہن نے میٹرک پاس کیا تو اس کے لئے بھی دوڑ دھوپ شروع ہوئی ۔ آخر اُسے بھی نوکری مل گئی ۔

میں میٹرک کے بعد بھی پڑھنا چاہتی تھی ۔میری ضد دیکھو ۔میری ماں نے مجھے ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھنے کے لئے ڈال تو دیا مگر مجھے گھر کا کام کاج بھی کرنا پڑتا تھا ۔ کیونکہ اب گھر میں سوائے چھوٹے بھائی کے سب کام پر جاتے تھے ۔

(مگر ہاں تم بور تو نہیں ہو گئی یار ۔ میں تو اب اپنی بات کہہ کر ہی ختم کروں گی ۔تم چاہو تو پھر پڑھ لینا اسے)

تو ہاں اتنے لمبے چوڑے عرصے میں یہ نہیں ہوا کہ میرے

والدنے میری ماں کے ساتھ جھگڑا کرنا چھوڑ دیا ہو۔ یا میری ماں کی کبھی پٹائی نہ کی ہو۔

اب وہ اکثر کہا کرتا "نہ جانے کس منحوس گھڑی میں نے تم سے شادی کی تھی"

(جیسے شادی اُس نے کی تھی۔ تم تو کہا کرتی ہو کہ شادی بھگوان پہلے سے ہی طے کر دیتا ہے آسمان میں۔ اور زمین پر تو صرف رسم ہی سرانجام دینی ہوتی ہے اسی لئے تو تم اب ایک افسر کی بیوی ہو)

ماں کبھی کبھی جواب دے ہی ڈالتی "نہ کرتے تم نے ہی تو ...." اور فقرہ غیر مکمل ہی رہ جاتا تھا۔

(شاید ہمیں خالی جگہ بھرنے کی پریکٹس کروائی جا رہی ہو)

اب والدِ محترم جُوا بھی کھیلنے لگے تھے۔ وقت کاٹنے کے لئے۔ سونے پر سہاگہ، شراب اور جُوا کا چولی دامن کا ساتھ تو (کہتے ہیں) ہوتا ہی ہے۔ وہ شراب اور جُوا کیلئے روپے مانگتا تو ماں اُسے جوان لڑکیوں کی شادی کے لئے فکرمند کرنا چاہتی مگر.......

ایک بار جن الفاظ کا استعمال میرے والد نے اس بارے میں کیا ہے اُسے کوئی بھی خوددار انسان اپنی اولاد کے لئے واجب نہیں سمجھے گا مگر شراب اور جُوا ایک انسان کو عام انسان کہاں رہنے دیتا ہے خودداری کی بات، تو خیر دُور کی بات ہے۔

اور پھر یوں ہوا کہ میری بھی نوکری لگوا دی گئی۔ اب میں بھی ایک سرکاری دفتر میں کلرک کے طور پر کام کرنے لگی۔

بڑی بہن کی شادی کی فکر ہوئی تو کوئی نوکری کرنے والی لڑکی چاہتا تھا تو کوئی نوکری نہ کرنے والی۔ کوئی بی۔اے پاس لڑکی چاہتا تھا تو کوئی بڑا گھر۔ میری بہن خوبصورت تھی۔ (ارے اس سے کیا ہوتا ہے؟) گھر کے کام کاج میں ماہر۔ نوکری بھی کرتی تھی۔ بڑی مشکل سے شادی طے ہوئی۔ شادی ہوئی۔ جہیز پر کافی رقم خرچ ہوئی۔ اگر اس پر بھی وہ خوش رہتی تو کوئی بات تھی میری

بہن کے سسرال والوں نے اُسے کمائی کرنے کی مشین سمجھ کر حاصل کیا تھا۔ لڑکا ایئر فورس میں تھا مدراس میں تعینات۔ میری بہن کی تنخواہ ساری کی ساری ساس کے سپرد ہوتی۔ جسے اپنی لڑکیوں کی شادی کی فکر تھی۔ ہمارا جیجا کبھی کبھی آتا۔ بہن کی نوکری چھڑوا اس کے ساتھ جانے کا مطلب تھا آمدن میں کمی۔ میری بہن دُکھی رہنے لگی۔ اور پھر اُسے بخار رہنے لگا۔ اور پھر اچانک اُس کی موت ہو گئی۔

ہمارے والد کے طعنے تیز ہو گئے تھے "اور کر شادی" "تو شادی نہ کرتی تو کیا کرتی"

"ابھی جلدی بھی کیا تھی۔" بادل گرج رہا تھا۔ مار پٹائی کی بارش کی آمد آمد تھی۔

"تمہیں تو شراب پینے اور جُوا کھیلنے سے ہی فرصت نہیں۔ لڑکیاں جوان ہیں۔ دوسری لڑکیوں کی فکر ہی کر لو۔ اب تم ہی......"

جواب کی جگہ ایک غلیظ گالی ملی۔ جیسے بجلی چمکی ہو، اور پھر میرا والد غصّے سے بپھرا شراب پینے نکل گیا۔ بارش ٹل گئی تھی۔

ماں کا خیال تھا کہ اس نے شادی کی تھی تو اسے پیار کی شادی کہا گیا۔ مگر وہ کامیاب نہیں رہی۔ روز روز کے تنازعے اس بات کے گواہ تھے۔ اوائل جوانی کے ہنگامہ پرور دن مون سون میں طوفان زدہ پہاڑی نالے کی طرح تھے۔ بارشیں گذر جانے پر اُن میں ریت ہی اُڑا کرتی ہے۔ اگلی مون سون تک مگر میری ماں کی زندگی میں مون سون کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔ اب اُن میں آپس کے اعتماد کا فقدان تھا۔ جو شادی اُس نے طے کی اس میں جوان بیٹی، موت کے منہ کا نوالہ بنی۔ کم پڑھی لکھی، شرابی اور جواری باپ کی بیٹی اگر نوکری بھی کر رہی تھی تو کیا ہوا۔ اچھا ور کہاں سے ملتا؟

اب میری ماں کو دوسری بیٹی کا فکر تھا۔ ہر اتوار کو انگریزی اخبار کے شادی کے اشتہارات دیکھے جاتے۔

ہی تفریحاً۔ ہر کام میں اور میری بہن کرتی تھیں۔ اشتہار پڑھ کر ہنستی رہتیں کسی کو خوبصورت سوشیل بی۔ اے پاس لڑکی چاہیئے تھی تو کسی کو اسکول یا بینک میں کام کرتی ہوئی۔ کسی کو اونچے قد کی چھریرے بدن والی تو کسی کو صرف لڑکی کی خصوصیات پر ہی قناعت تھی۔ میری بڑی بہن کبھی کبھی سنجیدہ ہو جاتی اور مجھ سے پوچھتی۔ کیا شادی کرنا ضروری ہے ؟

اور پھر یوں ہوا کہ میری اس بہن نے جھیل میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ وجہ کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ مجھے بھی نہیں۔ اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ "اپنی مرضی سے زندگی چھوڑ رہی ہوں۔" پولیس کے لیئے کافی تھا۔ مگر ہمارے لیئے نہیں۔ خاص کر میری ماں کے لیئے والد کیلیئے (بتاؤ تو یہ والدصاحب صرف بچے پیدا کرنے کے علاوہ بھی کسی کام آتے ہیں ؟) میرے خیال میں اُس بہن نے اپنی ماں کو اپنی شادی کی فکر سے نجات دلانے کے لیئے یہ قدم اٹھایا تھا۔

(تو یار تم سوچ رہی ہوگی کہ تمہیں میرے خاندان سے کیا دلچسپی ہے بھلا۔ مگر۔ تو اچھا اب میں اپنی بات ہی کہوں گی۔ لو بس۔ اب تو خوش ہو)

اب میں تھی تیسری لڑکی۔ جو جوان تھی۔ برسرِ روزگار تھی اور شادی کے قابل تو پھر کرنا خدا کا، ہوا یوں کہ میں جس دفتر میں کام کر رہی ہوں۔ اُسی میں میرے ساتھ والے میز پر ایک لڑکا کام کرتا تھا۔ "رمیش"، اُس کو جسم میں پیدائشی نقائص کی بنا پر نوکری ملی تھی۔ ویسے وہ بی۔ اے پاس ہے۔ دفتر کے کئی دوسرے نوجوان جو نوجوان لڑکیوں کو پھنسانے کے چکر میں تھے (یہ پھنسانا کیا ہوتا ہے یار ؟) اُس کے پاس آتے (دراصل وہ میرے پاس آتے تھے ؟) اس سے مذاق سے پوچھتے "رمیش، تم شادی کب کر رہے ہو ؟" اور رمیش کبھی تو جواب ہی نہ دیتا یا کبھی اتنا کہہ کر ہی خاموش ہو جاتا "سوچا ہی نہیں ابھی۔"

ہم لڑکیاں انٹرول میں اکٹھی ہوتیں تو اکثر ان لڑکوں کے بارے میں باتیں کرتیں۔ ان کی حرکات کا تمسخر اُڑاتیں اور رمیش کے بارے میں ہماری سب کی ایک ہی رائے تھی "۔ اس بے چارے سے شادی کون کرے گا ؟ جو بھی دیکھے گا۔ اُس سے نفرت کرے گا۔

مجھے بھی تو پہلے پہل اُس کے پاس بیٹھنا کچھ ناگوار سا گذرتا تھا مگر اُس کی بول چال کے ڈھنگ اور جذبہ سے آہستہ آہستہ میں اُسے برداشت کرنے لگی تھی۔

کبھی کبھی جب میں گھر کی بات پر دُکھی اور اُداس ہوتی تو وہ مجھ سے پوچھ لیتا۔

"کیوں جی۔ کیا بات ہے ؟"

"سر درد ہے" میں ٹالنے کے خیال سے کہتی۔ سر میز پر ٹکا کے کہنیاں میز پر رکھے سر کو دبانے کا بہانہ بناتی۔

وہ چپراسی کو آواز دے کر یا کبھی خود ہی اسپرو کی ٹکیا لے آتا اور چائے منگوا لیتا۔ پہلے پہل تو مجھے ناگوار گذرا۔ میں نے اُسے سختی سے منع کر دیا۔ (میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُلّو کہیں کا)"

ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گئی کہ جس جگہ ہم دونوں بیٹھتے تھے وہاں کمرے کا ایک کونہ تھا۔ وہ ریکارڈ کا کام کرتا تھا اور میں ڈائری کا۔

میری سہیلیاں کبھی کبھی مجھ سے اُس کے بارے میں پوچھا کرتیں۔ میرے جواب بے دھڑک ہوتے۔ مگر پھر وہ مجھے ایک اچھا لڑکا لگنے لگا بدصورتی کے باوجود۔

پھر ایک دن ہمیں پتہ چلا کہ رمیش کو دیکھنے کوئی آیا تھا۔ ہیڈ کلرک سے اس کی تنخواہ اور اس کے بارے میں دوسری جانکاری حاصل کرنے۔ دوسرے لڑکوں نے بہت سے سوال کر ڈالے تھے اُسے مگر دن مہینے گذر گئے اور رمیش اُسی طرح کام پر آتا رہا۔

ایک دن پتہ چلا کہ رمیش کے والد کی وفات ہوگئی تھی۔ ہم دفتر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس کے باپ کو

نملہ ھریانہ

ملے سرکاری کوارٹر میں ماتم پرسی کرنے گئے تھے۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ رمیش کی ماں اور ایک بہن کے علاوہ، اُن کے پسرِ لیواریں اور کوئی نہ تھا۔

رمیش کو ایک ماہ کی رخصت لینی پڑی۔ اُسے ہردوار جانا تھا سرکاری مکان کو اپنے نام منتقل کروانا تھا۔ باپ کی فیملی پنشن کیلئے بھاگ دوڑ کرنی تھی۔

ایک دن مجھے ہیڈ کلرک نے کسی ضروری فائل کو تلاش کرنے کے لئے کہا۔ مجھے وہ فائل نہیں ملی۔ ہیڈ کلرک صاحب کا حکم تھا کہ میں رمیش سے اُس فائل کا پتہ کروں کیونکہ یہ فائل افسرانِ بالا کو فوری چاہیئے تھی۔

میں نے چپراسی کو کہا تو اُس نے بہانا بنا کر انکار کر دیا۔ پھر میں دفتر کی ایک لڑکی کے ساتھ اُس کے گھر گئی تھی۔ فائل کا پتہ اُس نے بتا دیا تھا۔ مگر جس ڈھنگ سے اس کے گھر والوں نے ہماری عزت کی تھی اور جس تہذیب سے اُس نے ہم سے بات کی اس کا ہم دونوں پر اثر ہوا تھا۔

اور پھر میں نے سوچا۔ میرا باپ خوب رو تھا۔ میری ماں بھی خوبصورت تھی۔ مگر کیا اُن کی زندگی بھی خوبصورت رہی؟ میرے دماغ میں نہ جانے کیا کیا گھوم گیا۔ جہیز کی دباشی کہ پلنگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ نئے قوانین نے جہیز کا رنگ روپ بدل دیا تھا مگر حالت وہی کی وہی۔

پھر ایک دن ہمارے محلے میں ایک حادثہ ہوا۔ ایک نوجوان بہو کو اُس کی ساس اور نند نے مٹی کا تیل ڈال کر جھلس ڈالا تھا۔ اور وہ لڑکی ہسپتال میں دم توڑ گئی تھی۔ (ایسی خبریں تو اخبارات میں تم بھی پڑھتی رہتی ہوگی)۔

لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کی تھیں۔ "لڑکی خوبصورت نہیں تھی۔"

"لڑکا کسی اور لڑکی سے پیار کرتا تھا۔ اُس کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔"

"لڑکی بدچلن تھی۔"

میں کیا کیا لکھے جا رہی ہوں۔ مگر میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ وہ کیا پس منظر تھا اور میری دماغی حالت کیا تھی جس میں، ایک دن میں نے وہ قدم اٹھایا جس کی لڑکیوں سے کم ہی امید کی جاتی ہے۔

میں رمیش کی میز پر گئی۔ وہ کوئی کاغذ فائل میں لگا رہا تھا۔ میں نے اپنی کرسی اس کے قریب کھینچ لی اور دھیرے دھیرے سے اُس سے مخاطب ہوئی

"رمیش جی"

"جی"

"کیا" رمیش میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں کچھ گھبرا سی گئی تھی مگر میں نے ہمت کر کے اُسے کہہ ہی ڈالا تھا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟"

رمیش کے تو جیسے کاٹو تو بدن میں خون ہی نہ رہا ہو۔ وہ خشک سے گلے سے بولا "جی، آپ کیا کہہ رہی ہیں"

"جو آپ نے سُنا" میں نے ہمت کی۔

"شاباش تو دیدہ کم بخت، دور بیٹھی ہو تو کیا ہوا؟"

پھر کچھ دنوں کے بعد رمیش نے اپنی والدہ اور بہن سے مشورہ کیا اور آج جبکہ میں ۲۱ برس کی ہو چکی ہوں ہم کورٹ میرج کرنے جا رہے ہیں۔

میں نے اپنی والدہ کو نہیں بتایا تھا۔

باپ سے مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔

مگر میں نے عشق تو نہیں کیا نا؟ میں اِسے وہ جذبہ بھی نہیں کہہ سکتی جسے لوگ پیار کا نام دیتے ہیں۔ میں نے تو خوب سوچ سمجھ کر حالات کا جائزہ لیکر لوگوں کی زندگی سے سبق سیکھ کر زندگی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

رمیش نے مجھے بارہ بجے کورٹ بلایا ہے۔ اور میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ مگر مجھے یقین سا ہو رہا ہے کہ کنڈلیوں کے چکر ملانے کے بعد بھی پوتر اگنی کے گرد سات پھیرے لیکر بھی زندگیاں دوزخ ہو جاتی ہیں تو میری زندگی ..... خیر؟

اس خط کو ختم کر رہی ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آ رہا ہے کہ تم اسے پیار کی شادی کہو گی مگر میں تمہیں بتا دوں کہ مجھے تمہارا سنایا ہوا وہ مصرع ابھی تک یاد ہے۔

کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

ہم ہیں ہندوستانی

بیتاب علی پوری

سب رنگوں سے اسے سجائیں
آؤ اک تصویر بنائیں!

پہلے ہاتھ آزر کے لائیں
پھر پتھر کی قدر بڑھائیں

قوتِ بازو سے ہم اپنی
خاک کو بھی اکسیر بنائیں

میری ہستی اُن کے آگے؟
سورج کو کیا دیپ دکھائیں؟

پیار وطن سے گر کرتے ہیں
سر پہ کفن ہم باندھ کے آئیں

اپنی ان بیدار آنکھوں میں
آؤ پھر کچھ خواب سجائیں

ہم بیتاب ہیں ہندوستانی
سب مل کر نعرہ یہ لگائیں

تہنیت

رزّاق افسر

صبحِ آزادی کی آمد سے کھِلے ہیں دل تمام
ہر نظر سے رنگِ گُل کا ہے عیاں عکسِ جمیل
مستقل ارضِ وطن میں ہے بہاروں کا قیام

(۲)

انجمن آرائیوں کے ہر طرف سامان نئے
درد کی بُنیاد کے سب راستے مسدود ہیں
ہر نفس نے ہیں سجائے زیست کے عنوان نئے

(۳)

بن گئی ارضِ وطن ہے آج رشکِ آسماں
رنگ لاکر ہی رہا آخر شہیدوں کا لہو
آج ہم آزاد ہیں آزاد ہے ہندوستاں

(۴)

حاصلِ آزادئ ارضِ وطن کی خیر ہو
آرزوئے دل یہی افسر دُعا بھی ہے یہی
ایک دل اہلِ وطن ہوں، ختم سارا بَیر ہو

شفیقہ فرحت

کردار:

خاتون ۱ — دلی کی رہنے والی۔

خاتون ۲ — مدراس کی رہنے والی۔

(پسِ منظر میں ریل کے چلنے کی آواز)

(سلیپر کا لیڈیز کیبن)

خاتون ۱ — اف فوہ ․ ․ ․ ․ ․ یا اللہ کتنی گرمی ہے ․ ․ ․ ․ یہ ریل کا ڈبہ کا ہے کو ہے جہنم کی ہے۔ اس میں رات گزار لی تو سمجھو ساری سزا کاٹ لی۔ اللہ ——— میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ میں تو کھولتی ہوں پنکھا ․ ․ ․ ․ ․ دکھٹ ․ ․ ․ ․ ․ ․ فر فر پنکھے کی آواز)

خاتون ۲ — (مدراسی لہجہ میں) تم پھر کولا نین

خاتون ۱ — گرمی لگ رہی ہے۔

خاتون ۲ — امارے بچے کو ٹھنڈی لگتی۔

خاتون ۱ — بلینکٹ اڑھا دیجئے۔

خاتون ۲ — ایوجی۔ تم نا مالوم نہیں۔ ام ساؤتھ انڈین۔ ساؤتھ میں کون لیتا جی بلینکٹ

خاتون ۱ — پھرا لے لیجئے۔

خاتون ۲ — (ناراض ہوکر) کیا بولتے جی تم۔ بچے کو دوسرے کا کپڑا کون ڈالتا (بچے کی کھانسی) دیکھو اس کو کالسنی بی آگئی۔ آف کردی نین دکھٹ)

خاتون ۱ — ارے ․ ․ ․ ․ ․ اچھا تو کھڑکی کھول دیجئے۔

خاتون ۲ — (جھنجھلاکر) رات کے وکت کیسے کولے گا جی۔

خاتون ۱ — کیوں۔

خاتون ۲ — چور ڈاکو گھستا تو۔

خاتون ۱ — اوہو۔ بارس میں سے کیسے گھسے گا۔

خاتون ۲ — تم آج کل کا لڑکی لوگ اتنا بے وکوف۔ بارس کاٹ کے آجاتا۔ نیئں تو کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کے جیور بیور لے سکتا۔

خاتون ۱ — لیکن مجھے تو سخت گرمی لگ رہی ہے۔

خاتون ۲: کھڑکی تو نہیں کھولے گا۔

خاتون ۱: آپ کو ڈر لگتا ہے تو آپ اوپر کی برتھ پر آجائیے۔ میں نیچے آجاتی ہوں۔

خاتون ۲: ام اتنا HEAVY اوپر کیسے چڑھے گا اور بچہ لوگ۔

خاتون ۱: (عاجزی سے) تو پھر کیبن کا دروازہ ہی کھول دیجئے۔

خاتون ۲: O No No بار سب جینٹس بیٹھا۔

خاتون ۱: (بڑبڑاتی ہے) عجیب خرد ماغ اڈیل سے پالا پڑا ہے . . . . . . ہائے اللہ اس کال کوٹھری میں صبح تک دم ہی نکل جائے گا . . . . . . اگر ان کو سردی لگتی ہے تو ہم کو گرمی۔ ہم تو کھولیں گے پنکھا۔ (کھٹ بھر۔ بھر۔)

خاتون ۲: واٹ نان سینس۔ بند کرو (کھٹ)

خاتون ۱: نہیں بند ہوگا۔ (کھٹ بھر بھر۔)

خاتون ۲: STOP IT (کھٹ)

خاتون ۱: ہرگز نہیں۔ (کھٹ۔ بھر۔ بھر)

خاتون ۲: نہیں چلے گا۔ (کھٹ)

خاتون ۱: چلے گا گا۔ (کھٹ) چلے گا۔ نہیں چلے گا۔ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ۔

(سکنڈ کلاس سلیپر
پس منظر میں ریل کے چلنے
دھننے کی آواز)

مرد ۱: (جماہی) سوا دس ہو رہا ہے (زور سے) میں نے کہا بھائی صاحب سوا دس بج چکے۔

مرد ۲: (چونک کر) جی۔

مرد ۱: سوا دس ہو گئے۔ بلکہ اب تو ½ ۱۰ ہو رہا ہوگا۔

مرد ۲: اچھا۔

مرد ۱: آپ کو نیند نہیں آرہی۔

مرد ۲: نہیں۔

مرد ۱: مجھے تو آرہی ہے۔

مرد ۲: تو سو جائیے۔

مرد ۱: (بڑبڑاتا ہے) تو سو جائیے۔ کیسے سو جائیے۔ آپ تو سر پہ سورج لٹکائے ہیں۔ کوئی سو کیسے سکتا ہے (زور سے) کیا بھائی صاحب کوئی جاسوسی ناول ہے۔

مرد ۲: نہیں۔

مرد ۱: تو پھر اس کا ختم کرنا کیا ضروری ہے۔

مرد ۲: نہیں جب نیند آئے گی تو چھوڑ دوں گا۔

مرد ۱: تو نیند کب آئے گی۔

مرد ۲: ارے صاحب نیند کا بھی کوئی وقت مقرر ہے جب آنی ہوتی ہے آجاتی ہے۔

مرد ۱: پھر بھی آخر گھر میں کب تک سوتے ہیں آپ؟

مرد ۲: یہی کوئی ایک ڈیڑھ بجے

مرد ۱: ہیں۔ ایک ڈیڑھ بجے۔؟

مرد ۲ — کبھی تین چار بھی بج جاتے ہیں۔

مرد ۱ — (حیرت اور غصّے سے) تین۔ چار۔

مرد ۲ — مگر آپ کو تو نیند آ رہی تھی سو جائیے نا
آپ تکلف کیا ہے۔

مرد ۱ — حضور تکلف نہیں۔ تکلیف۔

مرد ۲ — کیسی تکلیف۔

مرد ۱ — لائٹ۔ مجھے روشنی میں نیند نہیں
آتی۔ بند کر دیجئے۔

مرد ۲ — مجھے بغیر پڑھے نیند نہیں آتی۔ اس لئے
میں تو ابھی پڑھوں گا۔ آپ کروٹ
بدل لیجئے۔

مرد ۱ — اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔۔
سنا نہیں آپ نے۔

مرد ۲ — میں نے جو عرض کیا وہ آپ نے نہیں
سنا۔

مرد ۱ — مجھے صبح چھ بجے اترنا ہے۔ میں نے
پوری رات کے آرام کے لئے پیسے
خرچ کئے ہیں۔

۲ — تو پھر کوئی دوسری برتھ لے لیجئے۔

مرد ۱ — آپ لے لیجئے۔

مرد ۲ — مگر مجھے تو آپ سے کوئی شکایت
نہیں۔

مرد ۱ — فضول بحث نہ کیجئے۔

مرد ۲ — میں نے تو آپ سے کچھ کہا ہی
نہیں۔

مرد ۱ — کہنے سننے کی کوئی ضرورت نہیں
بس لائٹ آف کر دیجئے۔

مرد ۲ — ابھی نہیں۔

مرد ۱ — جی نہیں۔ بہت ہو چکا۔ (کھٹ)

مرد ۲ — یہ آپ کی زیادتی ہے۔ (کھٹ)

مرد ۱ — زیادتی تو آپ کر رہے ہیں۔ (کھٹ)

مرد ۲ — آپ کو کسی کی ذاتیات میں دخل دینے کا
حق نہیں۔ لائٹ نہیں بجھے گی۔ (کھٹ)

مرد ۱ — آپ کو بھی نہیں۔ بتی بجھے گی۔ (کھٹ)

مرد ۲ — جلے گی۔ (کھٹ)

مرد ۱ — بجھے گی۔ (کھٹ)

مرد ۲ — جلے گی۔

مرد ۱ — بجھے گی۔

(ریلے کا ڈبہ۔ پس منظر میں
ریلے کے چلنے کی آواز۔)
(ریلے کے چلنے کی آواز سارا
وقت پس منظر میں آتی رہے گی)
کچھ ڈبے کے اندر کا شور
اور باتوں کی ملی جلی آواز ہے
قہقہے۔ پتّے پھینکنے کی آواز۔

سردار جی — پتّہ پھینکو بادشاہو۔

ایک آواز — سردار جی کوٹ بچائیے کوٹ۔
قہقہہ۔

بیوی — سنئے۔ مجھ سے تو اب نہیں بیٹھا جاتا۔

میاں — نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔

بیوی — تو کیا آپ پوری گاڑی کے سونے کا
انتظار کر رہے ہیں۔
بچھائیے نا بستر۔

میاں — برتھ تو خالی ہو۔

بیوی — ہٹا دیجئے ان لوگوں کو۔

میاں — مالک مکان اتنی آسانی سے اپنے

TANENT کو نہیں ہٹا سکتا۔ پگڑی دینی پڑتی ہے۔

بیوی: پگڑی تو مجھے اس وقت ایک ہی نظر آرہی ہے۔ انھیں سے COMPOUND INTEREST پر لے لیجئے۔

میاں: اس وقت یہ پگڑی آپ کے ڈوپٹے سے بہناپا جوڑنے کے موڈ میں قطعی نہیں۔ دیکھ نہیں رہی ہو اپنے کوٹ کی حفاظت میں پوری مجاہدانہ شان اور فوجی آن بان کے ساتھ ڈٹے ہیں۔

بیوی: تو صاحب کسی عدالت کے سامنے اپنا معاملہ رکھئے۔ اپنی بپتا سنائیے۔ ورنہ ہم تو کچھ ہی چھینٹوں میں مایا جال کو توڑ کے کسی HOLIDAY SPECIAL سے اس سنسار سے ٹکٹ کٹا لیں گے۔

میاں: بالکے تنک دھیرج رکھو۔

بیوی: اجی پیک کر کے رکھ دو تم اپنے اس دھیرج کو ٹانگیں اکڑ کے SEASONED WOOD کیا بلکہ اسٹین لیس اسٹیل کی ہو گئیں۔ عاشقوں اور دردسر سے بدتر حالت ہو گئی۔ پہلو بدلنا ہو تو پہلے اپنے تینوں پڑوسی ملک کے باشندوں سے اجازت لو۔ پھر یوں احتیاط سے اپنے ہی جسم کے حصوں کو اٹھاؤ دھرو جیسے چینی کی کوئی ڈش۔

میاں: آپ ہی اکیلی مظلوم نہیں ہیں۔ جام شہادت شاید ہمیں بھی چکھنے کو مل جائے گا۔

بیوی: کیا لکھنؤ کا سارا تکلف امپورٹ ہو کے آپ کے پاس آگیا ہے۔ آخر اٹھاتے کیوں نہیں۔ جائیں اپنی اپنی برتھ پہ۔

میاں: آدھے سے زیادہ تو ناخواندہ مہمان ہیں۔

بیوی: آخر انھیں گھسنے کیوں دیا جاتا ہے سلیپر ہیں۔

میاں: سرحد پہ کے حملوں کو کون روک سکتا ہے۔

بیوی: ہم نے اپنے آرام کے لئے پیسے خرچ کئے ہیں۔

میاں: اور فلک کج رفتار یعنی ریل بے ہنگام سے آپ کا یہ عیش بھی دیکھا نہ کیا گیا۔

بیوی: سنو۔ کتنے لگے۔

میاں: ۳۶ روپیہ ۷۵ پیسے۔

بیوی: پچھلی بار جب ہم گئے تھے تو شاید اٹھارہ انیس روپے لگے تھے۔

میاں: تم دس گیارہ سال پرانی بات کر رہی ہو۔ اب تو تقریباً دگنا ہو گیا ہے۔

بیوی: اس وقت تو II nd میں اتنا لگتا تھا۔

میاں: تو فرض کر لو کہ II nd میں بیٹھی ہو۔

بیوی — واہ کیسے فرض کرلوں۔ ایسے ڈبے کیا II nd کے ہوتے تھے۔

ایک مسافر — جی ہاں بھابی ٹھیک کہتی ہیں کرایا تو ہاتھی کے بچے کی طرح بڑھتا جاتا ہے۔

مسافر — یہ تو سراسر لوٹنا ہے۔

تاش کھیلنے والے مسافروں میں سے ایک:
ہیں کیا۔ کیا لٹ گئی۔ ریل گاڑی۔

دوسری آواز — ریل گاڑی لٹ گئی — کب — کون سی۔

سردارجی — ہم لوگ تو خیریت سے ہیں نا بادشاہو۔

مسافر — اجی بھگوان اور اللہ کے ملے جلے کرم سے سب خیریت ہے اتنی عرض کر رہا تھا کہ جنتا لٹ رہی ہے۔

میاں — سردارجی۔ یہ بڑا گمبھیر معاملہ ہے۔ ریلوے کی حالت کینسر کے مریض کی طرح دن بدن گرتی جا رہی ہے۔

بیوی — اور کرایہ۔

مسافر — اتنا پیسہ لے کر بھی ہمارے آرام کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا۔
رائٹ۔ رائٹ۔

آوازیں — ہیر۔ ہیر۔

(پلیٹ فارم کی آوازیں)

میاں — شاید بنیا آگیا۔ چائے پی جائے۔

مسافر — اجی آپ اترے نہیں کہ برتھ پر بیلنگ لگ گئی۔ پھر آپ کو اپنی ہی برتھ کیلئے T.T. کی خاطر کرنی پڑے گی۔

میاں — ہاں یہی تو موسم تو T.T. کیلئے سہانے ہوتے ہیں۔

(موسیقی)

بیوی — سنئے۔

میاں — تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔ خدا خدا کرکے تو برتھ ملی ہے۔ سو جاؤ۔

بیوی — دیکھئے۔

میاں — اف۔ فو۔ بھئی۔ کبھی دیکھو۔ کبھی سنو۔ میں کہتا ہوں۔ آپ اپنی یہ ڈرل صبح تک کے لئے اٹھا کے نہیں رکھ سکتیں۔

بیوی — انجن کی طرح دھاڑتے کیوں ہو۔ میں یہ کہہ رہی تھی۔ وہ جو ادھر والا باتھ روم ہے نا۔ اس کا آئینہ بہت صاف ہے اس میں میری شکل بڑی اچھی دکھائی دیتی ہے۔

میاں — حیرت ہے۔

بیوی — نہیں بھئی

میاں — تو پھر کیا کروں۔ کیا تمہیں ہر وقت اسی آئینہ میں دیکھا کروں۔ آرسی مصحف کی طرح۔

بیوی — ویسا ہی آئینہ مجھے لادینا۔

میاں — ویسا ہی کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ اسی کو نکال لیں گے۔

بیوی — اس کو۔؟

میاں — ریلوے ہماری ہے۔ ہم اس کے ہیں۔

بیوی — پھر یہ میرا تیرا کیا۔ سچ۔ مگر کیسے۔

میاں — یہ TOP SECRET ہے۔ آپ کو اس سے کیا۔ آپ تو بس اپنے رُخِ روشن کے آگے اسی کو دھرے پر دانے کو چیلنج کرتے ہوئے بیٹھئے گا۔

بیوی — دیکھو پنکھے کتنے تیز چل رہے ہیں اپنے یہاں تو ایک ہی پنکھا ہے۔

میاں — گھر کے میک اپ کے لئے تو یہاں سارا سامان موجود ہے پنکھے۔ فوم کشنز۔ واش بیسن۔

بیوی — تو کیا یہ سب بھی مل سکتی ہیں۔

میاں — کیوں نہیں۔ مگر گھر پہنچنے کے بعد۔

بیوی — کیسے۔

میاں — پھر وہی انکوائری کمیشن

بیوی — تو پھر جلدی سے سب چیزیں منگوا لینا۔

میاں — تاکہ بڑھتے ہوئے کرائے کا حساب برابر ہو سکے۔

غزل

ڈاکٹر اختر بستوی

گلفت کبھی بدن کی، کبھی کربِ ذات ہے
وقتِ سکوں جہاں میں نہ دن ہے نہ رات ہے

سقراط بن کے اس کو پیئے گا مرا جنوں
دستِ خرد میں ساغرِ زہرِ حیات ہے

چلنے کو چل رہا ہے، مگر کچھ پتہ نہیں
کس راستے پہ قافلۂ کائنات ہے

ساحل کے پاس رہ کے بھی ملتی ہے تشنگی
فنکار کیلئے یہ زمانہ فرات ہے

اختر جسے زبان سے کرتا نہیں ادا
تم اس پہ کیوں مُصر ہو وہ اک تلخ بات ہے

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ قارئین، پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور اُن کی مدد سے "تعمیر ہریانہ" کے خریداروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمیں اپنے ادب نواز دوستوں سے ایک بار پھر درخواست کرنا ہے کہ وہ خریداروں کی تعداد بڑھانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ پرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ پرچے کی خریداری کے لئے ایجنسیاں قائم کرنے کے لئے بھی ہمیں آپکے تعاون کی ضرورت ہے۔

ـــــ ادارہ

شام داس کھنہ

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادیؐ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

خواجہ الطاف حسین نام حالی تخلص ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ آباؤ اجداد شاہ بلبن کے عہد میں ہرات سے آکر پانی پت میں مقیم ہوئے۔ خواجہ حالی بچپن ہی میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے دلی چلے آئے اور شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کی مصاحبت میں رہنے کا موقع ملا اور اُن کے فیضِ صحبت سے حالی کی شاعری چمکی۔ نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کی۔ یہاں اُن کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنا پڑتی تھی۔ اس سے اُن کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔ لاہور سے اینگلو عربک اسکول دلی میں مدرس ہو کر چلے آئے اور یہیں ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھی۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں وفات پائی۔ آپ اُردو میں سیرت نگاری، تنقید، قومی شاعری اور نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔

حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی فکر پر غور و فکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی۔ اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنی حدود میں حالی نے جو کچھ کہا وہ بہت تعریف و ستائش کی بات ہے۔ وہ اُردو کے مربیوں میں ہیں اور اُردو کے بہترین نقاد بھی۔ اُن کی نثر بلند پایہ ہے۔ اُن کا خلوص زبردست ہے۔ اگر اُردو ادب کو بلند کرنا ہے تو نئے نئے خیالات اور نئے نئے اصول ہائے تنقید سے استفادہ کرنا ہو گا۔ ایسے خیالات اور ایسے اصول جن کی حالی کو خبر نہ تھی۔ اور نہ ہو سکتی تھی۔ اُن کی "مقدمہ شعر و شاعری" اُردو میں پہلی اور اہم ترین ناقدانہ تصنیف ہے۔ اس کا پہلا حصّہ زیادہ اہم ہے۔ آج اس کو تنقید کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

کلیم الدین احمد کے مطابق ــــ شعر و شاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ کہتے ہیں ــــ
شعر کی مدح و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس قدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ تعریف کی نسبت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ وہ افلاطون کے ہم خیال ہیں اور شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ چونکہ وہ شعر و شاعری کی اہمیت اور قدر و قیمت سے واقف نہ تھے اس لئے دوسروں کو ان چیزوں سے آگاہ کرنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ حالی کی نظر سطحی تھی اور یہ سطحیت ہر جگہ ملتی ہے۔ ویسے وہ فرماتے ہیں کہ شعر کی تاثیر مسلم ہے اور اس تاثیر کو ثابت کرنے کے لئے وہ بہت سی مثالیں دیتے ہیں جس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جس تاثیر کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اہم نہیں۔ شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا نہیں ہے۔ شاعری جذبات کی تعلیم و تربیت کرتی ہے۔ اسے برانگیختہ نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کا اثر ہنگامی نہیں پائدار ہوتا ہے۔ اچھے شعر جذبات کو بھڑکاتے نہیں اور جو شعر جذبات کو بھڑکاتے نہیں وہ اچھے نہیں۔ حالی کا نظریہ مادی ہے اور وہ شعر کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے۔ حالی کے ہر خیال کی جانچ پڑتال کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔

اختلاف اور شاعری اہم موضوع ہے لیکن اس موضوع پر حالی نے جو خیالات سپردِ قلم کئے ہیں وہ اہم نہیں۔ ان میں کوئی نیا پن یا گہرائی نہیں۔ اختلاف دیکھنے میں ایک سیدھا سادہ اور عام فہم لفظ ہے لیکن بہت سے الفاظ کی طرح اس کا بھی ایک مفہوم خاص ہے اس کے بعد شعر کی اہمیت پیش کی گئی ہے۔ یہاں بھی اُن کے قلم نے وہی لغزش کھائی ہے جو شعر کی اہمیت میں کھائی تھی۔ یہاں انھوں نے میکالے کا ایک قول نقل کیا۔ اس قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں کیونکہ ہم میکالے کو ایک نقاد کی حیثیت سے نہیں مانتے۔ ایک طرح حالی نے شاعری کے لئے جو شرائط پیش کی ہیں وہ بھی سطحی اور ہیں۔ ملٹن کے حوالہ سے شعر کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ ہو، جوش سے مبرّا ہو، اور اصلیت پر مبنی ہو۔ اگر سادگی یہ ٹھہری تو ملٹن کی نظمیں شعر کے زمرے سے خالی ہو جائیں گی۔ اس طرح شیکسپیئر غالب اور اقبال کے بہت سے اشعار سادگی کے درجہ سے گر جائیں گے۔

اسی طرح حالی نیچرل شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں۔ نیچرل شاعری وہ ہے جو لفظاً و معناً دونوں لحاظ سے نیچر یعنی فطرت و عادت کے موافق ہو۔ شاعری اچھی ہوتی ہے یا بُری۔ لفظاً یا معناً نیچرل ہو کر بھی بُری ہو سکتی ہے اور اَن نیچرل ہو کر بھی اچھی ہو سکتی ہے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ نیچرل شاعری قدماء کا حصّہ ہے۔ قدما کے اوّل طبقے کا نہیں دوسرے طبقے کا۔ لیکن یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ چوسر، بلیک اور کیٹس تینوں میں نیچرل شاعری ملتی ہے لیکن یہ قدما کے دوسرے طبقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ حالی نے مغرب سے استفادہ کیا ہے۔ اس استفادہ کی اہمیت کو سمجھا ہے لیکن اس میں کوئی جدّت نہیں دکھائی۔

حالی کی اہمیت تاریخی ہے۔ اور نقاد کی حیثیت سے اُن کی اہمیت باقی رہے گی لیکن اگر یہ کتاب مقدمہ شعر و شاعری پڑھی جاتی ہے اور پڑھی جائے گی تو اپنی بے مثل نثر کے لئے تنقیدی اصول اور نظریوں کے لئے نہیں۔ وہ نئی دنیا، نئی کائنات روشن

نہیں کرتی نہ کر سکتی ہے۔ اب اس کا جادو ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

رومین رولاں نے ایک جگہ لکھا ہے "بڑے فنکار وہی ہوتے ہیں جو صرف اپنی ترجمانی کرتے ہیں لیکن سب سے بڑے وہ ہیں جن کے دل سب انسانوں کے لئے دھڑکتے ہیں۔"

داغ کے یہاں آپ بیتی ہے اور حالی کے یہاں جگ بیتی۔ حالی نظم کی طرف اس لئے نہیں آئے تھے کہ انھیں غزل کہنا نہ آتی تھی۔ بلکہ اس لئے آئے تھے کہ وہ ایک نئے احساس کی پکار اور ایک نئے شعور کی آواز پیش کرنا چاہتے تھے۔ حالی کا غم میر تقی میر کا سا غم نہیں نہ وہ انیس کا سا ہے۔ حالی کا غم اُردو میں نئی قسم کی چیز ہے۔ حالی کے لئے تنگنائے غزل کافی نہ تھی ——— وہ شاعری کے اس سلسلہ سے مطمئن نہ تھے

جب انھوں نے

"برکھا رُت"، "حب وطن"، "نشاطِ امید"، رحم و انصاف کے مناظرے پیش کئے تو اُردو شاعری میں واقعیت، شعر نگاری، اور اخلاقی شعور کو اپنی اصلی جگہ دی اس کے علاوہ انھوں نے قومی شاعری کا سنگ بنیاد مسدس حالی لکھ کر رکھا۔ اس پر وقتی خیالات کا عکس ضرورت سے زیادہ ہے۔ یہ نئے رنگ کا مرثیہ ہے۔ انھوں نے شاعری سے ایک بڑا کام لیا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری وسیع اور رفیع ہو گئی۔ اگر اکبر اور حالی کا موازنہ کرنا چاہیں تو یہ کہیں گے کہ اکبر ماضی کے شاعر تھے اور حالی حال کے۔ حالی کہتے تھے۔ ع

پھر دو اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی

آل احمد سرور لکھتے ہیں " اگر میں یہ کہدوں کہ اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال شاید کچھ اور ہوتے تو یہ غلط نہیں۔ اُن کی نثر نے بھی شاعری کی طرح ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اُردو میں سوانح نگاری اور تنقید کی بنا کا سہرا حالی کے سر ہے آپ نے اُردو میں جدید سوانح نگاری کو تذکروں کی روش سے آزاد کیا۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیاتِ جاوید تینوں میں حالی کے چند اصول صاف نظر آتے ہیں۔ حالی کی تنقیدوں کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔ وہ اُردو کے پہلے نقاد ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد جو اُن کے بہت زیادہ قائل نہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حالی واقعی سب سے پہلے نقاد تھے۔ حالی سے پہلے تنقیدی شعور ناپید نہ تھا۔ سخن سنجوں اور سخن فہموں کی کمی نہ تھی۔ مگر کسی نے شاعری کے متعلق نظریاتی بحث اس طرح نہ کی تھی۔ کسی نے شعر کی ماہیت اور اُس کے لوازم پر غور نہ کیا تھا۔ آپ نے ہی تجزیہ اور تجربہ میں فرق کرنا سکھایا۔ حالی نے تنقید کے جو اصول بنائے ہیں صرف وہی اہم نہیں۔ اُن کی تنقیدیں بھی اہم ہیں۔"

اکرام نے "غالب نامہ" میں تسلیم کیا ہے کہ غالب پر سب سے منصفانہ تنقید حالی کی ہے۔ کچھ ان کے اسلوب کو پھیکا بتاتے ہیں یہ اس گروہ کا اعتراض ہے جس کے منہ کا مزہ گرم مصالح کی کثرت سے خراب ہو گیا۔ کچھ کے نزدیک اس میں وہ چستی پختگی اور صناعی نہیں جو بڑے ریاض کا ثمرہ ہے۔

حالی ہمارے دور کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور معلم اخلاق بھی۔ آج جس ادب پر حالی کی مہر نہیں وہ ٹکسال سے باہر کا سمجھا جاتا ہے۔ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی کہتے ہیں۔ مولانا حالی کا مقدمہ شعر و شاعری، ایک تاریخی حیثیت کتاب ہے اس بیش قیمت کتاب کا مطالعہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ

حالؔی کے خیالات کو انگریزی ادب کی خوبیوں نے بہت متاثر کیا۔ حالی کی زبان بھی انگریزی الفاظ سے آشنا ہونے لگی ـــ انگریزی الفاظ کا استعمال حالؔی کی تحریروں میں نہایت بے تکلفانہ ہے۔ اُن کی نادرۂ روزگار کتاب "یادگارِ غالب" عملی تنقید کے بہترین شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے۔ بے عیب اور بے لاگ سوانح نگاری کا فن حالؔی نے انگریزی ادب سے حاصل کیا۔ اُن کی مساعی جمیلہ کے طفیل عشق و محبت کے پامال اور فرسودہ مضامین کی بجائے نئی قسم کے جذبات و خیالات اُردو کی نئی شاعری کا موضوع بن گئے۔ تلقینِ بیداری، حب وطن، اصلاحِ قوم اور مناظرے وغیرہ شعر کا لباس اوڑھنے لگے۔ ایسے مضامین تفصیل اور استدلال چاہتے تھے تفصیل اور استدلال کے لئے کلام کا ربط اور تسلسل ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئی شاعری میں عام مقبولیت کا تاج غزل کے سر سے اتر کر قطعہ نظم مسدّس اور مثنوی کی بلائیں لینے لگا۔ مسدّس میں حالؔی نے وہ وہ معجزے دکھائے ہیں کہ ایک مدت تک اُن کا جواب نہیں ہو سکے گا حالؔی نے اپنے اشعار میں ایسی زبان استعمال کی ہے کہ نثر کی زبان سے مختلف معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ آرائشِ کلام اور رنگینیٔ بیان پہ واہ واہ کرنے والوں کو بھی اپنا نظریہ یکسر بدلنا پڑ جاتا ہے"

حالؔی نے سادگی اور آرائشِ بیان کے امتزاج سے اُردو نثر میں ایک ایسی شگفتگی اور دلآویزی بھر دی ہے جو اعلیٰ درجہ کی نظم کے حسن و لطافت سے کم نہیں۔ انشاءپردازی کو ایک فنِ لطیف بنا دینا حالؔی ہی کا کام تھا۔ اُن کی جادو بیانی اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ ایک عظیم المرتبت شاعر مایہ ناز نقاد اور عظیم مصلح تھے۔

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

غزل

شامِ غم ہی سے چراغِ مہ و اختر ڈوبے
کون دے ساتھ کسی کا جو مقدر ڈوبے

ذہن پہ اس کی وفا چھوڑ گئی دائمی نقش
ایک منظر کے سوا جتنے تھے منظر ڈوبے

زندگی چند ہی کو بخش سکا میرا شعور
یوں تو پیکر کئی ابھرے، کئی پیکر ڈوبے

پرسکون جھیل کے ماتھے پہ شکن سی ابھری
دائرے پھیل گئے اس میں، جو کنکر ڈوبے

کیوں نہ ہیرے کا جزیرہ اُسے ہاتھ آجائے
بحرِ ذخار میں جب کوئی شناور ڈوبے

کئی اڑتے سے کبوتر ہوئے آکاش میں گم
کئی آ آ کے مری ذات کے اندر ڈوبے

جس کے چھینٹوں سے کرامت ہوئیں دنیائیں رنگیں
خونِ ناحق میں چمکتے سے وہ خنجر ڈوبے

شام ڈھلے وہاں پہنچا تو منظر حسب معمول تھا۔

"چائے؟"

"سگریٹ؟"

"ہاں/نہیں ......" چائے اور سگریٹ پر ٹکی نپی تلی مسکراہٹ اور بیسیوں بار کی جانچی پرکھی نگاہوں کی مانوس دستک۔

آج فیصلہ کرکے آیا ہوں۔ میری مرضی کے خلاف تم مجھے نہیں کھول سکتے۔ میں نے اپنے احساس کے دروازے پر اپنے آپ کا قفل ڈال دیا ہے۔

دستک کی آواز بند دروازے سے ٹکرا کے نازک شیشے کی طرح چور چور ہو گئی ہے۔ چھناکے کی آواز سے لوگ باگ چونکتے ہیں۔

"معاف کیجئے .... بہت شرمندہ ہوں، مگر ......" بیرا ٹوٹی ہوئی چائے کی پیالی کے ٹکڑوں کو سمیٹنے لگا ہے۔ ریستوران کے مالک کی شناسا آنکھیں میری تلاشی لے کر مطمئن ہو چکی ہیں۔

"دیکھی تم نے آج کی یہ نیوز ...... بورڈ بورڈ آف ڈائرکٹرز نے ......" اپنا جملہ پورا کرکے اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا ہے۔ اتنی اچھی خبر پہ مسکرا کر کم از کم وش تو کرنا ہی چاہیئے۔

"مگر کیوں؟ کون سا احسان کر دیا ہے ان لوگوں نے؟"

"کچھ کہا تم نے؟"

"نہیں تو ...." بس پر جیسے اونگھتا ہوا کسی مسافر سے ٹکرا گیا ہوں۔

"اور وہ جوشی ......" میری آنکھوں میں خوشی کی چمک نہ پا کر دوسری کرسی حیرت سے قریب سمٹ آئی ہے اور تیسری کرسی کا آدمی کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے۔ لاشعوری طور پر چند الفاظ ترتیب پا کر باہر نکلنے کو ہوتے ہیں کہ دفعتًا انھیں حلق کے اندر گھونٹ لیتا ہوں۔ اپنے آپ سے کہنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت کیا ہے؟

"نہیں! مجھے کچھ بھی نہیں کہنا۔ جہنم میں جلے بورڈ آف ڈائرکٹرز اور وہ جوشی .... اس طرح خوش کرکے وہ میرے جذبات و احساسات کو نہیں خرید سکتے۔" وہ تینوں کسی موضوع پہ محو گفتگو ہیں۔ ان کے چہروں پر وقفے وقفے سے مختلف رنگ ڈوبتے ابھرتے ہیں

مسکراہٹ، ندامت، حیرت، مسرّت، بے چارگی،
رنج، افسوس، درد، دھواں، قہقہہ، جھینپ، شرمندگی،
تشکیک، اندھیرا، اُجالا، دستک دستک ......

میں نے دروازہ نہ کھولنے کا تعہد کر لیا ہے اور
اخبار کے اشتہارات پڑھنے لگا ہوں۔

گھر بیٹھے دھن کمایئے،
فلمی ایکٹر بنیئے،
بغیر آپریشن کے شرطیہ علاج،
سکنی مُبلورکرس، .... سفید داغ
...... سب فراڈ ہے۔ فریبی، مکّار.....

"کچھ کہا تم نے؟" ایک ساتھ کئی آوازیں میری
سماعت سے چمٹ جاتی ہیں۔ ایک ایک چہرے پر اپنی خالی
خالی نگاہیں پھینک کر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔

"نہیں کچھ بھی نہیں۔" ایک طویل خاموشی کے
درمیان تین مختلف چہروں پر سوالیہ نشان اُبھر آتے ہیں۔

"اُداس ہو؟"
"ناراض ہو؟"
"پریشان ہو؟"

میں نے خشمگیں نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا
ہے اور یکایک چیخ پڑا ہوں۔

"خاموش ہو جاؤ۔ فراڈ ہو تم سب۔ نقلی اشتہار،
فریبی، مکّار......" مجھے خلافِ توقع ناراض پاکر اُن کے
چہروں پر حیرت اور غصّہ کی مشترکہ لکیریں اُبھر آتی ہیں۔
شاید یہ لوگ میری دماغی حالت پر شبہ کرنے لگے ہیں۔ اتنی
اچھی خبر پاکر تو مجھے بے حد خوش ہونا چاہیئے، کتنی
بے صبری سے اس دن کا انتظار تھا۔ اور وہ ......
وہ سُن لے تو کتنی خوش ہوگی!

"مگر کیوں؟ کیوں خوش ہوگی وہ؟ اس کی
خوشی پر صرف میرا حق ہے۔" تشکیک کی ایک گہری لکیر
نے میرے وجود کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک
بے پناہ جذبات سے بھرا ہوا اور دوسرا کسی بھی احساس
سے بالکل خالی۔

"خالی ہو گیا صاحب؟" لاشعوری طور پر چونک
پڑتا ہوں۔ بیرا چائے کی خالی پیالی اُٹھا کر آگے بڑھ گیا
ہے۔ لوگ باگ آس پاس کی میزوں کو بھرنے لگے ہیں —
اخبار میری مٹھیوں میں دبا ہے۔ یکایک تین شناسا
چہروں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔

"ابے! آج پہلے کیسے پہنچ گیا؟" ایک ہی ضرب
سے جیسے دروازے کا قفل بے جان ہو کر نیچے گر پڑا
ہے۔

"کب سے انتظار کر رہا ہوں یار..... یہ دیکھ
بورڈ آف ڈائرکٹرز نے ہم لوگوں کو پرمانینٹ کر دیا اور وہ
جوشی آؤٹ ہو گیا چرچی کے غلام کی طرح......"
جلدی سے تازہ اخبار اور خالص مسکراہٹ ان کی طرف اُچھال
دیتا ہوں۔ خوشی سے تقریباً چیختے ہوئے وہ تینوں بے تحاشہ
مجھ سے لپٹ گئے ہیں۔

بیرا——
چائے،
سگریٹ،

دروازہ کھلتے ہی میرے وجود کا دوسرا ٹکڑا اس
شور شرابے سے گھبرا کر کہیں فرار ہو گیا ہے۔

آواز

راز اعظمی

گنگاجی کے امرت جل سے،
آتی ہے آواز۔
میری قسمیں کھانے والو۔
مندر مندر/میرے جل سے،
ہر مورت اشنان کرے۔
میرا مان بڑھانے والو۔
میرے گہرے آنچل میں ہیں —
موتی، پتھر، ریت کے ذرے۔
لیکن
سب ہی
آپس میں،
پیار سے مل کر رہتے ہیں۔
دل میں کسی کے کھوٹ نہیں۔
آپس میں کچھ بیر نہیں۔
میری چنچل لہریں/جس دم۔
ساحل سے ٹکراتی ہیں۔
چٹانیں کٹ جاتی ہیں۔
جنم جنم کی پیاسی دھرتی،
اپجاؤ بن جاتی ہے
دنیا والے/سمجھ گئے ہیں،
میرا پانی ——
امرت ہے۔
میرا مشرب ——
الفت ہے۔
میرے پیارے بچو ——
تم بھی
پیار کی من میں جوت جگاؤ۔
نفرت کی تاریکی کو،
اپنے دلوں سے دور بھگاؤ۔
بھید بھاؤ سب ختم کرو۔
پیاسوں کو سیراب کرو۔
دھرتی کو ——
گلزار بناؤ۔
صحراؤں میں ——
پھول کھلاؤ،
میری شیتل لہروں جیسے،
باہم مل کر،
ایک رہو۔

ہاجرہ شکور

بے دل

زندگی کی نزاکتوں اور نفاستوں کے لئے دل میں جو دیوانہ وار عشق تھا وہ اب اڑتالیسویں سالگرہ گزرنے کے بعد بھی موجود تھا۔ اب جبکہ سوچ کا انداز غیر جذباتی ہو چکا تھا۔ لیکن گلاب کے پودوں، مونا لیزا کی تصویر، بینٹ کے فرنیچر اور انگلش کراکری سے لگاؤ بدستور تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ خود پر بھی لکھ دوں "ہینڈل ود کیر"، لیکن یہ بھی ستم ظریفی تھی کہ اسے بے رحمی سے توڑا پھوڑا اور کچلا گیا تھا۔ اور زندگی کی جنگ بالکل تنہا ہی لڑ کر اب معمولی آسائشیں نفاستیں اور نزاکتیں اس نے خود ہی مہیا کر لی تھیں اسے اس کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑی تھی لیکن پھر بھی وہ نقصان کا سودا نہ تھا۔

روزانہ شام کو گلاب کے پودوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اسے یہ محسوس ہو جاتا کہ ایک کانٹے کی طرح اسیم کا خیال برابر کھٹک رہا ہے۔ شادی کے فوراً بعد اسیم کی بد اخلاقی، غصہ اور حد سے بڑھی ہوئی شراب نوشی کی بدولت وہ اسے چھوڑنا چاہ رہی تھی لیکن طلاق یافتہ بن کر وہ دو چھوٹی بہنوں اور ماں باپ کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایم۔ ایس۔ سی اور بی۔ ایڈ۔ ہونے کے باوجود اس کی شادی قطعی روایتی انداز میں ہوئی۔ شراب و شباب سے اسیم کی دلچسپی اور بد مستیوں کی داستان اسے بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ دل مسوس کر اور آنکھ میچ کر ہر بات برداشت کرتی رہی صرف اسیم کی خوشنودی کے لئے اسے اچھی خاصی نوکری چھوڑنی پڑی اسیم کو اس کا روز اس طرح باہر جانا پسند نہ تھا لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی پارٹیوں میں اس کی بیوی ملکی اور غیر ملکی لوگوں کے ساتھ گھل مل جائے شکنتلا یہ سب کراہیت کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔ لیکن ایک دن اسے اپنی سب قربانیاں بے معنی نظر آنے لگیں۔ اس کی سہیلیاں بہت دن سے پارٹی کے لئے اصرار کر رہی تھیں اس نے بھی گھٹن سے نجات پانے کے لئے پارٹی کا انتظام کیا۔ اسیم سات کی بجائے نو بجے آ کر اس میں شامل ہوا۔ حسب معمول وہ باہر سے پی کر آیا تھا۔ وہ شکنتلا کی سہیلیوں کے ساتھ عجیب انداز سے پیش آنے لگا۔ اسے پتہ تھا وہ اتنا مدہوش نہیں ہے جتنا ظاہر کر رہا ہے۔ شکنتلا نے اسے ہلکے سے تنبیہہ کی جس کے جواب میں وہ بہت زور سے گرج پڑا۔ پارٹی ایک عجیب انداز سے فوراً ختم ہو گئی۔ شکنتلا کی چھوٹی بہن

جو زولوجی میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رہی تھی پارٹی میں آئی۔
ہوئی تھی۔ اس نے ندامت اور پچھتاوے سے بے حال
بہن کو سہارا دیا۔ اس نے بتا دیا کہ ماں باپ کی بے عزتی
طلاق یافتہ بیٹی سے نہیں بلکہ اتنے گھٹیا داماد سے
ہوگی اور بہنیں اپنا مستقبل خود ہی سنوار لیں گی۔
شکنتلا کی موت سے بدتر زندگی سے انھیں کوئی بھی
فائدہ نہ ہوگا۔ کانتا یہ سب کہہ کر چلی گئی۔ اس کے
الفاظ کی بازگشت شکنتلا کے ان پرانے سنسکاروں
کی آواز پر غالب آتی گئی کہ شوہر کے گھر سے مر کر ہی
نکلنا چاہیئے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ مر چکی ہے اور
اب اس گھر سے نکل کر ایک نئی زندگی شروع کرے گی۔

ایک دن پھر کسی بات پر مشتعل ہوکر اسیم
نے اس پر ہاتھ اٹھایا اور غصہ میں بھر کر کہہ دیا ــــ
"نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

مرد کا غرور جو صرف کمائی کی بدولت ہوتا ہے
منہ سے بول پڑا۔ شکنتلا اسی دن کی تیاری کر رہی
تھی۔ اسے اپنے سارٹیفکیٹ اور ڈگریاں پہلے ہی
سوٹ کیس میں بند کر رکھے تھے ماں سے ملے زیور
اور ایک آدھ کپڑے کے سوا اس میں کچھ نہ تھا۔
حکم ملتے ہی وہ سوٹ کیس اٹھا کر باہر چلی گئی۔ اسے
پتہ تھا کہ اسیم یہ بغاوت برداشت نہیں کرے گا۔
اس لیے اس نے ایک منٹ بھی نہیں لگایا۔

اس نے صبر و سکون سے نوکری ڈھونڈنی
شروع کردی گھر میں ٹوٹے ہوئے فرنیچر کی طرح
پڑے پڑے اس میں زنگ لگ گیا تھا۔ اس نے خود کو
نکھارا اپنی ٹوٹی ہوئی شخصیت کو جوڑا۔ دھیرے
دھیرے زندگی مہربان ہوئی۔ جیون ساتھی کے
علاوہ اسے سب کچھ مل گیا تھا۔ اسے اسیم سے پیار
نہ تھا لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ کبھی وہ اسے یاد کرے گا۔
شاید کہیں وہ اسے پانے کے لئے بے چین ہو جائے۔
وہ اس کی زندگی کا پہلا اور آخری مرد تھا۔ اس نے اپنے
دل کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ ہر وقت ایک نامعلوم
انتظار کا احساس رہتا تھا۔ لیکن وہ دیوداسی نہ تھی اس
نے خود کو تباہ نہ کیا اس نے صرف اپنے لئے ہی ایک
خوبصورت گھر بنوایا۔ اکثر کانتا اور ستیا اپنے ننھے
منوں کے ساتھ آتیں اس کے گلابوں، نازک فرنیچر
اور انگلش کراکری کو برباد کر جاتیں لیکن وہ اپنے طور
پر مطمئن اور خوش رہتی وہ تنہا بھی نہیں تھی ــــ
بھائی بہنوں کی بھرپور رفاقت تھی۔ اسے اپنے نام کی
منحوسیت کا احساس ہوتا۔ شکنتلا تو ہر دور میں ٹھکرائی
گئی ہے لیکن کیا اس کا دشینت پھر اسے اپنانے آئے گا۔ وہ
اسے ایک بیٹا بھی تو نہیں دے گیا۔ رفتہ رفتہ اس کے گھر میں
کھیلنے والے بھانجے بھانجیاں جوان ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں
حلقے پڑ گئے لیکن انتظار کی جوت نہ بجھی بالوں پر برف پڑ گئی
لیکن زلفیں کسی کے دست شوق سے لگائی ایک کلی کے لئے
ترستی رہیں۔ اس کے جسم کو شریر بچوں کی تخلیق کا انتظار
ہی رہا یہاں تک کہ عمر نے بڑھاپے کی دستک پر کواڑ کھول
دئے نسوانیت کو زنگ لگ گیا۔ جسم تھک گیا۔ آنکھوں کے
کنارے کسی کا نہ معلوم پنجہ اپنے نشان چھوڑ گیا۔ اب شاید
اسیم کا نہیں موت کا انتظار تھا۔ جو لاحاصل ثابت ہونے
والا نہیں تھا۔

وہ رات اور راتوں سے زیادہ کالی اور اکیلی تھی۔
گلاب خاموش تھے لان میں تاریکی تھی۔ شکنتلا نے
گارڈن چیئر پر بیٹھے بیٹھے تھکن محسوس کی۔ وہ اٹھ کر
اندر جانے ہی والی تھی کہ نیم وا پھاٹک سے وہ آ گیا۔
سینکڑوں بے خواب راتیں جس کی دستک کا انتظار کرتی

رہیں وہ آج بغیر دستک کے ہی آ گیا تھا۔ موتی دم ہلا کر
غرانے لگا لیکن شکنتلا کے لرزتے ہوئے ہاتھ کے
لمس نے اسے چپ کرا دیا۔

"شکن" اسیم کی آواز بلغم زدہ اور
بوجھل تھی۔

"آؤ بیٹھو" اس نے یوں کہا گویا وہ روز ہی
آتا ہو "کیسے آنا ہوا؟"

"میں تمہیں لینے آیا ہوں"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم میری بیوی ہو۔"

"بیوی" شکنتلا نے سحر زدہ آواز میں
دہرایا لیکن اب کیا فائدہ اب وہ ماں نہیں بن سکتی
بیوی بننا بھی بے معنی ہے اور رفاقت بھی صرف یہی
ہو گی کہ آدھی رات کو شراب میں دھت شوہر کو اٹھا کر
پلنگ پر ڈال دوں جوتے کھول دوں۔ کمبل اڑھا دوں۔
صبح ناشتہ دے دوں دن بھر لاحاصل انتظار
کرتی رہوں! نہیں! یہ بہت خوفناک زندگی ہو گی۔
اب اسے تحفظ اور بدنامی کی بھی پرواہ نہیں ہے
اب وہ ہر دور سے گزر چکی ہے۔ جوانی کا تپتا ہوا ریگزار
وقت اس نے تنہا جھیل لیا تو اب یہ کیسا سراب ہے کل
تک یہ زلفیں ایک کلی کے لئے ترستی رہیں اور آج ان
جھڑی ہوئی سفید زلفوں کو کون یہ کانٹوں کا تاج پہنا
رہا ہے۔ اب اس سے دامن بچا کر نکل جانا ہی مناسب
ہے۔

"۲۴ سال بعد تمہیں یاد آیا کہ میں تمہاری بیوی
ہوں اب تم مجھے کیا دے سکتے ہو۔ نہ بچے نہ گھر نہ سکون
مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں" اس نے کھڑی ہوئی
آواز میں اس کے بوڑھے اور گناہ آلود چہرے کی
طرف دیکھ کر کہا۔

"اب تمہیں میری نہیں بلکہ ایک آسودہ گھر کی
تلاش ہے جہاں سے تازہ دم ہو کر تم نکلو تو پھر مجھے
ٹھوکر مار سکو۔ تمہیں میری نہیں میرے بنائے ہوئے گھر
کی ضرورت ہے۔"

"شکن! شوہر اور بیوی کا بندھن جنم جنم کا
بندھن ہے۔ یہ یوں نہیں"

"بس خبردار ہر پرائی عورت کو دیکھ کر رال ٹپکانے
والے اور شراب پی کر نالیوں میں لیٹنے والے انسان
کو یہ چوبیس سال بعد معلوم ہوا۔ اب جبکہ تم وقت
سے پہلے ہی بے حد بدنامی کے ساتھ ریٹائر کر دئے گئے
ہو تو تم میرے سکون میں آگ لگانے چلے آئے ہو۔ کیا
تم میری جوانی واپس کر دو گے کیا میری گود میں بچہ
ڈال سکو گے، نہیں تم مجھے کچھ نہیں دے سکتے۔
آج بھی تم شرمندہ نہیں ہو تم اپنا حق اور حصہ وصول
کرنے آئے ہو۔ نہیں اسیم اب دوبارہ تم میری توہین
نہ کر سکو گے ——— اس دن تم نے مجھے گھر
سے نکالا تھا آج میں تمہیں نکالتی ہوں کیونکہ یہ واقعی
صرف میرا گھر ہے۔

موتی انہیں پھاٹک تک پہنچا دو۔"

معافی اور تلافی کی طویل تقریر اور وعدہ
سب اسیم کے منہ میں ہی رہ گئے ——— موتی
اسے پھاٹک تک پہنچا آیا ——— شکنتلا نے اٹھ کر
اندر آنے کے لئے قدم بڑھائے۔ ماں کے وقت کی
پرانی نوکرانی برآمدے میں ساکت کھڑی رہی
اپنی مالکن کا ٹھوس اور بے حس چہرہ دیکھ کر
نصیحت کے الفاظ اس کے دماغ میں جامد ہو کر رہ گئے۔

غزل

رونق شہری

ہنرمندی کی ساری غرض و غایت ختم کر دے گی
یہ اُڑتی گرد تہذیبِ مسافت ختم کر دے گی
میں تازہ کار احساسات کے مینار پر روشن
ہوں سورج ، اور مجھے میری سخاوت ختم کر دیگی
وہی تشکیک اب تک معتبر کہلا رہی ہے جو
کسی دن امتیازِ رنج و راحت ختم کر دے گی
قبیلوں میں بٹے ہیں پھر بھی یکساں ہے ہنر اپنا
نئی سازش مگر یہ بھی علامت ختم کر دے گی
یہی ہے آگ کی تہذیب سارے کا ہنر رونق
مجھے اُس کی اسے میری ضرورت ختم کر دے گی
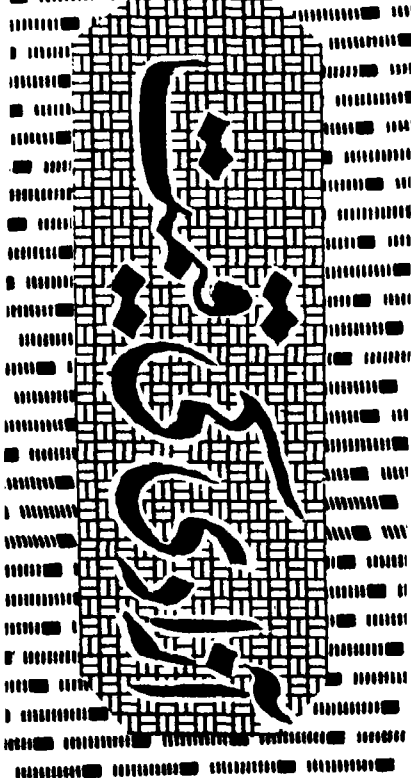
حقیقت ہیں دِلوں کا پیار آزادی کی قیمت ہے
ہمارا جذبۂ ایثار آزادی کی قیمت ہے
ہمہ تہذیب کی قدروں نے تاریخوں کو بتلایا
فنِ شہکاریِ معمار آزادی کی قیمت ہے
چمن والوں سے مت پوچھو غلامی کی وہ زنجیریں
لہو سے سُرخ رو گلزار آزادی کی قیمت ہے
ہمیں نے خوں بہایا تھا کبھی نیفا کی وادی میں
ہمالہ کا حسیں کُہسار آزادی کی قیمت ہے
یہ شہرِ خوشنما بُنیاد ہیں پُختہ اصُولوں کی
ارادوں کا نیا سنسار آزادی کی قیمت ہے
مُحبّت کی چمک کیا کوئی یاروں سے خرید ے گا
حجابِ عارضِ گلنار آزادی کی قیمت ہے
شہیدوں کا لہو صدیوں بہا میدانِ غیرت میں
اُن ہی کے خون کا شہکار آزادی کی قیمت ہے

تعمیر ہریانہ

جون ۱۹۸۵ء کا تعمیر ہریانہ قدرے تاخیر سے ملا۔ مگر پڑھ کر سبھی شکایت جاتی رہی۔ آپ نے اس شمارے میں اچھے افسانے، عمدہ ڈرامہ، اور بہترین غزلیں شائع کی ہیں۔ ڈرامہ کافی طویل ہے۔ پھر بھی مزہ دے گیا۔ محمد محسن جوادؔ کا مضمون " وطن پرستی کا علم بردار" "فراق" گو مختصر ہے، مگر عمدہ ہے۔ پر کاش فکریؔ صاحب کی غزل کا یہ شعر پسند آیا۔

اپنی اک دہلیز کبھی تھی وہ تو کب کی چھوٹی
کس کے در پہ دستک دیں اب کون ہمیں تبلائے

محمد راشد انورؔ ——— رانچی

ماہ جون ۱۹۸۵ء کا تازہ ترین شمارہ" تعمیر ہریانہ" باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارہ کی بعض غزلیں، مضامین اور خاص طور پر کرتار سنگھ دگل کا ڈرامہ "کس کے گھر جائیں" قابلِ ذکر ہے۔ **سید نہال الدین احمد ——— گیا**

تعمیرِ ہریانہ جون ۱۹۸۵ء بصیرت افروز ہوا۔ آپ نے اسے بے حد خوبصورت بنا دیا ہے "کس کے گھر جائیں۔" پامال ہوئی قدروں کا رونا ہے حصۂ نظم میں غلام ربانی تاباں کی غزل بے حد پسند آئی **سید حسین اخترؔ (جبلپور)**

جون کا تعمیر ہریانہ موصول ہوا۔ رسالہ خوب سے خوب تر کی جانب رواں ہے۔ گورنر ہریانہ کا پیغام۔ اور وزیر اعلیٰ کی ہریانہ سے متعلق ترقی کی روداد بھی بہت خوب ہے۔ دگل صاحب کے ڈرامے کا کیا کہنا۔ یہ ایک عمدہ اصلاحی ڈرامہ ہے۔ تعمیر ہریانہ کی قیمت میں کچھ اضافہ کیجیے اور کچھ صفحے بھی بڑھائیے۔

انوار انصاری ——— رانچی

تعمیر ہریانہ باصرہ نواز ہوا۔ محمد محسن جواد صاحب کی تحریر اور غلام ربانی تاباں صاحب کی غزل نے بے حد متاثر کیا۔ خدا کرے تعمیر اسی طرح ادب کے تعمیری کاموں میں سرگرداں رہے۔ اور قارئین تعمیر کو محظوظ کرنے کا سامان مہیا کرتا رہے۔

ہریانہ۔ ترقی کی کہانی ——— تصویروں کی زبانی۔" کا تصویری البم بھی کچھ کم نہیں۔ یہ البم ہر ماہ شائع کیا جائے۔

ایم۔ صابر حسین ——— مبارکپور

جون ۱۹۸۵ء کا شمارہ موصول ہوا۔ شیخ طیب کے مقبرہ کی تصویر دیکھنے کو ملی۔ کرتار سنگھ دگل کا ڈرامہ "کس کے گھر جائیں" بہت پسند آیا۔ **سید جاوید عالم (غازی پور)**

تعمیر ہریانہ برابر مل رہا ہے۔ ہر صفحہ پر آپ کی محنت اور لگن کے نقوش ثبت ہیں۔ خدا کرے یہ نقوش دن بہ دن شوخ سے شوخ تر ہوتے جائیں۔ **انجم عرفانی۔ بلرام پور**

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت ایسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او۔ ۱۹۱۔ ۱۸۹ سیکٹر ۱۷۔ سی چنڈی گڑھ سے اگست ۱۹۸۵ء کے لئے شائع کیا
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ ٹی چنڈیگڑھ

er Dana Ka Mazar, Hisar — Photo : Raj Kishan Nain

Kabul Bagh, Panipat

ستمبر ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۹ | جلد نمبر ۱۳

مدیرِ اعلیٰ:

رنجیت ایسر

مدیر:

سلطان انجم

سرورق: اے۔ پی۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹-۱۹۱
سیکٹر ۱۷سی، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آرار سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ترتیب

مجید انور

گھر سے باہر نکلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آج کوئی کام نہ کروں گا۔ سارا دن تفریح میں صرف کروں گا۔ کھانا بھی ہوٹل میں کھالوں گا۔ اور رات سے پہلے تو گھر آؤں گا ہی نہیں۔ کیوں کہ پرسوں میں نے ریس میں قریب تین سو روپئے جیتے تھے۔ اور جیب میں جب اتنی موٹی رقم ہو تو کون احمق کام کرتا ہے۔ کبھی سوال ہی نہیں ہوتا غمِ روزگار کا۔

سگریٹ لینے کے لئے میں سڑک عبور کر ہی رہا تھا کہ ایک گلی سے کالی بلّی نکلی۔ اور میرے سامنے سے گزرنے لگی۔ اچانک مجھے بزرگوں کی کہی ہوئی باتیں یاد آگئیں کہ کالی بلّی اگر راستہ کاٹ جائے تو نحوست ساتھ لگ جاتی ہے۔ گو میں اتنا توہم پرست نہیں ہوں لیکن اتنا جدید بھی نہیں ہوں کہ کالی بلّی کو نظر انداز کر دوں۔ کوئی اور رنگ کی بلّی ہوتی تو بات جدا ہوتی۔ بلّی میرے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اور اتفاق سے سڑک بھی سنسان تھی۔ اس لیے میں نے اپنی رفتار تیز کر لی کہ بلّی کے آنے سے پہلے ہی سڑک پار کر لوں۔ لیکن بلّی بھی شاید کچھ طے کر کے آئی تھی۔ وہ بھی تیزی سے بھاگنے لگی۔ اور عین بیچ سڑک پر ہم دونوں کا تصادم ہو گیا۔ اور بلّی میرے پاؤں کے بیچ سے نکل کر بھاگ گئی۔ اور میں گرتے گرتے بچا۔

پتلون کے پائینچے جھاڑتا ہوا میں فضلو پنواڑی کی دکان پر آیا۔ وہ غالباً سارا تماشہ دیکھ چکا تھا۔ اسی لئے پان پر چونا لگاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس سے سگریٹ کا پیکٹ لیا۔ ایک سگریٹ سلگایا۔ اور گہرا کش لے کر اس سے کہا۔

"سالے ہنس کیوں رہے ہو؟"

"تم نے کافی کوشش کی لیکن کامیاب نہ رہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ بلّی نے تمہارا راستہ کاٹا ہے یا تم نے بلّی کا۔ خیر یار! اور سناؤ۔ بن سنور کر کہاں جا رہے ہو۔ کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

"پان لگاؤ بیٹا پان! آج میں تفریح کے لئے نکلا ہوں۔"

"پان تو میں لگا ہی رہا ہوں۔ لیکن بیٹا اپنی خیر مناؤ۔ کالی بلّی سے مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ گھر واپس لوٹ جاؤ۔"

"گھر واپس جاؤں یا نہ جاؤں۔ پہلے پیسے واپس کرو۔ بیس کا نوٹ دیا ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"لو یہ تمہارے بقیہ پیسے۔ لگتا ہے جیب کافی گرم ہے۔ اسی لئے پنچم میں بول رہے ہو۔"

کچھ کہے بغیر میں نے پیسے جیب میں رکھے۔ اور آگے چل پڑا۔ ایک لمحے کے لئے دل میں خیال آیا کہ کہیں پنواڑی سچ تو نہیں کہہ رہا ہے۔ لیکن میں نے دل کو تسلّی دی کہ یہ سب پرانے زمانے کے خیالات ہیں۔ آج دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ آج کا آدمی چاند پر سیر وتفریح کر کے آچکا ہے۔ مریخ اور زہرہ کے گرد خلائی جہاز چکّر کاٹ رہے ہیں۔ عنقریب خلائی بس سروس جاری ہونے والی ہے۔ جس میں عام آدمی بھی خلار کی سیر کر سکتا ہے۔ اور میں گھر واپس چلا جاؤں ؟ نہیں . . . . نہیں میں اتنا الّو نہیں ہوں۔ اور میں واپس ہونے کے بجائے بس اسٹاپ کی طرف آگیا۔ جہاں ۴۴ نمبر کی بس آنے والی تھی۔

یہ ایک روشن اور چمکیلی صبح تھی۔ سنہری دھوپ، نیلا آسمان، باغ میں شاداب سبزہ، جیب میں موٹی رقم، معدے میں صبح کا بہترین ناشتہ اور کافی..... اب اس سے زیادہ مکمّل صبح اور کیا ہو سکتی ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے میں کیو میں کھڑا ہو گیا۔ اور بس کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک ہاکر صبح کا اخبار لئے گزرا۔ بس اسٹاپ پر بھیڑ دیکھ کر وہ میرے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے قوّالوں کی طرح ایک ہاتھ کان پر رکھا۔ اور سرخیاں سنانے لگا۔

اس کی کرخت آواز سے سنہری دھوپ دُھندلانے لگی۔ نیلا آسمان غبار آلود ہونے لگا۔ شاداب سبزہ مرجھانے لگا۔ اور میرا دل طیش میں آنے لگا۔

لوگ اخبار خرید کر پڑھنے لگے۔ لیکن مجھے اخباروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے جب کرخت آواز والا ہاکر آگے چلا گیا تو میں دو تین نمبر آگے والی لڑکی کا چہرہ پڑھنے لگا۔ چہرے پر کئی مصرعے درج تھے۔ مثلاً "پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے....."

یا پھر جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی وغیرہ وغیرہ۔

لڑکی نے جو مجھے اپنا چہرہ پڑھتا ہوا دیکھا تو فوراً چہرے کی کتاب بند کر لی۔ اور لاتعلق سا ہو کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ جہاں ۴۴ نمبر کی بس آنے والی تھی۔ کچھ دیر بعد اچانک اس نے کہا۔

"بھائی جان! ۴۴ نمبر کی بس سبزی منڈی جائے گی نا؟"

"جی..... جی ہاں..... جی ہاں جائے گی۔ ضرور جائے گی۔" میں نے بھائی جان کے صدمے کو جھیل کر کہا۔

میں نے ایک اور سگریٹ سلگائی۔ اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ساری خوبصورت لڑکیاں بھائی بنانے پر تُلی رہتی ہیں۔ کوئی میرے ذہن کو نہیں پڑھتی۔ کوئی میرے دل میں نہیں جھانکتی۔ کوئی میرے ..... میں اس صدمے کو بھولنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ بس آگئی۔ بس ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھی۔ اسٹاپ پر کوئی نہیں اترا۔ لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ دروازے پر کھڑا ہوا کنڈکٹر چیخ کر بولا۔

"دو سے زیادہ نہیں۔ تیسرا آیا تو اٹھا کر پھینک دوں گا۔"

لوگوں میں احتجاج کی ہمّت نہ رہی۔ کنڈکٹر خاصا صحت مند تھا۔

بس نے سبزی منڈی جانے والی میری منہ بولی بہن اور ایک منحنی کلرک کو لیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

تلخی دور کرنے کے لئے میں نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔ اور دوسری بس کا انتظار کرنے لگا۔ سبزی منڈی والی لڑکی کے بے نیازانہ رویّے سے میرا شوقِ عشق صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور دوسری کسی اور لڑکی سے عشق کرنے کی ہمّت نہ رہی۔ بھیڑ میں ایک سرخ سوٹ والی تھی۔ جو بار بار اپنی ننھی سی سنہری گھڑی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا نیا نویلا شوہر بھی کافی بے چین

نظر آرہا تھا۔ وہ ہر آنے والی ٹیکسی کو بغور دیکھتا۔ پھر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ٹریفک کے ہجوم کے اوپر دیکھنے لگتا جہاں سے لال کی بس آنے والی تھی۔

ریلنگ پر بیٹھے ہوئے ایک لمبے بالوں والے نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"یار! یہ لالی پاپ"، کب آئے گی۔ ہائے میری جان اب آ بھی جاؤ نا!"

سرخ سوٹ والی کا شوہر اچانک پلٹا اور لالی پاپ کہنے والے پر ٹوٹ پڑا۔ دوسرا ریلنگ پھلانگ کر بھاگ نکلا۔ دوسرے کئی لوگ بھی اس کی دھنائی میں ہاتھ بٹانے لگے۔ شاید یہ بس کے نہ آنے کی، اجتماعی جھلاہٹ تھی جو غصے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ایک پوپلے منہ والا بوڑھا کیو سے نکلا۔ اس نے اپنے آگے والے سے کہا۔

"میں ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔ ذرا میرے نمبر کا خیال رکھنا۔ بس گیا اور آیا۔"

کیو سے نکل کر وہ دھنائی کرتے ہوئے لوگوں کے پاس آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کس کس کے دو چھانپڑ نوجوان کو رسید کئے۔ اور بولا۔

"حرامی پنا کرتے ہو سالے۔ اور دوں۔ اور دوں کیا۔"

ہاتھ جھاڑ کر وہ پھر واپس کیو میں آ کھڑا ہوا۔ اتنے میں دو کانسٹبل آ گئے۔ انھوں نے نوجوان کو گریبان سے پکڑا۔ اور گھسیٹتے ہوئے اسے بس اسٹاپ سے آگے قریبی پولیس اسٹیشن کی طرف سے لے جانے لگے۔ پولیس کے جانے کے بعد بھیڑ چھٹنے لگی۔ اور پتہ چلا کہ اس ہنگامے کے دوران بس آ کر چلی گئی تھی۔ سرخ سوٹ والی اور اس کا شوہر دونوں غائب تھے۔ غالباً ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر چپکے سے بس میں سوار ہو گئے تھے۔

اب دھوپ تیز ہو چلی تھی۔ اور بس کے انتظار سے میں بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس لئے کیو سے نکلا۔ اور سڑک پر پیدل چل پڑا۔ ہو سکتا ہے اگلے اسٹاپ پر بس یا کوئی ٹیکسی مل جائے۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ کوئی بھی خالی ٹیکسی اتنے عرصے میں نظر نہ آئی تھی۔ جتنی بھی ٹیکسیاں گذریں، ان میں لوگ تھے۔ بلکہ ایک ٹیکسی میں تو ایک کتا بھی نظر آیا۔ جو ایک عورت کی گود میں بیٹھا تھا اور مجھے دیکھ کر بھونکنے لگا تھا۔

دوسرے اسٹاپ پر پہنچا تو وہ ویران پڑا تھا۔ صرف ایک خارش زدہ کتا تھا۔ جو دیوار سے اپنا جسم رگڑ رہا تھا۔ اور کوئی نہ تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے آواز دی۔ ٹیکسی رک گئی۔ ڈرائیور نے گردن نکال کر پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"بس سیدھا چلے چلو"، میں نے بیٹھتے ہوئے کہا ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کیا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ اسی وقت میں نے دیکھا۔ سنسان اسٹاپ پر ایک خالی خالی سی بس آ کر رکی تھی۔ اگر میں چند لمحے اور رک جاتا تو بس مل جاتی۔ اچانک مجھے کالی بلی کا خیال آ گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ فضلو پنواڑی کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی لگا ہوں کے سامنے آ گیا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ ہو سکتا ہے یہ محض اتفاق ہو۔ اور عام زندگی میں اس قسم کے اتفاقات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

ریس کورس کے قریب پہنچ کر میں نے ٹیکسی رکوائی۔ اور ڈرائیور کو دس کا نوٹ دیا۔

"بنرہ روپیئے ہوتے ہیں جناب۔" ڈرائیور نے خشک لہجے میں کہا۔

"بنرہ ——— ! ابے دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تیرا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"پیٹرول نہیں ملتا جناب۔ ایران میں جنگ ہو رہی ہے۔ بلیک میں خریدنا پڑتا ہے۔" اس نے بدستور خشک لہجے میں کہا۔

میں نے غصّے کو ضبط کیا۔ اور جیب سے پانچ کا
نوٹ نکال کر اسے دیا۔ ڈرائیور نے ادھر ادھر کی کئی ایک
جیبوں کو ٹٹولا۔ پھر بولا۔

"جناب تین روپئے چھٹا دیجئے۔ میرے پاس دو
روپیئے نہیں ہیں۔"

"نہیں ہے تو میں کیا کروں۔ مجھے تو بہرحال دو
روپیئے واپس لینا ہے تم سے۔ کچھ بھی کرو تم۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سامنے والے ہوٹل سے چلتے
پی کر آتا ہوں۔"

"تو کیا جب تک میں تمہارا انتظار کروں؟"

"مجبوری ہے صاحب! آج کل چھٹے کی بڑی مارا
ماری ہے۔ آپ ٹیکسی میں بیٹھئے۔ میں فوراً آتا ہوں۔ جب
تک آپ یہ کیسٹ سنیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیپ ریکارڈر
آن کر دیا۔ اور ٹیکسی "رمبا ہو ہو" سے گونجنے لگی۔ میں نے
جاتے ہوئے ڈرائیور کو روک کر کہا۔

"بند کرو یہ رمبا سمبا۔ اور جلدی آؤ۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے ٹیپ ریکارڈر
بند کیا۔ اور سڑک کے اس پار ریستوران میں گھس گیا۔
فٹ پاتھ پر لوگ آ جا رہے تھے۔ ہشاش بشاش،
شاداں و فرحاں اور آزاد۔ اور میں ــــ دو روپیئے کا
قیدی، ٹیکسی کی تپتی ہوئی چھت کے نیچے پسینہ پونچھ رہا
تھا۔ اور دل ہی دل میں کالی بلی کو کوس رہا تھا۔

ایک نوجوان لڑکی اور لڑکا قریب سے گذرے۔

"اسی ٹیکسی میں بیٹھ چلو۔" لڑکی پھسپھسائی۔

"آگے چلو۔ یہ تو کوئی غنڈہ معلوم پڑتا ہے۔
لفڑا کرے گا۔"

لڑکے نے پھسپھسا کر کہا تھا۔ لیکن میرے کانوں نے
اسے سن لیا تھا۔ میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ اور فٹ پاتھ
پر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میں نے
تیز جھٹکے سے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا۔ اور ریس کورس
میں داخل ہو گیا۔ جہنّم میں گئے دو روپیئے.....

ریس کورس میں گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ اور
آدمی شور مچا رہے تھے۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آدمیوں
کے شور سے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ یا ان کی دوڑ سے
آدمی شور مچا رہے تھے۔ میں نے کاؤنٹر سے بُک لیٹ
خریدی اور اس کا مطالعہ کرنے لگا کہ کون سا گھوڑا بہتر
رہے گا۔ بلیک روز........ یہ تو چار سو بیس
ہے۔ نہیں کوئی اور دیکھنا چاہیئے۔ یوں تو ستارہ
ٹھیک ہے لیکن ہمیشہ جیتتے جیتتے ہار جاتا ہے۔ اور ٹامی
تو گھوڑا نہیں ٹٹو ہے۔ بلکہ گدھا ہے۔ نہیں چلے گا۔ تو پھر
شالیمار ــــ نہیں اس کم بخت نے پچھلے ماہ میرے
ڈھائی سو روپیئے چرا لیے تھے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے لال رنگ
والا۔ نام بھی کیا شاندار ہے۔ برق........ یقیناً
برق رفتار ہوگا۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ یہ گھوڑا یقیناً
سارے دن کی کوفت دور کر دے گا۔

دوڑ شروع ہو گئی۔ لوگ پاگلوں کی طرح چیخ رہے
تھے اور غیرت دلا رہے تھے۔ میرے پاس ہی ایک پارسی
بوڑھا زور زور سے چلّا رہا تھا کہ اس کی مصنوعی بتیسی
کا اوپری حصّہ گر پڑا۔ اس نے بتیسی کا دوسرا حصّہ بھی
نکال لیا اور دونوں کو رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ
لیا۔ اور پہلے سے زیادہ زور زور سے شور مچانے لگا۔

"بھاگ ٹامی بھاگ۔ تیرے آگے زینت امان ہے
اُسے پھلانگ جا۔ ابے بھاگ۔ نکل چل۔ چل آ گئے۔ ہاں
اور آگے۔ ارے رے رے۔ ہائے ہائے۔ رہ گیا سالا رہ
گیا۔ ہائے تجھے ٹامی نہیں حرامی کہنا چاہیئے۔ ایک دم حرامی۔"

برق اس وقت دوسرے نمبر پر تھا۔ اور برق
رفتاری کا ثبوت دے رہا تھا۔ میرے جسم کا سارا خون سمٹ
کر کانوں میں آ گیا تھا۔ بوڑھا پارسی اب بھی ٹامی کو مسلسل
گالیاں دے رہا تھا۔ برق آگے اور آگے بڑھتا ہی جا رہا
تھا کہ اچانک زوردار دھاکہ ہوا۔ اور شور سے سارا ریس

کورس کانپ اُٹھا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اور دھول کے اڑتے
ہوئے بادلوں کی وجہ سے میں سمجھ نہ سکا کہ کیا حادثہ ہوا
ہے۔

تھوڑی دیر بعد لاؤڈ اسپیکر جاگ اٹھا ——

"حضرات —— حضرات ...... شانتی رکھئے۔
شانت رہیئے۔ اور اپنی اپنی نشستوں پر سے نہ اٹھیئے۔
برق ...... ہمارا پیارا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا ہے۔
جی ہاں حضرات اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ اور جاکی ——
حضرات افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جاکی زندہ نہ
بچ سکا۔ ہمیں ازحد افسوس ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا۔

لیکن مجھے یہ منظور نہ تھا کہ مزید وہاں رکوں۔ میں
ریس کورس سے باہر آ گیا۔ دل میں سوچا کہ گھر واپس
چلا جاؤں۔ ستارے گردش میں ہیں۔ آج کا دن واقعی بہت
منحوس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ
نہیں گھر واپس مت جاؤ۔ اور میرے اندر کے مہذب انسان
نے یہ خیال قبول کر لیا۔

اس وقت دوپہر کے ڈھائی بجے تھے۔ میں فیصلہ
نہیں کر پا رہا تھا کہ پہلے فلم دیکھی جائے یا کھانا کھایا جائے۔
کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ عادت کے مطابق میں نے سکہ
نکالا کہ ٹاس کر لیا جائے۔ اگر چہرہ آیا تو فلم نہیں تو پہلے
کھانا ——!

میں نے سکے کو فضا میں اچھالا۔ وہ ہوا میں پلٹیاں
کھاتا ہوا فٹ پاتھ پر گرا۔ اور پھر لڑھکتا ہوا کھلے مین ہول
میں داخل ہو گیا۔ میں نے ایک روپیہ کے سکے کی قبر پر فاتحہ
پڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ سوچا پہلے کھانا
کھا لیا جائے۔ بھوک زوروں کی لگی تھی۔ میرے ساتھ یہ
عجیب معاملہ رہا ہے کہ جب میں ذہنی طور سے پریشان
ہوتا ہوں۔ اس وقت بھوک بڑی شدید لگتی ہے۔
سینما گھر کے سامنے والے ریسٹورنٹ میں کافی بھیڑ
تھی۔ میں بھیڑ سے گذر کر اندر جانے ہی والا تھا کہ ایک
بیرے نے روک لیا۔

"صاحب کوپن دیجئے۔"

"کوپن؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیسا
کوپن؟؟"

"تو آپ براتیوں میں سے نہیں ہیں؟" اس نے
مزید سوال کیا۔

"برات ...... ؟ کیسی برات؟؟"

"اوہ جناب! یہ ریسٹورنٹ آج دوپہر میں
چھانگے لال مانگے لال نے بُک کیا ہے۔ اس کے لڑکے کی
شادی ہے۔ اور سارے براتیوں کو ابھی یہاں دعوت
دی گئی ہے۔ کوپن ہم نے اس لئے دیا ہے کہ ہر کوئی ایرا غیرا
نہ آ جائے۔"

اسی وقت سامنے سینما گھر کی گھنٹی بجی۔ اور میں اس
گستاخ بیرے کو چھوڑ کر سڑک عبور کرنے لگا۔

آس پاس کوئی دوسرا ریسٹورنٹ نہ تھا۔ اس لئے
میں نے کھانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ کیونکہ اگر کسی
دوسرے ریسٹورنٹ کی تلاش میں نکلتا تو فلم کا شروع کا
حصہ چھوٹ جاتا۔ اور میں یہ کبھی گوارہ نہیں کر سکتا۔ میں
سینما گھر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا، جس میں فلم "تیرا جوتا
میرا سر" بڑی دھوم سے چل رہی تھی۔ کافی رش تھا۔ ایک
مونچھ والے نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر آنکھ
سے ایک مبہم اشارہ بھی کیا جو میں سمجھ نہ سکا۔ میں اسے
دیوانہ سمجھ کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے چوروں
کی طرح ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر چپکے سے سبز رنگ کے ٹکٹ
کی جھلک دکھلائی۔ میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اور دُم ہلاتا ہوا
اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ بھیڑ سے نکل کر ایک طرف کھڑا
ہو گیا۔ جب میں قریب پہنچا تو اس نے سرگوشی میں کہا۔

"سارے ٹکٹ ختم ہو گئے ہیں۔ میرے پاس بالکنی کا
صرف ایک ٹکٹ بچا ہے۔ اور لوگ تو سات روپیے والا پندرہ
روپیئے میں فروخت کر رہے ہیں۔ میں آپ سے صرف دس

لوں گا۔ آپ مجھے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے فوراً دس روپئے دے کر ٹکٹ حاصل کیا۔ اور اس کا شکریہ ادا کر کے ہال کی طرف بڑھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ واقعی شریف آدمی تھا۔ اگر سارے بلیک مارکیٹیئے اور کالا دھندہ کرنے والے اپنے دل میں ذرا بھی نرم گوشہ رکھیں تو اس ملک کے بے شمار مسائل حل ہو جائیں ـــــ مگر کہاں ایسے سب لوگ ہوتے ہیں۔ کسے ضرورت ہے شرافت کی..... رحمدلی کی اور دردمندی کی بہت بُرا زمانہ آ گیا ہے یارو۔

میں انھیں خیالات میں مگن سنیما ہال کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میری نظر بکنگ آفس پر پڑی۔ دیکھا تو ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف بالکنی کے ٹکٹ کی کھڑکی کھلی تھی۔ ایک آدمی آیا۔ اس نے ہاتھ اندر ڈال کر ٹکٹ لیا اور اطمینان سے ہال میں داخل ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن وہ مونچھ والا شریف زادہ کہیں نظر نہ آیا.... چونا لگا دیا سالے نے......

میں زینہ عبور کر کے اوپری منزل کی بالکنی میں آ گیا۔ اندر کافی بھیڑ تھی۔ نیوز ریل ختم ہی ہونے والی تھی۔ اندھیرے میں ٹٹول کر آگے بڑھا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے ایک سریلی چیخ ابھری۔ اور میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کالے برقعے میں تھی۔ اس لیے نظر نہ آئی تھی۔ ویسے مجھے احساس ہو گیا تھا کہ سنیما کی کرسیاں اتنی نرم اور گداز نہیں ہوتیں۔

"سوری.....!" میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے ایک کرخت چیخ ابھری۔ اور میں دوبارہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن کرخت چیخ معاف کرنے والوں میں سے نہ تھی۔ اس نے جوتا نکالا۔ اور تڑ سے میرے سر پر دے مارا۔ اور عین اسی وقت آرکسٹرا کے عظیم الشان شور میں اسکرین پر فلم کا ٹائٹل ابھرا "تیرا جوتا میرا سر"

کئی ٹارچیں اندھیرے کے کینواس پر روشن لکیریں بنا رہی تھیں۔ ویسے ایک ہی جوتے نے میری بینائی کافی روشن کر دی تھی۔ اب مجھے ہر کرسی بیٹھے ہوئے جوتے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں بالکنی کے اگلے سرے پر آ گیا۔ اب کی مرتبہ میں نے ٹٹول کر اچھی طرح دیکھا۔ کرسی خالی تھی۔ بلکہ آس پاس کی بھی کرسیاں خالی تھیں۔ اس لئے میں آرام سے پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اور فلم دیکھنے لگا۔

فلم نام ہی کی طرح دلچسپ اور روح پرور تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہیرو ویلن کی جی بھر کے ٹھکائی کرتا تھا۔ اور چونّی والی پبلک کی تالیوں کے شور سے پورا ہال گونجنے لگتا تھا۔

فلم ختم ہوئی تو شام گہری ہو چکی تھی۔ اور سڑک کے کنارے کے لیمپ پوسٹ روشن ہو چکے تھے۔ بھوک کو بہلانے کے لئے میں نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ لیکن وہ خالی ہو چکا تھا۔ سگریٹ لینے کے لئے میں ایک اسٹال پر آیا۔

"پناما ایک پیکٹ دو۔"

پنواڑی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس پان پر چونا گھستا ہوا مسکراتا رہا۔ مجھے کچھ غصہ لگا۔ کیونکہ میں نے اس سے سگریٹ کی فرمائش کی تھی۔ مسکرانے کو ہرگز نہ کہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پان کو ایک طرف رکھا۔ اور مسکراتے ہوئے ایک اشارہ کیا۔ وہاں ایک بورڈ لگا تھا۔

"یہاں صرف پان ملتا ہے۔"

میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ میں پنواڑی کے ساتھ کون سا ایسا سلوک کروں کہ وہ مسکرانا بند کر دے میں فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ ایک دوسرے اسٹال پر آیا۔ وہاں صرف سگریٹ ملتے تھے۔ میں نے پناما کا سگریٹ لیا۔ اور پیسے دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور پھر میرے ہاتھوں کے طوطے دوسری مرتبہ پرواز کر گئے۔ پرس غائب تھا۔ سنیما سے عجلت میں نکلتے ہوئے

نعیم ہریانہ

پرس کہیں گر گیا تھا یا پھر کسی نے جیب سے نکال لیا تھا۔

میں نے سگریٹ کا پیکٹ واپس کر دیا۔ پنواڑی نے مجھے حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔"

میں اُسے حیران چھوڑ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ رات ہو چکی تھی۔ بھوک سے معدہ کڑ کڑا رہا تھا۔ جیب خالی تھی۔ اور میں گھر سے بہت دور تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ اب کیا کیا جائے؟ یہ سوال ہتھوڑے کی طرح میرے ذہن پر پڑ رہے تھے۔

کافی دیر بعد ایک خالی ٹیکسی نظر آئی تو مسئلہ حل ہو گیا۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ اور اسے گھر کی طرف چلنے کو کہا۔ راستے میں اُس کالی بلی کو کوستا رہا جس کی وجہ سے میرا سارا دن غارت ہوا تھا۔

فضلو پنواڑی کی دکان کے سامنے میں نے ٹیکسی رکوائی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ اور مسکرا کر کہا۔

"کہو کیسا دن گذرا؟"

"وہ سب بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے بیس روپئے دو۔"

اس نے بیس روپئے دیئے۔ میں ڈرائیور کی طرف آیا۔ اُسے بیس کا نوٹ دیا۔ اس نے میٹر برابر کر کے انجن اسٹارٹ کیا۔

"ارے —— باقی کے پیسے تو دو......!"

"برابر ہو گیا۔ پیٹرول بہت مہنگا ہو گیا ہے جناب!" ڈرائیور نے کہا۔ اور آگے بڑھ گیا — میں واپس فضلو کے پاس آیا۔ اور اس سے کہا۔

"یار آج کا سارا دن برباد ہو گیا۔ ہر جگہ ایک نئی مصیبت۔ آج میں واقعی مان گیا کہ کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو نحوست ساتھ لگ جاتی ہے۔

"چلو شکر ہے آج تم میری اس بات کی تائید کرتے ہو۔ لیکن اب میں اس معاملے پر دوسرے رُخ سے سوچ رہا ہوں۔ وہ یہ کہ کوئی انسان کسی کالی بلی کا راستہ کاٹ جائے تو اس بلی کا کیا حشر ہوگا؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"بلی کا کیا ہوگا۔ ذرا ادھر دیکھو۔ اس کی نحوست سے میرا سارا دن غارت ہوا۔ دَر دَر کی ٹھوکریں کھائیں۔ جیب کٹ گئی۔ صبح سے بھوکا ہوں۔ ٹیکسی کا کرایہ تم سے لے کر ادا کیا۔ اس سالی بلی کا کیا بگڑا؟"

"اب کیا بتاؤں برادر! تمہارے جانے کے آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ایک کار کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئی۔ تم تو سالے زندہ ہو۔ لیکن تمہاری نحوست نے اس کی جان لے لی۔ کب لوٹا رہے ہو میرے بیس روپئے؟"

جینا تو ہے اسی کا

بقیہ صـ۱۵ سے آگے

اسی لئے کہ اب پیچھے کی سیٹ پر محمد علی بھی بیٹھا ہوا تھا اور آگ کو ہوا دینے والے وہ وجود منتشر ہو چکے تھے صغرا خالہ ایک ہاتھ سے لال چند رکو تھامے دوسرا ہاتھ محمد علی کی کمر میں ڈالے دونوں کو ڈانٹتی چل رہی تھیں

"اب جو لڑے تم دونوں تو اللہ قسم لالو دودھ نہ معاف کروں گی اور وصیت کر جاؤں گی محمد علی میری قبر پہ نہ آئے!"

نشتر خانقاہی

بے نوائی چھین لے، بےچینیاں دے جا مجھے
پیڑ کہتا ہے ہوا سے، آندھیاں دے جا مجھے

سر پہ کوئی چھت تو ہو، مجھ جیسے بے گھر کے لئے
اے خلائے بیکراں، اک آسماں دے جا مجھے

تو نہیں تو اور میرا سننے والا کون ہے؟
عمر بھر کے واسطے خاموشیاں دے جا مجھے

ہر طرف انجان آنکھیں، ہر قدم پر حادثے
اے جہانِ گم شدہ! نام و نشاں دے جا مجھے

رات کی جانب رواں ہے لمحۂ شامِ زوال
کچھ نہیں ممکن تو احساسِ زیاں دے جا مجھے

اب گوارا ہو چکا، ہر ذائقہ زہراب سا
اپنی ساری تلخیاں، عمرِ رواں دے جا مجھے

مٹ چکا ہے دل سے اک اک یاد آور واقعہ
صحبتِ شامِ گزشتہ، ہچکیاں دے جا مجھے

تیوھریا نہ

علقمہ شبلی

شوق کی خوشبو، نہ کوئی خواب کا جادو ملا
رات یہ کیسی ہے، یادوں کا نہ اک جگنو ملا

زرد پتّوں کی طرح کیوں کر نہ بکھرے آدمی
ہر قدم پر زندگی میں شورِ ہاؤ ہُو ملا

من کے ساگر کی تلاطم خیزیاں بڑھنے لگیں
جب کبھی باہر کے طوفاں پر مجھے قابو ملا

سر پھری یادوں نے لے لی نیند آنکھوں کی مری
جو کبھی کروٹ میں نے بدلی درد کا پہلو ملا

درد کے سورج میں شبلی عمر بھر جلتا رہا
چھاؤں یادوں کی نہ اس کو سایۂ ابرو ملا

عطیہ پروین

صغرا خالہ کو صبح ہی صبح کسی نے آکے خبر سنادی نئی بازار میں جھگڑا ہو گیا ہے اور دوکانیں بند ہو رہی ہیں! بس صغرا خالہ کی اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے۔ چولہے پر چڑھی دال کو ابلتی چھوڑ آٹے کے تسلے میں مکھیاں بھنکتی چھوڑ ہائے واویلا مچاتی نقاب سر پر ڈالے ننگے پاؤں گھر سے نکل پڑیں۔

ماحول، سچ مچ بڑا ڈرا سہما اور پر اسرار سا لگ رہا تھا سڑک پر روز کی چہل پہل نہیں تھی دوکانیں تو کھلی تھیں مگر خریدار بہت کم تھے اور جو تھے بھی وہ سامان لے کر اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے کسی آفت کے آجانے کا ڈر ہو۔

"ارے کچھ سنا تم نے۔ صغرا خالہ سامنے آتے نا بیتا اگروال جی سے مخاطب ہوئیں۔ سنا بھیّا تم نے۔ نئی بزار میں جھگڑا ہو گیا ہے۔"

"ہاں صغرا خالہ۔ اگروال جی ٹھٹھکے۔ سنا میں نے بھی ہے بھگوان کرے خبر غلط ہو!"

"ارے بھیّا۔ میرے تو کلیجے میں آگ لگی ہے لالو کی دوکان وہیں پر تو ہے...... ہائے جانے کیا حال ہوگا اس کا ـــــ میں جاتی ہوں بلائے لاتے ہوں!"

"ارے نہیں خالہ۔ وہ گھبرا کر بولے۔ ادھر نہ جائیے اگر کہیں یہ خبر سچ ہے تو...... آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"اے ہے کیوں ٹھیک نہیں ہے ـــ وہ چلّائیں۔ میرا اللہ بیلی مددگار ہوگا میں نہ جاؤں گھر میں بیٹھی بکری کی طرح جگالی کرتی رہوں واہ بھیا اچھی صلاح دیتے ہو تم" اور انھوں نے سڑک پر تیز تیز جاتے ایک رکشہ والے کو آواز دی۔

"او رکشے والے۔ اے بھیا کیا ہوائی جہاز بنا ہے روک رکشا!"

بے حد کالے بے حد موٹے اس رکشہ والے نے گھوم کر دیکھا اور پوچھا۔

"کہاں جانا ہے ماں جی؟"

"جہنم میں جانا ہے"۔ صغرا خالہ خفا ہو کر بولیں۔ "لو اور سنو کہاں جانا ہے ارے کہیں جانا ہے تب ہی تو رشکہ رکوایا ہے نئی بزار کے کتنے پیسے لوگے؟"

"نئی بازار۔ رکشہ والا کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ نہیں ماں جی اپنی اور آپ کی جان تھوڑے لینا ہے سنا ہے ادھر پھساد ہو گیا ہے پولس لگی ہے!"

"ہائے پھر وہی فساد۔ اللہ میرے لالو کو اپنے حفظ و امان میں رکھیو۔۔۔۔۔ رہن دے تو اپنی جان بچا گھر والی کے آنچل میں جا کے چھپ جا میرا کون بیٹھا ہے کی اپنی سلامتی کی فکر کروں۔۔۔۔۔۔"
یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پیدل ہی چل پڑیں۔ ننگے پاؤں۔ بدحواس نقاب سر کے بجائے کندھوں پر پڑی ادھر ادھر دیکھتی اور لالو کے لئے دعائیں مانگتی ہوئی ---!

لالو۔۔۔۔۔جس کا پورا نام لال چند۔ آج اللہ رکھے بھر پور جوان تھا۔ نئی بازار میں اسٹیل کے برتنوں کی دوکان تھی اچھی خاصی آمدنی تھی چین سے زندگی گذر رہی تھی اور اب صغرا خالہ کو اس کی شادی کی بڑی فکر تھی۔

صغرا خالہ، جو محلے بھر کی خالہ تھیں۔ اپنے کچے گھر میں جس میں نیم کا بڑا سا پیڑ لگا ہوا تھا وہ بڑی سادہ اور قناعت بھری زندگی گزار رہی تھیں۔ میاں عرصہ ہوا مر چکے تھے ایک لڑکی تھی جس کی سہارن پور میں شادی ہو چکی تھی کبھی کبھار وہ آتی تو بہت زور لگاتی کہ صغرا خالہ کو اپنے ساتھ لے جائے مگر صغرا خالہ کو اپنا وہ گھر پیارا تھا جس میں انھوں نے گھونگھٹ الٹا تھا وہ نیم کا پیڑ پیارا تھا جس کو ان کے میاں نے بڑے چاؤ سے لگایا تھا وہ محلہ پیارا تھا جہاں ان کے اتنے برس گذرے تھے اور وہ لال چند پیارا تھا جس کو انھوں نے پورے سوا برس تک دودھ پلایا تھا۔
وہ، اس دن کو کبھی نہیں فراموش کر سکتی تھیں جس روز دھرم چند کی پتنی ننھے سے کیڑا سے لال چند کو جنم دے کر چل بسی تھیں اور دھرم چند پتنی کے غم سے نڈھال بھوک سے روتے بلبلاتے بچے کو سینے سے لگائے اس کے ننھے سے منھ میں روئی کی بتی سے دودھ نچوڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دودھ کی ایک بوند بھی بچے کے منہ میں نہیں جا پا رہی تھی ان کا گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا کئی عورتوں کی گودیوں میں بچے بھی تھے اور ان کے سینے قدرت کے انمول خزانے سے لبا لب تھے پھر بھی وہ اپنے ان خزانوں کو ایک لاوارث بچے کے لئے انڈیلنے پر تیار نہیں تھیں اور اپنے بچوں کو آنچل کی آڑ میں سیراب کرتی ہوئی مرنے والی کی خوبیاں بیان کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

صغرا خالہ یہ سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔
ان کی بچی اسمیٰ ان کی گود میں دبکی دودھ پی رہی تھی۔
وہ بڑی دیر تک منتظر رہیں کہ کوئی ماں اٹھے، کوئی مامتا چھلکے مگر کوئی نہ اٹھا، بن ماں کا بچہ روتا رہا بلکتا رہا۔۔۔۔۔ تب انھوں نے اسمیٰ کو پاس پڑی چارپائی پر ڈالا اور اٹھ کر دھرم چند کے پاس گئیں۔
"مجھے بچے کو دے دیجئے بھیا!" انھوں نے ہاتھ بڑھائے۔

"یہ کسی طرح چپ ہی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ کیا کروں!" دھرم چند بے بسی سے بولے اور روتے ہوئے بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔
"ابھی چپ ہو جائے گا!" صغرا خالہ نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اپنی جگہ آکے بیٹھیں آنچل اٹھایا اور بچے کو چھاتی سے لگا لیا۔

اف فوہ! اس منظر کو بھی وہ کبھی فراموش نہ کر سکیں۔ ساری عورتیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ بچہ چپ تھا اور صغرا خالہ کی ممتا کا رس نچوڑ رہا تھا اور لالہ دھرم چند کے لبوں پر کپکپاہٹ بھی تھی مسکراہٹ بھی تھی احسان کا جذبہ بھی تھا۔ چہرے پر اور عقیدت کے سائے بھی تھے حیرت بھی تھی اور حسرت آمیز مسرت بھی تھی۔
بڑا ہنگامہ ہوا اس پر!

ادھر بھی ادھر بھی۔ ہزار طرح کی باتیں۔ ہزار طرح کی تہمتیں طرح طرح کے طعنے، طنز و نشتر۔ آوازے، جملے۔ غصّہ گرمی، دھمکیاں موت زندگی ترک کرنے کے دعوے! صغرا خالہ ایک چپ ہزار چپ۔ مگر اپنی ڈگر سے نہ ہٹیں۔ وہ پیارا سا بچہ جو کبھی بڑا کمزور اور مریل تھا ان کے ممتا رس سے سیراب ہو ہو کر بڑا ہی تندرست اور گورا چٹّا نکل رہا تھا۔ اس کا نام لال چندر رکھا گیا تھا وہ پیار سے اس کو لالو پکارتی تھیں کبھی کبھی للوا بھی۔ لالہ دھوم چندر ان کے اس احسان تلے گلے گلے تک ڈوب گئے تھے کبھی وہ ان کی روپے پیسے سے مدد کرنا چاہتے ان کے لئے غلّہ بھجواتے یا پھلوں اور میووں کی ٹوکریاں نذر کرتے یا کبھی کرتے پاجامے کا کپڑا لاتے تو وہ بڑی خوبصورتی سے انکار کر دیتی۔

"نا بھیّا نا۔ یہ تو میری دودھ پلائی کی اجرت ہوئی پھر میں للوا کی ماں کہاں ہوتی اس کی انا ہو گئی کھلائی ہو گئی میری ممتا کو ان دنیا کی چیزوں سے تولنا چاہتے ہو!"

"ارے نہیں بہن جی۔ لالہ بے چارے شرمندہ ہو جاتے۔

"روکھی سوکھی کھا کے بھی اللہ نے مجھے اس قابل کیا ہے کہ دو دو بچوّں کا پیٹ بھر سکوں ....
آخر سیدانی ہوں نا!" وہ ہنس دیتیں۔ سیّد لوگ دیتے ہیں لیتے نہیں!"

اور اب لالو اللہ رکھے جوان تھا اور ان کی لڑکی اسمیٰ کی شادی ہو گئی تھی ان کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار اتر آئے تھے اور چکنے چہرے پر جھرّیوں کا جال بندھ رہا تھا پھر بھی، ان کی محبت اور شفقت آج بھی جوان تھی۔

وہ دو ایک جگہ سانس لینے کو رکیں چلتے چلتے پیر کانپنے لگے تھے پھر بھی وہ اپنے کو گھسیٹتی رہیں۔ لالو دوکان جانے سے پہلے ان کے پاس آتا ضرور تھا۔ وہ اس کو خدا حافظ کہتی دروازے تک جاتیں اور جب تک وہ نظر آتا رہتا چلاتی رہتیں۔

"دیکھو۔ زیادہ تیز پھٹ پھٹیا نہ چلانا۔ وہ موٹر سائیکل کو اب تک پھٹ پھٹیا ہی کہتی تھیں۔ سیدھے دوکان جانا سمجھے کہیں رستے میں کسی بدمانش، لڑکے سے بات نہ کرنا، ، سیدھے گھر واپس آنا نامراد سنیما ایما نہ چلے جانا او للوا۔"

شام کو لالو واپس آتا تو پہلے ان کے پاس آتا پھر اپنے گھر جاتا۔ ابھی صبح بھی وہ آیا تھا ان کے ہاتھ کی چائے پیکے اور ان کے بٹوے سے چھالیہ اور سونف پھانک کے وہ دوکان کے لئے روانہ ہوا تھا۔ پھر اب ایک دم سے کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ سارے راستے لوگوں سے پوچھتی اور دعائیں مانگتی آئی تھیں۔ وہ سامنے لالو کی دوکان تھی۔ پوری بازار بند تھی اور چار چار چھ چھ کی ٹکڑیوں میں پولیس والے ٹہلتے پھر رہے تھے۔

"او بڑی بی۔ ادھر کہاں!" ایک نے ان کو ٹوکا وہ بڑے زور سے خفا ہوئیں۔

"ارے پھر تمہیں کیا میں کہیں جاؤں خدائی فوجدار ہو گیا۔"

"جا کہاں رہی ہو اماں؟" دوسرے نے نرمی سے پوچھا۔

"اپنے بیٹے کے پاس۔ وہ بولیں۔ وہ کیا سامنے دوکان ہے وہ دیکھو اللہ رکھّے بورڈ لگا ہے۔ لالہ لال چندر..... ان کا لہجہ فخر و غرور سے بھرا ہوا تھا۔

نعیم ہریانہ

"لالہ لال چندر۔۔۔۔۔" کئی آنکھیں ان کے غرارے اور کرتے اور برقعے پر جم گئیں۔

معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ کوئی پرزہ۔۔۔۔" ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا اور کان کے اوپر انگلی گھمائی۔

"اُئے تم خود ہوگئے سڑی دیوانے۔ وہ چلّائیں۔ لو اور سنو کہہ رہے ہیں پرزہ ڈھیلا ہے۔ بولو میرا لالو کدھر ہے۔" اسی وقت ایک طرف سے آواز آئی۔

"اماں!"

مڑ کر انھوں نے دیکھا۔ لالو ایک طرف کھڑا انھیں پکار رہا تھا۔

"اُئے ہے میرا لال۔ میرا بچہ!" دوڑ کر پہلے تو انھوں نے لالو کی بلائیں لیں پھر اس کو اوپر سے نیچے تک ٹٹول کر یہ اطمینان کیا کہ وہ صحیح سلامت تو ہے پھر بولیں۔

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے دل میں تو پنکھے لگ گئے تھے۔ چل گھر چل سنا ہے یہاں کوئی جھگڑا اگڑا ہوا ہے!" "تونے تو نہیں کوئی ڈھیلا ڈنڈا اچلایا کیوں رے۔ چل گھر چل!"

"تم چلو اماں میں ابھی آتا ہوں لالو نے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔

"ہرگز نہیں جاؤں گی۔ انھوں نے اس کا بازو تھام لیا۔ تجھے لیکر چلوں گی نہیں تو یہیں تیری دوکان پر بیٹھوں گی!"

مجبوراً لالہ لال چندر کو ان کے ساتھ آنا پڑا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اسکی چمکتی دمکتی پھٹ پھٹیا پر بیٹھیں اس کی چوڑی کمر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے یا علی مدد یا علی مدد چیختی چلاتی ہوئیں اور اس کو دھیرے دھیرے چلنے کی دہائی دیتی ہوئی کچھ دور موٹر سائیکل چلی ہوگی کہ جانے کدھر سے کئی آدمیوں کا ایک غول نکل پڑا۔

"مارو پکڑو۔ جانے نہ دینا۔ اس نے ابھی ایک لڑکے کو مارا ہے!" سب کے آگے محمد علی تھا جس سے لالو کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی صغرا خالہ بھی اس کو بہت چاہتی تھیں۔ میرے للوا کا دوست ہے۔ وہ بڑے پیار سے کہا کرتی تھیں اور اکثر اس کو بڑے بال رکھنے پر ڈانٹتی بھی تھیں۔

"اچھا! تو یہ ارادے ہیں!" لالو نے موٹر سائیکل روک لی اور فوراً ہی اس کا ہاتھ پینٹ کی جیب میں گیا دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا۔

"اب بولو!" اس نے محمد علی سے پوچھا۔

دونوں ایک دوسرے کو وحشی درندوں کی طرح گھور رہے تھے ان دونوں کے چہروں پر وحشت تھی درندگی تھی بے مروتی تھی محمد علی کے ہاتھ میں لمبا سا چمکدار چاقو تھا اور اس کے پیچھے کھڑے کرائے کے ٹٹو اس کے حکم کے منتظر تھے۔

پہلے تو صغرا خالہ نے ایک چیخ ماری پھر باری باری دونوں کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر دونوں کے بیچ کھڑی ہوگئیں۔

"اماں تم ہٹ جاؤ!" لالو غرّایا۔

"تم ہٹ جاؤ صغرا خالہ!" محمد علی ڈپٹا۔

"نہیں ہٹوں گی۔ صغرا خالہ نے کہا۔ تم دونوں ایک دوسرے کو مارنے سے پہلے مجھے مار دو مجھے۔ سمجھے تم۔ مجھے ماردو۔ محمد تو چاقو بھونک کلیجے میں اور لالو۔ تو۔ تو اس سینے میں طمنچہ مار دے۔ مار دے بیٹا اسی لئے اسی دن کے لئے خون پلا پلا کے پالا تھا۔" پھر وہ چیخ چیخ کر رونے لگیں۔

"کمبختو۔ نامرادو۔ ماؤں کے کلیجے نوچ ڈالو۔ مرجاؤ ایک دوسرے کے ہاتھوں جوانیاں خاک میں ملالو۔!"

پولیس والے ڈنڈے ہلاتے سیٹیاں بجاتے جب تک ان لوگوں کے پاس آئے لالو، صغرا خالہ کو اسکوٹر پر پیچھے بٹھا کر زن سے چل دیا۔ پیچھے بس

(باقی صفحہ پر)

مہیش پٹیالوی

غزل

جو اِک صدی سے رہا کشمکش مردِ کامل کا
پہنچ کے ٹوٹا وہیں حوصلہ مرے دِل کا

عجب نشہ ہے مجھے زندگی کے حاصل کا
سوال اُٹھتا نہیں اب کسی بھی مشکل کا

کھنگال ڈالے سمندر تمام دُنیا کے
ملا نہ ایک بھی گوہر ترے مقابل کا

یہ کس مقام پہ لائی مری حیات مجھے
کہیں ہجومِ شوارق نہ شورِ ساحل کا

سما جو باندھا تھا تُو نے کلامِ وحدت سے
وہ رنگ جم نہ سکا پھر کسی سے محفل کا

متاعِ حق سے ملیں گی نہ خواب کی چیزیں
وہاں تو چل نہ سکے خیال و باطل کا

کہیں نگارِ عمارت نہ سنگِ میل مہیشؔ
سُراغ کیسے لگاؤں میں اپنی منزل کا

شاہد پرویز

تنہا آدمی

اس بار بھی، ناک کاٹنے کی وجہ وہ نہیں تھی۔ جو آج سے پندرہ سال پہلے تھی۔ لالہ دولت رام کو چند لمحوں تک تو خبر ہی نہ ہوئی کہ نواب دولہا خاں نے کب اس کی ناک پر چاقو رکھا اور کب کھٹ سے پوری ناک کی پھننگ اتر کر اس کی چٹکی میں آ گئی۔ وہ تو بس حیرت سے اپنی ادھ کٹی ناک کے سرے سے ٹپکتے خون کو مٹھائی تولنے کی ترازو میں گرتے دیکھ رہا تھا۔ اسی پل نواب دولہا کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"اب بول۔ ایٹا کتنے چلے گی کہ بترے کنے ــــ ؟"

دولت رام اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اسے اپنی تکلیف کا احساس بھی نہ ہوا۔ اس نے کوئی جواب دئے بغیر کانپتے ہاتھوں سے بہت سے پیڑے دونے میں بھر کر نواب دولہا کی طرف بڑھا دئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کافی لوگ دولت رام کی دوکان کے سامنے جمع ہو گئے۔ لیکن نواب دولہا نے پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ کب پولیس کی گاڑی آئی اور کب پولیس والوں نے اسے گھیر لیا۔ سپاہیوں میں سے تو کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اس پر ہاتھ ڈالتا۔ ہاں گوبند سنگھ تھانیدار نے جب اس کی کلائی تھامنا چاہی تو نواب دولہا نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا "ذرا ٹھہرو دیوان جی۔"

اتنا کہہ کر اس نے اطمینان سے آخری پیڑا نگل کر خالی دونے سے اپنے چاقو کی دھار پر لگا ہوا خون صاف کیا۔ پھر اسے بند کر کے گوبند سنگھ کے ہاتھ میں دے کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ جب پولیس کی گاڑی آگے بڑھی تو اس نے گاڑی میں سے چیخ کر کہا۔ لالہ دولت رام! اب مت اینٹھیو نواب دولہا سے۔"

بازار والوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پورا شہر جانتا تھا کہ سر پھٹوّل، ہاتھا پائی مار پیٹ، چاقو بازی، اور ناک کان کاٹ لینا نواب دولہا کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ شہر کا بدنام ترین غنڈہ تھا۔ اس طرح کی وارداتیں اس کے لئے بچوّں کا کھیل تھیں۔ وہ جتنے دن جیل سے باہر رہتا۔ شہر میں دہشت بپا رہتی۔

لیکن اس بار ناک کاٹنے کی وجہ وہ نہیں تھی جو آج سے پندرہ برس پہلے تھی۔ پچھلے پندرہ برس پہلے سے وہ اسی طرح کی زندگی گزار رہا تھا اور ان پندرہ برسوں میں لگ بھگ دس برس اس نے جیل میں گزارے تھے۔ وہ جب بھی سال دو سال یا چھ مہینے کی سزا کاٹ کر جیل سے نکلنے لگتا تو پھر سے ہنس کر کہتا۔ "صاحب۔ میرا چولہا مت توڑیو۔ میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔ فلقوں ملقوں میں۔"

قطب دین خاں جیلر یوں تو بلا کے تنک مزاج تھے۔ غصّہ ناک پر رکھا رہتا لیکن نواب دولہا سے ان کی بھی

ہو اسکتی تھی، وہ جتنے دن جیل میں رہتا عیش کی چھانتا۔ اُس
کے سزانامے پر بے شک قیدِ بامشقت لکھا رہتا لیکن وہ
مشقت ایک دن بھی نہیں کرتا تھا۔ دن بھر وہ اپنی بارک کے
سامنے جامن کے گھنے پیڑ کے سائے میں کچے چبوترے پر بیٹھا
بوڑھے جمعدار چھوٹے خاں سے قصۂ جانِ عالم، یا تاج الملوک
گل بکاؤلی سنتا رہتا۔ پھر شام کو روٹی پانی سے نمٹ کر گئے
رات تک اونچی آواز میں صبر استاد کی چار بینت گاتا رہتا۔

جس رے جگ چال سے دیکھو چلی آتی ہے پری

پاؤں میں سونے کے کڑے   پاؤں میں سونے کے کڑے
وہ بھی جواہر کے جڑے   وہ بھی جواہر کے جڑے

اس کی آواز میں سیر دن چرس اور ان گنت کچی
شراب کی بوتلیں پینے کے باوجود اتنی جان اور کھنک تھی کہ
سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے۔ لوگوں کو حیرت تھی اتنی
پرسوز آواز میں گانے والا اس قدر جلاد، سرکش اور خودسر
کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ مزاج
میں تیزی اور کسی قدر سنکی پن اُسے اپنے باپ حشمت خاں
پیگلے سے ملا تھا۔ اس کا باپ حشمت خاں شہر کے حاشیے کا
ایک پٹھان زمیندار تھا جسے اس ریاست کے مرحوم نواب
ظفر حسن نے اس کے بانکے پن اور ضدی طبیعت کی بنا پر
پیگلے کا خطاب دے دیا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب نواب دولھا تیرہ برس
کا تھا اور حشمت خاں زندہ تھا۔ برسات کے دن تھے۔ نواب
ظفر حسن اپنے خاص محل سے کوٹھی بے نظیر میں آئے ہوئے
تھے۔ کوٹھی بے نظیر میں پکے آموں سے لدے پیڑوں کے
نیچے کڑھائیاں، چڑھی ہوئی تھیں۔ پکوان پک رہے تھے۔
پیڑوں میں جھولے ڈالے جا چکے تھے۔ ساون کا اہتمام تھا۔
حشمت خاں اس دن باغ سے بالکل ملی ہوئی کچی سڑک پر
اپنی بھینسا گاڑی جوتتے اونچی آواز میں برساتی گیت۔

موسم برسات ہو   اور گھر میں بھرا اناج ہو
دس گھوڑے سرکے کے ہوں   اور بارہ دھڑی پیاز ہو

گاتا ہوا اپنے کھیت سے لوٹ رہا تھا۔ اس نے
دیکھا کہ نواب ظفر حسن اپنی بیگمات اور لونڈی باندیوں
کے جھرمٹ میں موجود ہیں۔ اس دوران ظفر حسن ایک آم کے
درخت کے نیچے سے نکلے۔ پیڑ کی شاخ بھی کچھ نیچی تھی۔ جھک
کر نکلنے کے باوجود ان کی سیاہ مخملی ٹوپی شاخ سے ٹکرا کر
نیچے گر پڑی۔ ٹوپی تو ایک ملازم نے فوراً اٹھالی۔ نواب
بھی اپنی کوٹھی کے کمرۂ خاص میں چلے گئے۔ لیکن حشمت نے
آؤ دیکھا نہ تاؤ کلہاڑی لے کر بھینسا گاڑی سے کودا
اور دیکھتے ہی دیکھتے آم کے پیڑ پر پل پڑا۔ کچھ ہی دیر
بعد نواب صاحب کو خبر ملی کہ ایک شخص نے ان کے
پسندیدہ آم کے پیڑ کو ٹھنڈا کر دیا تو ان کا خون کھول
گیا۔

پورے باغ میں اس نسل کے ثمر بہشتی آموں کے
کل چھ پیڑ تھے اور یہ آم نواب ظفر حسن بہت رغبت
سے کھاتے تھے۔ وہ ہاتھ میں بید لئے غصے میں اپنے کمرۂ
خاص سے باہر آئے۔ حشمت خاں کٹے ہوئے پیڑ کے تنے
سے بندھا کھڑا تھا۔ انھوں نے آتے ہی گرج کر کہا —
"کیوں رے پیڑ کیوں کاٹا؟"، حشمت نے بہت
سادگی سے جواب دیا۔ حضور جس وقت سرکار کی ٹوپی
اس کے ڈکٹے سے الجھ کر گری تو مسے نہیں دیکھا گیا
کہ ہمارے نیئر (شہر) کے مالک کے سر کی عزت اس طرح
زمین میں گرے۔ بس میں نے دو ملٹ (منٹ) میں
کلہاڑے کر تھور دیا سسرے کو۔"

ظفر حسن نکلے تو بہت غصے میں تھے لیکن اپنی
ذات سے رعایا کے ایک فرد کی اتنی محبت اور سادہ
لوحی دیکھ کر موم کی طرح پگھل گئے۔ دھیرے دھیرے
مسکراتے ہوئے انھوں نے اپنے اے۔ ڈی سی ابنِ خاں
کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر خود اپنے ہاتھوں سے
حشمت خاں کی بندش کھولی اور اس کی طرف چاندی کے
روپوں سے بھری ایک تھیلی بڑھا دی۔

حشمت دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کے قدموں پر گرتے ہوئے بولا "میرے پاس تو سرکار کا دیا پیلے (پہلے) ہی بہت کچھ ہے"۔ جب نواب ظفر حسن نے زیادہ ہی ضد کی اور کہا "کچھ تو مانگ لے۔" تب حشمت نے کہا "ایک تمنّا ہے سرکار۔ حشمت کی گاڑی کو گولے پر چلنے کا حکم دے دیں۔"

گولے پر چلنے کا مطلب تھا شارعِ خاص یعنی راہِ ظفر پر چلنا اور ریاست کی یہی ایک ایسی سڑک تھی جو پختہ، کشادہ اور صاف ستھری تھی۔ لیکن راہِ ظفر پر شہر کا کوئی عام شخص اپنی سواری لے کر نہیں نکل سکتا تھا۔

حشمت جب کھیتوں سے لوٹتا اسے کچّے راستے سے ہو کر گھر جانے کے لیے پانچ سات میل کا پھیر پڑتا اور راہِ ظفر سے ہو کر گزرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا مگر نواب ظفر حسن بھی آج بہت خوش تھے۔ مسکرا کر بولے "ٹھیک ہے آج سے تیری گاڑی بھی گولے پر چلے گی۔" پھر انھوں نے آبِن خاں کی طرف دیکھ کر کہا "پگلا ہے۔" بس اسی دن سے حشمت خاں پورے شہر میں حشمت پگلے کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اب ہوتا یوں کہ نواب ظفر حسن اپنی لال رنگ کی بڑی سی موٹر میں صبح سویرے ہوا خوری کو نکلتے اور حشمت پگلا اپنی بھینسا گاڑی پر کھیتوں میں جانے کے لیے نکلتا۔ حشمت کی گاڑی بیچ سڑک پر چرخ چوں کرتی جا رہی ہوتی کہ پیچھے سے نواب کی گاڑی دبا دب ہارن دے رہی ہوتی۔ لیکن حشمت بیچ میں سے اپنی بھینسا گاڑی نہیں ہٹاتا۔ آخر تنگ آ کر نواب ظفر حسن اپنی گاڑی سے چیختے "ارے حشمت۔ پگلے گاڑی ایک طرف کر لے۔"

حشمت برساتی گاتے گاتے اپنی تان روک کر کہتا۔ سرکار کا حکم ہے گاڑی تو گولے پر چلے گی"، نواب جھنجھلا کر ہارن بجانے لگتے اور حشمت کچھ زیادہ اونچی آواز میں گانے لگتا۔

ناسور ہے جگر میں ـــــ ناسور ہے جگر میں

حشمت جب تک زندہ رہا۔ اس کی گاڑی گولے پر چلتی رہی اور جب مرا تو چودہ برس کا ایک بیٹا نواب دولھا، ایک بیوہ، اور ڈیڑھ سو بیگھے زمین چھوڑ گیا۔

حشمت کے بڑے بھائی شوکت لڑّے نے بھائی کی زندگی میں کب کچھ کیا تھا جو اب کچھ کرتے۔ ان کی تو پوری زندگی بٹّن شرابی کے اڈّے، جوئے کے ڈیروں اور چار بیتوں کے اکھاڑوں میں گزری تھی۔ ساری زندگی کا سرمایہ ایک مرادآبادی پیتل کی پان رکھنے والی ڈبیہ اور ایک میلا سا بٹوہ تھا۔ سارے شہر میں لٹکتی رومالی والا ازار ہلاتے پھرتے۔ بھائی مرا تو ایک چودہ برس کے بھتیجے اور بھاوج کے علاوہ ڈیڑھ سو بیگھے زمین ہاتھ آ گئی۔ بھاوج اور بھتیجہ تو بھلا کس کام کے تھے۔ ہاں زمین انھوں نے چھ مہینے کے اندر ہی اندر خفیہ خفیہ بیچ کھوچ کر کچھ شراب پی لی۔ کچھ جوئے میں ہار گئے۔ جب نوبت فاقہ کشی تک پہنچی اور محلّے والوں نے لعنت ملامت کی تو اتنا ضرور کیا کہ نواب دولھا کو لے کر نواب ظفر حسن کے سامنے پیش ہو گئے۔

نواب کو جب یہ معلوم ہوا کہ نواب دولھا، حشمت پگلے کی نشانی ہے تو انھوں نے ازراہِ کرم اسے اپنے سرکاری موٹر خانے میں رکھ لیا اور حشمت کی بیوہ کے نام آٹھ روپے مہینے کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

چھ برس تک نواب دولھا نے جان توڑ محنت کی۔ اور اب وہ ایک اچھا مستری ہی نہیں بلکہ نواب ظفر حسن کی لال رنگ والی خاص موٹر رولس رائز کا ڈرائیور بن گیا۔

نواب ظفر حسن کا خاص ڈرائیور ہونے کی وجہ سے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کس دن اپنے عشرت کدے میں نواب صاحب کیسے طلب کرنے والے ہیں۔ اور کب میرٹھ، اندور، گوالیار یا لکھنؤ سے اُسے کون سی ڈیرے دار بائی جی کو لے کر اپنی موٹر میں آندھی طوفان کی طرح لوٹنا ہے۔

وہ نواب کے اتنا کہتے ہی کہ "نواب دولہا آج اندر چلے آؤ۔" سمجھ جاتا کہ آج نواب ظفر حسن اندور کی جہاں آرا بائی کا مجرا سننا چاہتے ہیں۔ ادھر نواب دولہا کو جو بھی دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس کے باپ کے کئی واقف کار تھے۔ کہتے۔ "بھیّے۔ حشمت کے لونڈے نے کیا ہاتھ پیر نکالے ہیں۔"

اس کی گوری چٹّی رنگت انگریزوں کی طرح کنجی کنجی بڑی آنکھوں اور تاڑ ایسے لمبے قد پر کوٹھی کی درجنوں لونڈیاں، باندیاں فدا تھیں۔ کبھی کبھی وہ اپنی وردی کی سفید پتلون پر دو گھوڑوں والی بوسکی کی قمیض پہن کر نکلتا تو سچ مچ انگریز لگتا۔ لیکن نواب دولہا میں جیسے وہ حس ہی نہیں تھی جو مرد کو عورت کے نزدیک لاتی ہے یا پھر ابھی اسے کوئی ایسی آنچ چھو کر نہیں گذری تھی جو اس کے اندر چھپے فولادی مرد کو پگھلا دیتی۔

زنان خانے سے کوئی ملازمہ نواب دولہا کے پاس کوئی حکم لے کر جانے لگتی تو کوئی کہتی۔ "کم بختی ماری سنبھل کر جیو۔ آنکھوں میں دل اینیچ (کھینچ) لے گا۔"

جانے والی جل کر کہتی "خاک اینیچے گا۔ دل ہے جب نا۔ اس کے دل میں تو بھتّو کسی کے لئے جگّہ ہی (جگہ ہی) نہیں۔"

لیکن ایک دن نواب دولہا کے سینے میں چھپے فولاد کو بھی پگھلنا پڑا۔ وہ چھوٹی بیگم کی بے بی آسٹن صاف کرنے کے بعد بڑے سرکار کی لال رولس رائز میں نیل بانی کی جانچ کر رہا تھا کہ کسی نے اس کا نام لے کر جھاڑ پونچھ کرنے والے لڑکے سے پوچھا "ارے تمّو۔ نواب دولہا خان ڈرائیور کون ہیں؟"

نواب دولہا کو لگا جیسے زنان خانے میں چاندی کے فرشی پاندان کی ساری کٹوریاں سنگِ مرمر کے فرش پر گر پڑی ہوں۔

"یہ کیا کھڑے وے ہیں۔ سرکار۔" تمّو نے کہا۔

نواب دولہا صافی سے اپنے ہاتھوں کا موبائل آئل صاف کرتے ہوئے پلٹا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں نورو۔" اُس نے اپنے سینے پر چھوٹا سا گورا ہاتھ رکھ کر کہا۔

نواب دولہا نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پہلی ہی بار میں اسے لگا جیسے اس نے ڈیوڑھی کے بوڑھے سنتری بنّن خاں پنکی کے نیفے سے افیم کی ڈبیہ نکال کر ایک ہی بار میں ساری افیم گھول کر پی لی ہو۔ اس کے سامنے نورو نہیں، ایک دہکتا ہوا شعلہ تھا جس کی آنچ میں اسے دھیرے دھیرے اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

نواب دولہا اس کی بڑی بڑی سیاہ کٹورا جیسی آنکھوں اور نواب ظفر حسن کی لال گاڑی سے بھی زیادہ دہکتے ہوئے لال ہونٹوں کے طلسم میں کھو گیا۔ وہ نواب دولہا کو اپنی طرف اپنی بے باکی سے دیکھتے ہوئے دیکھ کر مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ میں ایک عجیب سی تمکنت اور غرور کی جھلک تھی جیسے وہ اپنے سحر کے حسن سے واقف ہو۔ پھر وہ شوخ لہجے میں بولی۔ "لو۔ یوں ندیدوں کی طریو ں (طرح) کیا گھور رے (رہے) ہو تم" نواب دولہا ایک دم چونک گیا "کیا بات ہے؟"

"بڑی بیگم نے کیا (کہا) ہے ڈیوڑھی پر لال گاڑی لگا دو، ڈاکٹر کے یہاں جائیں گی۔"

"وہ تو بڑے سرکار کی موٹر ہے۔" نواب دولہا بولا۔

"ہوا کرے۔" نورو نے زنان خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، پھر ہنس کر بولی "وہ بھی بڑے سرکار کی بیگم ہیں۔"

اتنا کہہ کر دروازے تک پہنچتے پہنچتے نورو نے پلٹ کر دیکھا تو نواب دولہا ابھی تک اس کی طرف گھور رہا تھا۔ وہ ایک پل کو ٹھٹکی پھر نواب دولہا کو انگوٹھا دکھا کر زور سے بولی "ندیدہ" اور اندر بھاگ گئی۔

نواب دولہا کو لگا جیسے کسی نے بہت تیز دھار والا چاقو اس کے کلیجے میں اتار دیا ہو۔ کچھ دیر تک وہ بالکل بے جان سا کھڑا رہا۔ پھر جب وہ بڑی گاڑی اسٹارٹ کر کے ڈیوڑھی پہ لگاتے لگا تو اس نے ممّو سے پوچھا۔

"کیوں رے یہ نورو کون ہے؟"

"لو آپ کو خبر نہیں۔" ممّو حیرت سے بولا "ارے جناب یہ اپنی خدائی ڈومنی کی لونڈیا ہے۔ پہلے لے سے ماکپور میں تھی۔ اب بھین (بہن) کے ہوا ں کل ای تو آئی ہے۔ یہاں پے۔" —— اور نواب دولہا ایک لمبی، ہُوں کر کے خاموش ہو گیا۔

پھر کئی بار ایسا ہوا کہ نورو زنان خانے سے مطبخ یا توتے خانے میں کسی کام سے جاتی تو اکثر نواب دولہا سے اس کا آمنا سامنا ہو جاتا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنے چھوٹے سے گورے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے ننھا سا انگوٹھا دکھا کر اسے "ندیدہ" کہتی اور بھاگ جاتی۔

ادھر نواب دولہا کا یہ حال تھا کہ نورو کا سامنا ہوتے ہی جیسے اس کے منہ میں لوہے کی ڈھیر سی کیلیں بھر جاتیں، یوں تو وہ بہت شہ زور، ہٹو چھٹ، اور دبنگ آدمی تھا۔ لیکن نورو پر نظر پڑتے ہی اس کی ساری بہادری ہوا ہو جاتی۔ بس یا تو کبوتر کی طرح ٹکر ٹکر اُسے گھورے جاتا۔

ایک بار نواب دولہا کچھ عزیزوں کو بریلی چھوڑ کر لوٹا تو گیرج میں گاڑی کھڑی کرتے کرتے ممّو نے اسے خبر دی کہ بڑے سرکار نے نورو سے متاع کر لیا ہے۔ نواب دولہا پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ اگر کوئی تیز چاقو سے اس کے بدن کو دھیرے دھیرے کاٹ کر بوٹی بوٹی کر دیتا تب بھی اسے اتنی اذیت نہ ہوتی۔ جتنی نورو کے بیگم نورمحل بننے پر ہوئی تھی۔ لیکن نواب ظفر حسن پوری ریاست کے مالک۔ یہ نام کا نواب دولہا اور وہ سچ مچ کے نواب اور دولہا بھی۔ ان کے سامنے اس کی بساط ہی کیا تھی۔ جو انتقام لیتا۔ ہاں اس نے

اتنا ضرور کیا کہ جب زنان خانے کی خاص باندی پری چہرہ نے آ کر اسے بتایا بیگم نورمحل یاد کرتی ہیں تو وہ ڈیوڑھی پر پہنچ گیا۔

زرد رنگ کے باریک پردے کے پیچھے جھلمل کرتے ستاروں ٹکے لال جوڑے اور کڑے، جوشن، جھومر، جھالے، سے لدی بیگم نورمحل نے اسے حکم دیا "گاڑی لگاؤ۔ آج بڑے سرکار نے ہمیں ای یاد کرا ہے۔"

نواب دولہا نے بڑی حقارت سے آج کی بیگم نورمحل کو دیکھا، پھر مضبوط لہجے میں بولا "میں ابی (ابھی) منصرم صاحب کو استی فا (استعفیٰ) دینے جا رہا ہوں گاڑی کسی نئے ڈرائیور سے لگوا لیں۔"

اتنا کہہ کر وہ سیدھا کوٹھری میں آ کر سامان باندھنے لگا، لیکن کوٹھی چھوڑ کر نواب دولہا کا آنا۔ پورے شہر پر آفت کا آنا تھا، اب نواب دولہا پہلے جیسا نہیں تھا —— اب تو شہر والوں کے بقول وہ ایک بد دعا تھا جو کسی دل جلے نے شہر والوں کو نواب دولہا کی شکل میں دی تھی۔ مگر سب سے زیادہ مصیبت نواب دولہا کے محلّے میں چائے کا ہوٹل چلانے والے متین خاں پر آئی تھی۔ وہ اکثر کہتا۔

"بھیّے دوکنداری کیا خاک کریں گے، اب تو گھاٹے کی شرعات (شروعات) ہوئی ہے، ھُبو سے تمام نلکو (تلک) نواب دولہا خاں ڈٹے ربتے (رہتے) ہیں۔ کوئی گراہک ڈر کے مارے آتا ای نہیں۔ کتنّے اپنی انٹریاں بھارے اکلوانی ہیں۔ سارے شہر (شہر) میں غدر کاٹ رکھا ہے گا۔"

یوں بھی متین خاں کا ہوٹل کیا تھا کسی اخبار کی نیوز ایجنسی تھی۔ شہر میں کوئی بھی حادثہ ہوتا اس کے ہوٹل میں خبر پہنچ جاتی۔ لیکن اس قسم کی تمام خبروں میں سب سے اہم خبر وہ ہوتی جو نواب دولہا خاں کی کسی واردات سے متعلق ہوتی۔

کبھی کوئی شخص آ کر بتاتا کہ آج نواب دولہا نے

ایک ہی ہاتھ میں کسی کی آنتیں باہر نکال دیں۔ کبھی خبر ملتی کہ رات نواب دولھا نے جھولے والی املیوں تلے فلاں خاں صاحب کے ہاتھ پیر توڑ دیئے۔ اور کبھی معلوم ہوتا کہ شہر سے باہر بڑ کُسیا کی پُلیا پر، نواب دولھا نے بنجاروں پر لٹھ بیر کر چاول کے بورے چھین لیے۔ شہر میں جتنے مُنہ تھے اتنی ہی باتیں۔ جھوٹی بھی اور سچّی بھی۔ اب تو اکثر لوگوں نے اسے فنڈے سے ہیرو بنا دیا تھا۔ کوئی کہتا۔ "بھیّے نواب دولھا کے چاقو پر تو چندا میاں پیر نے اسم اعظم دم کر دیا ہے۔"

یہ سُن کر کوئی چائے کی سڑکی لیتے ہوئے کہتا۔ جبھی تو میں نے اس دن ٹٹکوں کی مسیت (مسجد) میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ادھر نواب دولھا نے حسین خاں کے پیٹ میں چقّو مارا۔ ادھر چیخ دی ایک آواز ہوئی۔ ایک ملٹ تلک تو حسین خاں کو بھی خبر نہیں لگی کہ کس وقت کوکھ کے اِس سِرے سے اس سِرے تک چکّو کی تیز دھار پیٹ کو تراشتی اِکل گئی۔"

بیچ ہی میں کوئی بولتا۔ اسے کہتے ہیں ہاتھ کی صفائی۔

"میاں پوری بات تو سُننے دو۔" کوئی جھنجھلا کر کہتا۔ "بیچ میں ای ٹکوں میں جھجیاں مِلوائے جاتے ہو۔ ہاں جی پھر کیا ہوا۔"

"ہوتا کیا۔ ایک مِلٹ بعد حسین خاں غیبی سی آواز اِکلی اور لوٹ لیے ایک طرف کو۔"

اسی دوران شبّن خاں بکّو آ کر متین خاں کو چائے کا آرڈر دیتے ہوئے لکڑی کی پرانی تپائی پر جم کر کہتا۔

"بھیّے پرانی چھوڑو نئی سُنو۔"

کئی لوگ چائے پیتے پیتے رُک کر پوچھتے — کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے۔ رات دُتی پہلوان کا بھڑکا بول گیا۔"

"ارے . . . . . ." کئی کے منہ کھلے رہ جاتے۔

"لو۔ ارے کیا۔ ایک ای ہاتھ میں توند ہلکی کر دی نواب دولھا نے۔ وہ تو آدمی جاندار تھے۔ دروازے تلک بھاگے۔ برے نواب دولھا نے جو شائیں شائیں ہاتھ مارے ہیں تو کدی دکبھی) آلی طرف کدی بلّی طرف بے گنتی کُرٹھیاں کھا گئے بچارے۔" کسی نے ہنس کر کہا۔ چلو ہو گئے چاروں کُل ماف۔"

متین خاں چائے بناتے بناتے جھنجھلا کر کہتے۔ یار شبّن بھیّے، ہر وقت اسی کا قصّہ۔"

شبّن خاں ہنس کر کہتے۔ "دھیرے بول بھیّے۔ اس نے سن لیا تو سونت کر رکھ دے گا۔ چوبیس گھنٹے بارہ انچی کا نیفے میں رکھتا ہے۔ اکال کر پھینک دیا تو سئی (صحیح) ہو لوگے۔"

غرض اس طرح کے دو ہزار قصّے نواب دولھا کی ذات سے منسوب تھے۔ پچھلے پندرہ برس میں لگ بھگ دس برس جیل خانے کی نذر ہو گئے تھے۔ یوں پندرہ برسوں میں وہ مشکل سے پانچ چھ برس باہر رہا تھا۔ لیکن جیل سے باہر رہنے کے اس وقفے میں اس نے شہر والوں کے بقول پورے شہر میں بھوبل جوت رکھا تھی۔

ابھی سال بھر پہلے ہی چلتی مال گاڑی کا ایک ڈبّہ کاٹتے وقت پولیس نے اسے گھیر لیا تھا لیکن وہ کوسی ندّی کا پل آتے ہی چلتی ٹرین سے پھاند گیا۔ پھر ٹانگ کی ہڈّی ٹوٹ جانے کے باوجود اس نے شہر کی طرف ایسی دوڑ لگائی کہ پولیس والوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمّت والا ایسا کہ ایسی حالت میں رات بھر جنوں والی مسجد میں ٹھنڈے فرش پر پڑا کراہتا رہا۔ اور مسجد بھی ایسی ویران کہ اچھے اچھے دل گردے والے دن میں ادھر جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ شہر کا بچّہ بچّہ جانتا تھا کہ برسوں سے سنسان پڑی

اس مسجد میں جنوں کا بسیرا ہے۔

اب یہ الگ بات تھی کہ نواب دولہا جنوں کی پٹخی سے تو بچ گیا لیکن ٹخنے کی ہڈی ایسی ٹوٹی کہ پھر ٹھیک نہ ہوئی۔ علاج کرانے کا وقت بھی اس کے پاس کہاں تھا؟ کچھ دن تک تو زخم پکتا پھوٹتا رہا پھر ہر وقت رِسنے والے ناسور میں بدل گیا۔ دیکھنے میں اس کے دونوں پیر ٹھیک لگتے لیکن بایاں پیر زمین پر نہ ٹکتا۔ لیکن وہ کب نچلا بیٹھنے والا تھا۔ ٹوٹے ہوئے پیر کی جگہ چھوٹی سی چھڑی لے لی تھی۔ اسی کے سہارے کھڑا ہو جاتا۔ اور چلنے پھرنے کے لئے اس نے ایک پرانی زنگ آلود سائیکل خرید لی۔ ویسے لوگوں کا کہنا تھا کہ اس سائیکل کو صرف نواب دولہا ہی ہانک سکتا ہے۔ قد اس کا شروع سے ہی لمبا تھا۔ چھڑی کے سہارے سائیکل پر چڑھ کر وہ داہنے پیر سے پیڈل گھماتا۔

بائیں ٹانگ لاوارث سی لٹکی رہتی۔ اس طرف کا پیڈل بھی غائب تھا۔ اس نے بائیں پیر کا کام وہ سائیکل چلاتے وقت بار بار پکّی سڑک پر تیزی سے چھڑی ٹیک کر لیتا۔ جب وہ سائیکل پر ہوتا ٹھک ٹھک کی آواز سن کر دور ہی سے لوگ اندازہ لگا لیتے کہ نواب دولہا کی سواری آرہی ہے۔ اس کے باوجود کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگا، ہاں موقع واردات پر ہی اگر پولیس نے اسے گانٹھ لیا یا سوتے میں گھیر کر دبوچ لیا تو سال چھ مہینے جیل میں کاٹ آیا۔

جب جیل سے باہر ہوتا، دن میں کہیں بھی ہوتا لیکن شام ہوتے ہوتے اپنے محلّے میں آجاتا، پھر متین خاں کا ہوٹل ہوتا یا ہوٹل کے سامنے چبوترے پر پڑی اس کی چارپائی۔ اس کے چارپائی پر لیٹتے ہی دل میں اس کی برائی اور منہ پر اچھائی کرنے والے اسے گھیر لیتے۔ پھر اس کے اگلے پچھلے کارناموں کی کہانیاں شروع ہو جاتیں متین خاں کی چائے بکتی رہتی اور رات گئے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ متین خاں ہوٹل بند کر کے چلے جاتے۔ لوگوں کی بھیڑ چھٹ جاتی اور وہ تنہا رہ جاتا۔ رات کو دو ڈھائی بجے گشت کے سپاہی نکلتے تو وہ زور سے آواز دیتا۔ ارے کون ہے رے؟ —— سپاہی ٹھٹک کر رک جاتے۔

"اچھا گشت والے ہیں۔" وہ کہتا "چلو ذرا کھٹیا اٹھا کر پلّی طرف رکھ دو۔"

اب مجال تھی کہ کوئی نا کر دیتا۔ تھانیدار محمد ولی خاں اپنی نگرانی میں سپاہیوں سے نواب دولہا کی چارپائی نواب دولہا سمیت اٹھوا کر دکانوں کے سائبان تلے رکھوا دیتے۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ بلا کا نظر شناس تھا وہ کبھی اپنے یا کسی پرانے محلّے کے شریف آدمی سے نہیں الجھا۔ اس کے باپ کا کوئی دوست یا محلّے کا بزرگ اس کے سامنے پڑ جاتا تو "چچا سلام" کہہ کر نظریں نیچی کر لیتا۔ محلّے کی کوئی بہو بیٹی سامنے پڑ جاتی تو فوراً نظر جھکا لیتا اسے اپنے چھوٹے چھوٹے یہ اصول زندگی سے بھی زیادہ پیارے تھے۔

شمّون خاں بینڈ یے اور حولدار اچّھن خاں بڑے کا واقعہ بھی کچھ کم کھیا ٹک نہ تھا۔ شہر میں سب سے مشہور اور سریلا بینڈ باجہ شمّون خاں کا تھا۔ اس دن شمّون خاں رات کے گیارہ بجے نواب دولہا کے محلّے ہی کی ایک برات بجا کر واپس آرہے تھے۔ ویسے جس دن انہیں نواب دولہا کی طرف کی کوئی برات بجانی ہوتی وہ لرز جاتے۔ وہ جانتے تھے اگر واپسی میں نواب دولہا کی نظر ان پر پڑ گئی تو وہ انہیں اور ان کے آدمیوں کو دو تین بجے رات تک نہیں بخشے گا۔ اس لئے اس دن بھی وہ دائیں بائیں دیکھتے نواب دولہا کی بو سونگھتے نکلے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ والے بھی کچھ کم چوکنّے

نہیں تھے۔ اچانک سڑک کے کنارے ایک بیل گاڑی کی آڑ میں بچھی چارپائی سے نواب دولھا کی پاٹ دار آواز ابھری۔ شموں خاں ہوت...... بھیئے کنوتیاں کاٹنے کاٹے کے لئے فرار ہو رہے ہو...... قسم قرآن کی ایک ہی بیٹھک میں خرچہ کر دینگا۔

ایسا لگا جیسے سب کے پیروں نے زمین پکڑلی ہو۔ شموں خاں سمجھ گئے شامت آگئی۔ وہ نواب دولھا کے قریب جا کر بولے۔ نہیں بھیئے۔ میں تو تجھے ہی دیکھ رہا تھا۔"

"اماں چھوڑو بھیئے۔ بٹیا بٹیا دیگڈنڈی پگڈنڈی) اکیلے جارہے تھے۔ وہ تو میں نے بھانپ لیا۔ نواب دولھا نے ہنس کر کہا۔ پھر بولا۔ چلو ہو جاؤ شرو۔ وئی ہو جائے۔ کاٹے کو دیہی بدیس سن لکھی بابل مورے۔"

در اصل بابل اور رخصتی کے گیت نواب دولھا کی کمزوری تھی۔ یہ سہرا تو وہ نہیں باندھ سکا تھا لیکن گھنٹوں آنکھیں بند کئے وہ ان گیتوں کی دھن پر جھومتا رہتا۔ پھر جب آنکھیں کھولتا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ موٹے موٹے آنسو گرنے لگتے۔ شاید اس طرح وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے المیہ کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس دن بھی شموں خاں کی نفیری کے سینے سے بابل کا درد بھرا گیت پھوٹ نکلا تھا۔ ابھی بارہ بھی نہیں بجے تھے کہ حوالدار اچھن خاں گشت کے چھ سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ آتے ہی انھوں نے شموں خاں کو ڈانٹ پلائی۔ "کیا غدر کاٹ رکھا ہے چلو بند کرو۔"

اب شموں خاں کے منہ میں دبی نفیری تو خاموش ہو گئی۔ لیکن نواب دولھا کے منہ سے تغلّظات کا فوارہ چھوٹ گیا۔ اچھن خاں بھی کھرے پٹھان۔ ادیر سے پولیس کے حوالدار۔ کریلا بیچ نیم پر چڑھا تھا۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نواب دولھا پہ ڈنڈا گھمایا تو شموں خاں کے بقول اسے پھنّی کر دیا۔ لیکن اسی دوران نہ جانے کیسے اچھن خاں کی ٹانگ نواب دولھا کے ہاتھ میں آگئی۔ اب سارے سپاہی اچھن خاں کو چھڑا رہے تھے اور ان کی چیخیں تھیں کہ رکتی ہی نہ تھیں۔

شموں خاں نے دوسرے دن قسم کھا کر بتایا تھا کہ "بھیئے اس کے تو پیروں کی جان بھی ہاتھوں میں آگئی ہے۔ سب نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ نواب دولھا کی انگلیاں اچھن بھیئے کی پنڈلیوں کا گوش (گوشت) پھاڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھیں۔ پھر جو پولیس نے اس پر مار پکڑی تو ایسا سونتا جیسے کٹائی کے بعد کسان لٹھ سے سنّا کوٹتا ہے۔ مگر سا ب کیا کرا جوان ہے۔ اتی مار کھا کر بی ٹس سے مس نہیں ہوا۔

پھر سال بھر بھی نہیں گزرا ہوگا کہ اس نے ایک دن اچھن خاں بڑے سے کی ناک بھی موقع پا کر اتار لی۔ اور چھ مہینے کی اس میں بھی کاٹ آیا۔

لیکن اچھن خاں یشو خاں یا آج دولت رام کے ناک کاٹنے کی وجہ بھی وہ نہیں تھی جو آج سے پندرہ برس پہلے تھی۔

آج تو بہت معمولی بات تھی۔ سویرے سویرے نہ جانے کیسے اس کا دل بھنے ہوئے گلابی ماوے کے پیڑے کھانے کو چاہا۔ اس نے اٹھنّی نکال کر لالہ دولت رام کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "لالہ آٹھ آنے کے پیڑے تو لو۔"

لیکن لالہ نہ جانے کس دھنکی میں تھے۔ اٹھنّی کو الٹ پلٹ کر ہتھیلی پر رگڑتے ہوئے بڑے ناگوار لہجے میں بولے "یہ اٹھنّی اٹیا کے یہاں لے جا۔ ہوئیں چلے گی۔"

بس ...... کا نام سننا تھا کہ نواب دولھا کا خون کھول گیا۔ اس نے زندگی میں نورو کے سوا کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ خود اس کے بقول اس نے نورو سے پاک محبت کی تھی۔ مگر لالہ دولت رام نے اسے اٹیا

کا لمعنہ دیا تھا۔ اٹیا جو شہر کے چوک میں بیٹھنے والی ایک گھٹیا درجہ کی کسبی تھی۔

اور حسب روایت نواب دولھا کے اس واردات کی خبر بھی آدھے گھنٹے کے اندر متین خاں کے ہوٹل پر پہنچ گئی۔ طفیل خاں ٹھیکیدار جو موقعۂ واردات پر موجود تھے۔ اپنی سائیکل ہوٹل کے سامنے روک کر زور سے بولے "متین خاں ہوت۔ بھیئے دولت رام کی ناک بھی صفا ہوگئ۔"

متین خاں نے ریزگاری گنتے گنتے چونک کر کہا۔ "بھیئے سچ کہو۔"

"لو اور سنو" طفیل ٹھیکیدار بولے، "ابی وہیں سے تو آرہا ہوں۔ میں تو بالکل بگیچ (نزدیک) کھڑا تھا۔ لالہ نے بڑی کڑی بات کے دی تھی نواب دولھا کو۔ بس ایک ہی بات میں ایسی بپھر گئے۔ کیا کلائی ہاتھ مارا ہے میرے شیر نے۔"

ہوٹل پر بیٹھے لوگوں میں سے کسی نے کہا "میاں ٹھیکیدار ادھر پاٹی (دیارٹی) میں آکر بیٹھو۔ کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟"

"نہیں بھئی۔ ذرا جلدی میں ہوں۔" طفیل خاں نے اتنا کہہ کر سائیکل آگے بڑھائی ہی تھی کہ شبن بکو اس سے بھی دردناک خبر لے کر آدھمکے۔ انھیں دیکھتے ہی متین خاں بولے "آؤ میرے دل کے لوٹرے۔ کدھر سے اڑے ودے آرتے ہو؟"

شبن ہانپتے ہوئے بولے "دیر بھیئے نواب دولھا کی بھی کوئی خبر ہے؟"

چائے پینے والوں میں سے ایک نے کہا "تمھیں خبر نئیں۔ صبو صبو آنسے (اس نے) لالہ دولت رام کی ناک صفا کردی۔ اب تو کلکٹر صاحب کے آگے پیشی میں ہوگا۔"

شبن خاں ٹھنڈی سانس بھر کر بیٹھتے ہوئے بولے "اسے کہتے ہیں گے بن نفیبی (بدنفیبی) میّا (ماں) کے آخری دیدار بھی نئیں ہوسکے۔"

"کیا مطلب؟" متین خاں نے آنکھیں چوڑی کیں۔

"مطلب کیا جی۔ نواب دولھا کی ماں جنت کو سدھار گئیں۔ ابی گھنٹے بھر پہلے۔"

"کیا ہوا تھا؟" کسی نے پوچھا۔

"خبر نئیں۔ میری جروا تو کے رئی تھی کہ موتی جھالہ بیٹھ گئی تھی بڑے حکیم معصومی خاں کا آڈر یا ہے کہ ہارٹ اٹیک ہو گیا۔"

ادھر عدالت میں ایک سال کی سزا کے ساتھ ہی جب نواب دولھانے اپنے ماں کے مرنے کی خبر بھی سُنی تو اس نے دھیمے لہجے میں بس اتنا کہا "میّا بھی مرگئی۔" اور چپ ہوگیا کسی نے اسے روتے نہ دیکھا نہ بلکتے۔

پھر لگ بھگ سال بھر بعد جب وہ جیل سے چھوٹ کر محلّے میں آیا تو متین خاں اور محلّے کے لوگوں نے دیکھا کہ اس بار وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ورنہ ہر بار جب وہ جیل خانے سے باہر آتا تو کچھ زیادہ ہی تگڑا ہو کر لوٹتا۔ لیکن اس بار تو چوڑی ہڈیوں کا سارا گوشت گھل گیا تھا۔ بس کھال ہی منڈھی رہ گئی تھی۔ چہرے کی ساری سُرخی زردی میں بدل گئی تھی۔ دن بھر اپنی چارپائی پر چپ چاپ چادر تانے پڑا رہتا۔ چھیدنی میاں کے گھر سے کھانے کی تھالی دونوں وقت پہلے کی طرح آجاتی لیکن اکثر ویسے کی ویسی ہی واپس ہوجاتی۔ اس بار اس نے اپنی سائیکل کی خبر بھی نہیں لی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے محلّے کے گندے نالے میں پڑی تھی۔ خیر سائیکل کا تو یہ تھا کہ وہ جتنے دن جیل میں رہتا۔ اس کی سائیکل نالے ہی میں پڑی رہتی۔ کیا مجال تھی کہ کوئی اُسے ہاتھ لگاتا۔ ہاں جب اس کے جیل سے چھوٹنے کے دن قریب ہوتے تو متین خاں خود ہی کہتے "شُرگ سائیکل کے ٹیوب ٹائر بھی گل گئے ہوں گے۔ اب نواب دولھا آئے گا تبھی سدھرے گی۔"

لیکن اس بار متین خاں اور شبن خاں دونوں ہی حیران تھے کہ آخر نواب دولھا کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک بار شمون خاں بینڈ والے نے بھی رُک کر پوچھا "نواب دولھا خاں بالکل بجا تو

بہوت دنوں سے تم نے کچھ سنا ہنیں۔"

نواب دولہا نے خالی خالی آنکھوں سے شمعون خاں کو دیکھ کر کہا "اب تو رخصتی ہی بجانا بھیّے۔"

شمعون خاں جیسا بکواسی آدمی جس نے زندگی بھر خوشیوں کے شادیانے بجائے تھے ہل کر رہ گیا تھا متین خاں اکثر شمعون خاں سے کہتے "بھیّے ماں کا غم بیٹھ گیا دل پر اُس کے۔"

"ہاں اب وہ پہلے سی ہنک نہیں رہی" شبّن خاں کہتے۔

ہر شخص حیران تھا کہ نواب دولہا کو ہو کیا گیا۔ ناکیں تو وہ پہلے بھی کئی بار اتار چکا تھا۔ اب سے پندرہ برس پہلے کوٹھی سے آنے کے کوئی سال بھر بعد ہی اس نے سب سے پہلے نورو بیگم نور محل اور بڑے سرکار کے ڈرائیور ظہور حسن کی ناک بمبئی جا کر کاٹی تھی۔ لیکن اپنی چہیتی نورو کی ناک کاٹنے کے بعد بھی کسی نے اسے اتنا بے چین اور بکھرا بکھرا نہیں دیکھا تھا جبکہ نورو ہی صرف وہ پہلی اور آخری عورت تھی جسے نواب دولہا نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ پھر جب بڑے سرکار نواب ظفر حسن مرے اور نورو راتوں رات ظہور حسن ڈرائیور کے ساتھ بمبئی فرار ہوئی تو نواب دولہا کسی زخمی چیتے کی طرح تڑپ گیا تھا۔ اچانک کچھ دن شہر سے غائب رہ کر وہ واپس آیا تو تیسرے ہی دن اسے بمبئی پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ اور تب شہر والوں کو پتہ لگا کہ نواب دولہا بمبئی میں بھی کام دکھا آیا۔

کچھ لوگوں نے کہا تھا — "میاں شیر بہادر ہو تو ایسا نمک کا حق ادا کر دیا۔"

لیکن اس بار تو جیسے کوئی بات اسے گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہی تھی۔ آخر ایک صبح متین خاں اور شبّن بکّو، ہمت کر کے اس کے پاس پہنچ گئے شبّن خاں نے چائے کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بھیّے کیسا دل ہے۔ ٹھیک تو ہو۔؟"

متین خاں نے اپنے ہوٹل کی طرف منہ کر کے زور سے آواز لگائی "مکھن توس لا نواب دولہا کے لئے۔"

پھر نواب دولہا سے پوچھا "بھیّے۔ کونسا غم بیٹھ گیا دل پر؟"

نواب دولہا کو لگا جیسے وہ دونوں اس کے بہت قریبی رشتہ دار ہوں اور اس کے بیٹے دنوں کی میّت کا پُرسہ دینے آئے ہوں۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں رُک رُک کر بولا "بھیّے۔ موت زیست کا کوئی بھروسہ تو ہے نہیں —— یار ہے؟"

نہیں۔ نہیں بالکل نہیں —— وہ دونوں بولے۔

"بس تو پھر۔ اب دیکھو نا جیل میں بالے میاں کا نڑا ملا تھا۔

"کون دئی جیب کتّو۔ غلام رسول ہیڈ کا لونڈا۔ وہ بمبئی سے کب آیا۔ شبّن خاں نے پوچھا۔

نواب دولہا نے اسی لہجے میں کہا "آج کل اپنے منبر کی جیل میں ہے۔ وہ کہ رہا تھا کہ اُس نے سال بھر سے بمبئی میں نورو اور ظہور کو بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ نورو لکڑی کی ایک بکسے جیسی گاڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ اور ظہور بکسے میں بندھی رسّی کو اپنے کمر سے باندھے اسے پوری بمبئی میں گھسیٹے پھرتا ہے۔ اتنا کہہ کر نواب دولہا سانس لینے کو رُکا۔ پھر بولا۔

"متین بھیّے۔ بالے نے بتایا کہ نورو کا پورا پنڈا پکّے پھوڑے کی طرح ہیوں ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیروں کی انگلیاں گل کر جھڑ گئی ہیں۔ اب وہ لکڑی کے بکسے نما گاڑی میں پڑی گاتی ہے

خط بھیج کر بلا دو رے۔ کہنا لبوں پہ دم ہے
دن رات تیرا غم ہے
مینہ کی لگی ہیں جھڑیاں رے

تیوڑھ ہریانہ

دن رات برسے پانی
لوٹا نہ میرا جانی

شبن بھیتے۔ بالے میاں کہ رہا تھا کہ نورو کی آواز میں اب بھی پہلے جیسا دم ہے۔ اور میّا بھی مر گئی۔ توبہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ نواب دولھا اتنا کہہ کر بھرائی آواز میں بولا۔ ایک ظہور حسن ہے کہ اس حالت میں بھی نورو کے گنے ہے اور ایک میں ہوں کہ آخر وقت میں بھی اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ اتنا کہہ کر نواب دولھا نے سر جھکا لیا۔ اور اس کے قریب بیٹھے متین خاں اور شبن خاں کو جیسے چپ سی لگ گئی۔

نواب دولھا نے سر اٹھا کر ایک بار پھر کہا۔ بھیتے۔ میری سیکل کو ہمارے کی طرف شاہ باد دروازے کے اوپر ٹنگوا دو۔ کچھ تو یادگار رہ جائے گی۔ ہماری شیروانی دون کے لیے۔" اتنا کہہ کر اس نے سر سے پیر تک چادر تان لی۔
متین خاں نے اس سے پہلے نواب دولھا کو کبھی اتنا شریف اور تھکا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

شام تک ان دونوں نے شاہ آباد دروازے کے باہر کی طرف خوب اوپر لوہے کی دو مضبوط سلاخیں ٹھونک کر نواب دولھا کی سائیکل ٹنگوا دی۔ پھر وہ دونوں سیدھے نواب دولھا کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت بھی چادر تانے پڑا تھا۔ متین خاں نے آواز دی۔ نواب دولھا خاں ہوت۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

پھر شبن خاں نے ذرا زور سے کہا۔ دیکھو بھیتے ہم نے تمہاری سیکل دروازے پر ٹانگ دی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا تو شبن خاں نے سوالیہ نظروں سے متین خاں کو دیکھا۔ پھر جیسے ہی متین خاں کی نظر نواب دولھا کی چارپائی کے نیچے پھیلے تازے تازے خون کے تھتلوں پر پڑی تو انھوں نے فوراً نواب دولھا کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔ ان دونوں کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ نواب دولھا نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چاقو کا بارہ انچ کا چوڑا پھلکا اس کے سینے میں عین دل کے پاس پیوست تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ کہیں۔ نواب دولھا نے اپنی پتھرائی آنکھیں ان کی طرف پھیر کر پرسکون لہجے میں کہا "شبن بھیتے ـــ بیرن کلمہ پڑھوا دو۔ بلاوا آ گیا۔"

نواب دولھا خاں کو مرے آج تیس برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ اس کی سائیکل آج بھی شاہ آباد دروازے کے باہر ٹنگی اس بات کی یاد دلاتی رہتی ہے کہ پورے شہر میں غدر کاٹنے والا ایک بڑا آدمی تھا جواب نہیں ہے۔

ادم کرشن راحت

ہم تھے بے مانگی دل سے بھی لاچار بہت
اور ارماں بھی رہے درپۂ آزار بہت

ہم ہی رفتارِ زمانہ سے نہیں بھاگے تھے
وقت کو اور ملے راندۂ رفتار بہت

زیست کے اور بھی پہلو ہیں خرد کیا جانے
ایک ہی دائرے میں گھومی ہے بیکار بہت

یہ الگ بات کہ فرصت نہیں سستانے کی
پر کشش آج بھی ہے سایۂ دیوار بہت

اپنا ایمان بچا لاؤ تو جانیں راحت
آج بازار میں پھرتے ہیں خریدار بہت

صغیر افراہیم

مرثیہ کی ابتدا اور اس کی نشوونما

دُنیا کے پہلے انسان کے نام کے ساتھ، ایک تصوّر مرثیہ کا بھی اُبھرتا ہے۔

"حضرت ہابیلؑ کی موت پر ابو البشر حضرت آدمؑ کی آنکھوں میں چھلک آنے والے آنسو شاید وہ پہلا خاموش مرثیہ ہیں جو خود فطرت نے ایک درد رسیدہ باپ کے صحیفۂ عارض پر لکھا ہوگا۔"[1] یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے ساتھی، عزیز یا خورد و بزرگ کی موت اور اس کی دائمی جدائی پر رنج و الم کے شدید جذبہ سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کا اظہار وہ مختلف صورتوں میں کرتا ہے "رنج وغم کے احساس کی شدّت ہی اشک و آہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے ـــــ اس لئے انسانی آنسوؤں کی اس مکتوبی شکل کا نام ہی مرثیہ ہوگا۔"[2] اظہارِ غم کے لئے شعوری طور پر انسان جس ملفوظی وسیلہ کو موزوں ترتیب کے ساتھ پہلے پہل استعمال میں لایا اس کو مرثیہ کی ابتدائی شکل کا نام دیا جا سکتا ہے۔ قدیم ترین زبان و ادب میں بھی ایسی صنف شاعری کا وجود ملتا ہے جو اظہارِ غم کا ذریعہ رہی ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں کی ابتداء نظم سے ہوئی اور نظم کی سب سے قدیم صنف، جس کا اب تک پتہ لگا ہے، مرثیہ ہے۔"[3] علماء کا خیال ہے کہ دُنیا کا سب سے پہلا شعر آدمؑ ہی نے سریانی زبان میں کہا تھا۔ اور یہ شعر مرثیہ ہی میں موزوں کیا گیا تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ خدا تعالےٰ نے جب حضرت آدمؑ کو جنت سے نکال کر دُنیا میں بھیج دیا تو انھوں نے جنت کے فراق میں مرثیہ کہا۔ کئی لوگوں کی یہ رائے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو موت کے گھاٹ اُتارا تو آدمؑ نے اپنے بیٹے پر رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔ اور اپنے مقتول بیٹے پر ماتم و بکا کیا تھا۔ یہ کلمات موزوں کلام کی صورت میں رونما ہوئے اور اسی کا نام مرثیہ ہے۔"[4]

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ "رثی" سے مشتق ہے" جس کے لغوی معنی مردے کو رونے اور اس

---

[1] مرثیہ از آدمؑ تا ایں دم، عظیم امروہوی "آج کل" نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۲ء۔ ص ۶

[2] ایضاً

[3] انیسیات، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔ ص ۱۰۴

[4] میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، ڈاکٹر اکبر حیدری ۔ ص ۴۴۵

کی خوبیاں بیان کرتے ہیں، اصطلاحاً مرثیہ اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی تعریف وتوصیف اور اس کی وفات پر اظہار ماتم کیا جائے۔[5] عربی دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے اور مرثیہ، عربی کی قدیم ترین صنفِ سخن ہے "مرثیہ گوئی کا صحیح مبدا ملک عرب اور زبان عرب ہے وہاں مرثیہ گوئی کا عام رواج تھا۔[6] اس لئے یہ کہنا کسی حد تک بجا ہوگا کہ عرب میں شاعری کا آغاز مرثیہ سے ہی ہوا۔[7] "اور یہی ہونا چاہیئے تھا۔ عرب میں شاعری کی ابتدا بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی۔ یعنی جو جذبات دلوں میں پیدا ہوتے تھے، وہی اشعار میں ادا کر دئے جاتے تھے۔ جذبات میں درد وغم کا جذبہ اور جذبات سے قوی تر ہے، اور جس جوش سے یہ ظاہر ہوتا ہے اور جذبات ظاہر نہیں ہوسکتے۔[8] عربی شعرا اپنے عزیزوں، ساتھیوں، بزرگوں اور قبیلے کے افراد کی موت پر مرثیے کہا کرتے۔ ان میں مرنے والے کی توصیف اور مرحوم سے تعلق خاطر کی بنا پر قلبی رنج وغم کا اظہار کیا جاتا۔ عباسی دور میں خراسانیوں کی معرفت ایرانیوں کا عمل دخل ہوا تو انھوں نے اس صنف شاعری کو بھی اپنایا اور فارسی میں رائج کیا۔ "ایرانی شعرا نے عربوں کے مرثیے کے نمونے دیکھے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ فارسی شاعری میں بھی مرثیوں کے اضافے ہو گئے۔[9] اور پھر ایرانیوں اور فارسی زبان کی معرفت اردو میں اس صنف شاعری کی ابتدا ہوئی۔

آج کے عہد میں مرثیہ کا تصور واقعۂ کربلا کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ "اردو تنقید وتاریخ میں جب 'مرثیے' کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے مراد وہ مرثیے ہوتے ہیں جو واقعات کربلا سے متعلق ہیں اور جن کی ایک الگ ادبی حیثیت ہے۔[10] واقعۂ کربلا تاریخ اسلام کا ایک عظیم سانحہ ہے جو ہجرت نبوی کے اکسٹھویں سال وقوع پذیر ہوا۔ "یعنی اس وقت جب امیر معاویہؓ کے بیٹے یزید نے خلافت یعنی اللہ کے رسول کی نیابت کا اعلان کیا۔ اور مسلمانوں سے بیعت مانگی۔ حضرت علیؓ کے بیٹے اور پیغمبر اسلام کے چھوٹے نواسے حسین نے بیعت سے انکار کر دیا۔ حسین کو انکار کی قیمت دینا پڑی۔ گھر چھٹا، مدینہ سے بہت دور عراق میں فرات ندی کے کنارے حسین کو ان کے بہتّر ساتھیوں کے ساتھ، جن میں کوئی بچپن کا دوست تھا، تو کوئی محبت کرنے والا، اور باقی بھائی بھتیجے، بھانجے اور بیٹے جن میں چھ مہینے کی ننھی سی جان، حسین کا بیٹا علی اصغر بھی تھا" ان سب کو یزید کی فوج نے گھیر لیا۔ تین دن تک یزید کی فوج سے حسین کی بات چیت ہوتی رہی۔ حسین نے بیعت سے تو انکار کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو، میں اس سے بات کر لوں گا۔ مگر یہ بات نہیں مانی گئی۔ حسین نے کہا میں یزید کی حکومت

---

۵ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ص ۴۶۹

۶ اردو میں مرثیے کی تاریخی ادبی حیثیت، قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی ("شاعر" آگرہ جولائی ۱۹۴۷ء) ص ۶

۷ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، ڈاکٹر اکبر حیدری۔ ص ۴۴۵

۸ موازنۂ انیس ودبیر، علامہ شبلی نعمانی مرتبہ ڈاکٹر فضل امام۔ ص ۲۲

۹ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، ڈاکٹر اکبر حیدری۔ ص ۴۴۹

۱۰ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی، ڈاکٹر جعفر رضا۔ ص ۱۹

سے باہر نکل جاؤں گا، مجھے چلا جانے دو، یہ بات بھی
قبول نہ کی گئی تو حسین نے یزید کی بیعت کے مقابلے
میں اپنا سر دینا پسند کیا۔ اور ۶۱ھ کے محرم کی دس
تاریخ کو اپنے سب ساتھیوں، دوستوں اور عزیزوں
کے ساتھ تیسرے پہر تک شہید ہو گئے۔[11] میدانِ کربلا
میں پیغمبر اسلامؐ کی آل و اہلِ بیعت کو جس بیدردی
اور انسانیت سوز انداز میں شہید کیا گیا اُس کی
مثال ملنی محال ہے " واقعہ کربلا در اصل حق و باطل
کی کشمکش تھی اور اگرچہ مادّی ساز و سامان کے
بل بوتے پر اس کشمکش میں ظاہری فتح باطل کو ہوئی۔
مگر حقیقی فتح و سرفرازی ان جانبازوں کی قسمت میں
لکھ دی گئی جنھوں نے سر دینا گوارا کیا مگر باطل کے
سامنے جھکنا پسند نہ کیا۔[12] یہ جنگ " نیکی اور بدی،
انسانیت اور بہیمیت کی جنگ ہے۔[13] یعنی " باطل نے
حق کو چیلنج کیا کہ وہ اطاعت قبول کرے، حق نے انکار
کیا۔ حق و باطل کے درمیان یہی جہاد، حق کے نام پر حق
کے پرستاروں کی شہادت اور اس کے نتیجے کے طور
پر حق کی آفاقی جیت نے اس واقعے کو انسانی تاریخ کا
ایک عظیم واقعہ بنا دیا۔[14] اس اندوہناک سانحہ کی یاد منانا
عزاداری کہلایا " مرثیہ گوئی عزاداری سے مربوط و متعلق
ہے۔ عزاداری ان رسوم کا نام ہے جو امام حسین کی
شہادت کی یادگار میں رائج ہیں۔[15] " واقعہ کربلا کی
یادگار منانے کا طریقہ اصلاً ایران کے شیعوں کی رسم
ہے۔[16] لیکن عزاداری کی ابتدا عراق میں ہوئی یہ سلطنت
بنی اُمیہ کے زوال کے بعد عراق میں معز الدولہ احمد
بن بویہ کی سلطنت قائم ہوئی۔ انھوں نے ۳۵۲ھ/۹۶۳ء
میں بغداد میں سب سے پہلے عزاداری کی بنیاد ڈالی۔[17]
آل رسول سے محبت و عقیدت کی بنا پر یہ رسم اتنی عام
اور مقبول ہوئی کہ ایران میں اس کو مذہبی فریضہ کی
حیثیت دے دی گئی۔ ایرانی شعرا نے مرثیہ کو واقعات
کربلا کے پیش کرنے کا وسیلہ بنا لیا۔ اس طرح مرثیہ
نے جہاں لوگوں کی توجہ اپنی طرف ملتفت کی وہاں اس
صنف شاعری کا تعلق عزاداری سے بھی قائم ہو گیا۔
ہمارے یہاں یہ رسوم، فارسی زبان اور ایرانیوں
کے زیر اثر دکن سے شروع ہوئیں گو کہ آج " مقامی
حالات و خصوصیات کی بنا پر اگرچہ یہ رسمیں اب
ملک کے مختلف حصوں میں الگ الگ طرح سے رواج
پا گئی ہیں لیکن ان سب کا آغاز ہندوستان میں
ایرانیوں کے اثر و اقتدار سے ہوا۔[18]

اُردو شعر و ادب کی باقاعدہ ابتدا
اور نشو و نما سر زمین دکن میں ہوئی " ابتدائی
شاعری کے تمام نمونے ہم کو دکن ہی میں ملتے
ہیں۔[19] اور اُن اوّلین نمونوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی
ہے کہ صنف مرثیہ سے ہی اس کا آغاز ہوا۔[20] یہ
مرثیے، محض چند کاوشوں کو چھوڑ کر، اپنے موضوع کے اعتبار
سے شہدائے کربلا اور واقعاتِ کربلا تک محدود رہے۔

۱۱۔ اُردو مرثیہ، سفارش حسین رضوی۔ ص ۱۴-۱۵
۱۲۔ تحقیقی مطالعۂ انیس، ظہیر احمد صدیقی۔ ص ۹
۱۳۔ انیسیات، مسعود حسن رضوی ادیب۔ ص ۸-۱۰
۱۴۔ ادبی مطالعے، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ ص ۴-۱۰
۱۵۔ اردو مرثیے کی روایت، ڈاکٹر مسیح الزماں، ص ۱۴
۱۶۔ " " " " ص ۲۰
۱۷۔ اردو میں اردو مرثیے کا ارتقاء
ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری۔ ص ۶۹
۱۸۔ اردو مرثیے کی روایت، ڈاکٹر مسیح الزماں، ص ۱۴
۱۹۔ مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر، شارب ردولوی
۲۰۔ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر ص ۲۴
ڈاکٹر اکبر حیدری ص ۵۸۴

اس بنا پر مرثیے کی اصطلاح کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ وہ نظم جو شہدائے کربلا سے متعلق ہو اور جس میں ان کی تعریف اور توصیف کے ساتھ اپنے رنج والم کا اظہار بھی ہو، مرثیہ کہلاتی ہے ادبی اصطلاح کے طور پر مرثیہ اس صنفِ شعر کو کہتے ہیں جس میں سید الشہدا حضرت امام حسین یا ان کے رفیقوں کے سفرِ کربلا، مصائب، شجاعت اور شہادت کا بیان کیا جائے۔ اس ضمن میں کئی اور چیزیں بھی آجاتی ہیں لیکن اصلاً اردو مرثیے کی بنیاد انھیں باتوں پر قائم ہے۔[21] لغت میں اگرچہ مرثیہ کے معنی وہی ہیں جو عربی ادب کے ابتدائی عہد میں تھے لیکن آج اس کے اصطلاحی معنی بدلے ہوئے ہیں۔ ہمارے ادب میں مرثیے کی مقبولیت اور اس جانب خصوصی توجہ کا سبب، وہ محبت اور عقیدت ہے جو ہر خاص و عام کو آلِ رسول و اہلِ بیعت سے ہے اور اسی والہانہ لگاؤ نے اس صنف شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔

دکن میں مرثیہ بہمنی عہد کی دین ہے۔ سنہ ۱۳۴۷ء میں ایرانی النسل علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی نے دکن کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت دی۔ یہ چھوٹی سی ریاست جلد ہی ایک وسیع اور پائدار سلطنت کی شکل اختیار کر گئی اور ساتھ ہی علم و فن کا مرکز بننا شروع ہوئی۔ حسن بہمنی کے دربار میں "ابتدا سے ہی سرکردہ ہستیوں میں دوسروں کے مقابلے میں ایرانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی اس وقت کی تہذیبی زندگی پر ایرانیوں کے اثرات نمایاں ہیں۔[22] بعد کے بہمنی حکمرانوں نے بھی ایرانیوں کی قدر و منزلت کی اور انھیں اچھے عہدوں پر فائز کیا جس کی وجہ سے اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور ان کا اثر و اقتدار بھی بڑھتا رہا۔ نتیجہ میں دکنی تہذیب ایرانی رسم و رواج سے متاثر ہوئی اور مذہبی نقطۂ نظر سے عزاداری کو اہمیت ملتی گئی۔ عزاداری کے دوش بدوش مرثیے بھی کہے گئے اور جیسے جیسے اردو زبان کی نشو و نما ہوتی رہی، مرثیہ کا دامن بھی وسیع ہوتا رہا۔ لیکن اس صنف کا باقاعدہ فروغ اُس وقت ہوا جب آخری بہمنی حکمران، محمود شاہ، کی غفلت اور کمزوری کی بدولت سلطنت پانچ خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، برار میں عماد شاہی اور بیدر میں بریدشاہی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو ان حکومتوں نے اردو مرثیہ کو بھی نوازا۔ ان تمام سلطنتوں کے حکمراں بڑے عالم دوست تھے۔ اور انھوں نے شعرا و ادیبوں اور عالموں کی بڑی سرپرستی کی۔ ان میں اکثر حکمراں خود بھی بڑے اچھے شاعر تھے۔[23] گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں کو اس اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ شاہی سرپرستی، خوشگوار ماحول اور فنکارانہ صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی نے تخلیقی قوتوں کو اُبھرنے کے بہترین مواقع فراہم کئے اور مذہبی عقیدت کی بنا پر فنِ مرثیہ گوئی سے خاصی دلچسپی لی گئی۔

اردو کے پہلے مرثیہ گو شاعر کے بارے میں اختلاف رائے ہے "یقین کے ساتھ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں مرثیہ گوئی کا آغاز کب سے ہوا اور پہلا شاعر کون ہے جس نے سب سے پہلے مرثیہ کہا ہو۔[24] "نصیر الدین ہاشمی

---

[21] اصول انتقاد ادبیات، سید عابد علی عابد ـــــ ص ۶۴۶

[22] مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے، ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ ـــ ص ۲۰۸

[23] مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر، شارب ردولوی ـــــ ص ۲۵

[24] اُردو میں مرثیہ گوئی اور اس کے اثرات، سعید احمد اکبرآبادی (ماہنامہ "شاعر" آگرہ مارچ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء) ص ۱۲

نے مثنوی نوسرہار کے مصنف اشرف کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا ہے جس نے اُسے ۹۰۹ ہجری میں تصنیف کیا۔ لیکن مثنوی نوسرہار کو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔ وجہی اور قطب شاہ (۹۷۳ھ — ۱۰۲۰ھ / ۱۵۶۵ء — ۱۶۱۲ء) دونوں معاصرین ہیں۔ انھیں کے مرثیے قدیم ترین موجود مرثیے ہیں۔[۲۵] ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے مطابق "سید شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری نے اردو کا پہلا مستقل مرثیہ لکھا"[۲۶] ہے۔ لیکن اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ جس عہد سے اُردو میں مستند مرثیے ملتے ہیں اُس عہد کا ممتاز مرثیہ گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے۔

"جس زمانے میں ایران میں شاہ عباس اعظم (متوفی ۱۰۳۸ھ / ۱۶۲۸ء) کا دور دورہ تھا اور عزاداری شباب پر تھی انہی ایام میں جنوبِ ہند میں سلطان محمد قلی قطب شاہ متوفی (۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء) سر برآرائے سلطنت تھے۔ ان دونوں عظیم الشان بادشاہوں کے تعلقات بڑے استوار تھے۔ دونوں حکومتیں ایک ہی مذہبی رشتے میں منسلک تھیں اور عزاداری کا دم بھر رہی تھیں۔"[۲۷] محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا حکمراں تھا۔ اس کا عہد سولہویں صدی عیسوی کے نصف اوّل سے شروع ہوتا ہے جس کو اردو زبان و ادب کا ابتدائی دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود محمد قلی قطب شاہ نے فنی اعتبار سے کامیاب مرثیے کہے ہیں —— نمونے کے لئے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

مصطفٰے کے باغ کا پھولاں کوں بن پانی سکائے
مصطفٰے ہور مرتضٰے ہور فاطمہ کا دل دکھائے

جیوں نبیاں میں مصطفٰے ہیں تیوں اماماں میں حسین
کفر کے تیئں جان کر اسلام یوں کہتے ہیں حسین

آسمان چیچ جالا ہوا، سورج اگن والا ہوا
چندر سو جل کالا ہوا ہے دُکھ م پاری وائے وائے

ساتوں گگن، آٹھو جنت، ساتو دریا، ساتو دہرت ——
ایک تھے ایک، اپس میں اپ، دُکھ کرتے کاری وائے وائے

سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں وجہی اور غواصی کے نام آتے ہیں لیکن ان دونوں کے مرثیوں میں وہ تاثیر اور زورِ بیان نہیں جو محمد قلی قطب شاہ کے مرثیوں میں ہے۔ سترہویں صدی میں ریاست گولکنڈہ کو مرثیہ گوئی کے میدان میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ عشقی، شاہ قلی خاں شاہی، کاظم، نوری وغیرہ اس عہد کے قابلِ ذکر شعرا ہیں جن کے مرثیے زبان کے ابتدائی نمونوں کے اعتبار سے پختہ اور پُر اثر ہیں۔

(باقی آئندہ)

۲۵ھ — اُردو مرثیے کا ارتقاء، مسیح الزماں — ص ۹۴
۲۶ھ — ادبی مطالعے، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ ص ۱۰۸
۲۷ھ — اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء، ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری۔ ص ۱۷

دوسرا ورق :- تغلق کا قلعہ (حصار)
تصویر :- راج کشن نین
تیسرا ورق :- شاہ سکندر کا مقبرہ (کیتھل)

م۔ کے۔ مہتاب

گھریلو صنعتیں اور خواتین

ہندوستانی معاشرے میں قدر و منزلت کے لحاظ سے خواتین کا مقام دوسرے بہت سے ممالک کی نسبت کہیں بلند ہے۔ یہاں ہر مذہب کے ماننے والے خواتین کو انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں دوسرے ممالک میں عورت معاشیات کے ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش آگے بڑھی ہے وہاں ہندوستان کے روایتی معاشرے میں خواتین کا مقام کھیت کھلیان یا گھر کی چاردیواری رہی ہے۔ اگرچہ شہری علاقوں کے بعض اقتصادی شعبوں مثلاً الیکٹرانکس گھڑی سازی وغیرہ میں خواتین کام کرتی نظر آنے لگی ہیں پھر بھی مجموعی صنعتی یا اقتصادی سرگرمیوں میں ان کی نمائندگی بہت کم ہے۔

اس صورتِ حال کا بڑا سبب یہ ہے کہ صدیوں سے ہندوستانی معاشرے میں مرد کو ہر قسم کی اقتصادی سرگرمی میں فوقیت حاصل رہی ہے۔ اس نے خواتین سے کھیتوں میں کام لیا یا اسے چاردیواری میں قید رکھا۔ لیکن وہاں بھی خواتین نے ثابت کیا ہے کہ وہ ہمت محنت اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے کسی طور پر بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ زرعی سرگرمیوں میں وہ ہمیشہ برابر کی شریک رہی ہیں بلکہ کئی علاقوں میں تو انھیں مردوں پر سبقت حاصل ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے دیہات میں جو سبز انقلاب آتے دکھائی دیتے ہیں ان میں کچھ حصہ ہماری خواتین کا بھی ہے جو ہمیں کھیتوں میں گیت گاتی، دھان لگاتی، اوکھلوں میں دھان کوٹتی، گندم کاٹتی، چائے اور کپاس چنتی اور زرعی سرگرمی کے دوسرے شعبوں میں شرکت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

جو خواتین گھروں تک محدود رہتی ہیں ان کی انگلیاں ہندوستان کی سینکڑوں شہرہ آفاق گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں میں جادو جگاتی نظر آتی ہیں۔ ہینڈ کرگھے پر بنے دلکش کپڑے ہوں یا ان پر جیران کن رنگوں کی چھپائی، پنجاب کی پھلکاری ہو یا کشمیر کا زردوزی کشیدہ، لکھنؤ کی چکن ہو یا کامرانی، بنگال کا کنتھا، تامل ناڈو کی زری ہو، یا کرناٹک کی کپڑے کی صنعت میں خواتین کی نازک انگلیوں کا کمال کہاں نظر نہیں آتا؟ اسی پر بس نہیں ہمارے ملک کی خواتین گھریلو پیمانے پر تیار ہونے والی دریوں،

تالینوں لکڑی اور ہاتھی دانت کی مصنوعات پیتوں اور بانس کی تیلیوں سے تیار ہونے والی ٹوکریاں اور چٹائیاں بنانے کی صنعتوں میں برابر کی شریک نظر آتی ہیں۔ گڑیاں اور کھلونے بنانے میں انھیں مردوں پر سبقت حاصل ہے اور مدھوبنی یا کپڑے پر دوسری لوک مصوری تو گویا ان کا ہی حصہ ہے۔ اسی طرح مٹی اور چینی کے برتن بنانے، شیشے کی مصنوعات، پیپر میشی دستکاریوں میں بھی وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

خواتین کی ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود دیکھا گیا ہے کہ ملک کے اقتصادی نظام میں ان کو ثانوی حیثیت ہی حاصل رہی ہے۔

آزادی کے بعد

آزادی کے بعد ملک کے رہنماؤں خصوصاً جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی نے جو خواتین کی تعلیمی سماجی اور معاشی ترقی کے بہت بڑے حامی تھے صورتِ حال کو بدلنے کے کئی اقدامات کیے۔ خواتین کو کئی آئینی اور قانونی ترجیحات دی گئیں اور ان کے لئے خصوصی ترقیاتی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ چنانچہ ہندوستان کے آئین میں عورتوں کے لئے مردوں کے برابر حقوق کا اہتمام کیا گیا ہے اور منصوبہ بند ترقی کے عمل میں خواتین کی ترقی و بہبود پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خواتین میں اپنے حقوق اور صلاحیتوں کے بارے میں بیداری پیدا ہوئی ہے وہ آگے بڑھ رہی ہیں اور اس کا ان کی اقتصادی حالت پر نمایاں اثر پڑا ہے۔

چھٹے پانچسالہ منصوبے میں پہلی بار ایک خاص باب خواتین اور ان کی ترقی کے لئے وقف کیا گیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ حکومت سماج کے اس حصے کو کتنی اہمیت دے رہی ہے۔ اسی باب کے ہدایتی اصولوں کے مطابق خواتین کی سماجی واقتصادی ترقی کے لئے مرکزی وزارتوں کے تحت اسکیموں میں خواتین کو کام دلانے اور ان کی تعلیم وتربیت میں اضافے کے پروگراموں پر عمل جاری ہے۔

بے شک ان پروگراموں کی بدولت شہروں اور قصبات میں خواتین کی زندگی مختلف معاشی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر نظر آنے لگتی ہے لیکن ہماری ۸۰ فی صد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ اس لئے جب تک دیہات میں خواتین کی غربت دور نہیں ہوتی ملک کے مجموعی معاشی عمل میں خواتین کی حالت میں بہتری نہیں ہو سکتی۔

آبادی اور خواتین کا تناسب

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۶۸ کروڑ تھی جس میں خواتین کا تناسب ۴۸ فی صد تھا۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کل آبادی میں کارکنوں کا تناسب ۳۳ فی صد تھا لیکن مرد کارکنوں کا تناسب ۵۳ فی صد اور خواتین کا حصہ ۱۳ فی صد تھا۔ دوسرے الفاظ میں اقتصادی سرگرمیوں میں خواتین کا حصہ مقابلتاً بہت کم ہے۔ مزید برآں خواتین کارکن زیادہ تر زراعتی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں جبکہ معاشی سرگرمیوں کے ثانوی شعبے جیسے کہ تجارت اور صنعت میں ان کا تناسب صرف سات فی صدی ہے۔ چنانچہ ملک کے منصوبہ سازوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دیہات میں جہاں ابھی

یک بڑا ذریعہ معاش زراعت ہی ہے وہاں خواتین کو گھریلو اور دیہی صنعتوں کے ذریعہ غیر زرعی شعبے میں روزگار کے متبادل ذرائع مہیا کیے جائیں۔

یہ بھی محسوس کیا گیا ہے کہ جہاں شہروں اور قصبوں میں خواتین کی مالی حالت قدرے بہتر ہے وہاں دیہات میں خواتین کی حالت کہیں ابتر ہے۔ ناخواندگی سماجی بندھن اور غربت انھیں گھروں سے نکلنے نہیں دیتی کہ وہ باہر آکر اپنے کنبوں کی آمدنی بڑھانے کے عمل میں ہاتھ بٹا سکیں۔ چنانچہ یہ ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ ان خواتین کو ان کے گھر یا ان کے دروازے پر کام مہیا کیا جائے دیہی اور گھریلو صنعتوں کے مرکزی کمیشن نے اپنے اکثر پروگرام اسی بنیاد کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر بنائے ہیں۔ ان پروگراموں پر گذشتہ کئی برسوں سے عمل ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر گھریلو صنعتوں میں خواتین کی تعداد متواتر بڑھ رہی ہے۔

کھادی کے پروگرام کے تحت ہتھ کرگھے پر سوتی، اونی اور ریشمی کپڑا تیار کرنے کی صنعت میں عورتوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اسی طرح ۲۵ ایسی گھریلو صنعتیں منتخب کی گئی ہیں جن میں تربیت، مالی امداد اور مارکیٹنگ کی سہولیات کے ذریعہ خواتین کا حصہ بڑھایا جا رہا ہے۔ اس وقت کھادی اور دیہی گھریلو صنعتوں میں خواتین کی شرکت کا تناسب درج ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔

کھادی

سوتی	۶۰ سے ۷۵ فی صد
اونی	۴۰ فی صد
ریشمی	۵۰ سے ۶۰ فی صد

گھریلو صنعتیں

۱۔	اناج اور دالوں کی مصنوعات:	۸۰ فی صد
۲۔	چمڑے کی مصنوعات:	۱۰ فی صد
۳۔	دیا سلائیاں اور اگربتیاں:	۴۵ فی صد
۴۔	تازے گڑ اور دیگر مصنوعات:	۳۵ فی صد
۵۔	غیر خوردنی تیلوں کی مصنوعات اور صابن	۴۰ فی صد
۶۔	ہاتھ سے بنا کاغذ:	۴۰ فی صد
۷۔	مٹی کے برتن:	۳۵ سے ۴۰ فی صد
۸۔	ریشے تیار کرنا:	۱۵ سے ۲۰ فی صد
۹۔	طبی مقاصد کیلئے جڑی بوٹیاں	۵۰ فی صد
۱۰	بیروزہ اور گوند کی فراہمی	۲۰ سے ۵۰ فی صد
۱۱۔	کتھا تیار کرنا	۵۰ فی صد
۱۲	چونا بنانا	۱۵ فی صد
۱۳۔	پھلوں کے اچار مربے	۵۰ فی صد
۱۴۔	بانس اور بید کی ٹوکریاں	۳۰ سے ۴۰ فی صد

کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن نے گھریلو صنعتوں کے پروگرام شروع کر رکھے ہیں ان میں خواتین کا حصہ ۴۵ فی صد ہے جب کہ ملک کی کل آبادی میں خواتین کا تناسب ۴۸ فی صد ہے۔ کمیشن نے ۱۹۸۲-۸۳ء میں خواتین کو سوت اور ریشوں کی کتائی کے لئے چھ تکلوں والے ۱۴۸۷۵، بارہ تکلے والے ۳۷۷۵ اور اون کی کتائی کیلئے ۹۷۵ چرخے مہیا کیے۔

ہنر مند خواتین کی جسمانی مشقت کم کرنے کے لیے بھی نئے نئے طریقے ایجاد کیے جا رہے ہیں اور یہ معلومات دور افتادہ دیہات تک خواتین

کو پہنچائی جا رہی ہیں یہ طریقے آسان بھی ہیں اور کم خرچ بھی۔ ملک میں بہت کم ایسی چھوٹی یا بڑی صنعتیں ہیں جو خواتین کی ملکیت ہیں اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے یہ بہتر خیال کیا گیا ہے کہ ایسی گھریلو صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے جن میں خواتین اپنا روزگار خود حاصل کر سکتی ہیں۔ اس فیصلے کے تحت ملک کے مختلف حصوں میں ہنر مند خواتین کو جو اپنے اپنے علاقوں کی مشہور دستکاریوں کو چلانے کی صلاحیت رکھتی ہیں مالی اور تیکنیکی امداد دی جا رہی ہے۔

مال کی فروخت

گھریلو صنعتوں میں مصروف خواتین کا ایک بڑا مسئلہ جو بہت سی خواتین کے کام شروع کرنے میں مانع راہ ہے، تیار مال کی فروخت کا ہے۔ اکثر خواتین اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر باقی وقت میں گھریلو صنعتیں چلاتی ہیں تاکہ وہ اپنے کنبوں کی آمدنی میں اضافہ کر سکیں لہٰذا ان کے پاس مال کی فروخت کے لئے اتنا وقت اور قابلیت نہیں ہوتی جتنی ان کے مدِ مقابل مردوں کے پاس ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درمیانہ وار تاجر اور صنعت کار ان کا استحصال کرتے ہیں جس سے نہ تو ان خواتین کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ ملتا ہے اور نہ وہ اپنے کام میں اضافہ کر سکتی ہیں اس مشکل سے نپٹنے کیلئے مرکزی اور ریاستی سطح پر گھریلو صنعتوں سے متعلقہ محکموں نے اہتمام کیا ہے کہ ان خواتین یا ان کی انجمنوں سے مال خرید کر فروخت کیا جائے۔ یہ اسکیم کشمیر سے کیرل تک قریب قریب ہر ریاست میں زیرِ عمل ہے۔

گوبر گیس چولھے

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دیہات کے گھروں میں ماحول ایسا صاف ستھرا نہیں ہوتا جس میں گھریلو صنعتوں سے بہتر مال تیار ہو سکے۔ اس کا ایک اور بڑا سبب گھروں میں استعمال ہونے والے ایندھن کا دھواں ہے جو مال کے معیار پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ روایتی ایندھن کے استعمال کے سبب خواتین کو گھریلو صنعتوں کے لئے وقت بھی کم ملتا ہے۔ اب دیہات میں ہزاروں کی تعداد میں گوبر گیس کے پلانٹ لگائے جا رہے ہیں۔ گوبر گیس سے دیہی گھروں کے رسوئی گھر صاف ستھرے ہو رہے ہیں، خواتین کام سے جلد فارغ ہو کر صنعتی سرگرمیوں کے لئے زیادہ وقت صرف کر رہی ہیں اور ماحول بہتر ہو جانے سے ان کے تیار کردہ مال کا معیار بھی بہتر ہو رہا ہے۔

بُنے ہوئے کپڑے ہوں یا ہاتھ سے چھپے پارچہ جات، کشیدہ کاری ہو یا قالین و نمدہ سازی چمڑے کا کام ہو، لکڑی پر نقش و نگاری ہو یا ہاتھی دانت کی نفیس مصنوعات پیپر میشی ہو یا سینگ و گھونگھے کا سامان، کھلونے ہوں یا برتن، چوڑیاں ہو یا زیور پتھر کا کام ہو یا پیتل کا وہ کونسی صنعت ہے جہاں ہمیں ہنر مند خواتین کاریگر دکھائی نہیں دیتیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ نہ منظم تھیں اور نہ انھیں کوئی ادارہ جاتی امداد حاصل تھی اس لئے کہیں بھی نسوانی ہاتھ نمایاں نہیں تھا۔ اب ان کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور معاشی شعبے میں وہ آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ ناممکن نہیں کہ آئندہ کچھ برسوں میں بعض گھریلو صنعتوں میں وہ مردوں سے بازی لے جائیں۔

(بشکریہ پی۔ آئی۔ بی)

طلعت عرفانی

غزل

نہ کوئی لفظ نہ پیکر نہ رنگ ٹھہرے ہے
ہر ایک خواب طبیعت پہ سنگ ٹھہرے ہے

وہ پھول ہو کہ کھلونا کہ چاند ہو کہ بدن
نظر کی پیاس تو دِل کی اُمنگ ٹھہرے ہے

نہ جانے شدت ہوں کن کن سمندروں کے نقوش
ذرا سی دیر جس آہن پہ زنگ ٹھہرے ہے

جبیں کے نور سے احساس کے خلاؤں تک
حیات صرف نشے کی ترنگ ٹھہرے ہے

یہ کون اُداس درختوں کی چھاؤں میں طلعت
سحر کی اوس میں بھیگی پتنگ ٹھہرے ہے

محمد سلیم خاں ہمراز

قومی یکجہتی

رُوح کی ٹھنڈک، دِل کا سکوں ہے آنکھ کا اپنی تارا ہے
اپنے وطن کا ذرّہ ذرّہ ہم کو جان سے پیارا ہے
پیار ہے مذہب ہم لوگوں کا اور یہ ہم کو پیارا ہے
بیج جو نفرت کا بوتا ہے دشمن وہی ہمارا ہے
بھارت کے اس تاج محل میں اپنے لہو کا گارا ہے
ہم بھارت کے رکھوالے ہیں بھارت دیش ہمارا ہے
آؤ ہم مِل جُل کے مِٹا دیں آپس کے سب جھگڑوں کو
ہندو مسلم سِکھ عیسائی ایک ہوں اپنا نعرہ ہے
ہم ہیں اس گلشن کی رونق، ہم اس کے رکھوالے ہیں
ہمیں سے اس کا سُندر چہرا جگ بھر میں اجیارا ہے
ظلم سہے کتنے ہی لیکن ہم سے نہ چھوٹی پریم ڈگر
ہم سے جو بھی ٹکرایا ہے، آخر کو وہ ہارا ہے
اپنے چمن پر آنکھ اٹھائے دیکھیں ہمّت ہے کِس کی
ڈالی ڈالی تیغ بنی ہے پھول پھول انگارا ہے
زور تمہارے بازو میں کتنا ہے ہم بھی دیکھیں تو
سمجھو اجل اس کی آئی ہے جس نے ہمیں للکارا ہے
اپنی خیر مناؤ تم اب اے باطل کے متوالو!
قلزمِ حق کا قطرہ قطرہ برقِ اجل کا دھارا ہے
نسل و زباں کے نام پہ ناحق آپس میں لڑنے والو
قوم کی ایکتا قائم رکھنا پہلا فرض تمہارا ہے

ایس ایس چاولہ

رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ ڈاکٹر کرشن کی آنکھوں میں نیند ٹوٹ کر آپڑی تھی۔ آنکھیں بمشکل کھل رہی تھیں۔ ویسے تو یہ اس کی روزمرہ کی عادت تھی کہ ڈیڑھ دو بجے سے پہلے سونا اس کے لئے مشکل تھا۔ مگر آج وہ بہت تھک گیا تھا وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اٹھایا۔ اور پوچھا کون ہے؟ ایک ہلکی۔ باریک۔ مدھر آواز اُبھری "موہن۔ یہ تم ہو؟" ڈاکٹر کی نیند کوسوں دور بھاگ گئی۔ وہ چستی سے اٹھا۔ وہ اپنے جسم۔ جذبات اور آواز پر قابو نہ پا سکا تھا۔ وہ تقریباً چلاتا ہوا بولا۔ کون رادھا۔ رادھا۔ تم کہاں سے بول رہی ہو؟ رادھا نے کہا۔ موہن میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں کہ تم سے ملاقات ہو جائے تم سے بات چیت ہو جائے۔ مگر تم اتنے مشہور اور معروف آدمی ہو کہ میں نے تمہاری آتے جاتے صرف جھلک ہی دیکھی ہے۔ بارہا تمہارے سیکریٹری کو فون کیا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ ڈاکٹر کرشن نے کہا "تم ہو کہاں؟" رادھا نے جواب دیا۔ اس ہوٹل کی لابی میں ا ڈاکٹر نے کہا کہ تم میرا انتظار کرنا۔ لفٹ کا انتظار کرتے ڈاکٹر کی حالت ایسی تھی جیسے وہ زندگی کا بہت بڑا امتحان دینے جا رہا ہو۔

من میں بار بار یہی خیال آتا تھا کہ وہ کہیں ادھر اُدھر چلی نہ جائے کتنی تمنا تھی کہ وہ اس سے مل پاتا۔ بس کل کا دن تو وہ یہاں پر تھا اور پھر اسکو واپس جانا تھا۔ یہ اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ جب وہ اس سے بچھڑا تھا تو عجیب حالات تھے اور آج جب وہ اس سے پھر ملنے جا رہا تھا تو حالات عجیب تر تھے۔ ڈاکٹر کرشن کی رادھا سے ملنے کی تمنا ہمیشہ جوان رہتی تھی۔

لابی میں کہیں کہیں روشنی ٹمٹماتی نظر آرہی تھی اور اس کے ایک کونے میں اسکو رادھا نظر آئی۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ رادھا کو اس نے ایک جگہ اچھی روشنی میں دیکھا۔ وہ بہت کمزور تھی۔ رادھا کی آنکھوں میں نمی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ۔ چہرے پر بے تابی۔ خوشی کے جذبات اُبھرتے اور مٹتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر کرشن ایک بُت کی طرح ساکن کھڑا ہو گیا تھا۔ سکوت رادھا نے توڑا تھا۔ "موہن اچھے تو ہو؟" ڈاکٹر اس کے لاغر جسم کو دیکھ رہا تھا اس نے ہوش سنبھالا۔ وہ بمشکل کہہ سکا۔ اب تک تو اچھا نہیں تھا۔ اب آپ مجھے مل گئی ہیں تو ضرور اچھا ہو جاؤں گا۔ مگر تمہیں کیا ہوا؟ تم کمزور۔ لاغر۔ ناتواں ہو۔ کیا وجہ؟ اور کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟ تمہارے وہ کیا کرتے ہیں؟ کتنے بچے ہیں؟

یاس میں ڈوبی آواز میں رادھا نے کہا کہ موہن۔ تم نے جاتے وقت کہا تھا کہ میں تمہارا انتظار کروں۔ اور اگر تم نے کبھی شادی کی تو صرف رادھا سے ہی کروگے۔ اور۔ میں اتنی مُدت تک تمہاری واپسی کا انتظار کرتی رہی!

ڈاکٹر نے کہا آؤ۔ اوپر چلو۔ اس نے سہارا دینے کے لئے

ہاتھ بڑھایا۔ مگر رادھا نے کہا۔ موہن میری ایک التجا ہے۔ اگر میری بات مان لو تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ تم میرے ساتھ گھر چلے چلو۔ اس گھر میں جہاں سے تمہیں بے عزّت کر کے نکال دیا گیا تھا اور جہاں اب تم پوری عزّت کے ساتھ جاؤ گے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اچھا میں کپڑے بدل لوں۔ رادھا نے کہا کہ تم کھدر کے کرتے پائجامہ میں بہت سُندر لگتے ہو ایسے ہی چلے آؤ۔ ڈاکٹر کچھ بول نہ سکا۔ مگر وہ انجانی کشش کے تحت کھینچا چلا جا رہا تھا مگر اس کشش کو کسی بھی نام سے یاد نہ کر پایا۔

کار میں دونوں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو دونوں اپنے اپنے خیالات میں ڈوب گئے۔ ڈاکٹر ماضی کے صندوق کا ڈھکن کھول کر بیٹھ گیا۔

اس کا پورا نام کرشن موہن تھا۔ دُنیا میں بس ایک وہ تھا اور دوسری اس کی ماں۔ ماں اس کی بے نظیر شخصیت تھی۔ اس نے اپنے بچے کو ہمیشہ بڑھاوا دیا تھا۔ غریبی میں بھی اس کا دل بادشاہوں سے بھی زیادہ فیاض تھا۔ کرشن کے دل میں ایک لگن تھی۔ اسکی ایک منزل تھی کہ اس نے ڈاکٹر بننا ہے۔

اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس کو ٹیوشن لینے پڑے تھے جب وہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھا تو اس کو ایک ٹیوشن ملی۔ یہ لڑکی سیٹھ رام داس کی اکلوتی اولاد رادھا تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی اور امیروں کے تمام نخرے اور چوچلے اس میں موجود تھے۔ پڑھائی میں وہ تیز نہ تھی سو اسی وجہ سے کرشن سے وہ ٹیوشن لیتی تھی۔

کرشن کو پہلے دن ہی یہ پتہ چل گیا تھا کہ رادھا مزاج کی تیز ہے۔ وہ بات بات پر غصّہ کرتی تھی اور ہر پانچ منٹ کے بعد یہ دھمکی دیتی تھی کہ وہ کرشن سے ٹیوشن نہیں لینا چاہتی ہے۔ کرشن نے ایک ہفتہ تک تو صبر کیا اور اس کے بعد اس نے رادھا کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ پڑھائی ڈاکٹر کا مکسچر نہیں ہے جو کہ منہ کھول کر مریض کے منہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اگر رادھا پڑھنا نہیں چاہتی تو وہ بھی نہیں پڑھانا چاہتا۔ یہ بات رادھا کو بالکل نہیں بھائی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ لوگ اس کے سامنے گڑگڑائیں۔ ناک رگڑیں ہاتھ جوڑیں۔ منّت سماجت کریں۔ مگر یہاں کرشن نہ صرف جانے کے لئے تیار تھا بلکہ ٹیوشن کے بقایا پیسے بھی لینے کو تیار نہ تھا۔

رادھا کرشن کی اس بے نیازی پر جل اٹھی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ ایسے تو اسکی شکست ہو جائے گی۔ اسے چند روز انتظار کرنا چاہیئے۔ پھر موقع دیکھ کر وہ وار کرے گی۔ مجبوراً جب اسے پڑھنا پڑا تو پڑھائی میں بھی تھوڑی سی توجّہ دینے کی سوچ لی۔ جب پڑھائی کی طرف توجہ دی تو وہ حیران رہ گئی کہ کرشن مشکل سے مشکل بات کو آسان سے آسان طریقہ پر سمجھانے کا ماہر ہے۔

کئی بار رادھا کو کرشن پر بے حد غصّہ آتا تھا۔ کیسا بے تکا انسان ہے۔ لباس ہے تو وہی کھدر کی قمیض اور پائجامہ۔ کتنی سردی ہو بس ایک پرانا سوئیٹر ہوتا تھا۔ اور وہ مشین کی طرح کام کرتا تھا۔ بخار ہو تھکان ہو۔ آندھی یا طوفان ہو وہ اپنے وقت پر پہنچ جاتا تھا۔ پھر وہ اپنی حد سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھتا تھا۔ نہ اس کے حسن کا، نہ جوانی کا، نہ اس کی امارت کا کرشن پر اثر تھا۔

رادھا کے گھر اس دن پارٹی تھی۔ اس کی سہیلیاں۔ کالج کے ساتھی دوست پارٹی میں جمع تھے۔ کرشن کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ سو وہ آگیا رادھا نے کہا کہ آج وہ نہیں پڑھے گی۔ کرشن جانے کے لئے مڑا تو رادھا نے سوچا کہ کرشن کو اس کی غریبی۔ مینرز سے لاعلمی کے احساس کرانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ سو اس نے کرشن کو بھی مدعو کر لیا۔ اس نے دو چار دفعہ معافی مانگی۔ مگر رادھا بضد تھی۔ سو وہ مان گیا۔ رادھا کے ایک کلاس فیلو نے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ کرشن اچھا آرٹسٹ ہے۔ اس کی پینٹنگز کی ایک دفعہ نمائش ہو چکی ہے۔ ہر لڑکا۔ لڑکی کچھ نہ کچھ سنا رہا تھا۔ گانا لطیفہ۔ غزل۔ سو رادھا نے کہا کہ اس کے ماسٹر جی "ماسٹر جی" پر اس نے خاص زور دیا تھا۔ آپ کو اپنا ایک گانا سنائیں گے۔ ویسے یہ بہت اچھا گاتے ہیں۔ کہنے کو تو اس نے کرشن کو گھسیٹا تھا۔ مگر جب کرشن نے گانا شروع کیا تو لوگوں کے سانس رُک گئے لگتے تھے۔ گانا ختم ہوا تو کمرہ تالیوں سے گونج

اُف! بہت اصرار پر کرشن نے دو اور گانے سنائے۔ رادھا نے سوچا کہ قدرت کا یہ کیا راز ہے کہ غریبوں کو اتنے سارے گن کیسے مل جاتے ہیں۔ اور پھر وہ ہمیشہ مسکین بنے رہتے ہیں اور ادھر امیر امارت کے نشے میں مدمست انسانیت تک کو بھول جاتے ہیں۔ اس دن کے بعد رادھا کا رویہ کرشن کی طرف بدل گیا تھا۔ آہستہ آہستہ نزدیکی آئی پھر وہ وقت بھی آیا کہ وہ مکمل طور پر کرشن کے عشق میں ڈوب گئی تھی۔

سوتے جاگتے اس کے سپنے دیکھتی تھی اور اس کو موہن کہہ کر پکارتی تھی سپنے دیکھنا تو برا نہیں ہے مگر جب اس کا چرچا دنیا کی ملکیت بن جاتا ہے تو پیار کی راہ میں دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ یہی دنیا والوں کا دستور ہے۔ سب سے پہلے اس بات کا رادھا کی ماں کو پتہ لگا۔ اگر لڑکا امیر ہوتا تو رادھا کی ماں کو اعتراض تو کیا بے حد خوشی ہوتی۔ مگر یہاں تو لڑکا غریب تھا۔ بے نام خاندان کا تھا۔ اور پھر غریب سے عشق تو امیروں کے لئے مہلک اور چھوت کی بیماری کے برابر ہوتا ہے۔ ماں نے پتی سے بات کی۔ کہ آپ کی لاڈلی اپنے ماسٹر جی پر مرمٹی ہے۔

انھوں نے کرشن کو بلایا اور اس سے اس بات کا جواب طلب کیا کہ اُسے یہاں پر ٹیوشن پڑھانے کے لئے رکھا تھا یا اُن کی لڑکی سے عشق کرنے کے لیے؟ کرشن نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ اور رادھا ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ مگر اس کے آگے کہ کرشن کچھ بول سکے، رادھا کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ہم نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھا لی ہیں۔ سیٹھ جی نے کہا کہ اس غریب کے ساتھ شادی کر کے تجھے دُنیا کا کیا سُکھ ملے گا؟ رادھا نے کہا کہ پاپا سُکھ اور دُکھ تو احساس کے دو نام ہیں۔ پھر یہ جلد ڈاکٹر بن جائیں گے اور ہم دونوں مِل جُل کر اپنا گزارہ تو کر ہی لیں گے۔ رادھا کا باپ گرم توے کی طرح تپا ہوا تھا۔ اس نے کرشن کو کہا کہ تم وشواش گھاتی ہو۔ خبردار اب کبھی اس گھر کی طرف جھانک کر بھی نہ دیکھنا۔ اگر تم نے پھر کبھی رادھا سے ملاقات یا بات چیت کی تو تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔ رادھا نے اپنے قدم کرشن کی طرف بڑھائے۔ تو سیٹھ جی نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ رادھا نے کہا کہ وہ کرشن موہن کے ساتھ ہی جائے گی تو اس کی خاطر تھپڑوں۔ گھونسوں سے ہوئی۔ مرد بادشاہ ہے اور عورت کا چاہے کوئی روپ کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ بیوی ہو یا بیٹی وہ اسی کی غلام ہے اور وہ جیسے چاہے اس سے سلوک کرے سو نوکروں نے کرشن کو دھکّے دے کر باہر دھکیلنا شروع کیا۔ اور باپ کا ہاتھ بیٹی پر برابر اُٹھ رہا تھا۔

رادھا نے زور سے کہا کہ موہن میں تمہاری ہوں اور تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔ اور موہن نے کہا کہ رادھا میں تمہارا ہوں اور تمہارا رہوں گا۔ زندگی کے آخری سانس تک۔

پر کرشن کے دل پر اتنا گہرا زخم لگا تھا کہ وہ اسے جلد نہ بھر سکا۔ پھر اس نے یہ دُکھ اپنے اندر سمیٹ لیا اور اپنی تمام تر توجہ اپنی زندگی کامیاب بنانے میں لگا دی۔ آخر وہ ڈاکٹر بن گیا اور کام کے ساتھ اس نے کینسر کے علاج کے لئے ریسرچ شروع کر دیا تھا۔ بعد میں وہ انگلستان چلا گیا۔ کینسر کے علاج میں اس نے مشہوری پائی اور پھر اس کے نام کی دھوم تمام دُنیا میں پھیل گئی۔ اس کے پاس اب روپئے پیسے کی کمی نہ تھی اس کا نام تھا۔ دنیا میں ایک مقام تھا۔ چند دنوں کے لیے وہ ہندوستان آیا تھا۔ اس ملک میں اسے اتنی عزت ملی کہ وہ حیران رہ گیا۔ ہر اخبار میں روز ہی اس کے متعلق چرچا ہوتا تھا۔ اس کے فوٹو چھپتے تھے۔ تعریف ہوتی تھی۔ کل یہاں اس کا آخری دن تھا۔ وہ رادھا کو ملنے کی تمنا دل میں لئے ہوئے تھا مگر یہاں آتے ہی وہ اتنا مصروف ہوا کہ اسے کھانے پینے سونے تک کا ہوش نہیں

رہا تھا۔ اس کے اندر ایک تمنا جو ان تھی۔ ایک الجھن تھی۔ ایک خلش تھی کہ وہ رادھا سے مل کر ہی جائے اور کل کا دن اس نے اسی کام کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

اب اس کو رادھا ملی بھی تو اتنی لاغر، بیمار اور ناتواں۔

وہ رادھا کے محل نما گھر پہنچا۔ رادھا نے پوچھا۔

"ارے موہن میں پوچھنا بھول گئی۔ کیا تم نے شادی کر لی ہے؟"

موہن نے کہا کہ ہاں رادھا میں نے شادی کر لی ہے "بیوی کہاں ہے؟" بچے کتنے ہیں؟"

موہن نے کہا کہ شادی میں نے اپنے پیشے اپنے کام سے کی ہے۔ اور کسی بات یا شادی کے لیے نہ ہی وقت ملا ہے نہ ہی خیال آیا ہے۔

رادھا نے ایک لمبا۔ گہرا سانس لیا۔ تھکاوٹ اس کے چہرہ پر عیاں تھی۔ موہن نے کہا کہ ٹھہرو۔ میں پہلے تمہارا ٹیسٹ لے لوں۔ رادھا نے کہا نہیں موہن میرے پاس میرے حال کی پوری رپورٹ موجود ہے۔ یہ لفافہ پڑا ہے۔ اسے پڑھ لو۔ میں اتنے میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔

موہن نے رپورٹ پڑھی اور چونک پڑا۔

اس کو معلوم ہوا کہ رادھا کی حالت بے حد خطرناک ہے اس کے کینسر زدہ پھیپھڑے آخری حد تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے ڈاکٹر مترا کو جو وہاں کا مشہور ڈاکٹر تھا ایک فون کیا اور ضروری ہدایات دیں۔

رادھا نے چائے بنائی اور کہا کہ میری ایک خواہش تو یہ تھی کہ اس گھر میں تمہیں پوری عزت کے ساتھ واپس لاؤں۔ جہاں سے تمہیں کبھی بے عزت کر کے نکال دیا گیا تھا اور دوسری شادی کی رسم مرنے سے پہلے پوری کر جانے کی تاکہ میں سدا سہاگن بن کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔

کرشن موہن نے کہا ٹھیک ہے۔ شادی کی رسم تو ابھی پوری کر لیتے ہیں اس نے پھل کاٹنے والی چھری کو ہاتھ میں پکڑا۔ بائیں ہاتھ میں چھری لے کر اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی کاٹ ڈالی۔ لال لال خون سے اس نے رادھا کی مانگ میں سیندور کی بجائے وہ خون لگا دیا۔ اور کہا کہ لو بھئی ہماری شادی بھی ہو گئی اور تم سہاگن بھی بن گئی ہو۔

رادھا نے موہن کی انگلی میں سے خون بہتا دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔ دوائی لینے کے لیے آگے بڑھی تو موہن نے روک دیا۔ فکر مت کرو۔ گہرا گھاؤ نہیں ہے۔

اب رادھا جذباتی ہو گئی تھی اس نے کہا کہ موہن تم نے میری زندگی کی آخری گھڑیوں میں مجھے خوشیوں سے مالا مال کر دیا ہے اب میں سکھ چین سے مر سکوں گی۔

موہن نے کہا کہ رادھا۔ تم یاس کی باتیں مت کرو۔ یقین جانو کہ تم زندہ رہو گی۔ ہم دونوں مل کر اپنا گھر آباد کریں گے۔ بچے بھی آئیں گے اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بچوں کو اپنی من مرضی سے شادی کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔ رادھا اب اس زندگی میں تم میرا سب سے بڑا سرمایہ ہو۔ میں اب میرکارواں ہوں اور میں اپنے کارواں کو لٹتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور تمہارا شوہر بھی اتنے میں دور۔ کہیں دور ایمبولینس گاڑی کے سائرن کی آواز رات کے سناٹے کو توڑ کر گونج رہی تھی۔

کرشن موہن کے اندر کا ڈاکٹر جاگ اٹھا تھا۔ اس نے رادھا کو کہا کہ اب تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد ایمبولینس گاڑی آ جائے گی اور تم ہسپتال چلو گی۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں بھرپور زندگی کی طرف واپس لے جاؤں۔ میں دوا بھی کروں گا اور جھولی پھیلا کر اس پروردگار کے حضور تمہارے لیے ہر پل دعا بھی مانگتا رہوں گا۔

اتنے میں ڈاکٹر مترا دوسرے ڈاکٹروں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

مثنوی حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ

ایک تاریخی و معاشی جائزہ

مصنف : این - ڈی - آہوجہ

قیمت : درج نہیں

ملنے کا پتہ: انٹرنیشنل سٹڈی سینٹر، سیکٹر ۱۴ - ۱۔ چنڈی گڈھ

پانی پت اہلِ صفا و علم و فن کا مرجع رہا ہے۔ اس خاکِ پاک سے جنم لینے والی برگزیدہ شخصیتوں میں حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ سرِ فہرست ہیں۔ نظریۂ "وحدت الوجود" اور "ہمہ اوست" کے مبلغ حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ نے طویل عمر پائی تھی اور دورانِ حیات بہت سے عالم پناہوں کی مسند نشینی اور تخت و تاج سے محرومی کے دلفریب و دلخراش ہنگامے دیکھے تھے۔ خود بھی عہدِ بلبن میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر متمکن رہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ کی تخلیقات میں (خواہ پس منظر میں ہی سہی) اس دور کی سیاسی و معاشی ابتری کے حالات و واقعات در نہ آتے۔ اس لحاظ سے آپ کی فارسی مثنوی اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کا مستند تاریخی ماخذ قرار دی جا سکتی ہے ــــ

پروفیسر آہوجہ نے نہایت عرق ریزی کے بعد متذکرہ مثنوی کے مختلف اشعار کو بطور حوالہ پیش کرتے ہوئے اسی امر کو بصراحت بیان کیا ہے۔

معنوی خوبیوں اور مفید مطلب حواشی سے مزین اس تحقیقی کاوش کی اشاعت میں اگر صوری حسن کا بھی دھیان رکھا جاتا تو زیرِ نظر تصنیف کی افادیت یقیناً دوبالا ہو جاتی۔

(سلطان انجم)

سانیٹ

منوہر لال ہادی

پوچھتا ہوں اہلِ زر سے کس میں ملتا ہے سکوں
مجھ سے کہتے ہیں کہ سکوں کے سُریلے راگ میں
جس سے کھُل جاتے ہیں امکاں کے دریچے بھاگ میں
رحمتِ دیر و حرم سے ہم پہ رِستا ہے سکوں
پوچھتا ہوں حاکموں سے کس میں ملتا ہے سکوں
مجھ سے کہتے ہیں عصا کی حرکتِ صد رنگ میں
مسندوں کی کیف افگن نکہتِ صد رنگ میں
اور ہمارے شوخ فرمانوں سے رِستا ہے سکوں
پوچھتا ہوں بے گھروں سے کس میں ملتا ہے سکوں
مجھ سے کہتے ہیں قناعت کے طلسمی گیت میں
سادگی میں، بندگی میں، مردمی میں، پریت میں
لامکانوں کے کرم سے ہم پہ رِستا ہے سکوں
پوچھتا ہوں رات سے کس کا سکوں ہے معتبر
مجھ سے کہتی ہے کہ گھوموں کوچہ کوچہ، در بدر

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت ایبسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ سے ستمبر ۱۹۸۵ء کے لئے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس، یو۔ ٹی۔ چنڈی گڑھ۔

Regd. No. NW/CH-

۱۸۸/۱۲
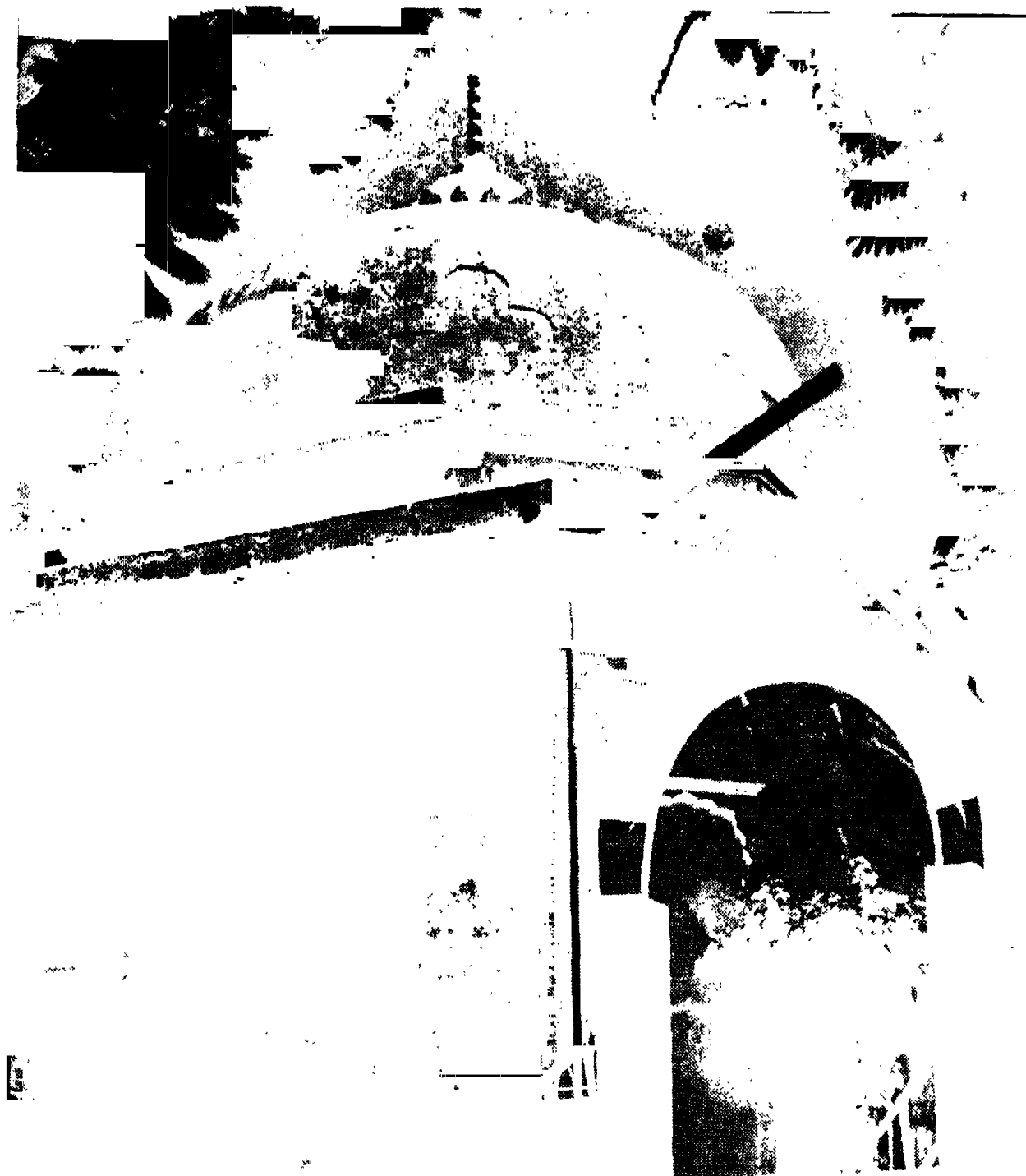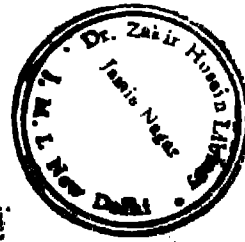
تعمیر

ہریانہ

Majeera—A folk-dance of Haryana.

اکتوبر ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۱۰ | جلد نمبر ۱۳

مدیر اعلیٰ:

رنجیت ایسر

مدیر:

سلطان انجم

سرورق: اے۔ پی۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے
شرحِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔ سی۔ او ۱۸۹-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ترتیب

ڈاکٹر رزاق اثر

بے شک ہے یہ احسان ترا اہلِ وطن پر
بے شک ہے یہ احسان ترا گنگ و جمن پر

واضح ہے یہ احسان ترا دورِ کہن پر
ثابت ہے یہ احسان ترا ہندی چمن پر

اس ملک پہ اس قوم پہ احسان ترا ہے
ہم تجھ کو بھلا دیں تو یہ ایمان ترا ہے

تقسیم تھیں خانوں میں کئی ہند کی ذاتیں
آپس میں لڑانے کی تھیں انگریز کی گھاتیں

کرتا تھا کبھی نسل کبھی رنگ کی باتیں
لیکن تری تدبیر نے دی ہیں اُسے ماتیں

ہر دور میں تُو قابلِ صد داد رہے گا
اے محسنِ گل باغ کو تُو یاد رہے گا

سوئی ہوئی اس قوم کو یوں تونے جگایا
انگریز چلے جاؤ کا نعرہ ہے لگایا

زنداں میں کبھی آزادی کا نغمہ ہے سنایا
چرخے سے یہاں تُونے ہر اک گھر ہے بسایا

تاریخ کچھ اس طرح سے گاندھی نے بنائی
مل ہی گئی بھارت کو غلامی سے رہائی

اس ملک کا ہر شخص یہ دیتا ہے گواہی
ہاتھوں سے مٹی تیرے غلامی کی سیاہی

تُو امن کی منزل کا ہے ممتاز سپاہی
قدموں پہ ترے جھک گئی انگریز کی شاہی

کھاتے ہیں قسم دیش یہ آزاد رہے گا
ہر حال میں گلشن ترا آباد رہے گا

صالحہ عابد حسین

ان چاہی نعمت

(اس ناول کا پہلا باب جو لکھا نہ جا سکا)

دسمبر کی ایک سرد و سیاہ رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تابناک تاروں اور پورن ماشی چاند کے روشن چہرے کو سیاہ بادلوں کی نقاب نے پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ کبھی کبھی بجلی زور سے کڑکتی تو اس کی تیز چمک دھوم پور کے چھوٹے اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے مسافروں کے سردی اور خوف سے تنے ہوئے چہروں اور اکڑے ہوئے جسموں کو نمایاں کر دیتی اور پھر دم بھر میں وہ اسی تاریکی کا جزو بن جاتے۔ دور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکلتی ہوئی دھیمی روشنی کا دھندلا سا عکس البتہ کچھ مسافروں کے ہیولوں کو اجاگر کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی دھیمی کراہ، یا بیزار بڑبڑاہٹ اس خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔

زور کا ایک تڑاخا ہوا —— بجلی کی ایک کاٹتی ہوئی لہر نیلے لمبے پلیٹ فارم پر بیٹھے، لیٹے، کھڑے مسافروں کے طرح طرح کے چہروں کی بلائیں لیتی ہوئی نکل گئی اور ساتھ ہی بادل کی زور سے کڑک نے دلوں کو سہما دیا۔ اور کڑک کی آواز میں ملی ہوئی، ایک نسوانی چیخ فضا میں گونجی اور کئی مسافروں نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا...... سب سکڑ کر،

تعیو مریانہ

لیٹ کر، بیزار ہو کر، اونگھنے لگے......

ایک بڑے سے بکس پر بیٹھا ہوا کوئی مسافر کھڑا ہو گیا۔ دھیمی سی آواز میں اس نے کہا "خان صاحب۔ میں ذرا اُدھر جا کر دیکھوں کس کی چیخ تھی یہ....." اور قدم آگے بڑھ گئے۔

"بی بی جی —— میں بھی چلتا ہوں" دوسری بھاری آواز نے کہا اور ایک لمبا تڑنگا ہیولا زمین پر سے اٹھ کھڑا ہوا تو —— ایسا معلوم ہوا جیسے سارے پلیٹ فارم پر چھا گیا ہو...... اور آگے جانے والی کے پیچھے لپکا۔ خاموشی اور اندھیرے میں سبک قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ بھاری فوجی بوٹوں کی یہ چاپ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

بجلی پھر چمکی —— اور چند گز پرے زمین پر پڑی ایک گٹھڑی میں سے ایک دردناک کراہ کی آواز پھر سنائی دی "آ —— آ —— ہ ——" عورت لپک کر آگے بڑھی اور گٹھڑی پر جھک کر آہستہ سے بولی "کیوں جی —— تم کون ہو —— تمہیں کیا تکلیف ہے ——؟"

ایک دلدوز کراہ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

اس نے منہ سے چادر ہٹائی۔ دور کہیں بجلی کی چمک ہوئی اور اسی روشنی میں ایک نوجوان عورت کا

چہرہ جو کرب اور خوف سے بالکل سفید پڑا ہوا تھا۔ نظر آیا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ابل کر معلوم ہوتا تھا باہر نکل پڑیں گی۔ بس ایک لمحے کے لئے یہ شکل نمایاں ہوئی اور پھر تاریکی میں ڈوب گئی۔

وہ اکڑوں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "بہن۔ بہن ——کچھ تو بولو —— تمہیں کیا تکلیف ہے ——"

دوسری نے جواب دینا چاہا —— "میں —— میں —— آہ ——" مگر بات پوری نہ کر سکی اور ایک کرب کے عالم میں اس کا سارا جسم سکڑنے لگا۔ عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ ناچاہا مگر اس کی مٹھیاں اتنے زور سے بھنچی ہوئی تھیں جیسے ہسٹیریا کے شدید دورے میں ..... پتھر کی طرح ایک سخت ہاتھ اس کے نرم و نازک ہاتھ میں تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا "خاں صاحب —— یہ بیچاری شاید بے ہوش ہے۔ ذرا لپک کر جاؤ اور میرا کمبل و ٹارچ تو لے آؤ —— جلدی ——"

وہ دوڑا گیا۔ بجلی پھر کڑکی۔ اسٹیشن کی ٹین کی چھت پر اولوں کی ٹپ ٹپ۔ اس کے دل کی ٹک ٹک کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مریضہ کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں —— وہ بے ہوش نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"بہن —— ذرا سنبھلو —— مجھے بتاؤ تو تمہیں کیا تکلیف ہے —— کہیں درد ہے —— سردی لگ رہی ہے —— بخار ہے ؟"

"آہ۔ کیا بتاؤں —— اچھی بہن —— میرے —— میرے —— درد ہو رہا ہے۔"

"کہاں سینے میں"

"نہیں —— پیٹ میں —— آہ —— اوہ۔"

"کیا تم —— بالکل اکیلی ہو بہن —— ؟

کوئی ساتھ نہیں۔"

"نہیں —— میرا کوئی نہیں —— اس دنیا میں کوئی نہیں ——"

اور درد و کرب کی پھر ایک تیز لہر آئی۔ اس کے ہاتھ جو چند منٹ کے لئے نرم پڑ گئے تھے پھر اکڑنے لگے اور دوسری عورت کی انگلیاں اس کے ہاتھوں کی گرفت میں اس طرح آگئیں جیسے شکنجے میں کس جاتی ہیں —— خود اس کے منھ سے دھیمی سی آہ نکل گئی —— وہ حیران تھی —— یہ کیسا درد ہے —— کیسی تکلیف ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس کی انگلیاں مریضہ کی گرفت سے آزاد ہوئیں۔

اس نے دوبارہ پوچھا "بہن میں سمجھی نہیں —— کیسا درد ہے یہ —— کب سے ہے —— ؟" وہ جواب میں اس پر بالکل جھک گئی تھی۔ شرم، درد اور بے کسی میں ڈوبی ہوئی ایک آواز اس کے کان میں آئی ——

"درد —— آہ —— کیا بتاؤں ...... میں —— مجھے —— میں —— بدبخت —— آہ بہن —— مجھے درد —— درد —— لگے ہیں ——"

ایک منٹ کے لئے اس کا دماغ چکرا گیا ——

"درد لگے ہیں، درد لگے ہیں۔"

"کیا مطلب ؟" اور بجلی کی کڑک کے ساتھ اس کے دماغ میں ادراک کا ایک کوندا لپکا۔ اور ساری حقیقت اس کی سمجھ میں آگئی!

اسی وقت خاں صاحب ٹارچ اور کمبل لے کر پہنچ گیا۔

لپک کر اس نے کمبل لیا اور تڑپتی عورت کو چاروں طرف سے اس میں لپیٹ کر جھک کر اس سے بولی

"بہن —— گھبراؤ نہیں —— اللہ مالک ہے —— دیکھو میں ابھی کچھ انتظام کرتی ہوں۔"

وہ اپنے سامان کی طرف واپس پلٹی ـــــ چاروں طرف ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھا۔ اِکا دُکا آدمی اِدھر لیٹے یا بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ایک کونے میں اپنے پرانے سے بکس کا سہارا لئے میلے سے برقع میں ملفوف اس نے ایک عورت کو اونگھتے ہوئے دیکھا تو لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اس کا شانہ ہلایا" اے بہن ذرا سننا۔"

کھُرّے لہجے میں چونک کر جواب ملا "کیا ہے ری۔ کیوں مجھے سونے سے جگاوے ہے ـــــ واہ ـــــ"

"دیکھنا بہن ـــــ وہ اُدھر ـــــ اس کونے میں ـــــ ایک عورت بیچاری بیمار رہے ـــــ میں اس کے لئے کچھ انتظام کرنے جا رہی ہوں ـــــ اتنی دیر تم اس کے پاس جا بیٹھو بہن ـــــ" اس نے خوشامد کے ساتھ کہا۔

"رے واہ ـــــ میں نا جاؤں ـــــ جانے کون ہے کون نہیں ـــــ پھر ـــــ اللہ جانے کون بیماری ہو اُسے ـــــ"

اُس نے جھک کر کان میں کچھ کہا ـــــ عورت کے لہجے میں فوراً تبدیلی آ گئی "ہے ہے ـــــ توبہ توبہ ـــــ بیچاری ـــــ اس کے ساتھ تو کوئی ہوگا نا۔"

"کوئی بھی نہیں ـــــ اس کے ساتھ تو ـــــ اور ابھی بالکل نوعمر ہے ـــــ مشکل سے ۱۸ - ۱۹ برس کی ہوگی۔"

"ہنہ نہ - نہ ـــــ" اور برقعہ سنبھالتی عورت کھڑی ہو گئی "یہ تو بیٹا مزے سے سو رہا ہے ـــــ" اس نے موٹی دوسوتی میں لپٹے ایک دیہاتی مرد کی طرف عجب انداز سے دیکھا۔

"وہ اُدھر ـــــ اُس کونے میں چلی جاؤ ـــــ"

برقعہ والی سٹر پٹر سلیپر گھسیٹتی اس طرف روانہ ہو گئی۔

خاں صاحب پیچھے کھڑے غور سے اپنی مالکہ کو دیکھ رہے تھے۔ آخر یہ کرنا کیا چاہتی ہے ـــــ وہ چند لمحے ماتھے پر ہاتھ رکھے جیسے کچھ سوچتی رہی اور پھر پلٹی "چلو خاں صاحب۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں میرے ساتھ ـــــ"

"اسٹیشن ماسٹر بڑا کھراب دماگ آدمی ہے بی بی ـــــ وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ ہم دو بار جا کر خوشامد کیا ـــــ کہا ہماری بی بی جی سردی میں سکڑ رہا ہے ـــــ پر ـــــ سالا مانتا ہی نہیں ـــــ فس کلاس کا ٹکٹ مانگتا ہے۔"

اس نے خان کی بڑبڑاہٹ پر کوئی توجہ نہیں دی اور تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھی جس میں سے روشنی کی ہلکی سی لکیر اس انداز سے نکل رہی تھی جیسے کسی مایوس دل میں آشا کا مدھم سا دیپک ٹمٹما رہا ہو۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

پرانی وضع کی ایک لمبی سی آرام کرسی پر نوجوان اسٹیشن ماسٹر پڑا اونگھ رہا تھا اور برابر کی میز پر ایک اندھی لالٹین ٹمٹما رہی تھی! کسی عورت کی نرم، رسیلی، التجا آمیز آواز نے جیسے اس کے کانوں میں رس گھول دیا ہو ـــــ دل میں گدگدی ہونے لگی۔ اس وقت آدھی رات کو یہ کون ہے جو اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ جوش اور مسرت سے کانپتے لہجے میں اس نے کہا۔

"آیئے آیئے ـــــ ضرور آیئے ـــــ دروازہ کھلا ہے ـــــ"

دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر گھسا تو لالٹین کی لو خود بخود بھڑک اٹھی اور اس کی روشنی میں سفید ساڑھی میں ملبوس ایک نازک اندام دلکش صورت عورت کی جھلک اُسے ایسی لگی جیسے آسمان سے کوئی اپسرا اتر آئی ہو۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

"آؤ آؤ ـــــ اندر آجاؤ ـــــ وہاں کیوں کھڑی ہو ـــــ اس آرام کرسی پر لیٹ جاؤ!" لہجے میں اب گھٹیا اور سستا انداز تھا جسے سن کر کسی اور وقت شاید وہ اس کے منہ پر جوتا مارتی۔ مگر اس وقت تو اسے کسی بات کا بھی ہوش نہ تھا ـــــ وہ چند قدم آگے بڑھی!

"دیکھئے باہر سخت سردی اور ہوا ہے۔ بس مسافر پریشان ہو رہے ہیں۔"

"اجی تمہیں اور مسافروں سے کیا مطلب؟ تمہارے لئے یہ کمرہ حاضر ہے۔" اور عین اسی وقت اس کی نظر دروازے میں کھڑی ایک شکل پر پڑی۔ ماتھے پر بل آگئے۔ پھر آواز میں کاروباری کرختگی پیدا ہو گئی!

"کیا کام ہے تم لوگوں کو؟" اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو دو بار پہلے بھی اس سے آکر جھگڑ چکا ہے۔

خان نے کرخت لہجے میں کہا "بابو جی ذرا باہر نکل کر دیکھو کیسی سخت سردی پڑ رہی ہے۔ ہوا کلیجے کے پار ہوئی جاتی ہے۔ اور اب تو اولے بھی گرنے لگے ہیں ـــــ جلدی سے کمرہ کھلاؤ نہیں تو پھر ـــــ میں بھی پٹھان کا پوت ہوں ـــــ ہاں ـــــ"

"کیا بک بک لگائی ہے۔ آیا بڑا پٹھان کا پوت۔ ویٹنگ روم صرف فرسٹ کلاس پسنجر کے لئے ہے ہر ایرے غیرے کے لئے نہیں۔" وہ پھر اپنی آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

"سنیئے تو سہی۔ باہر ایک عورت ـــــ" عورت نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

"اجی میں کسی عورت وورت کو نہیں جانتا ـــــ قانون تو قانون ہی ہے۔"

عورت غصے میں دو قدم اور آگے بڑھ گئی "بابو صاحب قانون آدمی کے لئے بنتا ہے آدمی قانون کے لئے نہیں بنا ہے۔ میں اپنے لئے ویٹنگ روم کھلوانا نہیں چاہتی۔ بلکہ باہر ایک بیکس عورت سخت بیمار ہے ـــــ سردی اور ہوا میں وہ مر جائے گی اس کے لئے کمرے کی اشد ضرورت ہے۔"

"اس کا ٹکٹ . . . . ."

اس کا ٹکٹ غالباً تھرڈ کا ہے مگر اسے فوراً کسی گرم اور بند جگہ پہنچانا ہے۔"

"ہوں ـــــ پر میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں بھلا؟"

"بابو صاحب ـــــ وہ ـــــ وہ ـــــ عورت ـــــ اس کی حالت بہت خراب ہے ـــــ میرا مطلب ہے کہ . . . . . ."

"جی ہاں ـــــ میں آپ کا مطلب بالکل سمجھ گیا ـــــ وہ بیمار ہے اور مجھے اس کی تیمارداری کرنی چاہیئے ـــــ" لہجے میں سخت طنز تھا ـــــ "لیکن آپ بھولتی ہیں کہ میں سرکاری افسر ہوں کسی اسپتال کی نرس نہیں ـــــ میرا فرض صرف اپنی ڈیوٹی ادا کرنا ہے۔"

"آپ سمجھے نہیں"، اس نے اب بھی ہمت نہیں ہاری اور بڑی مشکل سے وہ الفاظ جو کسی طرح اس جبر اور بے غیرت مرد کے سامنے اس سے ادا نہیں ہو رہے تھے ـــــ اس نے کہہ ہی ڈالے۔

"آپ سمجھیئے تو ـــــ اس کے بچہ ہونے والا ہے ـــــ درد شروع ہو گئے ہیں۔"

"بابو صاحب" کے چوڑے دہانے پر ایک نفرت بھری طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی ـــــ "ہوں ـــــ بچہ ہونے والا ہے ـــــ درد شروع ہو گئے ہیں۔ معاف کیجئے یہ زچہ خانہ نہیں اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ ہے۔"

"اور تم انسان نہیں حیوان ہو۔ تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہے ـــــ"، غصے میں اس کی

آواز اتنی بلند ہوگئی کہ پلیٹ فارم پر اونگھتے کئی مسافر چونک پڑے۔

"بے حس آدمی ―― ایک بیکس عورت انسان کو جنم دینے کے لئے سرد زمین پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی ہے ―― ہر طرف غیر مرد ہیں ― اور تم یہاں کھڑے مجھ سے قانون بگھار رہے ہو ―― شرم نہیں آتی تمہیں؟"

بابو صاحب کا چہرہ اتنا سا نکل آیا۔ بیچارے نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی عورت کسی مرد کو اس طرح ڈانٹ بھی سکتی ہے۔

"کھولو ابھی ویٹنگ روم ―― ورنہ دو جانوں کا خون تم پر ہوگا اور تمہیں جیل پہنچانے کا فرض میں انجام دوں گی ――" اس کی آواز میں تحکم بھی تھا اور عزم بھی!

بابو کا چہرہ پہلے سرخ، پھر سفید اور پھر زرد پڑ گیا۔ ایک لفظ بولے بغیر اس نے میز کی دراز سے ایک موٹی سی زنگ خوردہ چابی نکال کر زور سے پھینکی جو خان کے قدموں میں جا کر گری اور اس نے جھک کر فوراً ہی اسے اٹھا لیا۔

وہ جاتے جاتے پلٹی "شکریہ ―― مگر آج کا واقعہ یاد رکھنا۔ بابو سے پہلے انسان بننا سیکھو۔"

ویٹنگ روم کا دروازہ کھلتے ہی گھٹن، سیلن اور بدبو کا ایک تیز بھبکا آیا کہ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "خان صاحب تم ذرا جلدی سے یہ میز صاف کردو اور ایک آدھ کھڑکی ذرا دیر کے لئے کھول دو۔ میں اس بیچاری لڑکی کو لاتی ہوں ――" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے چلی گئی اور خان صاحب نے لال لال آنکھوں سے بابو کو گھورتے ہوئے لالٹین اس کے ہاتھ سے لے لی اور کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ گرد آلود بڑی سی ایک بیضوی میز کمرہ کے بیشتر حصے کو گھیرے ہوئے تھی۔ چاروں طرف چند بید اور لکڑی کی پرانی وضع کی کرسیاں اور بینچیں پڑی تھیں۔

دو تین منٹ بعد دونوں عورتیں مریضہ کو سنبھالے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ بڑی شدید تکلیف کے ساتھ گھسٹتی ہوئی آرہی تھی جیسے اس کی ٹانگوں میں بالکل ہی دم نہ ہو۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں بھی اس کا ہوش رُبا حسن نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہا۔ بابو منھ کھولے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہا تھا کہ ایک تیز آواز اس کے کان میں برمے کی طرح چبھی "یہاں کیوں کھڑے ہو ―― باہر جاؤ ――"

وہ اس تیزی سے باہر کی طرف بھاگا کہ بند دروازے سے زور سے سر ٹکرایا۔ ابھی اس کی جھنجلاہٹ اور کھسیاہٹ سے پنپنے بھی نہ پایا تھا کہ اس "مرد مار" عورت کی آواز پھر آئی "خان صاحب ―― بابو صاحب کے کوارٹر میں گرم پانی کرنے کے لئے انگیٹھی اور کیتلی وغیرہ اور ایک تیز چاقو لے آؤ ―― سب کے دام ادا کردیئے جائیں گے۔ اور ہاں ―― بابو صاحب سے کہو کسی کو بھیج کر قصبے میں جو بھی ڈاکٹر یا ڈاکٹرنی ہو اُسے فوراً بلائیں ―― جتنی فیس مانگیں گے ادا کردی جائے گی۔ اور ہاں میرا بستر اور بکس یہاں دے جاؤ ――"

لالٹین اندر رہ گئی، دروازہ بند ہوگیا اور وہ بھیگی بلّی بنا خان کے ساتھ اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

اس نے کوٹ اتار کر کرسی پر پھینک دیا اور برقعہ پوش بڑھیا سے بولی "ہاں جی ―― تم بھی اپنا برقعہ اتار ڈالو ―― اور مجھے ذرا سہارا دو تو میں ان کو میز پر لٹا دوں ――"

بڑی مشکل سے تڑپتی ہوئی حسینہ کو دونوں نے میز پر لٹا دیا اور چاروں طرف سے اُسے کمبل سے ڈھک دیا۔

اُسی وقت خان سامان لے آیا تو اس نے کہا۔
"خان صاحب خدا کے لئے جلدی ڈاکٹر کو بلاؤ ——
اگر کوئی مل جائے تو ——"
"بہت خوب سرکار ——" اور بھاری
قدم دور جاتے ہوئے سنائی دیئے۔
ارے بھئی ڈاکٹر موا کیا کرے گا آکر —— یہ
عورتوں کی پردے کی باتیں ہیں —— اللہ نہ کرے کہ
شریف زادیاں ایسے وقت مردوں کے ہاتھ پڑیں۔
مردموا تو ایسے وقت اگر دیکھ لے تو یہ سمجھو کہ بس
. . . . ." اس نے بڑی بی کی بات پوری ہونے سے
پہلے ہی انھیں روک دیا —— "ماں جی باتوں کا
وقت نہیں —— دیکھو —— دیکھو ——
اسے کیا ہوا جا رہا ہے ——"
مریضہ نے پوری قوت سے ایک ہاتھ میں اس
کی کلائی بھینچ رکھی تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے بیڈ کے
کنارے کو توڑے ڈال رہی تھی۔ چہرے کا نیچے کا
حصہ سوج کر گول غبارہ بن گیا تھا، بتیسی ایک دوسرے
کے اوپر اتنے زور سے بیٹھ گئی تھی جیسے سارا جبڑا
اب ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، سیاہ آنکھیں ابلتے
ابلتے بالکل ہی باہر نکل پڑی تھیں، ماتھے اور گالوں
پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے یوں چمک رہے
تھے جیسے برگِ گل پر شبنم کے قطرے کانپ رہے
ہوں —— ایک گھٹی ہوئی سی آواز اس کے
گلے سے نکل رہی تھی —— ایسی آواز جو اس نے
اس سے پہلے کسی اتنے بڑے انسان کے منہ سے
نہ سنی تھی —— خود اس کا اپنا چہرہ بالکل سفید
پڑ گیا تھا اور ساری جان سے کھڑی کانپ رہی
تھی!
"ارے بیٹی گھبراوے کیوں ہے —— بس
اب وقت بالکل قریب ہے نا —— تو پیٹ پکڑلے۔
میں بچے کو سنبھال لوں گی۔" بڑھیا نے بڑے
اطمینان سے اپنے موٹے کھردرے ہاتھوں کو
اوپر نچایا جن میں لاتعداد چاندی کے چھلّے اور انگوٹھیاں
اور کلائیوں میں چوڑیاں، جہاں گھیریاں وغیرہ
چمک رہی تھیں اور سب پر میل کی موٹی تہہ جمی
ہوئی تھی۔
اس نے گھبرا کر دو تین بار ان کے ہاتھوں کی
طرف دیکھا —— پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھا ——
"نہ نہ نہ —— ماں جی —— تم ٹارچ دکھاؤ۔
بچہ میں سنبھالوں گی ——" اور یہ کہتے کہتے
اس نے اپنی کلائی بڑی مشکل سے زچہ کی گرفت
سے چھڑائی —— دو انگوٹھیاں انگلیوں سے
اتار کر بڑھیا کے ہاتھ میں دیں اور پھرتی سے
غسل خانہ میں جا کر ہاتھ دھونے لگی —— پانی سرد،
باسی اور خدا جانے کب کا بھرا ہوا تھا —— مگر یہ
سب سوچنے کا وقت کہاں تھا —— منٹ بھر بعد
وہ زچہ کی پائینتی کھڑی تھی اور بڑھیا اس کی انگوٹھیاں
اپنی موٹی انگلیوں میں پھنسائے ٹارچ کو بچوں کی طرح
جلا اور بجھا رہی تھی۔
ایک درد و محبت میں ڈوبی ہوئی نحیف آواز
جس کا سریلا پن کرب ناک اذیت نے لوٹ لیا تھا
اس کے کان میں آئی —— "آہ —— اوہ
—— اف —— میری بہن —— تم ——
تم —— اسی دنیا کی رہنے والی ہو —— نہیں
—— نہیں تم تو جنت کی حور ہو —— فرشتہ
ہو —— میری مصیبت پر رحم کھا کر خدا نے
تمہیں —— آہ —— اوہ —— اُف ——"
اور پھر وہی درد کا ریلا —— وہی چہرہ کا خوفناک
پوز —— وہی مٹھیوں کی زبردست گرفت اور
گھٹی ہوئی عجیب و غریب آواز —— اور اگلے لمحے

اس کے ہاتھوں پہ ایک نرم سی، لجلجی سی، چھوٹی سی چیز پھسل کر آن پڑی اور ماں کی بھیانک چیخوں کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ بچے نے گلا پھاڑ پھاڑ کر بین الاقوامی زبان میں دنیا کو مخاطب کرنا شروع کیا وہ اعلان کر رہا تھا "خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا[1]"

رات کا اندھیرا چھٹ چکا۔ گھٹا برس کر کھل گئی اور ہوا کی تیزی اور خنکی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ہلکے دودھیا آسمان پہ بادلوں کے اِکّا دُکّا ٹکڑے سفید بادبانی کشتیوں کی طرح اِدھر اُدھر تیرتے نظر آ رہے ہیں۔

مشرق کی سمت افق پر آفتاب کا گول تارنجی چہرہ جھانک رہا ہے۔

دھرم پور اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں لالٹین آخری بار جھلملا کر بجھ چکی ہے۔ ایک پراسرار خاموشی اور دھند کمرے میں چھائی ہوئی ہے۔ میز پہ زچہ کمبل میں لپٹی بے حس و حرکت لیٹی ہے۔ میز کی داہنی طرف اس کی تیماردار دوست اس پر جھکی ہوئی کھڑی ہے۔ چہرے پر تکان، بے خوابی اور پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں ـــــ بائیں جانب ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر مریضہ کے دل کا معائنہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر اور تیماردار دونوں کے سر اتنے قریب ہیں کہ سیاہ بال سفید بالوں سے سرگوشی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ آلے کو احتیاط سے تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ عین اس وقت روشندان سے سورج کی پہلی کرن کمرے میں داخل ہوئی۔ اب ڈاکٹر تیماردار اور مریض کے چہروں کو دیکھ سکتا تھا۔

مریضہ اس حالت میں بھی حسن کا ایک کامل نمونہ تھی۔ ہاتھی دانت کا سا بے داغ رنگ، وینس کا سا متناسب جسم، ہرنی کی سی سیاہ حسین آنکھیں! لمبے سیاہ بال جو بے ترتیبی سے میز پہ ماتھے پر اور سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ موت کا سایہ بھی جو اس کے ہر طرف ناچ رہا تھا، اس خداداد حُسن کو کم نہ کر سکا تھا۔

چند لمحے کے لئے تیماردار اور ڈاکٹر دونوں بنتے ہوئے پورن ماشی چاند کے اس حُسن سے مبہوت ہو کر رہ گئے ـــــ نظر اٹھا کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تیماردار کا گندمی رنگ رات بھر کی مشقت اور پریشانی نے زرد کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تیز و ذہین آنکھوں کی چمک میں شب بیداری کی سرخی بھی شامل ہو گئی تھی اور پتلے پتلے گلابی خم دار ہونٹوں پر ایک تھکی ہوئی سی مسکراہٹ چغلی کھا رہی تھی کہ یہ محض عادتاً ان ہونٹوں پر کھیل رہی ہے ..... مریضہ پہ جھکی وہ بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی نازک سی شاخِ گل لچک کھا کر جھک آئی ہو۔

ڈاکٹر کے سخت بے رنگ چہرے پر ان دونوں چہروں کو دیکھتے دیکھتے ایک نرمی، گھلاوٹ اور شفقت کا ہلکا ہلکا رنگ ابھرنے لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "بی بی۔ تم نے رات بھر سخت محنت کی ہے ـــ ذرا دیر بیٹھ کر آرام کر لو۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب ـــــ جب تک ان کو ہوش نہ آ جائے ـــــ ڈاکٹر صاحب۔ کیا ہوش

---

[1] ٹیگور کا ایک قول "ہر نوزائیدہ بچہ دنیا میں یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا ـــــ"

آجائے گا ـــــ بچ جائے گی یہ بیچاری ـــ اس کی آواز میں سخت بے قراری تھی۔

ڈاکٹر کے چہرے پر مایوسی کا رنگ صاف جھلک رہا تھا۔

"خدا میں سب قدرت ہے بیٹی ـــ اس نے پیشہ ورانہ امید برداری کے انداز میں جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب ـــ کیا ـــ کیا میری ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے تو ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ـــ" آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

"نہیں نہیں ـــ تم نے تو بڑے سلیقے اور سمجھداری سے یہ کیس کیا۔ ورنہ بچے کا بچنا محال تھا۔ ایسی حالت تھی ماں کی ـــ دونوں جانوں کا مزار ہو جاتا ـــ خدانخواستہ ـــ معلوم ہوتا ہے تمہیں اس کا اچھا تجربہ ہے ـــ"

"نہیں ـــ ڈاکٹر ـــ میں نے تو آج سے پہلے کبھی بھی اس قسم کا کیس دیکھا تک نہ تھا۔"

"تعجب ہے ـــ بہرحال تمہاری کامن سنس نے کام دیا۔ تمہیں غالباً اپنا تجربہ ہوگا ـــ کتنے بچے ہیں تمہارے ـــ ؟" ڈاکٹر کو خواہ مخواہ مریض سے زیادہ تیماردار سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

"میں ـــ میرے ـــ جی ـــ میرے تو کوئی بچہ نہیں ـــ" شرم، جھجک اور مایوسی کی کپکپاہٹ آواز میں صاف محسوس ہو جاتی تھی۔

"آہ ـــ اوہ ـــ ارے ـــ میرا دم ـــ میرا دم گھٹا۔ آہ ـــ میں ـــ میں کہاں" ایک کراہ کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چند لفظ مریضہ کے منہ سے نکلے اور دونوں اس پر جھک گئے۔

"گھبراؤ نہیں تم اسپتال میں ہو بیٹی ـــ" ڈاکٹر نے مریضہ کو تسلی دینی چاہی۔

"تو ـــ پھر ـــ میرا بچہ ـــ"

"ہاں ـــ تمہارے بچہ ہوا ہے۔"

"زندہ ؟" بڑی مشکل سے۔ جیسے وہ یہ لفظ ادا کر سکی . . . . . .

"ہاں ہاں زندہ ہے۔ اور وہ لپک کر کمرے کے آخری سرے کی طرف گئی جہاں ایک بید کے بنچ پر اس کی رضائی میں لپٹا ہوا بچہ پڑا تھا۔ اور بڑھیا اس بنچ کے پائے پر سر ٹکائے سو رہی تھی۔ اس نے آہستہ۔ بہت آہستہ سے بچے کو سنبھال کر ہاتھوں پر اٹھایا اور اس انداز سے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ جیسے کوئی معصوم بچہ شیشے کے کسی نازک سے برتن کو لے کر چلتا ہے ـــ دھیرے سے اس نے بچے کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔ ماں کے بے رنگ چہرے پر مسرت کا ایک ہلکا سا رنگ آیا اور گزر گیا ـــ بے اختیاری میں ایک ہاتھ ذرا سا اٹھا اور گر گیا ـــ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری اور ڈوب گئی۔ آنکھوں میں چمک آئی اور آنسو بن کر ڈھلک گئی۔

اس نے بچے کا منہ کھول دیا اور انھیں ایسا لگا کہ ماں کی آنکھوں میں جیسے اس کی ساری روح کھنچ آئی ہو! وہ جس اشتیاق، جس مامتا، جس محبت سے اس ننھی سی گلگلی، جھریوں بھری سرخ سرخ چیز کو دیکھ رہی تھی اسے دیکھ کر تیماردار شدتِ جذبات سے کانپ رہی تھی ـــ آہ ـــ مامتا کی یہ انمول دولت!! اس کی آنکھوں میں آنسوؤں نے سچے موتیوں کی چمک پیدا کر دی تھی۔

ماں چند لمحے بچے پر پیار سے اپنا زرد ہاتھ پھیرتی رہی "لڑکا ہے نا؟"

"نہیں لڑکی ہے۔ بہن۔"

"آہ ـــ لڑکی ہے ـــ بدنصیب ماں کی ـــ بدنصیب بیٹی ـــ کاش تو زندہ نہ ہوتی۔ لڑکی نہ ہوتی ـــ آہ ـــ"

"نہیں نہیں کیسی باتیں کرتی ہو۔"

ماں خالی خالی نظروں سے کبھی تیماردار کو کبھی بچی کو دیکھتی رہی ــــ اور پھر ــــ بڑی صاف سُریلی آواز میں جو کسی طرح ایسی کمزور بدحال مریض کی آواز نہ لگتی تھی بولی "میری بچی ــــ اچھا ہو اگر تو خوبصورت نہیں۔ اپنی ماں کے سے حسن کی لعنت تیرے حصے میں نہیں آئی۔ شاید اس کی سی بدقسمتی سے بھی تو بچ جائے ــــ شاید درندے ــ حیوان ــ شیطان مرد ــــ تجھے نہ بھنبھوڑیں۔ شاید تیری بدصورتی تیری محافظ بن جائے آہ ــــ میری بچی ــــ"

وہ دونوں حیران پریشان کھڑے اس کی باتیں سن رہے تھے!

یہ ہذیان ہے یا ہوش و خرد کے نکتے؟ اس کا چہرہ اب اور بھی زیادہ زرد ہو چکا تھا جیسے ہلدی کی پوری گرہ پیس کر مل دی گئی ہو اور شفاف ماتھے پر سیاہی آچکی تھی۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور مایوسی کے ساتھ گردن ہلائی اور جھک کر آہستہ سے بولا۔

"بیٹی۔ تم اپنا نام۔ بچی کے باپ کا نام۔ اس کا کچھ اتا پتہ۔ خاندان کا حال نہ بتاؤ گی ــ؟

آہ۔ اس کے سب ہیں۔ اور پھر۔ کوئی نہیں ہے۔ سب.... سب اس کی جان کے دشمن ہیں ــ آہ ــ اس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں ــــ کوئی نہیں"

جانے وہ اور کیا کہہ رہی تھی۔ مگر اب کچھ سنائی نہ دیتا تھا صرف ہونٹوں میں ہلکی ہلکی حرکت دیکھی جا سکتی تھی!

اس نے اپنا نحیف ہاتھ گریبان کے اندر ڈالا اور ایک چمڑے کا پتلا سا بٹوا نکال کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر جیسے بہت کوشش سے اس نے اپنا سر تیماردار کی طرف موڑا ــــ "آہ بہن ــــ تم تم کتنی اچھی ہو۔ میری ــــ بچے ــ بچی ــــ یہ ــــ بچے ــ بچی؟" الفاظ سے زیادہ اس کی بجھتی ہوئی مدھم نظروں نے اپنا مطلب ادا کیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ جلدی سے بچی کو اٹھا کر اس نے اپنی چھاتی سے لگا لیا اور سسکتی ہوئی بولی۔

"بہن ــــ تمہاری بچی میری بچی ہے ــــ میری جان ــــ"

ماں کے کمان جیسے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ کھل اٹھی جیسے کسی سوکھی شاخ پر اچانک کوئی ننھی سی کلی مسکرا پڑے ــ اس کی نظریں ڈاکٹر کی طرف مڑیں۔ ڈاکٹر ــــ یہ ــــ بچی ــــ اس کا حق۔"

مگر پھر کوئی آواز نہ نکلی ــــ ہتھیلیاں پھر گئیں۔ گردن ڈھلک گئی۔ ہاتھ میز سے نیچے لٹک گیا۔

میز پر ایک بے جان موم کی عورت کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

عین اسی وقت بچی نے پوری قوت سے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔

●

اندرا گاندھی

زاہدہ زیدی

کبھی دہکتا ہوا سرخ لالہ زار تھی وہ
کبھی تڑپتا ہوا تند آبشار تھی وہ

کبھی گھٹاؤں کی مانند مست و آوارہ
کبھی چٹانوں کی مانند بردبار تھی وہ

ہمالیہ کی وہ بیٹی، وہ دختر کہسار
بلند ہمت و بیباک و پروقار تھی وہ

یقین، عزم، عمل، فکر اور بالآخر
فرازِ کوہ پہ بکھرا ہوا غبار تھی وہ

بدن کی خاک نے چومی ہمالیہ کی جبیں
کہ بعد مرگ بھی کتنی وفا شعار تھی وہ

وہ اس کا رنگ طبیعت، وہ اس کا ذوقِ جمال
گماں گزرتا تھا اک پارۂ بہار تھی وہ

وہ تازگی، وہ حلاوت، وہ دلکشی، وہ ادا
خدا گواہ ہے فطرت کا شاہکار تھی وہ

وہ اس کی محفل یاراں میں تند گفتاری
بہ کارزار سیاست میں شعلہ بار تھی وہ

جب اس نے تھام لیا امن و صلح کا پرچم
تو سب نے مان لیا وقت کی پکار تھی وہ

یہ کیا عجب ہے کہ ہر موئے تن ہوا مجروح
کہ رہ نورد رہ دشتِ خاردار تھی وہ

تڑپ کے موت کے دامن میں جب ہوئی روپوش
خود اپنے جذبۂ پنہاں سے آشکار تھی وہ

چمن کھلاتی چلیں سرخ خون کی بوندیں
شہید ہو کے بھی افسانۂ بہار تھی وہ

ہر ایک چشم اب اس کے الم میں پرنم ہے
کہ ملک و قوم کی مونس تھی، غمگسار تھی وہ

ہمیں یہ غم ہے وطن اس سے ہو گیا محروم
ہمیں یہ فخر بھی ہے فخرِ روزگار تھی وہ

ڈاکٹر مظفر حنفی

ظریفانہ شاعری آزاد ہندوستان میں

آزادی سے قبل اردو کی ظریفانہ شاعری میں جعفر زٹلی سے احمق پھپھوندوی تک جو کہکشاں پھیلتی چلی گئی ہے اس میں سودا اور اکبر الہ آبادی جیسے کئی تابندہ ستارے بھی موجود ہیں اور انشا سے اقبال تک ایسے اہم شاعر بھی، جن کی شاعری کا اصل مزاج تو ظریفانہ نہیں تھا لیکن حسبِ ضرورت انھوں نے بھی طنز و مزاح کے حربوں سے کام لینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ کم و بیش تین سو برس پہلے جعفر زٹلی نے "بہوت بڑا ہوا نامہ" اور "کچھوا نامہ" جیسی مشہور مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں لکھ کر اردو میں ظریفانہ شاعری کا آغاز کیا اور اپنے فن کو کلیتاً اسی رنگ سے آراستہ کیا ویسے محققین چاہیں تو اس دور کو کھینچ تان کر امیر خسرو کے زمانے تک طول دے سکتے ہیں جن کے یہاں چوسانی کی شان میں مزاحیہ اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ تقسیمِ ہند سے پیشتر اردو کی ظریفانہ شاعری کی روایت کا ہلکا سا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔ جعفر زٹلی نے ایسا کیا

کہ مکھی کو مل مل کے بھنیسا کیا

سودا فرماتے ہیں۔

جس نے سجدہ کیا نہ آدم کو
شیخ کا پوجتا ہے بایاں پاؤں

انشا کا دعویٰ ہے۔

کُودا ترے کوٹھے پہ کوئی دھم سے نہ ہوگا
جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہو گا

اکبر کے مشہور زمانہ اشعار ہیں۔

ہم ایسی سب کتابیں لائقِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اور ——

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

نیز اقبال جیسے فلسفہ طراز شاعر کے یہاں اس قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

— — — — — — — —

اس ضمن میں احمق پھپھوندوی کا شعر بھی سُن لیجیے۔

ایسے وعدے سے تو اچھا تھا کہیں انکارِ وصل
دو مہینے ہو گئے ظالم کو ٹرخاتے ہوئے

بیسویں صدی کے نصف اوّل کو ہم اردو کی ظریفانہ شاعری کا عہدِ زرّیں کہہ سکتے ہیں۔ اس دور تک پہنچتے پہنچتے اکبر الہ آبادی نے طنز و مزاح کے وسیلے سے سیاسی شعور کو عام کر دیا تھا اور ملک میں حصولِ آزادی کے لئے عوامی جدّ و جہد میں تیزی آ چکی تھی۔ چنانچہ اعلیٰ اور بامقصد ظریفانہ شاعری کے لئے فضا بے حد سازگار تھی۔ اخباروں اور رسالوں میں "اودھ پنچ" کی روش پر طنزیہ اور مزاحیہ کالموں کے توسط سے ظریفانہ شاعری کو نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اور ظریف شاعر زہر خند اور قہقہوں کے تیر و تلوار سے آراستہ ہو کر جنگ آزادی میں برابر کے شریک تھے۔ اس دور میں عوام کی خستہ حالت کے دلچسپ مرقعے، ہندستانیوں کی بے حسی پر طنز کے عمدہ نمونے اور برطانوی استبداد کے خلاف استہزائیہ اشعار بکثرت مل جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں طنز و مزاح نگار شعراء کی طویل فہرست میں ظفر علی خاں، محمد دین فوقؔ، ظریفؔ لکھنوی، چراغ حسن حسرتؔ، مجیدؔ لاہوری، حسین میر کاشمیری، خضرؔ تمیمی، عاشق محمد غوری، اکبر لاہوری، نازشؔ رضوی، ہری چند اخترؔ، سید محمد جعفری، ظریف جبل پوری، فرقت کاکوروی، ضمیر جعفری اور راجہ مہدی علی خاں کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی جوشؔ ملسیانی، جوشؔ ملیح آبادی، اور شادؔ عارفی جیسے بلند قامت سنجیدہ شاعروں نے بھی خالص طنز کے شاہکار ادب پارے اسی دور میں تخلیق کئے۔ بحیثیت مجموعی ظریفانہ شاعری میں اس عہد کو نظموں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ظریف لکھنوی کی "میونسپل الکشن"، اور "مشاعرہ"، چراغ حسن حسرتؔ کی "اتحاد پارٹی" اور "چنا جور گرم"، مجیدؔ لاہوری کی "منکہ ایک منسٹر ہوں" اور "گداگری"، حسین میر کاشمیری کی "لیڈر کی فریاد" اور "انقلابِ آسماں"، خضرؔ تمیمی کی "ہاتھ کی روانی"، اور "کمال کا سماں"، عاشق محمد غوری کی "سلمیٰ" اور "گتا"، اکبرؔ لاہوری کی "اپنا اپنا قاتل"، سید محمد جعفری کی "وزیروں کی نماز"، "بھنگیوں کی ہڑتال"، اور "کلرک نامہ" ظریفؔ جبلپوری کی "لکھنؤ کا شاعر" ضمیر جعفری کی "دیارِ ملٹری" ... "وبا مے الاٹمنٹ"، فرقت کاکوروی کی "بنگال کی رزمیہ" راجہ مہدی علی خاں کی "ایک جہلم پر" اور "اس سے اور اس سے" وغیرہ منظومات کو ظریفانہ شاعری کے ہر اچھے انتخاب میں جگہ دی جائے گی۔ سنجیدہ شعراء میں سے بطور خاص جوشؔ ملیح آبادی کی "مہاجن" اور "جشنِ آزادی" اور شادؔ عارفی کی "ساس بہو"، اور "اونچے اونچے محلوں میں" طنزیہ ادب کی شاہکار تخلیقات تصور کی جاتی ہیں۔ اس دور کی ظریفانہ غزلوں کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے۔

خدا ہی آبرو رکھے تو رکھے فوقؔ اس گھر کی
میاں ہو جس کا جاہل اور ہو اخبار خواں بی بی
(فوقؔ)

پرتگال کا میں دلدادہ نہیں اے ساقی
انڈیا میڈ اگر ہے تو دکھا کون سی ہے
(جوشؔ ملسیانی)

زمانے کو توپیں بھی دیں، مال و زر بھی
ہمیں تو نے ٹرخا دیا دینے والے
(ہری چند اخترؔ)

وہ دل میں گھس رہے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں
کہ سنگاپور میں جاپان داخل ہوتا ہے
(ظریفؔ جبل پوری)

اس دور کے بیشتر شاعر آزادیٔ ہند کے بعد بھی اپنے تخلیقی شعر کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے اور سرحد کے دونوں جانب ظریفانہ شاعری میں انھیں کا ڈنکا بجتا رہا۔ آگے چل کر اس قافلے میں یوں تو درجنوں ظریف شعراء کا اضافہ ہوا لیکن ادبی وقار ہندوستان میں رضا نقوی واہیؔ اور پاکستان میں انجمؔ رومانی کو حاصل ہو سکا ۱۹۴۷ء کے بعد کے تیسرے اہم ظریف شاعر دلاور فگارؔ ہیں جو بعد ازاں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر گئے۔

ان نظموں میں واہی کا ادبی قد سب سے بلند ہے۔ موصوف کی ظریفانہ نظموں میں طنز کی گہری سیاسی اور سماجی معنویت بنیادی حیثیت رکھتی ہے خصوصاً "ریل کا سفر" "نقاد" "شعرستان"، اور ان فنکاروں کے نام منظوم خطوط نے واہی کو ظریفانہ شاعری کے دربار میں بقائے دوام عطا کی ہے۔ اسی طرح انجم رومانی کی پیروڈی دیجیٹ کی گرم ٹین شاد باد۔ پاک سرزمین شاد باد) اور دلاور فگار کی نظمیں "آداب عرض ہے"، "شہر مسئلہ"، اور "آج کی تازہ خبر"، کو بھی طنز و مزاح کے شعری سرمائے میں اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد کی مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو اس افسوس ناک حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مشاعروں میں مزاحیہ شاعروں کی بے پناہ مقبولیت نے ظریفانہ شاعری میں ابتذال، رکاکت اور سطحیت کو بہت عام کر دیا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ظریف شاعر ایک بار پھر جعفر زٹلی کی راہ پر گامزن ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں درجہ اوّل کے ادب پارے بہت کم منظرِ عام پر آتے ہیں۔ مسرور ڈانڈا اور سلیمان خطیب مرحوم نے دکنی لہجے کے استعمال سے مزاح کی پھلجھڑیاں روشن کیں اور ان کے بعد کے ظریف شعراء میں بید مرطک اندر دی، طاہرہ بیگم مخفی، ہلال سیوہاروی، استاد رام پوری، شجنی لکھنوی، یوسف پاپا، گرگٹ گورکھپوری، دلکش کھنڈوی، بے باک بھوجپوری، ہلال رامپوری، آفتاب لکھنوی، پاگل عادل آبادی، اسرار جامعی، ناظر خیامی، فیاض افسوس، ماچس لکھنوی، مسطر دہلوی، ساغر خیامی، ساحر ادیبی، ناظم انصاری، بوگس جیدر آبادی، مفلس فاروقی اور نظر برنی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ مجھ خاکسار کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا ایک مجموعہ بھی کتابی صورت میں "عکس ریز"، کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ادب میں احکامات اور ہدایات جاری کرنے کی روش کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھی گئی۔ البتہ عہدِ حاضر کے ظریف شاعروں سے بصد ادب یہ درخواست کی جا سکتی ہے کہ مشاعرے کے علاوہ اگر وہ ادب کی لافانی دنیا میں بھی اپنا مقام محفوظ کرنا چاہتے ہیں تو اپنے ظریفانہ اشعار میں اعلیٰ اقدار اور فنی معیارات کو بھی ملحوظ رکھیں کہ اس طرح ظریفانہ شاعری کی عاقبت بھی سدھر جائے گی اور ان کی بھی●

ڈاکٹر جاوید وشِشٹ

غزل

نکہتِ گل کی طرح رنگ بکھر جائیں گے؟
میلہ بچھڑے گا تو یہ لوگ کدھر جائیں گے

وقت ہے اوڑھے ہوئے زخموں کی رنگیں چادر
اُس کے ہمراہ نہ کیوں شمس و قمر جائیں گے

آگ میں جیسے سمندر ہوں ترے دیوانے
وادیِ درد سے نکلیں گے تو مر جائیں گے

شہرِ خوباں سے لئے درد کی سوغاتِ حسیں
اہلِ دل، اہلِ وفا، اہلِ نظر جائیں گے

تم ذرا سامنے آجاؤ! اِن آئینوں کے
پر تَوِ رُخ سے یہ آئینے نکھر جائیں گے

سازِ خوشبو کا لئے نرم ہوا کے جھونکے
گنگناتے ہوئے کانٹوں سے گزر جائیں گے

یہ غزل جا کے سُنائیں گے اُنہی کو جاوید
اُن کی محفل میں اگر بارِ دگر جائیں گے

کرتار سنگھ دُگل

شبنم، شمع، ہُما، حُسنہ۔ ایک کے بعد ایک چار لڑکیاں نواب صاحب کے یہاں ہوئیں۔ ان کی بیگم نے ایک بیٹے کی تلاش میں چار بیٹیاں اُوپر تلے پیدا کیں۔ اور پھر نواب صاحب نے صبر شکر کر لیا۔ یہ جُوا اب وہ اور نہیں کھیلیں گے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ زندگی میں ہار لکھی ہوئی تھی۔ اُدھر نوابی والی بات سرکار نے کوئی نہیں رہنے دی تھی اور اِدھر چار بیٹیاں ہو گئی تھیں۔ ان چاروں میں سے ہی کسی کو وہ بیٹا، کہہ کر پکار لیتے کسی کو بچّو کہہ کر بُلا لیتے۔ نواب صاحب نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔

اور پھر لڑکیاں جوان ہوئیں، جوان جیسے چار سرو کسی کے آنگن میں لگے ہوں۔ اونچی، لانبی، گوری چٹی، ہاتھ لگانے سے جیسے میلی ہوتیں۔ ان کی ماں بیٹیوں کو ڈھنک کر چھپا چھپا کر نہ رکھ سکتی۔ ہنستیں، کھیلتیں، گاتیں بجتیں جیسے آکاش سے اُتری پریاں ہوں۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین، ایک سے ایک بڑھ کر نازک، ایک سے ایک بڑھ کر اونچی — سرکار جاگیر چھین سکتی تھی لیکن نواب صاحب کی بیٹیوں سے اُن کا رنگ روپ تو چھین نہیں سکتی تھی۔ اور پھر نواب صاحب کو لڑکیوں کے لئے بر ڈھونڈنے کی فکر ستانے لگی۔ بیگم لڑکیوں کے لئے رشتے تلاش کرتی رہتیں۔ لڑکیاں چار تھیں اور لڑکا آگے پیچھے رشتہ داروں میں صرف ایک ہی تھا۔

فرید لڑکیوں کا چچا زاد بھائی تھا۔ خوبصورت، سجیلا جوان۔ کھیلنے میں سب سے پیش پیش، پڑھنے میں سب سے آگے سلیقہ شعار، شیریں زبان۔ اپنی چچی، لڑکیوں کی ماں پر جان چھڑکتا تھا۔ فرید بیگم کو چچی تھوڑا ہی پکارتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی اسے امّی کہہ کر بلاتا تھا۔ یہ بات تو شروع سے ہی پکّی تھی کہ فرید اس گھر میں سہرا باندھ کر آئے گا۔ اُدھر اس کی مسیں بھیگیں اِدھر اُس کا اس گھر میں پردہ ہو گیا۔

پردہ تھا تو کیا، فرید اپنی چچی سے ملنے آتا تھا۔ چچا، چچی اور حُسنہ کو۔ حُسنہ ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی تو تھی لیکن سب سے چھوٹی ہونے کے باعث وہ کسی کو بڑی نہیں لگتی تھی۔ اور اس سے بڑی ہُما کہتی "فرید بھائی جان سے پردہ کرے تو شبنم باجی کرے۔ ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے۔" اور اگر سیڑھیاں اُترتے چڑھتے زنان خانے میں آتے جاتے کبھی اس کی ملاقات فرید بھائی سے ہو جاتی تو آنکھیں نیچی کئے شرمانے کے بجائے وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ ہنستی جاتی اور ٹکر ٹکر فرید

کی طرف دیکھتی جاتی ۔ فرید نے ہُما کا نام پگلی رکھا ہوا تھا۔
ہُما پگلی تھی، حسنہ دیوانی تھی۔

"اور بھائی جان شبنم باجی ؟" حسنہ فرید کو
چھیڑتی۔

اور وہ چپ ہو جاتا۔

شمع سُنتی اور اسے چاروں کپڑے آگ لگ
جاتی۔ فرید سے کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ شمع کے بارے
میں اس کی کیا رائے تھی۔ شمع تو کسی شمار میں ہی نہیں تھی۔
اور سچ بھی یہ تھا کہ فرید کی شادی شبنم سے ہی ہونا تھی۔
شبنم سب سے بڑی تھی۔ پہلا حق اس کا تھا۔ ہاں یہ بات
اور تھی کہ کوئی ایسا ور مل جائے جسے صرف شبنم ہی پسند
ہو، یا لڑکے کی عمر زیادہ ہو سب سے بڑی بہن کا اس
سے بیاہا جانا مناسب ہو۔ اس حالت میں، صرف فرید اور
شمع کی شادی ہوسکتی تھی۔ فرید تو گھر کا لڑکا تھا۔ اسے
تو کسی ایک کے ساتھ بیاہا جاسکتا تھا۔ اسے تو بس
ایک فکر اپنے چچا چچی کی کم کرنا تھا۔

اور شمع سوچتی کاش کوئی اور لڑکا شبنم باجی
کے لئے مل جائے!

لیکن لڑکے کہاں تھے ؟

شمع سوچتی، شبنم اور فرید کی عمر برابر ہے ___
برابر کی عمر میں شادی نہیں ہونی چاہیئے۔

لیکن یہ بات اور کوئی نہیں سوچتا تھا۔

شمع سوچتی، کیا ہوا جو شبنم سب سے بڑی ہے۔
شمع سب سے زیادہ حسین تھی۔ سب سے حسین لڑکی کو
یہ حق ہونا چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے اپنا من پسند لڑکا
چُن لے۔

شمع کو فرید سے بے پناہ محبت تھی۔

بچپن میں ہمیشہ فرید شمع کا ساتھی بنتا تھا۔ اکٹھے
وہ چھپتے تھے، اکٹھے وہ پکڑے جاتے تھے۔ ایک بار کھیل
ہی کھیل میں وہ شہزادی بنی تھی۔ فرید شہزادہ بنا تھا
اور جھوٹ موٹ کے گھوڑے پر بٹھا کر وہ سچ مچ اسے
باغ کے ایک کونے میں لے گیا تھا۔ اور گھاس کے میدان
پر دونوں ایک ساتھ لیٹے تھے۔ شمع کو کتنا مزہ آیا تھا۔
ہلکی ہلکی دھوپ، ادھر اُدھر کھلی نرگس کی کیاریاں۔
اس دن اُس نے بسنتی رنگ کی چُنری اوڑھی ہوتی تھی۔
اور فرید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا "تم بھی تو ایک
نرگس ہو۔ بیمار بیمار آنکھیں! ہاں شمع جب فرید کو
دیکھتی، اس کی آنکھوں میں جیسے بخار گھُس آتا تھا۔ گرمیوں
کے موسم میں فرید امرائی پر چڑھ کر کیریاں توڑا کرتا
تھا۔ سب کے لئے ایک ایک پھینکتا تھا اور شمع کے لئے
ایک اور اپنے نیفے میں چھپا لاتا تھا۔ شمع چھپ چھپ کر
اس کیری کو کھاتی تھی۔ اس کیری کا کتنا مزہ ہوتا تھا۔
ایک بار گلی ڈنڈا کھیل رہا۔ فرید کی گلّی شمع کے گال پر
آ لگی تھی۔ خون کی تاریں پھوٹ نکلیں، ٹپ ٹپ آنسو
بہہ رہے تھے۔ مگر ایک ٹیس شمع کی کسی نے نہ سُنی، ایک
بول شکایت کا اس کے مُنہ سے نہ نکلا۔ اور پھر جب
فرید پتنگ اُڑاتا تھا کنّی ہمیشہ شمع دیتی تھی۔ شمع کنّی دیتی
اور اس کی پتنگ جھٹکے سے چڑھ جاتی۔ فرید پتنگ اُڑا رہا
ہوتا اور شمع ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتی رہتی۔

"اللہ فرید بھائی جان کی پتنگ نہ کٹے ___ یا اللہ
فرید بھائی جان کی پتنگ اوپر ہی اوپر چڑھتی جائے!"
دیوانی!

اور پھر وہ ایک دم بڑی ہو گئی۔ فرید سے اس کا
پردہ کرایا گیا۔ شمع کو یاد تھا وہ اس روز کتنی روئی
تھی۔ چھت پر مٹی کے پیچھے کھڑی اس کی چیخیں نکل گئی
تھیں۔ ساری رات اس کی آنکھ نہیں لگی تھی۔ بار بار
اس کی پلکیں بھیگ بھیگ جاتیں۔ اگلے دن آئینے کے
سامنے کھڑی گز گز لمبے اپنے بالوں کو کنگھی کرتے وقت
اس نے سوچا تھا کہ اب وہ دو چوٹیاں نہیں بنایا کرے گی۔
مگر نہیں، اس کا دل نہیں مانا۔ جس گھر میں فرید آئے اس

گھر کو خوبصورت ہونا چاہیئے۔ جس دنیا میں فرید رہے اس دنیا کو حسین ہونا چاہیئے۔ اور وہ کھڑکی میں کھڑی رہتی۔ اور اُدھر سے فرید آنکلتا۔ کھڑکی میں کھڑی ہو کر وہ آنکھیں موند کر کہتی "اللہ فرید آجائے"۔ اور سامنے ابھی ابھی اس گھر سے گیا فرید لوٹ کر آ کھڑا ہوتا۔ شمع پسینہ پسینہ ہو جاتی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے فرید اس کی مٹھی میں ہو؟ خواہ کبھی اسے وہ بلا لے۔ اور وہ اس گول کمرے کو سجاتی رہتی جس میں آ کر وہ بیٹھتا تھا۔ اس آنگن کو سنوارتی رہتی جس میں وہ آ کر قدم رکھتا تھا اس برآمدے کو صاف کرتی رہتی جس میں آ کر وہ کھڑا ہوتا تھا۔

اور پھر اس کی نظر شبنم باجی پر جا پڑتی۔ خاموش، سنجیدہ، بے لوث! ہر بات میں سلیقہ، ہر بات میں باقاعدگی، ایثار کا جیسے مجسمہ ہو۔ شمع سوچتی۔ اگر وہ شبنم باجی کو اپنے دل کی بات بتا دے تو شبنم ایک بار بھی انکار نہ کرے۔ وہ تو اپنی بہنوں پر جان دیتی تھی۔ شبنم تو اپنی کسی بہن کے مکھڑے پر مسکراہٹ دیکھنے کی خاطر ساری عمر کنواری رہ لے۔ نہیں نہیں، یوں وہ نہیں کرے گی۔ شبنم باجی سے وہ اس کا حق نہیں چھینے گی۔ اور شمع کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو ڈھلک آتے۔ فرید کے بغیر وہ کیسے رہ سکے گی۔ فرید کے بغیر وہ کیسے جی سکے گی؟ جب فرید کسی اور کا ہو جائے گا تو وہ سوچتی، یہ دنیا اندھیری ہو جائے گی۔ اور اسے لگتا جیسے واقعی وہ دیوانی ہو رہی ہو۔ ہر لمحہ اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتی رہتی، فریادیں کرتی رہتی، دل کی مُراد مانگتی رہتی۔ دوسرے لمحہ شبنم باجی کو دیکھتی اور سوچتی وہ تو اپنی بہن سے ناانصافی نہیں کر سکے گی۔ اور چھل چھل آنسو اس کے بہنے لگتے۔

کوئی اور لڑکا نہیں ملا۔ اللہ اس کی سب باتیں مانتا تھا۔ لیکن اس کی یہ بات اس نے نہ سُنی۔ اور پھر شبنم، فرید کی شادی طے ہو گئی۔ فرید فارن سروس میں آ گیا تھا اور گھر والوں کی مرضی تھی کہ پردیس جانے سے پہلے لڑکا بیاہ کر کے اپنی دُلہن ساتھ لے جاتے۔ تاکہ گھر والوں کی فکر ختم ہو۔ اور لڑکے کو بھی باہر تکلیف نہ ہو۔

شمع سر پکڑ کر رہ گئی۔

اور پھر شبنم کی شادی کی تیاریاں۔ ڈھولک کے گیت، پانچ ہزار برقی قمقموں کی جگمگاہٹ۔ شہنائیاں! ایک سو ایک باجہ والوں کا بینڈ۔ پھر وہ سہرا باندھ کر آیا۔ گھوڑی پر چڑھ کر۔ شمع نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ پھر شبنم کا نکاح "منظور ہے"، "منظور ہے"، "منظور؟" "منظور!!!" شبنم فرید کو منظور تھی، فرید شبنم کو منظور تھا۔ اور پھر شبنم ڈولی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ ڈولی کے ساتھ ساتھ چلتا اپنے سرمایہ کو سنبھالے وہ بھی چلا گیا۔ شمع نے اپنے دل کو سمجھا لیا،

شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اُس کے دل سے تو کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ شمع نے اپنے غم کو سینے سے لگا لیا۔ ہنس رہی بہنوں سے ہنس لیتی، سنور رہی بہنوں سے مل کر سج لیتی، لیکن اپنے دل کے کواڑ اس نے بند کر لئے تھے۔ ایک سال، دو سال، تین سال۔ شبنم کے بعد شادی کی اس کی باری تھی، پر شمع کسی اور لڑکے کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے گھر والوں نے کئی رشتے ڈھونڈے، لیکن شمع نے کسی کے لئے بھی ہاں نہیں کی۔

کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ جب تک شمع شادی نہ کرے ہُما کا بیاہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اور ہُما کوٹھے کا کوٹھا ہو رہی تھی۔ اور پھر لڑکے کہاں ملتے تھے؟ لیکن شمع تھی کہ شادی کا نام نہیں لیتی تھی۔ شادی کا کوئی ذکر کرتا تو چھل چھل آنسو رونے لگتی۔

شبنم کے ایک بچہ ہوا، اب دوسرا ہونے والا تھا، لیکن شمع شادی کے لئے تیار نہیں ہوئی۔

ایک شام موٹر میں بیٹھا سارا خاندان کہیں سیر کو نکلا۔ شمع ساتھ نہ تھی۔ شمع اکثر باہر نہیں جایا کرتی تھی۔ بازار میں ایک جگہ آ کر موٹر رک گئی۔ سڑک تنگ تھی، بھیڑ زیادہ

نمیر ھریانہ

تھی، اور موٹر کے سامنے ایک اور موٹر کھڑی تھی۔ ڈرائیور
ہارن بجا بجا کر ہار گیا تھا۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے اگلی موٹر
خراب ہوئی پڑی ہو۔

'یہ موٹر کیوں نہیں چلتی ؟' اخبار پڑھ رہی حُسنہ
نے سر اٹھا کر پوچھا۔

'موٹر ہماری کیسے چلے؟ آگے شمع بہن بیٹھی ہوئی
ہے۔'' ہُما نے جواب دیا۔

اور سب ہنس دیئے۔ ہنس ہنس کر سب کے پیٹ
میں درد ہونے لگا۔ ایک بار ہنسی ختم ہوتی پھر چھڑ جاتی
اور گھر آکر جب شمع کو یہ بات سُنائی گئی ساری رات
اس کی پلکیں سلگتی رہیں۔

تھک ہار کر گھر والوں نے ہُما کا بیاہ رچا دیا۔
شمع نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ شادی کبھی نہیں کرے گی۔
آخر وہ لوگ بھی تو ہیں جو ساری عمر کنوارے رہتے ہیں۔

ایک سال اور گزر گیا۔ شبنم کے گھر ایک اور
بچہ ہوا۔ ہُما کے گھر بھی بچہ ہونے والا تھا۔ اب تو حُسنہ
کی شادی کی بھی چرچا شروع ہو گئی تھی، لیکن شمع تھی کہ
اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

شمع جیسی حسین لڑکی کا یوں گھر میں کنواری
بیٹھ جانے پر شہر افسانے گھڑنے لگا۔ جتنے منہ اتنی ہی
باتیں۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ کہتا۔ اور پھر یہ کہانیاں
چلتے چلتے شمع کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ اس کی امی تک
بھی پہنچ گئیں۔ اس کے ابا کو بھی اشارے کنائے ہونے
لگے۔ اور گھر میں آٹھوں پہر اندھیرا اندھیرا سا چھایا
رہتا۔ گیلے اُپلے کی طرح شمع سُلگتی رہتی۔ اس کی ماں
چارپائی پر پڑ گئی۔ اس کا باپ گھُلتا جا رہا تھا۔ بیٹی کا
صدمہ تھا۔ مگر وہ بیاہ کیوں نہیں کرتی تھی؟ یہ بات
کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اچھے لڑکے بے شک مشکل
سے ملتے تھے۔ لیکن شمع جیسی خوبصورت لڑکی کے لئے کوئی
قحط نہیں تھا۔

اور پھر اس کی امی کو پتہ لگ گیا کہ شمع کیوں بیاہ
نہیں کرتی تھی۔ ایک دن اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔
فرید کی تصویر کے سامنے کھڑی وہ چھل چھل آنسو بہا رہی
تھی۔ بیگم کے سینے میں جیسے کٹار آ لگی ہو۔ اور وہ وہیں کی
وہیں بے سُدھ ہو گئیں۔ شمع کا راز کھل گیا تھا۔ لیکن یہ کیسے
ہو سکتا تھا؟ اس کے سینے کا سب سے محبوب راز۔ یہ کیسے
ممکن تھا؟ اور شمع دیوانی نے اپنی ماں کو جھٹلانے کے لئے
شادی کرنے کا اقرار کر لیا۔ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی
کہ کوئی یہ سوچے کہ وہ اپنی بہن سے اس کا شوہر چھین لینا
چاہتی تھی۔ شمع کو کوئی کہے تو وہ لاکھ جانیں اپنی آپ پر
نچھاور کر دے۔ شبنم کا اس میں کیا قصور تھا؟

اپنی ماں کو غلط ثابت کرنے کے لئے شمع
نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ——— اور پہلا لڑکا
جس کا ذکر ہوا اس کے ساتھ شادی کے لئے اُس نے
اپنی رضامندی دے دی۔ شمع نے 'ہاں' کی اور جیسے
بہار آ گئی ہو۔ سارے گھر میں گہما گہمی ہونے لگی۔ شبنم
ولایت سے اُڑ کر اس کے نکاح میں شامل ہونے
کے لئے آئی۔ ہُما آئی۔ ہُما کا گھر والا آیا۔ ڈھیر سے رشتہ دار
اکٹھے ہوئے۔

کتنی پیاری دُلہن بنی تھی شمع! اسے دیکھ دیکھ کر
بھوک نہ ملتی۔ امی نے جی بھر کر اپنے ارمان اتارے۔
ڈھیر سا اسے جہیز دیا گیا۔ اس کے باپ نے اپنی لاڈلی کیلئے
لاکھوں روپے لٹا دیئے۔

اور شمع ڈولی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اپنی پاک
محبت کا راز سینے میں چھپائے شمع چلی گئی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ابھی پورا ہفتہ
نہیں گزرا تھا کہ خبر آئی اس کی بہن شبنم مر گئی ہے۔ وہ
بچوں کے کپڑے استری کر رہی تھی کہ اسے بجلی کا جھٹکا
لگا اور وہیں کی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ شمع نے سنا اور وہ
اوندھی جا گری۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ چار دن اسے بیاہے نہیں

ہوتے تھے۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ اس طرح بے وقت کی موت، سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ رو پیٹ کر گھر والے بے حال ہو گئے۔ جوان جہان لڑکی پھولوں جیسے تین بچے چھوڑ کر ایک پلک جھپکنے میں چلی گئی تھی۔

کوئی نہیں کہتا تھا کہ بیگم بچے گی۔ کوئی نہیں کہتا تھا کہ نواب صاحب بچیں گے شبنم کے خاوند کی طرف وہ دیکھتے، شبنم کے ننھے ننھے بچوں کی طرف دیکھتے اور بوڑھے بڑھیا کو ہول پڑنے لگتے۔

اور پھر وہ دن قریب آگیا جب فرید کو لوٹ کر نوکری پہ پہنچنا تھا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ سب سے چھوٹی حسنہ کا اس سے بیاہ کر دیا جائے۔ اپنی آپا کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھال لے گی۔ اور پھر لڑکا بھی اتنی دور جا رہا تھا۔ باہر اکیلے اسے تکلیف ہو گی۔

شمع سب کچھ سنتی رہی۔ شمع سب کچھ دیکھتی رہی۔ سب سے چھوٹی بہن حسنہ اور اس کے شوہر فرید کو ہوائی جہاز میں بٹھا کر لوٹ رہی تھی اسی شام اپنے خاوند کے ساتھ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی شمع پھوٹ پڑی۔ اتنے دن سے وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اتنے دن سے وہ قدرت کے اس ستم پہ حیران گم سم تھی۔ آج اپنے گھر والے کے کندھے پر سر رکھ کر شمع کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جیسے جھڑی لگ گئی۔ وہ روئے چلی جا رہی تھی، روئے چلی جا رہی تھی۔ سب اسے سمجھاتے تھے، سب اسے دلاسا دیتے تھے۔ لیکن شمع کے دل کا درد کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ کوئی نہیں۔ رب العالمین نے جو بے انصافی اس سے کی تھی وہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کوئی نہیں۔ اور شمع میں کی عورت کے سینے کا راز کسی کو نہیں پتہ لگا چاہے ساری عمر جلتی رہے، جلتی جلتی ختم ہو جائے۔ شمع کے دل کا مرض کوئی نہیں جان سکے گا۔

اے سی بہار

فرقہ پرستی اور تعصب

قطعات

فرقہ داری ہے وہ گناہِ عظیم
جس سے انساں کا دِل دھڑک اُٹھے
اِس کو چھوڑو، کہیں نہ ایسا ہو
آگ نفرت کی پھر بھڑک اُٹھے!

فرقہ داری کو ختم کر دو تم
یہ تمہیں ورنہ ختم کر دے گی
بُغض کا، بَیر کا، کدُورت کا
زہر سب کے دِلوں میں بھر دے گی!

فِرقہ داروں کی فتنہ انگیزی
ملک کو ختم ہی نہ کر جائے
یہ اِک ایسا عظیم خطرہ ہے
جس سے شیطاں بھی ہو تو ڈر جائے!

اپنا دامن جو پھُونک کر رکھ دے
شمع کی اتنی تیز لَو بھی نہ ہو
جس تعصّب کا ہو رہے ہو شکار
وہ قیامت کا پیش رَو ہی نہ ہو!

فرقہ داری ہے اِک بڑی لعنت
اس سے بچ کر رہیں تو اچھا ہے
مادرِ ہند کی جبیں پر بہار
کس قدر بدنما یہ دھبا ہے!

تیرہ ہریانہ

مصوّر سبزواری

پریہ درشنی

وہ پھول سی وہ کامنی سی پریہ درشنی تھی وہ
وہ چاندنی سجل سی دیوتاؤں کی ہنسی تھی وہ

تھے صبح و شام ہند چاند سورج اس کی آنکھ کے
کروڑوں آئینوں کا ایک عکس بن گئی تھی وہ

صفات اس کی ان گنت حیات اس کی شش جہت
کہیں سنائی دیتی تھی کہیں پکارتی تھی وہ

وہ سب کے دل کا درد تھی وہ چارہ گر ہر ایک کی
غرضیکہ سارا جسم ساری جانِ ہند کی تھی وہ

سیاستوں کے خیمے جب اکھڑ رہے تھے چار سُو
ہوائے تیز و تند میں چٹان سی کھڑی تھی وہ

شہید ہو کے بھی کھڑی ہے فاتحوں میں سر بلند
فنا کی ہر فصیل کو شکست دے چکی تھی وہ

اسے تو جانا ہی تھا خوشبوؤں کے پار اُس طرف
گلاب موسموں میں دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی وہ

خراج پیش کیا کریں گی بوند بوند عقیدتیں ؟
ہے سچ تو یہ کہ اپنے وقت سے بہت بڑی تھی وہ

کرشن ادیب

بے صدا، شہر ہے، آواز لگاؤں کیسے
کوئی سنتا ہی نہیں، شور مچاؤں کیسے

اب مرے جسم پہ باقی نہیں دھجی کوئی
اپنی عریانی کو دنیا سے چھپاؤں کیسے

اب ہوا بن کے ترے ساتھ چلوں گا، ورنہ
تُو تو خوشبو ہے تجھے ہاتھ لگاؤں کیسے

میں کہ ہر موڑ پہ ہوں، تیرِ ملامت کا ہدف
بارشِ سنگ ہیں، آئینہ بچاؤں کیسے

ہاتھ سے اپنے جسے قتل کیا تھا اک شب
آج اُس شخص کا میں سوگ مناؤں کیسے

صغیر افراہیم

دوسری اور آخری قسط

قطب شاہی عہد کی طرح عادل شاہی دور بھی علم و ہنر کی سرپرستی کے لئے مشہور رہے۔ خصوصًا علی عادل شاہ ثانی کا دور "ترقیٔ علم و فن خاص کر اردو کی ترقی کے لئے مشہور رہے۔ اس کا دربار باکمالوں کا مجمع تھا۔ دور دور سے اہل علم و فضل آکر اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ اس کے زمانہ میں بیجاپور علم و ہنر کی قدردانی کے لحاظ سے رشک بغداد اور قرطبہ بنا ہوا تھا"[28]۔ بیجاپور کی عادل شاہی مملکت میں جن مرثیہ نگاروں کا کلام ملتا ہے اُن میں شاہی، نصرتی، مرزا اور ہاشمی کے نام سرِفہرست ہیں لیکن مرزا کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ مرزا آلِ رسول و اہلِ بیعت کی بے پناہ عقیدت اور محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اپنی اسی حد سے بڑھی عقیدت مندی کی بنا پر انھوں نے "ساری عمر صرف حمد، نعت، منقبت اور مرثیے"[29] کے سوا کچھ نہ کہا۔ ان کے مرثیے دکنی مرثیوں میں اپنی لسانی و فنی خوبیوں کی بنا پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن میں سے اکثر دنیا کی بے ثباتی اور اخلاقی مضامین سے پُر ہیں۔ انھوں نے واقعات کربلا اور اس کے تعلق سے دیگر مضامین کو اس حسن و خوبی کے ساتھ باندھا ہے کہ سارے دردناک مناظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتے ہیں اور مرثیوں میں چھپا، ان کا باطنی کرب سامعین پر رقّت طاری کر دیتا ہے۔ انسان آہ و بکا کے لئے مجبور ہو جاتا ہے —— حضرت قاسم کے حال پر ان کا کہا ہوا مرثیہ بے حد مشہور ہے ؎

کیوں قصّہ شجاعت کا
سو قاسم کی شہادت کا
بزدیاں کی عداوت کا
کرو زاری مسلمانان

کہ یہ اولاد حیدر ہے
دو لوں عالم میں بہتر ہے
نہیں ساریاں یہ پودر ہے
کرو زاری مسلمانان

---

[28] چند دکنی مرثیہ گو، نصیر الدین ہاشمی (ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور) جون ۱۹۳۰ء۔ ص ۷ ۵ ۴

[29] اردو مرثیے کی روایت، ڈاکٹر مسیح الزماں۔ ص ۲۲

کہے اے نورجانی یو
دیکھ دنیا ہے فانی یو
وفا نہیں زندگانی یو
کروزاری مسلمانان

دیکھو جدیاں نہیں رہے ہیں
بقا کے تخت اپر گئے ہیں
وفا دنیا سے نہیں کئے ہیں
کروزاری مسلمانان

تجا کا نہیں ہے ٹھارا یو
گزارے عمر سارا یو
وداع ہے اب ہمارا یو
کروزاری مسلمانان

مرزا نے کربلا کے مختلف واقعات اور مختلف کرداروں پہ الگ الگ مرثیے کہے ہیں جن میں سماجی پس منظر، مقامی رسمیں، گھریلو زندگی اور انسانی نفسیات کو انھوں نے اچھوتے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ حضرت حُر کی شہادت کے تعلق سے مرزا نے اپنے طویل مرثیہ میں پہلے حضرت امام حسینؓ کی عظمت کو بیان کیا ہے، پھر میدانِ کربلا کا نقشہ کھینچ کر، حضرت حُر کا ذکر، وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

حُر تب آ اُس رن پہ ایسا ہانک ماری ہولناک
گئی گگن ساتوں اپر جس ہانک کی ہیبت کی دھاک
یوں کہے میں ادہوں شیر نر کہ میرے سر پہ آج
مصطفےٰ کے نور دیدہ کی شفقت کا ہے تاج
آج اگر رستم کوں میں اپنا مقابل پاؤں گا
تو اسی باعث منے ملک عدم میں بھاؤں گا

دکن کی ریاستیں جب تک خود مختار رہیں مرثیہ کو شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعرائے اردو کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ بے حد مراعات کی جاتیں۔ "انھیں ان کی تصنیفات کا معقول صلہ دیا جاتا تھا۔ نہ صرف سلاطین بلکہ امراء دکن بھی اردو کی سرپرستی کرتے تھے۔"[۳۰] مگر سترھویں صدی کے نصف آخر کے بعد اورنگ زیب دکن کی ریاستوں کی جانب متوجہ ہوا تو ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کی ریاستوں کو اس نے فتح کر لیا۔ کچھ ہی عرصے بعد دکن کے باقی علاقے پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا اور اُن ساری مفتوحہ ریاستوں کو اس نے ایک صوبہ کی شکل دے دی۔ اس انقلاب سے شاعری خصوصاً مرثیہ حکومت کی عنایت سے محروم ہوا اور اس کی شاہی سرپرستی ختم ہوئی لیکن اُسے پھلنے پھولنے کے مزید مواقع فراہم ہوئے۔ بہت سے مرثیہ نگار جو دربار سے منسلک تھے، منتشر ہوئے۔ کچھ نے گجرات، کرناٹک، کرنول، برہانپور کا رُخ کیا اور کچھ دہلی چلے آئے "اور وہاں شعر و سخن کی نئی روایتیں قائم کرنے لگے۔"[۳۱] اس وقت تک مرثیہ ایک محدود حلقہ میں پرورش پا رہا تھا لیکن بدلے ہوئے حالات میں وہ مختلف سمتوں سے ملک کے دور دراز حصوں میں پہنچ کر نئی آب و تاب کے ساتھ دن بہ دن ترقی کے منازل طے کرنے لگا۔

مُغل سلطنت کمزور ہوئی تو دکن میں ایک بار پھر خود مختار ریاست قائم ہوئی۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت پر زوال کے آثار نمایاں ہوئے اور دھیرے دھیرے اس عظیم الشان سلطنت کے بھی ٹکڑے ہونے لگے۔ با اثر صوبے داروں نے سلطنت

۳۰؎ چند دکنی مرثیہ گو، نصیر الدین ہاشمی (ادبی دنیا، جنوری ۱۹۳۱ء) ۔ص ۳۳
۳۱؎ اردو مرثیے کا ارتقاء، مسیح الزماں ۔ص ۷۲

کے مختلف حصوں میں اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کر لیں ۔ چنانچہ ۱۷۲۳ء میں نظام الملک آصف جاہ کی سرکردگی میں دکن کی آصف جاہی سلطنت کا قیام ہوا اور اس نئی سلطنت نے یہاں کی دوسری تہذیبی سرگرمیوں کے ساتھ عزاداری اور مرثیہ خوانی کی روایتوں کو بھی ترقی دی۔[۳۲] آصف جاہی حکومت میں عہدِ گذشتہ کی طرح مرثیہ گوئی کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ اس عہد کے مرثیہ نگاروں میں ہاشم علی برہانپوری، درگاہ قلی خاں سالار جنگ، امامی، رضا گجراتی، عزلت، غلامی، ماتمی، تمنا، ذرہ، قیس وغیرہ کے نام خاص اہمیت اور شہرت کے حامل ہیں۔ خاص طور سے ہاشم علی برہانپوری اور درگاہ قلی خاں سالار جنگ نے فنِ مرثیہ گوئی کو مزید ترقی دی۔ موضوعات اور اسلوبِ بیان میں وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔

ہاشم علی برہانپوری کا شمار اپنے دور کے ممتاز مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ہاشم کے مرثیوں میں سوز و گداز، غم و الم، واقعہ نگاری وغیرہ کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں۔ صبح کا سماں۔ گرمی کا موسم۔ لڑائی کا منظر۔ سفر کی حالت۔ تنہائی۔ بے کسی اور بے بسی جدائی وغیرہ کے مضامین پر اچھی طرح طبع آزمائی کی ہے۔[۳۳]" انھوں نے مرثیہ کو فنی پختگی اور فکری بلندی عطا کی۔ تشبیہات و استعارات کو بڑے دلکش پیرائے میں پیش کیا۔ ندرتِ کلام، زبان کی سلاست و روانی ان کے مرثیوں کو ممتاز کرتی ہے۔ شہدائے کربلا کے علاوہ جناب فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت زین العابدین، جناب سکینہ اور لپسران حضرت مسلم پر بھی انھوں نے مرثیے لکھے ہیں لیکن جس خوبی کے ساتھ انھوں نے حضرت قاسم اور معصوم علی اصغر کے المیہ کو پیش کیا ہے دکن میں اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کے اکثر مرثیوں کا مکالماتی اندازِ بیان، ان کو دوسروں سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ حضرت قاسم اور اُن کی نئی نویلی دُلہن جناب فاطمۃ الکبریٰ کی گفتگو کو انھوں نے مکالمات کے پیرائے میں فنی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے کہ مقامی رسمیں بھی اُجاگر ہو جاتی ہیں اور کلام کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ مرثیہ مربع کی صورت میں ہے ؎

جلوے سے اُٹھ کے رن کو چلا تب کہی دولھن
دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن
تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون مرا

جانے ہو چھوڑ رن کی طرف مجھ کو تم رُلا
نہیں شرم کا ہنوز یہ سرسوں گھونگھٹ کھلا
کرنے نہیں محبت وہ جانتے میاں بھُلا
اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن مرا

قاسم کھڑا تھا رونے نین سُن دولھن کی بات
غمناک اپنا دیکھ کے دامن دولھن کے ہات
تب آہِ دردناک سوں بولا دولھن کے سات
اے بوستانِ راحت و سرورِ چمن مرا

مجھ کو نہیں ہے تیری جُدائی پہ اختیار
تیرے فراق ساتھ میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں صلاح نہیں حکمِ کردگار
حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن مرا

۳۲؎ اُردو مرثیے کا ارتقاء، مسیح الزماں۔

۳۳؎ چند دکنی مرثیہ گو، نصیر الدین ہاشمی (ادبی دنیا، فروری ۱۹۳۱ء) ص ۱۰۰

ہاشم علی کا ایک اور مرثیہ معصوم علی اصغر کی شہادت
پر ہے۔ اس میں انھوں نے جناب شہر بانو کی آہ و فغاں
کو بیان کیا ہے۔ یہ مرثیہ جذبات سے پُر، واقعہ نگاری
کا ایک اچھا نمونہ ہے ؎

آج پُر خوں کفن ترا اصغر
آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے کل بدن ترا اصغر
حیف یو بال پن ترا اصغر

دیکھ اپنا شہید نور العین
شہر بانو انجھواں سے بھر کے نین
روتی چھاتی کوں کوٹ کرتی بین
حیف یو بال پن ترا اصغر

کیوں جدا بچہ سنتیں کئے تجہ کوں
پھر میں گودی لئے پھروں کس کوں
کیوں نہ لاگی بلا تری مجہ کوں
حیف یو بال پن ترا اصغر

درگاہ قلی کو شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا۔
عزاداری ورثے میں ملی تھی۔ آلِ رسول سے والہانہ
لگاؤ نے مرثیہ گوئی کی طرف ان کو راغب کیا۔ اس عہد
میں دکن اور شمالی ہند کے باہمی ربط و ضبط کی وجہ سے
زبان میں سادگی اور سلاست پیدا ہو چکی تھی۔ موضوعات
میں وسعت اور گہرائی آچکی تھی۔ ہیئت نے بھی بہت کچھ
روپ بدل لیا تھا۔ درگاہ قلی کے کلام میں یہ تمام خوبیاں
ہمیں ملتی ہیں۔ وہ خود دلی میں متعدد بار مقیم رہ چکے تھے۔
ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر انھوں نے اہلِ زبانِ
دلی کے تاثر کو قبول کیا تھا اور اپنی شاعری خاص کر مرثیوں
سے دلی والوں کو متاثر بھی کیا۔ شمالی ہند کے اردو مرثیے
کی ارتقا میں ان کا اہم کردار ہے۔ زبان و بیان کی
جو تبدیلی درگاہ قلی کے بیشتر مرثیوں میں نظر آتی ہے
وہ شمالی ہند کی دین ہے۔ ان کے مرثیوں میں قدیم دکنی
لب و لہجہ اور جدید دہلوی انداز دونوں کا امتزاج ہے۔
دلکش انداز اور بھرپور جذبات میں تر و تازہ عقیدت
و محبت کی شمولیت نے ان کے مرثیوں میں اور بھی چار
چاند لگا دئے ہیں۔ عموماً ان کے مرثیے واقعۂ کربلا کے
کسی ایک موضوع تک محدود نہیں رہتے۔ وہ ایک بند
میں کسی منظر کو پیش کرتے ہیں تو دوسرا بند کسی اور پہلو
کو اجاگر کرتا ہے پھر بھی ربط اور روانی میں فرق نہیں
آتا ؎

پیاس سیں بیتاب جانِ بو تراب
آٹھ دن میں نہیں ملا اک قطرہ آب
دیکھ عباس علی یہ اضطراب
قصد پانی کا کئے جلد و شتاب
مشک بھر کر لے چلے مثلِ سحاب
بے مروت ہائے بھورے کر عتاب
چھوٹے بڑے سبھیں کیا ہے ہے آئی کر
سارے بالک چلائے پانی پانی کر
خوک سگ سیراب و اولادِ بتول
در عطش با صد مصیبت یا رسول

وقت سختی بادشاہِ انس و جاں
یاد کر بھائی کا وہ غم گیں سخن
تھی مصیبت۔ بن عروسی کیا کٹھن
شربت آنسو اور مقنع تھا کفن
کیا تھا دل کیا مہورت کیا شگن
آہ یہ کیسی پڑی غم کی لگن

درگاہ قلی کے مرثیے سلاست، روانی، فنی پختگی
اور تخیل کی بلندی کے آئینہ دار ہیں۔ منفرد طرزِ بیان،

موثر لب ولہجہ اور تخاطب کا انوکھا پن ان کے مرثیوں کی نمایاں خوبیاں ہیں ؎

فاطمی کہتی سنو یہ دکھ خدا کے واسطے
اور رسول اللہ حضرت مصطفیٰ کے واسطے
کیا جگر گوشوں کو پالے تھی بلا کے واسطے
ظلم و بیداد و مصیبت اور جفا کے واسطے

ہے آج کربلا کا بیاباں لہو لہو
صحرائے دل فگار کا داماں لہو لہو
سب دشت و کوہ و جنگل و میداں لہو لہو
وہ رزم گاہ شاہ شہیداں لہو لہو

ہے گا محمد عربی جن کے جد کا ناؤں
مکا ہے جن کا گاؤں مدینہ ہے جن کی ٹھاؤں
ان اہل عصمتوں کو چلایا ہے پاؤں پاؤں
لے لے پھرا ہے شہر بہ شہر ہائے گاؤں گاؤں
نازل ہوئی ہے جن کے اوپر آیت حجاب

اردو مرثیہ کے اس ابتدائی دور کو اگر دکنی مرثیوں کا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ـــ یہ مرثیے اس زمانے میں لکھے گئے جب اردو، زبان کے اعتبار سے اپنے ابتدائی مدارج سے گذر رہی تھی اور اس میں بہ تدریج تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں چنانچہ مرثیوں میں اس دور کی زبان کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ آج کے مرثیے دکنی مرثیوں سے بڑے مختلف ہیں کیونکہ زبان اور بیان میں بڑا فرق آ چکا ہے یہی وجہ ہے کہ دکنی مرثیے لسانی اعتبار سے غیر مانوس معلوم دیتے ہیں ان میں ثقل کا بھی احساس ہوتا ہے لیکن یہ مرثیے اپنے دور کے لحاظ سے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں لسانی لطافت، فنی پختگی، اسلوب بیان اور روانی کے تمام عناصر افراط سے موجود ہیں۔ حالانکہ ان مرثیوں کا خاص مقصد مجلس عزا کو رلانا تھا۔ وہ اپنے کلام میں سوز و گداز، رنج و غم کے مضامین اس طرح بیان کرتے تھے کہ سوز و گداز کا سماں پیش ہو جاتا تھا۔ دکنی مرثیوں سے ایک اور بات بھی ظاہر ہوتی ہے ان میں جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ وہاں سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بھی مستعمل ہوئے ہیں۔ بعض جگہ ان الفاظ کے استعمال سے کلام میں خاصہ زور پیدا ہو گیا ہے۔"[۳۴] دکنی مرثیوں کا یہ دو سو سالہ عہد اردو مرثیہ کی تاریخ میں انتہائی اہم ہے۔ مرثیہ کی ابتدا اور اس کی نشو و نما اسی عہد کی دین ہے اور اسی عہد نے شمالی ہند میں اردو مرثیہ کے لئے راہ ہموار کی ہے۔

●

---

۳۴ چند دکنی مرثیہ گو، نصیر الدین ہاشمی
آدبی دنیا، فروری ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۲

نصیر پرواز

سفر میں نے کیا تھا
اونچے نیچے راستوں پر میں نے چھوڑے نقش پا اپنے
میں دریا تھا
جنم مجھ کو دیا تھا برف پوشی آشاؤں نے
لکھا تھا یہ مقدّر میں
کہ جب میں قطرہ قطرہ جوڑ کر موجِ یقیں کا پیرہن پہنوں
تو سب انجان سمتیں گنگنا اٹھیں
جو پربت باپ ہے میرا
ترس جائے مجھے بانہوں میں بھرنے کو
یہ اونچا آسماں نیچے اتر کر آئے اور میرے قدم چومے
سفر میرا مقدّر تھا
سفر میرا ازل میرا ابد میرا یقیں بھی تھا
میرے قدموں کا غم کربِ زمیں بھی تھا
سمندر میری منزل تھا
اگر میں بیٹھ جاتا راہ میں تھک کر
تو یہ پیاسے اجالے مجھ کو پی جاتے
تو پھر مل کر سمندر میں سمندر کیسے کہلاتا
میں شاید حل نہ ہو پاتا
میں دریا تھا
سفر میرا مقدّر تھا
مجھے رکنا نہیں تھا صرف چلنا تھا
چلو اچھا ہوا تم نے مجھے آنسو بنا ڈالا
کہ میں نے آج خود کو ایک آنسو کی طرح بہتے
تمہاری ڈوبتی آنکھوں میں دیکھا ہے
میں دریا ہوں
یہی آنسو فقط میرا سراپا ہے
میں پربت سے نہیں شاید
سمندر سے ہی نکلا ہوں

شرون کمار ورما

واقعیٔ بہت بڑا اور خوبصورت بورڈ تھا۔

مسز گل نے کار روک کر پڑھا: "اپنے شہر کو گندہ مت کیجئے"، ساتھ ہی ایک موٹے، بھدّے شخص کی بے ڈھبی سی تصویر تھی۔ وہ گندے پانی کی بالٹی کھڑکی سے سڑک پر اُلٹا رہا تھا۔ شہر کی دیگر اہم جگہوں پر بھی اس قسم کے بورڈ لگائے گئے تھے "نل کھلا مت چھوڑیئے"، "بجلی کم استعمال کیجئے"، یہ سب مسز گل کی تجاویز اور اَن تھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔

موڑ کے یوُرنیل کے پائپ کا پانی فوّارے کی طرح سڑک پر گر رہا تھا۔ کونے میں کوڑے کا ڈھیر تھا۔ دو ننگ دھڑنگ بچے اس میں سے کاغذ پلاسٹک کی چیزیں اور چیتھڑے تلاش کر رہے تھے۔ ایک لڑکا جو رسّی گھما تا، گالیاں بکتا، گوبر اور کیچڑ میں سنی بھینسیں ہانکتا لئے آرہا تھا، سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر بے شرمی سے پیشاب کرنے لگا تھا۔ ایک بھینس سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی گوبر کر رہی تھی۔ پیچھے مُڑ کے ٹریفک کا شور بڑھ گیا تھا۔ ایک تانگے والا سخت اکھڑ پن سے احتجاج کر رہا تھا۔

وہ یہ سب ان جاہلوں کے لئے کر رہی ہے۔

مسز گل نے کراہت سے سوچا۔ کار آگے بڑھادی۔ گھروں کی ساری غلاظت سڑک پر ڈھیر تھی اور یہ گندگی دور تک پھیل گئی تھی۔ نالیاں بند تھیں، پچھلی بارش کا پانی جگہ جگہ کھڑا تھا۔ گٹر کے ڈھکن بھیڑوں میں پگھل چکے تھے اور زیرِ زمین سیوریج کا پانی سیمنٹ کی کمی کے سبب گھروں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔

کلب کی پچھلی میٹنگ میں اُس نے گائے بھینسیں شہر کی حدود سے نکالنے کی تجویز رکھّی تھی اور یاد دلایا تھا کہ اس مطلب کے لئے کارپوریشن کا قانون بھی ہے۔ سندھو صاحب جو اسمبلی کے لئے اُمیدوار تھے مسکرا دیئے تھے۔

"مسز گل یہ باتیں آپ نہیں سمجھیں گی۔"

"اُن معاملات کو سختی سے نپٹیئے، قانون آپ کے ساتھ ہے۔" سردار بہادر کشن سنگھ نے رائے دی۔

"یہ انگریزوں کا زمانہ نہیں ہے"، سندھو صاحب اب بھی مسکرا رہے تھے۔ "اب ایڈمنسٹریشن میں عوام کا دخل ہے۔"

کشن سنگھ اپنا پیگ سنبھالے، اپنی ٹیبل کی طرف چلے گئے تھے اور سندھو صاحب آنے والے الیکشن کی بات لے بیٹھے تھے۔ شہر کی چنتا صرف مسز گل کو تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو خود کو تھکا ہوا سا محسوس کر رہی تھی۔ مسٹر گل آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے واپس آکر آرائشی

پودوں کا معائنہ کر رہے تھے۔

"کیسی رہی تمہاری کٹی پارٹی۔؟"

"بکواس ——"

"مسز والیہ کا مینو تو لمبا چوڑا تھا۔"

"شی از اے بگ سناب۔" مسز گل نے منہ بنا کر کہا —"تمہیں اُس پرانے کھنڈر میں کیا ملا۔؟"

"کچھ نہیں، ایک مزدور دیوار کے نیچے آتے آتے بچا۔" وہ مسکرائے "تمہارے لئے بلیک روز کی قلمیں لایا ہوں۔"

مسز گل برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر پنسل ہیل پر ڈولتی اندر گئی تو بالکل کسی نئی عمارت سی لگی۔ اُس کی آواز کی کھنک کے ساتھ خوشگوار مہک بھی گل صاحب تک پہنچی تھی۔ ملبے اور سیلن کی بُو نے تو اُنھیں پریشان کر دیا تھا۔ وہ پودوں کی کانٹ چھانٹ بھول گئے۔ یوں بھی وہ کئی دن سے گارے اور نانک شاہی اینٹوں میں پھنسے تھے اور مسز گل کٹی پارٹیوں، ویلفیئر کے کاموں اور کلب کی الیکشن مہم میں اُلجھی ہوئی تھی اور اُس کا اور چھور رہی نہیں ملتا تھا۔

چند منٹ بعد وہ بھی اندر چلے گئے۔

مسز گل صوفے پر لیٹی تھی۔ دوپٹہ کرسی پر جھول رہا تھا۔ سینڈل قالین پر اوندھے پڑے تھے، وہ خوشگوار مہک سارے میں رچ بس گئی تھی۔ صوفے پر لیٹی وہ عورت کسی اُترے ہوئے دریا کی طرح لگ رہی تھی، جس کی تکان میں بھی ایک حُسن ہوتا ہے گل صاحب صوفے سے ہٹ کر قالین پر بیٹھ گئے۔ وہ اُس بدن سے اسی طرح واقف تھے جیسے اپنے بریف کیس سے، پھر بھی ان کے اندر چھپا آثارِ قدیمہ کا ماہر کھوجی، کچھ نہ کچھ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش میں رہتا تھا۔

اچانک مسز گل نے آنکھیں کھول دیں اور تھکے سے لہجے میں بولی۔

"اٹس اے تھنکلس جاب۔"

"دل نہ ہارو۔" گل صاحب نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ لیکن کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ مسز گل ابھی تک ٹریفک کے شور، تانگے والے کی بدتمیزی اور لڑکے کی بے شرمی سے بیزار تھی۔ "تمہارے ڈیلی گیشن کا کیا بنا۔؟"

"ہر ممبر فارن جانا چاہتی ہے۔"

اُس نرم و نازک ہاتھ اور مانوس خوشبو کے سہارے گل صاحب قالین سے اُٹھ کر صوفے پر پہنچ گئے۔ مسز گل چہرہ اُٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھنے لگی تھی پرانی حویلی میں کھدائی اور کھوج سے گل صاحب کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ مسز گل کی ستواں ناک دیکھنے لگے۔

"تم کچھ سونگھ نہیں رہے۔؟"

"جب سے تم نے سوشل ویلفیئر اور شہر کی صفائی کی ذمہ داری سنبھالی ہے، یہ بدبو تمہیں پریشان کرنے لگی ہے ——" گل صاحب ہنسے

مسز گل اُٹھ کر کھڑکی تک گئی۔ باہر دیکھا اور خفگی سے بولی۔

"ڈاکٹر باجوہ کتنے بڑے سرجن ہیں، فارن ریٹرنڈ ہزار پندرہ سو روز کماتے ہیں لیکن گندی کاٹن، بینڈیجز اور پلاسٹر سڑک پر پھنکواتے ہیں۔"

مسز گل نے دو اگر بتیاں سلگا دیں۔" میں عورتوں کا ڈیلی گیشن لے کر اُن سے ملوں گی، مسز والیہ کو ساتھ لے جاؤں گی۔"

"وہ نہیں جانے والی۔"

"کیوں —— ؟"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے —"

"تم نے کب کھوج کی۔" مسز گل نے پینی نظروں سے دیکھا۔

گل صاحب پرانے اور تجربہ کار سرکاری افسر تھے، وار

بچا گئے۔ بولے! "

"پڑوسیوں سے بگاڑا نہیں کرتے۔"

"یہ ہائی جین کا مسئلہ ہے، پڑوس کا نہیں۔"

"ہائی جین کے بارے میں وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں، تم اس طرح کیوں نہیں سوچتیں کہ کبھی ہمیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے، تم اپنا فیلڈ آف سوشل ورک، گھر اور پڑوس سے دُور رکھو۔"

بات مسز گِل کی سمجھ میں آ گئی۔

گِل صاحب کلب کے لئے تیار ہونے لگے۔

مسز گِل پلنگ پر بیٹھی انھیں پیار سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا خاوند کتنا عقل مند تھا۔ وہی تو اُسے اس فیلڈ میں لایا تھا۔ اُس کا سکریٹری چُنے جانا، سوشل سرکل میں آگے بڑھنا، سب گِل صاحب کی محنت، توجّہ اور رہنمائی کا نتیجہ تھا۔

"کلب نہیں چلو گی ــــــ؟"

"تین چار دِن سے لگاتار ہار رہی ہوں۔"

"کتنا ہار چکی ہو، ہم سے لے لو۔ اِٹس آل اِن دی گیم۔ ہار جیت بے معنی بات ہے، اصل چیز ہیں تعلقات، مائی ڈیئر، اچھے تعلقات، تمہارے الیکشنز ہونے والے ہیں۔ اس مرتبہ تمہیں ہر حال میں پریذیڈنٹ بننا ہے۔ بطور صدر کے تمہارا ڈیلی گیشن کی سربراہی کرنا لازمی ہو جائے گا۔ ایک ٹور میں دس بیس ہزار نکل آئیں گے کسٹمز میں تمہارا کزن ہے ــــ" وہ مسکرائے۔ "تمہاری کوشش تو یہ ہونی چاہیئے کہ اپنی باتوں، عمل اور موجودگی سے سب کے دل و دماغ پر چھا جاؤ۔ ڈاکٹر رندھاوا کے ہاتھ میں آٹھ دس ووٹ ہیں، دھیان رہے۔"

مسز گِل نے اُٹھ کر خاوند کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ چھ فٹ کے اُس جوان کے لبوں تک پہنچنے کے لئے اُسے اونچی ایڑی کے باوجود پنجوں پر اُٹھنا تھا۔

دوبارہ پینسل ہیل پر اُتر کر وہ ڈریسنگ ٹیبل پر جا بیٹھی۔ وہیں سے وہ گِل صاحب سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ نوکر کو ضروری ہدایات دے رہی تھی اور آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ کار میں جا بیٹھی۔ بڑا بیٹا دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے گیا تھا۔ چھوٹی بیٹی "ٹاٹا"، کہہ کر اپنے کمرے میں الیکٹرک گٹار پر ریاض کرنے چلی گئی تھی۔ گھر کی نوکرانی جیتاں ستون کے سہارے اُداس کھڑی تھی۔ صاحب کی موجودگی میں وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی تھی مسز گِل نے اشارے سے اُسے پاس بلایا اور کہا۔

"جیتاں، ہم کل تمہاری بستی میں آئیں گے، کپڑے اور دوائیاں تقسیم کریں گے، تم سب کو اکٹھا کر لینا عورتوں سے فیملی پلاننگ پر باتیں بھی ہو جائیں گی۔ یاد رکھنا۔"

"بی بی جی" میرا چھوٹا لڑکا بیمار ہے، چھٹی۔"

"ٹھیک ہے، چلی جانا، راجو کو کھانا کھلا کر، تم تو جانتی ہی ہو کہ وہ گرم اور خشک چپاتی پسند کرتا ہے، اُسے کھلا کر چلی جانا۔"

"دوائی ــــــ"

"ہم کل بستی میں آئیں گے، یاد رکھنا۔ راجو کو کھانا کھلا کر جانا۔"

کار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ راستے میں وہ کلب سوسائٹی اور الیکشنز کی باتیں کرتے رہے۔

"تم کل بستی میں ضرور جاؤ۔ گِل صاحب نے کہا "ہو سکے تو میڈیکل کیمپ کا انتظام کرا لو، آئی کیمپ۔ کلب میں ڈاکٹر رندھاوا سے بات کر لینا۔ اور ہاں، فوٹو گرافر ساتھ رکھنا، تمہاری تصویریں اخبار میں آنی چاہئیں۔"

کار کلب میں داخل ہو گئی۔

مسٹر گل اپنے دوستوں کے ساتھ جا بیٹھے۔ مسز
گل ڈاکٹر رندھاوا کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہی
تھی۔ پرسوں ٹی۔ وی۔ ریکارڈنگ کے لئے اُسے لازمی
جانا تھا۔ کل کیمپ لگنا ضروری تھا، لیکن ڈاکٹر رندھاوا
کہیں نظر نہیں آرہے تھے نہ کارڈ روم میں، نہ بار میں،
نہ بلیرڈ ٹیبل پر۔ وہ مایوس سی برآمدے میں کھڑی
لان میں پھیلتی شام کو دیکھ رہی تھی۔
دفتر سے فون کرکے لوٹتی مسز سندھو نے آہستہ
سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہاں کھڑی ہو۔۔۔!"

"یونہی۔۔۔" مسز گل جانتی تھی کہ مسز
سندھو مخالف گروپ کی سرگرم رکن رہی ہے۔

"آؤ اُدھر ٹیبل لگی ہے۔"

"آج من نہیں چاہ رہا۔۔۔"

"آؤ تو سہی۔"

حقیقت تو یہ تھی کہ مسز گل کو عورتوں کی ٹیبل پر
بیٹھنا کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کھیلتی کم تھیں، باتیں
زیادہ کرتی تھیں اور لڑتیں اُس سے بھی زیادہ تھیں۔
چغلی، جھوٹ، سکنڈلز۔۔۔ ہر چہرے پر ایک
مکھوٹا تھا۔

"کیا بات ہے دو دن ہار کر چہرہ اُتر گیا
ہے۔" مسز مان نے چوٹ کی۔

مسز گل سخت جواب دینا چاہتی تھی، کاٹتا ہوا
چبھتا ہوا۔ لیکن الیکشنز، ووٹ۔ ڈیلی گیشن،
فارن ٹور۔ مسکرا کر رہ گئی۔ پھر بات بدل کر بولی۔

"یہ بات نہیں، ہماری نوکرانی کا بیٹا بیمار ہے،
جب سے سنا ہے پریشان ہوں۔۔۔"

"تم نے نوکرانی رکھ لی تمہاری ساس چلی
گئی۔!" مسز جاٹیہ نے رمی کے پتے لگاتے
ہوئے کہا۔

تاش میں مسز گل کا من نہیں تھا بس ہارتی رہی
اچانک اُسے احساس ہوا کہ مسز والیہ ٹیبل پر نہیں تھی،
کلب میں ہی نہیں تھی۔ سال بھر صدر رہ کر بھی اُس کا
من نہیں بھرا تھا۔ راؤنڈ ختم ہونے پر وہ اُٹھ گئی۔۔۔
اُس نے پھر کلب کا چکر لگایا۔ کمرہ کمرہ جھانک کر دیکھا۔
دفتر میں جا کر دریافت کیا۔ ڈاکٹر رندھاوا مسز والیہ
کی آنکھیں ٹیسٹ کرنے لے گئے تھے۔ اُن دنوں مسز
والیہ کی آنکھیں خراب رہنے لگی تھیں۔

اب مسز گل اور بھی پریشان ہو گئی۔ وہ سیدھی
مسٹر گل کی ٹیبل پر گئی۔ وہ لگاتار جیت رہے تھے
اس لئے اُٹھنا نہیں چاہتے تھے لیکن جب بیوی کا
اُداس، اُترا ہوا چہرہ دیکھا تو دوستوں سے معذرت
کرکے اُٹھ آئے۔

"مسز والیہ، ڈاکٹر رندھاوا کے ساتھ آنکھیں
ٹیسٹ کرانے گئی ہے۔"

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔!"

"مسز والیہ بستی میں آئی کیمپ لگوائے گی۔۔"

اب مسٹر گل سوچ میں پڑ گئے۔ اس فکر میں
گھلتے وہ گھر آگئے۔ کار میں وہ دونوں خاموش رہے تھے۔
احتیاطاً وہ ڈاکٹر رندھاوا کے کلینک اور کوٹھی میں
ہو آئے تھے گھر پہنچ کر مسٹر گل نے پیگ بنایا۔ گلاس
لبوں سے لگا اُنھوں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ لگا جیسے
یہ عمارت ابھی گر جائے گی

"ایک چھوٹا تم بھی لے لو۔ پھر کوئی حل تلاش کرتے
ہیں۔"

ایک گھونٹ بھر کر مسز گل کو جیسے کچھ یاد آگیا۔
بولی۔

"مسز والیہ کی آنکھیں تو اچھی بھلی ہیں۔۔۔ پھر"

مسٹر گل سوچ رہے تھے کہ پُرانی حویلی کی دیوار
تلے آکر وہ مزدور مرتے مرتے بچا تھا۔ آثارِ قدیمہ میں
(باقی صفحہ ۴۱ پر)

عشرت امیر

وہ آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اُسے لگا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کے سائے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن اس نے پرواہ نہیں کی، اور آگے بڑھ گئی۔ آئے کوئی اس کی بلا سے..... کِس کِس کی پرواہ کرے....

اتنی بھیڑ! لوگ آجا رہے ہیں۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے وہاں آگ لگ گئی ہے۔ اور لوگ بدحواسی میں بھاگ رہے ہیں۔ کچھ آگ بجھانے، کچھ لوگ آگ سے بچنے کے لئے۔ کون آجا رہا ہے۔ کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ سب اپنے کام کی جلدی میں تیزی سے بھاگ رہے ہیں،

بھیڑ سے بچتی ہوئی وہ آگے بڑھتی رہی۔ کسی سے کندھا چھو جاتا تو کسی سے زور سے ٹکرا جاتا۔ اس کے دل میں آیا کہ پرس بائیں ہاتھ میں لے لے..... اور جو جان بوجھ کر ٹکرائے اس کے گال پر الٹے ہاتھ سے زوردار طمانچہ مارے پر ہوتا کچھ نہیں!

اور تو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اُسے سب سے زیادہ بےچینی ہو رہی تھی اس سے جو برابر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا —— اس کے ہونے کا احساس ہی اُسے مضطرب کر رہا تھا۔

کسی کی پیچھا کرتی ہوئی نگاہیں۔ جیسے اُس کے آرپار ہو رہی تھیں۔ تیکھی اور تیز۔ ا

اس کی چال میں تیزی آگئی تھی، ساتھ والا بھی اتنا ہی تیز چل رہا تھا۔ اس نے تب محسوس کیا تھا۔ ابھی اسے سبق نہیں سکھایا تو راہ چلتی یہ مصیبت گلے پڑ جائے گی، اس نے سوچا اور رُک گئی،

پیچھے والا نزدیک آیا تو وہ عقاب کی طرح جھپٹ پڑی، "شرم نہیں آتی اس طرح پیچھا کرتے ہوئے، بس میں سیٹ کیا دے دی، پیچھا کرنے لگے"..... آنے والا شخص بھونچکا رہ گیا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں، میں سمجھا نہیں..... کون پیچھا کر رہا ہے؟"

"تم کیوں سمجھو گے، تمہیں تو سمجھانا پڑے گا اور یہ مجھے خوب آتا ہے....." اس نے طنزیہ کہا۔

وہ بھی غصہ میں آگیا، "آپ کو کسی شریف آدمی سے بات کرنے کا ڈھنگ تو سیکھنا چاہیئے۔"

"تم اور شریف! سب شرافت نکل جائے گی" اس نے سختی سے کہا۔

"میں شریف نہ سہی۔ لیکن آپ پاگل ضرور ہیں!" اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ —— دل ہی دل میں تلملاتی رہ گئی، کرے بھی کیا؟ اتنی ہمت کیا کم کی؟ وہ سوچ رہی تھی۔ چار دن پہلے

جب وہ گاڑی سے اتری تو اتنی بھیڑ اور چیخ و پکار سن کر
گھبرا اٹھی تھی، اتنا بڑا شہر، انجانا شہر۔۔۔۔۔۔
بھیّا لینے آتے تھے ورنہ اس نے اپنے چھوٹے سے شہر
واپس جانے کی ٹھان لی تھی، اب جو کچھ ہوا۔ اور جس طرح
سے ہوا، اُسے خود حیرانی ہو رہی تھی، بھائی کو بتائے تو
وہ یقین نہیں کریں گے، اتنی سی لڑکی اور اتنی تیز ہو ہی
نہیں سکتی۔۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا کہیں گے؟

گیتا۔ سامنے کی میز کی طرف دیکھتی ہے، وہی
ہے فائلوں پر سر جھکائے۔۔۔۔ دوسری میز خالی
ہے۔ ٹائپسٹ کہیں باہر گئی ہے۔

اس سے اور ٹائپسٹ سے تھوڑی بات ہو چکی
ہے وہ اپنی میز پر ڈٹ کر بیٹھا ہے اور ٹائپسٹ۔
کوئی مس چھن چھن والا ہے، لڑکا کا سا لڑکی، اسکرٹ
پہنے، اسکارف باندھے، کھٹ کھٹ کرتی قریب دس
بار کمرے میں آئی اور گئی اس کا جی چاہا کہ اس بار وہ آئے
تو اسے مس ڈاڑھی والا کہہ کر پکارے، اور خوب
زور سے ہنس پڑے، لیکن وہ کہتی کچھ نہیں۔ فائلوں پر
نظر گڑائے رکھتی ہے کبھی انھیں پلٹتی ہے اور کبھی حاشیے پر
لکھے ریمارکس پڑھتی ہے۔

صبح سے اب تک کی کہانی جیسے اِن ہی کاغذوں پر
لکھی ہوئی ہو۔ جو ریمارکس اِن میں دیئے گئے ہیں۔ وہ اور
کچھ نہیں، صبح سے لے کر اب تک کی گئی باتیں ہیں۔ یا سوچی گئی
باتیں ہیں کہ اسے کس وقت کیا کہنا ہے؟

صبح آفس کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ گھبرا اٹھی
تھی، اتنی بڑی بلڈنگ اتنی بھیڑ، پہلی بار آئی تھی، پیچھا
کرنے والا اس کے آگے آگے ہی اِس بڑی بلڈنگ میں پھیلی
بھیڑ میں کہیں کھو گیا تھا۔ اور تب اُسے افسوس ہوا تھا،
ناحق ڈانٹا، اُسے بھی اِدھر آنا تھا، لیکن مجھے کیا پتہ تھا؟
وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی تھی،

اب کیا کروں؟ کوئی پہچان والا ہی دکھائی دے
جائے، وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی، خود اپنا
قصور تھا، کیسے الزام دے؟ بھائی نے کہا بھی تھا۔۔۔۔
چلو چھوڑ آؤں، پہلا دن ہے!

لیکن تب وہ شیر بن گئی تھی،

وہ کمروں کے باہر دروازوں پر لگی نیم پلیٹ
پڑھنے لگی، دو، دو مینجر دو ڈیپارٹمنٹ ہیں اور دونوں
کے الگ الگ مینجر، بھائی نے اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ
اسے کس ڈیپارٹمنٹ کے مینجر کے پاس جانا ہے۔۔۔۔
تب ہی وہ۔ نمودار ہوا ـــــ گیتا نے اُسے پکارا
بھی، سنیئے، ۔۔۔۔۔ سنیئے تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور
دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"بدتمیز!" وہ بڑبڑائی،

قریب دس منٹ بعد ہی وہ آ کر اس کے
قریب رک گیا تھا۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

"جی نہیں بلایا ـــــ یہی تو غلطی ہوتی، اب
پتہ چلا کہ لوگ اس حد تک بدتمیز ہوتے ہیں!" اس نے
بات پر دھیان نہیں دیا اور کہا تھا ـــــ "کام ضروری تھا
۔۔۔۔۔ بہت جلدی میں تھا ـــــ آپ کو کوئی کام ہے
یہاں؟"

"جی نہیں!"

سروس یہیں لگی ہے!

کس ڈیپارٹمنٹ میں!

جواب میں گیتا نے اپائنٹمنٹ لیٹر بڑھا دیا
تھا، اس نے پڑھا، "ارے آپ تو ہمارے ڈیپارٹمنٹ
میں ہی آئی ہیں؟

وہی اُسے مینجر کے پاس لے گیا تھا۔ مینجر نے
بھی اس سے کہا تھا۔ مسٹر آنند، آپ ذرا اِن کو گائیڈ
کرتے رہیں، اور وہ مینجر کے پاس سے اس کے ساتھ ہی
واپس لوٹی تھی۔

"آج سے آپ اس کمرے میں رہیں گی، ابھی تو
آپ صرف اِن فائلوں کا جائزہ لیجئے، اور کوئی کام نہیں
ہے۔"

وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور تب سے بیٹھا
ہے فائلوں میں سر جھکائے۔ کیا مشین کی طرح کام کرتا
ہے۔ اس کا ایک بار بھی اپنی طرف نہ دیکھنا گیتا کو
بہت بُرا لگا، یہ فائلیں لہریں ہیں جو اُسے چھو کر لوٹ
جاتی ہیں۔ لیکن یہ!

تب ہی مشین رُک گئی، لہریں ساکت ہوئیں اور
وہ اٹھ کھڑا ہوا "لنچ ہو گیا ہے۔ یہیں چائے لینا پسند
کریں گی، یا کینٹین چلا جائے۔"

وہ اس کی میز کے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن گیتا
سر نہیں اٹھا سکی،

"آپ نہیں بولیں گی، لیکن میں بدتمیز جو ٹھہرا، اس لئے
بولنا ہی پڑے گا۔ . . . وقت ختم ہو گیا تو آپ کے
ساتھ مجھے بھی بھوکا ہی رہنا پڑے گا۔" وہ اٹھ کھڑی
ہوئی تھی۔ دونوں کینٹین میں آ گئے تھے، بالکنی کی
جالی سے دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی، ہلکی سردی میں
یہ دھوپ کتنی اچھی لگتی ہے اس نے چائے کے ساتھ
کچھ اور چیزیں بھی منگوالی تھیں۔

چائے ختم ہوتے ہوتے —— گیتا کی جھجک
اور شرم کسی حد تک دُور ہو چکی تھی، آپ نے اپنے بارے
میں کچھ بتایا نہیں!

کیا؟

یہی کہ آپ کا نام . . . . . وغیرہ

آپ نے تو پہلے ہی میرا نام رکھ دیا۔ "بدتمیز"۔ . . .
اتنا کہہ کر وہ ہنسا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

آپ مجھے صرف آنند کہہ سکتی ہیں۔

چائے پی کر دونوں واپس لوٹ پڑے۔

کمرے میں آ کر وہ پھر اپنے کام میں مصروف
ہو گیا۔ شام کو وہ پھر ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے
تھے، آنند اب آگے تھا۔ اُس نے پکارا بھی تھا ساتھ
آنے کے لئے، لیکن گیتا نے ہی قدم سُست کر دیئے
تھے، بس اسٹاپ پر اچھی خاصی بھیڑ تھی، لمبی قطار میں
کھڑے وہ مسکرا دیئے تھے، گھنٹہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔
دونوں جیسے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں۔ دو
بسیں بھیڑ کی وجہ سے مس کر دی تھیں گیتا نے، آنند
بھی رُک گیا تھا۔ اس طرح تو آپ رات تک بھی گھر
نہیں پہنچ پائیں گی، آنند نے کہا۔

تو؟

"ایک دھکا لگے تو دو دھکے لگا کر بس میں چڑھنے
کی کوشش کیجئے، تب ہی چڑھ پائیں گی۔"

قطار دو بار ٹوٹ چکی تھی، اور وہ وہیں
کے وہیں تھے، ایک منی بس ملی تو اتفاق سے دونوں
کو ایک ساتھ ہی سیٹ ملی۔

گیتا کو آنند کے ساتھ ہی بیٹھنا پڑا۔ اُسے
اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو شاید وہ یہ بس بھی چھوڑ
دیتی۔ وہ سوچ رہی تھی، سارے راستے خاموشی،
بس سے باہر سڑک پر چلتی موٹر گاڑیوں، بسوں،
اسکوٹروں اور سائیکلوں کو دیکھ رہی تھی، جیسے
اُسے کسی سے کوئی مطلب نہیں، نہ بس میں سوار بھیڑ
سے نہ پاس بیٹھے آنند سے۔

"کیا آپ نے چپ شاہ کا برت رکھ لیا ہے؟"
وہ دھیرے سے بولا۔

"نہیں تو!" وہ ہڑبڑا کر بولی،

بس رُکی تو وہ بس اسٹاپ سے پہلے ہی اتر گئی۔
آنند سے بچنے کے لئے، لیکن گھر کے دروازے تک اُسے
یہی محسوس ہوتا رہا کہ جیسے آنند اس کے پیچھے پیچھے
آ رہا ہے۔ ایک بار اس نے مڑ کر بھی دیکھا تھا۔
اس کی ذہنی حالت عجیب سی ہو رہی تھی، مکڑی کے

جالے سے نکلنے کی جتنی کوشش کرتا ہے، اتنا ہی
جکڑتا جاتا ہے ایسا ہی کچھ گیتا محسوس کر رہی تھی ـــــ
دُور ہٹنے کی کوشش میں وہ آنند کے اپنے آپ کو اور
زیادہ قریب پاتی۔

کئی بار وہ گھر سے نکلنے سے پہلے یہ فیصلہ
کرتی۔ آج آنند سے زیادہ بات نہیں کرے گی، لیکن آنند
موقعہ ملتے ہی باتوں کا سلسلہ اس طرح سے شروع کرتا کہ
اس کے سارے فیصلے موم کی طرح پگھل جاتے تھے۔

دھیرے دھیرے گیتا نے محسوس کیا کہ غیر
ارادی طور پر وہ آنند کے اتنے قریب آ چکی ہے کہ اس
سے دور ہونے کے احساس سے ہی وحشت ہونے لگتی
ہے۔ وہ انجانے میں اتنا آگے بڑھ چکی تھی کہ اب واپس
لوٹنا بھی مشکل تھا۔

بھائی نے دو ایک بار اُن دونوں کو ایک ساتھ
دیکھ لیا تھا۔ لیکن ابھی کچھ پوچھا نہیں تھا۔ ایک بار خود گیتا
نے ہی بتایا تھا کہ "بھیّا وہ آنند ہیں۔ میرے ساتھ ہی
دفتر میں کام کرتے ہیں۔ مجھ سے سینئر ہیں۔"

"ایک بار بھائی نے اچانک اس سے پوچھا تھا،
گیتا کیا آنند تجھے بہت اچھا لگتا ہے؟" وہ کچھ نہیں
کہہ پائی تھی، اس کا سر جھک گیا تھا اور بھائی ہنس پڑے
تھے۔

گیتا قدم قدم بڑھتی رہی۔ مڑ کر دیکھنے سے
کبھی اسے ڈر لگتا تھا۔ کبھی دیکھا نہیں، کبھی سوچا نہیں۔
ماں کو پتہ چلے گا تو کیا کہیں گی؟ یا پاپا کیا سوچیں گے؟

اس کی ماں دقیانوسی ضرور تھیں لیکن جس طرح
وہ تین بار ٹھکرائی گئی تھی ماں کے پاس مخالفت کرنے
کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی،

بنا کسی عیب کے، بنا کسی کمی کے یہ کہہ کر ٹھکرایا
جانا "جانے کس ذات کی لڑکی آپ نے پال لی ہے،" اُسے
اپنے بارے میں زبردست بے انصافی لگتی تھی۔ ٹھیک بھی
تھا۔ وہ اپنے ان ماں باپ کی اصلی لڑکی کہاں تھی۔ اُسے
انھوں نے صرف پالا پوسا تھا۔

گیتا نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پاپا کی
خودداری کو مجروح نہیں ہونے دے گی وہ! اس نے
بھائی کو خط لکھ کر اپنے فیصلہ سے مطلع کیا تو اس نے اُسے
اپنے پاس بلا لیا تھا اور یہ نوکری دلوا دی تھی۔

کبھی کبھی وہ آنند کے بارے میں سوچتی، دیکھو
آنند پیار رکھنے ہی نہ دینا لیکن میرے ساتھ ہمدردی
مت جتانا۔ میں ہمدردی نہیں پیار کی بھوکی ہوں۔

آنند کے پیار کو وہ کسی تپتے ہوئے صحرا میں نخلستان
سے کم نہیں سمجھتی تھی۔

گیتا نے آنند کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا
تھا، ٹھکرائے جانے کی بات بھی بتا دی تھی، پھر اس نے
آنند سے کہا تھا، کیا تم بھی۔

نہیں! آنند نے پختہ لہجہ میں کہا تھا۔

سوچ لو!

سوچ کر ہی کہہ رہا ہوں، میں نے بہت سوچ
سمجھ کر تمہیں اپنایا ہے۔

سنیچر کی دوپہر دونوں کی مشترکہ ہوتی، اور
ان کا ساتھی ہوتا، سونا، اُداس ہمایوں کا وہ بوڑھا
مقبرہ۔ گلاب کی جھاڑیوں کے پاس بیٹھنا گیتا کو بہت
اچھا لگتا ہے۔

ممّی اور پاپا کچھ دنوں کے لئے آئے تو وہ شام
گیتا کو گھر پہ ہی گزارنی پڑی ایک کمرے سے دوسرے
کمرے میں۔ یا پلنگ پہ کروٹیں بدلتے ہوتے۔ کہیں بھی
چین نہیں ملا اُسے!

ایک دن آنند غصّہ سے بولا۔ تمہارے ممّی پاپا کب
واپس جائیں گے؟"

کیوں؟

نہ ٹھیک سے ملاقات ہو پاتی ہے نہ ملنا ہوتا

ہے اکب تک ؟

ملتی تو ہوں روز ہی!

یہ ملنا ہے ؟ اِس طرح ملنے سے تو نہ ملنا بہتر ہے!

آنند! تم سمجھتے کیوں نہیں، ماں سے یہ سب کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، پاپا سے کہوں تو......

خیر۔ میں سُننا نہیں چاہتا، تم اِس اتوار کو آؤ گی، بس!

گیتا روہانسی ہو گئی تھی، آنند تم میری مجبوری نہیں سمجھتے!

گیتا پہنچی تھی۔ ماں سے جھوٹ بول کر۔ آنند گھاس پر لیٹا انتظار کر رہا تھا چھٹی کی وجہ سے مقبرہ پر گھومنے والوں کی بھیڑ تھی۔

گیتا آنند کے نزدیک ہی بیٹھ گئی تھی۔

اور پھر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مقبرہ سونا ہوتا جا رہا تھا، اسے لگا یہ بوڑھا مقبرہ اگلے اتوار کے انتظار میں سونے جا رہا ہے۔

آنند اٹھتا نہیں۔ گیتا اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ باہنہ پکڑ کر اُسے پھر بٹھا لیتا ہے۔ کچھ دیر اور...... ابھی دل بھرا نہیں!

"ارے اٹھو۔ دیکھو کتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"مجھے گھر جانا ہے!"

"ضروری ہے کیا؟"

"ہاں، اِس وقت تو!" وہ ایک ہی جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے!

دونوں ساتھ ساتھ لوٹتے ہیں، چپ چاپ پھر آنند پوچھتا ہے۔

"اندھیرے سے ڈر لگتا ہے!"

"شاید!" وہ مڑک کر کہتی ہے!

"جانتی ہو گیتا، مجھے یہ اندھیرا اچھا لگتا ہے، اندھیرا سب کچھ ایک کر دیتا ہے سب عیب چھپ جاتے ہیں سارے امتیاز اور فرق ختم ہو جاتے ہیں۔ ہم۔ تم سب ایک سے....."

دونوں گلاب کی جھاڑیوں کو پیچھے چھوڑ کر مقبرے کے گیٹ تک پہنچ جاتے ہیں پھر اور آگے۔ بوڑھا مقبرہ اندھیرے میں کہیں کھو گیا ہے۔

اور گیتا کے کانوں میں شہنائیاں سی گونج رہی ہیں!

غزل

نازسونی پتی

وفاداروں نے جتنی بھی وفا کی
جفا کاروں نے اتنی ہی جفا کی

نہیں سُنتا کوئی ناصح کی باتیں
نہیں کچھ پیش چلتی پارسا کی

کہاں تک خون روئیں گی یہ آنکھیں
انھوں نے کونسی ایسی خطا کی؟

جسے تُو نے ہنسی کی بات سمجھا
کہانی تھی دلِ درد آشنا کی

زبانِ ناز سے کیونکر ادا ہو!
جو خوبی ہے تیری اک اک ادا کی

رام سروپ ورما

میوات کا علاقہ ارادلی پہاڑیوں سے گھرا۔ اُدبڑ کھابڑ اور بنجر زمین گوڑگانوہ ضلع کے نوح۔ تاوڑو۔ نگینہ، پُنہانہ۔ فیروز پُور جھرکہ پانچ بلاکوں اور فرید آباد ضلع کے ہتھین بلاک پر مشتمل ہے، ۱۸۷۳ مربع کلومیٹر کے رقبہ اور ۴۹۱ گاؤں میں تقریباً ۵ لاکھ کی آبادی بسی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ہریانہ ریاست سے لگے راجستھان کے الور۔ اور بھرت پور ضلعوں کے کچھ گاؤں بھی علاقہ میوات کہلاتے ہیں۔ اور زیادہ آبادی میو برادری کی ہونے کی وجہ سے ہی اِسے میوات کہتے ہیں۔ اِس علاقے کے لوگ زمانہ قدیم سے بہادر۔ جنگجو اور نہایت ہی جفاکش اور محنتی رہے ہیں۔ اور ترقی کے ذرائع کی غیر موجودگی میں کھیتی باڑی اور پشو پالن کرکے پُرانے ڈھرے پر ہی زندگی گذارتے چلے آرہے تھے

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی پہلی لڑائی میں میوات کے عوام نے انگریز فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ گوڑگاؤں کے نزدیکی گاؤں رائے سینہ میں ساری انگریز فوج کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس پر انگریز حکومت نے میوات کو دبانے اور برباد کرنے کی ٹھانی۔

فروری ۱۸۵۸ء میں ضلعوں کے ریگولیشن سے اس علاقے کو بھی الگ کرکے ہریانہ کے دوسرے علاقوں کے ساتھ ہی جان لارینس نے پنجاب کے علاقے کے ساتھ منسلک کر دیا۔ نتیجے کے طور پر علاقے کا وکاس رُک گیا۔ اور سارا علاقہ غریبی۔ فاقہ کشی اور پسماندگی کا شکار ہوتا رہا۔

موجودہ سرکار جو سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں کے لوگوں کی اقتصادی اور سماجی حالت سُدھارنے اور سماج میں اُنھیں برابری کا حق دلانے پر کمربستہ ہے نے اِس پچھڑے علاقے کی کایا کلپ کرنے اور ریاست کے دوسرے ترقی پذیر علاقوں کا ہم پلّہ بنانے کے نظریہ سے ہی وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری بھجن لال کی قیادت میں میوات ڈویلپمنٹ بورڈ کی تشکیل کی — اور ڈپٹی کمشنر گوڑگاؤں کے زیرِ صدارت میوات ڈویلپمنٹ ایجنسی قائم کی گئی۔ ریاست کے دوسرے علاقوں میں جاری ترقیاتی اسکیموں کے ساتھ ساتھ خطۂ میوات کی ترقی کے لئے کئی اہم اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں۔ اب تک میوات علاقے کے وکاس پر ۹۲۴ لاکھ روپے کے قریب خرچ کئے گئے ہیں۔ اِس سے علاقے کے لوگوں کی اقتصادی حالت میں قابلِ ذکر سُدھار ہوا ہے۔ علاقے کے ۸۰ فی صد لوگوں کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہے۔ اسی لئے میوات ڈویلپمنٹ بورڈ نے کھیتی باڑی کے وکاس کے لئے کئی ایک کارگر اسکیمیں لاگو کرکے کھیتی باڑی کی پیداوار بڑھانے میں نمایاں

ادا کیا ہے۔ یہ علاقہ اراولی پہاڑیوں کے جھرمٹ میں بنجر اور اُوبڑ کھابڑ ہونے کی وجہ سے یہاں زمین کا کٹاؤ جاری رہتا تھا۔ اسی کے مدِّ نظر واٹر شیڈ مینجمنٹ اسکیم تیار کی گئی۔ جس کے تحت زمین کا کٹاؤ روکنا۔ پھلدار اور دوسرے درخت لگانا۔ مچھلی پالنا وغیرہ شامل ہیں۔ زمین کے کٹاؤ کو روکنے اور فالتو پانی کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے میوات کو ۹۰ منی واٹر شیڈوں میں بانٹا گیا ہے۔ پچھلے پانچسالہ پلان کے دوران یہ اسکیم علاقے کے ۳۴۴ گاؤں میں لاگو کی گئی تھی۔ جس پر ۷۶ لاکھ روپیہ کا خرچ آیا۔

فصل کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں سے بچانے کے لئے تھم پک اپ وین“ خریدی گئیں۔ جن سے کیڑے مار دوائیاں چھڑکی جا رہی ہیں۔ اور پچھلے ۵ سالوں میں اس کام پر ۱۰ لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔

کھیتی کی پیداوار بڑھانے کے لئے اُن جگہوں پر جہاں کہ پانی کی سطح اُوپر ہے کنوؤں اور ٹیوب ویلوں کی کھدائی کے لئے بورنگ اور بلاسٹنگ کا کام کیا جا رہا ہے۔ جس کے لئے متعلقہ مشینیں خریدی جا چکی ہیں۔ اور اس کام پر ۵۶۲۰ لاکھ روپیہ کا خرچ آیا کھیتی کے ساتھ ساتھ پشو پالن کو بھی منافع بخش سمجھتے ہوئے میوات وکاس ایجنسی نے اس شعبے میں کارگر قدم اُٹھائے ہیں۔ یہاں مویشیوں کی زیادہ تعداد کے بموجب مویشیوں کی اچھی صحت اور نسل سُدھارنے کے لئے جن کی کہ علاقے میں تعداد تقریبًا ۳۶۵۵ لاکھ ہے۔ بیماریوں سے بچانے کے لئے جراثیم ختم مہم چلائی گئی۔ جس پر ۵ سالوں میں ۶۵ ۷ لاکھ روپے کا خرچہ آیا۔ اور لگ بھگ ۳۲۶۰۰۰ مویشیوں کا علاج کیا گیا۔ اس کے علاوہ پشوؤں کی بیماری کی جانچ کرنے کے لئے نوح میں ایک لیبارٹری قائم کی گئی ہے۔

دِلّی کے نزدیک ہونے کی وجہ سے گوڑگانوہ ضلع میں مُرغی پالن کا کاروبار بڑے پیمانے پر اپنایا گیا ہے۔

چھوٹے کسان اور مزدُور طبقہ کے لوگوں کو اس کام کو اپنانے کے لئے سرکار کی طرف سے مُکسایا گیا ہے۔ تاکہ اُن کی آمدن میں اضافہ کیا جا سکے۔ مُرغی پالکوں کو چھ ہفتہ کے چُوزے مہیّا کرانے کے لئے نوح میں ایک مُرغی پالن سینٹر قائم کیا گیا ہے۔ جہاں ۲ لاکھ روپے خرچ کرکے ۶۶ ۲ ۷ چُوزے مرغ خانوں کے مالکان کو دئے گئے۔

ہریانہ دستکاری ایکسپورٹ کارپوریشن نے علاقہ میوات میں ۴ تربیتی سینٹر کھولے ہیں۔ جن میں لوگوں کو چمڑا۔ ہوزری۔ موڑھا بنانا اور پوٹری کے کام دھندوں سے متعلقہ ٹریننگ میوات وکاس بورڈ کے زیرِ اہتمام دی جا رہی ہے۔ اب تک اس کام پر ۱۲۶۳۵ لاکھ روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے۔

علاقے کے پچھڑے پن کو دُور کرنے میں مددگار تعلیم کی ضرورت کو دھیان میں رکھتے ہوئے میوات وکاس بورڈ کے فیصلہ کے مطابق ۶ سے ۱۱ سال کی عمر تک کے بچوں کی اسکولوں میں ۱۰۰ فی صد حاضری پر اوّل۔ دوئم۔ اور سوئم آنے والی پنچایتوں کو بالترتیب ۱۰ ہزار ساڑھے سات ہزار اور پانچ ہزار روپے گرانٹ کے روپ میں دئے جا رہے ہیں۔ علاقے کے ہر گاؤں میں پرائمری اسکول کے فیصلہ کے تحت اسکول بھون پر خرچ ہونے والی رقم کا ۷۵ فی صد میوات وکاس بورڈ اور باقی ۲۵ فی صد متعلقہ پنچایت کے زمین اور مزدوری کے روپ میں برداشت کرنے پر چھٹے پانچسالہ پلان کے دوران ۲۳۶۲۰ لاکھ روپے کی رقم میوات وکاس بورڈ نے خرچ کرکے ۹۹ پرائمری اسکولوں کی عمارتیں بنائی ہیں۔

میوات علاقے میں بارہ ماہی سینچائی کے ذرائع مہیّا کرانے کے نظریہ سے ایک ماسٹر پلان تیار کیا گیا ہے جس کے تحت سالِ رواں میں ۷۵ ہزار ایکڑ زمین میں سینچائی کی جا سکے گی۔ سیلاب سے راحت کے مدِّ نظر چندینی۔ اور نوح نالوں کی صلاحیت بڑھا دی گئی ہے۔ اور اُوجینا

ڈرائی ورشن ڈرین تیار ہو چکی ہے۔ کوٹلہ میں ایک ایڈیشنل پانی گھر کی تعمیر۔ لنڈو بانا نے کی تعمیر، پرانی چند بیتی نہر کی مرمت وغیرہ اسکیمیں پوری ہو چکی ہیں۔

میوات میں رہائشی مکانوں کی کمی کو دھیان میں رکھتے ہوئے میوات وکاس بورڈ کی طرف سے مکانوں کی تعمیر کے لئے ۰۷ لاکھ روپیہ کی رقم ہاؤسنگ بورڈ ہریانہ کو دی جا چکی ہے۔ زمین کے کٹاؤ کو روکنے، باڑھ اور طوفان وغیرہ کے دباؤ کو کم کرنے، عمارتی اور جلانے کی لکڑی اور چارے کی دستیابی کا انحصار جنگلات پر ہے۔ میوات میں جنگلات کی کمی پورا کرنے کے لئے ۶۲ لاکھ روپیہ کی رقم خرچ کی جا چکی ہے اس کے علاوہ نوح اسپتال میں میوات ڈویلپمنٹ بورڈ کی طرف سے ایک ٹی بی یونٹ اور ایمرجنسی وارڈ کھولا گیا ہے۔ اس کام پر پچھلے پانچ سالوں میں ۶۶۰ ۱۲ لاکھ روپے خرچ آیا ہے۔ یہ خطہ ہر لحاظ سے راہ ترقی پر گامزن ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خطہ اندھیرے سے اُجالے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے تو غیر واجب نہ ہوگا۔

بقیہ: سرو کے پیڑ صٓ ۳۳ سے آگے

کھودنے اور کھدائی کا کام اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔

"مسز والیہ پھر فارن ٹور پر چلی جائے گی۔" مسز گل بے حد متفکر تھی۔

مسز گل میز پر انگلیوں سے طبلہ بجا بجا کر کچھ سوچ رہے تھے۔ آخر جیسے سوچ کے کھنڈر سے نکل کر بولے۔

"تم کہہ رہی تھیں جتیا ن کی چھوٹی بہن کی آنکھیں خراب ہیں۔ اُسے ڈاکٹر رندھاوا کے کلینک لے جاؤ۔" وہ مسکرائے۔

"اس سے کیا ہوگا ۔۔۔۔ ؟" مسز گل نے حیرت سے پوچھا۔

"کبھی کبھی بالکل نئی عمارتیں بھی گرا دی جاتی ہیں"

مسز گل اطمینان سے ہنسی اور اپنے لئے بڑا پیگ بنا کر صوفے پر جا بیٹھی۔

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ قارئین پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور اُن کی مدد سے "تعمیر ہریانہ" کے خریداروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمیں اپنے ادب نواز دوستوں سے ایک بار پھر درخواست کرنا ہے کہ وہ خریداروں کی تعداد بڑھانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ پرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ پرچے کی خریداری کے لئے ایجنسیاں قائم کرنے کے لئے بھی ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔

۔۔۔۔ ادارہ

مہدی پرتاپ گڑھی

دیکھی جاتی نہیں اقدار کی یہ پامالی
آدمیت کا ہے اس دور میں منصب خالی

آدمی ہوں میں خطا مجھ سے بھی ہو سکتی ہے
ڈھونڈھتے کیوں ہو صفت مجھ میں فرشتوں والی

میں کسی شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ تو نہیں
میں ہوں انساں، مرا مقسوم نہیں پامالی

گھر سے باہر تو رہا جسم پہ خوش پوشی کا خول
گھر میں ڈستی رہی مجھ کو بھی شکستہ حالی

اور شہد آگیں بنانا ہے غزل کا لہجہ
بات کرنی ہے سلیقے سے لطافت والی

ہے یقیں مجھکو تری ذات پہ اتنا یا رب
مجھ سے خالق ملی خلوت میں مری بدحالی

جبر کر سکتا ہے تسخیر ممالک مہدی
دل کو جیتے ہے نظر حسنِ محبت والی

محسن جلگانوی

میں شہرِ خوش گماں کی نویدوں میں پھنس گیا
اپنے وطن سے دور یزیدوں میں پھنس گیا

جو آئے اختلاف کا دروازہ کھول دے
بیچارہ پیر اپنے مریدوں میں پھنس گیا

کھلتی نہیں ہیں خوف سے اب شاہ داریاں
کیا شہرِ کج کلاہ کلیدوں میں پھنس گیا

لوگوں نے زخم زخم کی تنقید بانٹ لی
میں کیا شکار تھا کہ ندیدوں میں پھنس گیا

آواز کے ہجوم میں پہچان کھو گئی
محسن درونِ حرف نشیدوں میں پھنس گیا

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔
سی۔او۔ ۱۸۹، ۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی۔
چنڈی گڑھ سے اکتوبر ۸۵ء کے لئے شائع کیا۔
طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ٹی۔ چنڈی گڑھ۔

Brahm Yoni Tirath, Pehowa

Cave of Vashishtha, Pehowa

Photo : Raj Kishan Nain

نومبر ۸۵ء
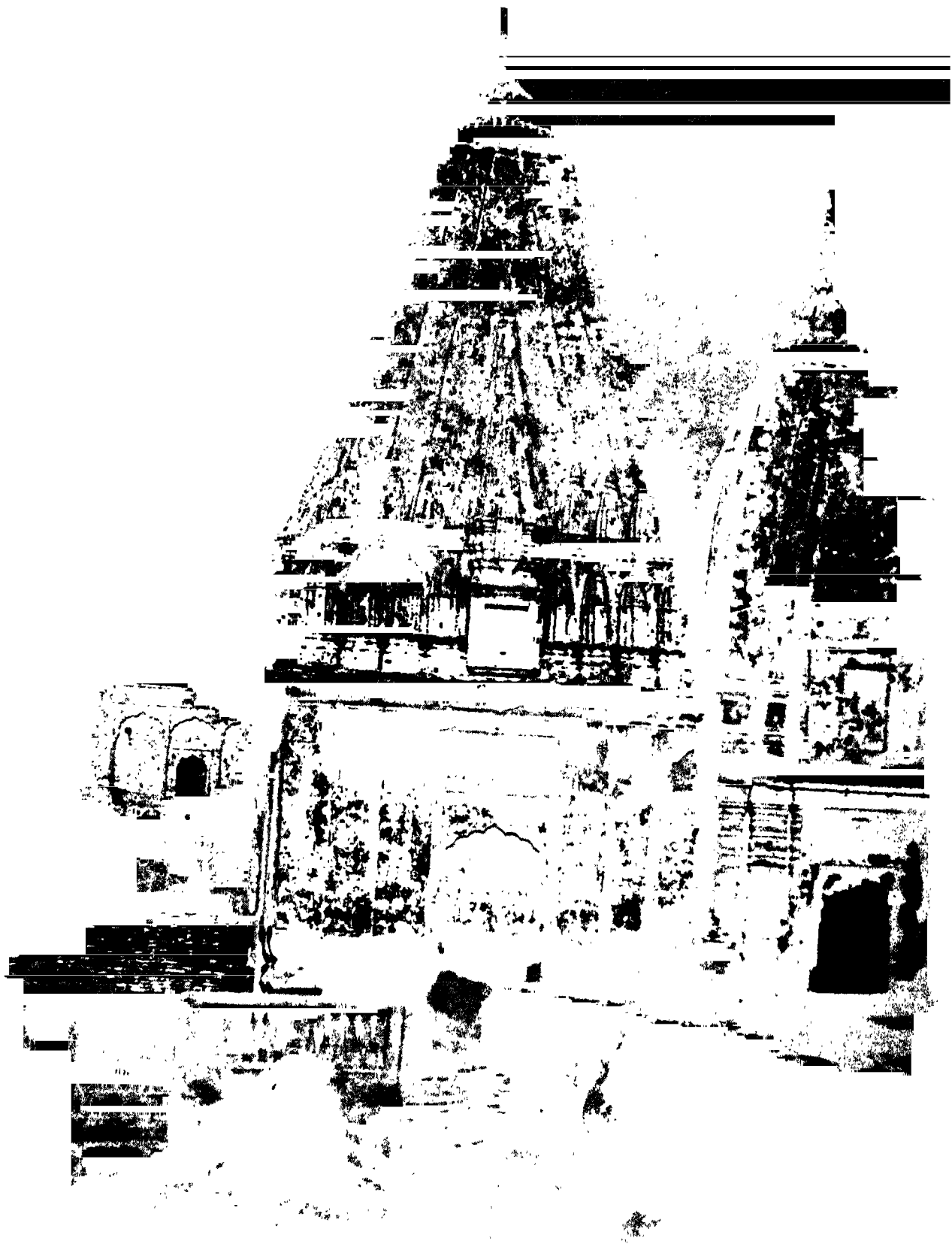
The ancient Dattatreya Temple, Pehowa

آپ کا محبوب مصور ماہنامہ

نومبر ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۱۱ | جلد نمبر ۱۳

مدیرِ اعلیٰ:

رنجیت ایسر

مدیر:

سلطان انجم

سرورق: مکیش سہگل

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

ڈاکٹر دھری چند گل انبالوی

میرا ہریانہ

میرے ہریانے کا گلشن پُر بہار　　میرے ہریانے کے موسم خوشگوار
میرے ہریانے کی دھرتی تابدار　　میرے ہریانے کی فصلیں زرنگار
میرے ہریانے میں ہر شے بیشمار

اس کا ہر اک مرد۔ مردِ آہنی　　جو مچا دیتا ہے رن میں کھلبلی
دھاک ہے دُنیا میں اس کے وار کی　　پھیل جاتی ہے جہاں میں سنسنی
اس کی جرأت ہر کسی پر آشکار

اس کی مٹی سونے سے بہتر کہیں　　اس کا پانی انگبیں ہی انگبیں ہو
اس کے مندر قابلِ صد آفریں　　گیان گیتا کا ہُوا اِفشا یہیں
اس جگہ ہیں علمِ حق کے رازدار

ہر طرف پانی کے رجبا ہے رواں　　ہر طرف لہرا رہی ہیں کھیتیاں
پھر رہے ہیں ہنستے گاتے نوجواں　　کیوں نہ پھر اس کو کہیں رشکِ جناں
اس زمیں پر کوہ و دشت و آبشار

رشکِ جنت ہے مرا باغِ وطن　　جس میں کھلتے ہیں محبت کے سمن
پُر بہار و پُر فضا میرا چمن　　دیکھتے ہی بنتی ہے جس کی پھبن
کیوں نہ آئے گل اس پہ ہم جائیں نثار

سید مظفر حسین برنی
گورنر ہریانہ

20 ویں یوم ہریانہ کے مبارک موقع پر میں اہلِ ہریانہ کو مبارک باد دیتا ہوں اور نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔ آج کے دن ہمیں خود کو ہریانہ کی جدید بنیادوں پر تعمیرِ نو کے لئے پھر سے وقف کرنا چاہیئے تاکہ ریاست 21 ویں صدی کی سمت مضبوط قدموں سے آگے بڑھے۔ معاشی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لئے ریاستی سرکار کے ترقی پسند نظریات کے علاوہ عوام کے شعوری اور مجموعی تعاون کی بھی ضرورت ہوگی۔

ہریانہ ملک میں 19 سال قبل الگ ریاست کے طور پر وجود میں آیا۔ یہ باعثِ مسرت ہے کہ ریاست اِس قلیل عرصے میں ہی شاہراہِ ترقی اور خوشحالی پر گامزن ہوئی ہے۔ اِس نے زرعی شعبہ میں قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ 1966 میں کمی والی اِس ریاست میں اجناس کی پیداوار 26 لاکھ ٹن تھی۔ آج یہ نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ مرکزی ذخیرے میں سب سے زیادہ اناج دینے والی ریاستوں میں اِس کا دوسرا مقام ہے۔ اب اجناس کی پیداوار 72 لاکھ ٹن سے زائد ہے۔

اِسی طرح صنعتی ترقی کے میدان میں ریاست نے نمایاں ترقی کی ہے۔ ریاست میں اب 63 ہزار سے کچھ زائد چھوٹی صنعتی اکائیاں ہیں۔ جبکہ 1966 میں ان کی تعداد محض 4,519 تھی۔ ہماری برآمدات تک بھگ 200 کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہیں۔ جبکہ 1966 میں یہ رقم صرف چار کروڑ 55 لاکھ روپے ہی تھی۔ بیرونی ممالک میں آباد ہندوستانیوں کو ہریانہ میں صنعتیں لگانے کے لئے خاص سہولیات دی جا رہی ہیں۔ دیہی تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو روزگار کے مواقع مہیا کرانے کے لئے دیہی صنعتی سکیم شروع کی گئی ہے۔ اِس سکیم کے تحت 10,000 سے زائد صنعتی اکائیاں قائم کی گئی ہیں۔ جن سے تقریباً 50,000 افراد کو روزگار ملا ہے۔

تعلیمی خدمات کے میدان میں بھی ترقی ہوئی ہے۔ لگ بھگ ایک کلو میٹر کے دائرے میں پرائمری سکول، 2.20 کلو میٹر کے دائرے میں مڈل سکول اور 2.00 کلو میٹر کے دائرے میں ایک ہائی سکول قائم ہے۔ پرائمری لڑکیوں کو تعلیم جاری رکھنے کے لئے فراخدلی سے وظائف دیئے جا رہے ہیں۔ ایسے طبی سہولیات 5.6 کلو میٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ ریاست میں خاندانی بہبود پروگرام بھی رضاکارانہ پروگرام کے طور پر چل رہا ہے۔

[illegible]

خواتین اور بچوں کی بہبود کے پروگرام کو بھی اولیت دی جا رہی ہے۔ انٹیگریٹڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ پروگرام نے بھی ریاست میں ترقی کی ہے۔ لگ بھگ چار لاکھ غریب سکولی بچوں کو دوپہر کا کھانا مفت دیا جاتا ہے تاکہ ان کی واجب نشو و نما ہو سکے۔ بہبودیٔ اطفال کی اہم رضاکارانہ تنظیم ہریانہ اسٹیٹ کونسل فار چائلڈ ویلفیئر کو ملک میں اعلیٰ ترین کونسل تسلیم کیا گیا ہے۔ کونسل ہذا کو بچوں کی بہبود کے میدان میں شاندار کارکردگی کے لئے ایک شیلڈ دی گئی ہے۔ بہبودیٔ خواتین کی سکیموں کو مؤثر بنانے کے لئے ہریانہ اکانومیکل ویکر کلاسیس کلیان نگم کے موجودہ نام کو تبدیل کر کے ہریانہ اکانومیکل ویکر سیکشن اینڈ ویمنس ویلفیئر کارپوریشن کرنے کی تجویز ہے۔

دیہات میں پینے کے صاف پانی کا انتظام ایک دوسرا اہم کام ہے۔ 4,690 دِقّت والے گاؤں میں سے 3,500 گاؤں کو یہ سہولت مہیا کرا دی گئی ہے۔ اُمید ہے آئندہ دو برسوں میں بقیہ گاؤں کو بھی یہ سہولت مہیا کرا دی جائے گی۔

ہریانہ سبھی گاؤں کو پکّی سڑکوں سے جوڑنے والی پہلی ریاست ہے۔ ریاست کو اپنی روڈویز پر فخر ہے۔ جس میں لگ بھگ 3,000 بسیں ہیں۔ ہریانہ روڈویز کو ملک میں اعلیٰ ترین تسلیم کیا گیا ہے۔ ہریانہ ٹورزم بھی اپنی آرام دہ خدمات کے لئے ملک بھر میں مشہور ہے۔ ریاست میں 30 سے زائد خوبصورت سیاحی مراکز ہیں۔ اور کچھ نئے مرکز زیرِ تعمیر ہیں۔

ریاستی سرکار آلودگی سے پاک ماحول مہیا کرانے کی ضرورت سے بھی باخبر ہے۔ ایک پولیوشن کنٹرول بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شجرکاری کے لئے ایک مہم چلائی گئی ہے۔ گزشتہ سال لگ بھگ 10 کروڑ پودے لگائے گئے۔ سالِ رواں کے لئے اتنے ہی پودے لگانے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

غریبی دور کرنے کے پروگرام بھی کافی ترقی کر رہے ہیں۔ چار لاکھ 35 ہزار کنبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے امداد دی گئی ہے۔ لگ بھگ تین لاکھ بے گھر افراد کو رہائشی پلاٹ دیے گئے ہیں۔ سبھی ہریجن بستیوں میں بجلی پہنچا دی گئی ہے۔ میوات کے پچھڑے علاقے میں ترقیاتی پروگراموں کو تیز کرنے کے لئے میوات ترقیاتی بورڈ قائم ہے۔ اِس سال اِس مقصد کے لئے 2 کروڑ 50 لاکھ روپے کی رقم مہیا کرائی گئی ہے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ریاست میں امن و امان ہے، ریاست میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارہ کا ماحول قائم ہے۔

میں ہریانہ کے محنت کش عوام کو ایک بار پھر دلی مبارکباد دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ ہریانہ کو ایک فلاحی ریاست بنانے کے لئے اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ بلاشبہ ریاست کا مستقبل تابناک اور شاندار ہے۔۔۔۔۔۔

عوامی بہبود

ہماری منزلِ مقصود

بھجن لال
وزیرِ اعلےٰ ہریانہ

یکم نومبر ہریانہ کی تاریخ میں ایک سنہری دِن ہے۔ جب ہم نے ہندوستانی ریاستوں میں ایک مکمل ریاست کا درجہ حاصل کیا۔ آج ہریانہ میں نئی زندگی، نئی قوت اور نئے جوش و خروش کا ماحول ہے۔ ۱۹ برسوں میں ہریانہ سرکار کی ہمہ پہلو سرگرمیوں اور جفاکش عوام کے تعاون سے ریاست کی کایا کلپ ہو گئی ہے۔

تہذیب و تمدن کا گہوارہ تسلیم ہونے والے ہریانہ نے قدیم اقدار، خیالات اور نظریات کو محفوظ رکھا ہے۔ یہاں کے محنت کش عوام نے مہابھارت کورو کی اِس سرزمین کے لئے فاضل اناج پیدا کرنے والی ریاست کی سابقہ عظمت کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے سخت محنت کی ہے۔ مستحکم صنعتی بُنیاد کے قیام سے نہ صرف اِس کم عمر ریاست کو نئی اقتصادی زِندگی مِلی ہے بلکہ اِس سے عوام کو روزگار کے نئے مواقع دستیاب ہوئے ہیں۔ طبی سہولیات میں توسیع، پینے کے صاف پانی کی فراہمی، تعلیمی اداروں کے قیام، ریاست میں ایک کونے سے دُوسرے کونے تک پھیلی بجلی اور لنک سڑکوں نے عوام کی زِندگی کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔

نابرابری اور حق تلفی کو دُور کرنے کے لئے کمزور طبقوں کی بہبُود پر زیادہ توجہ دینے سے اِن طبقوں میں خوشحالی اور اُمید کے نئے دَور کا آغاز ہوا ہے۔ آج تیزی سے ترقی کر رہی دُنیا کے ساتھ قدم مِلا کر چلنے کے لئے سائینس اور ٹکنالوجی کو اوّلیت دی گئی ہے۔ ہمارے جواں سال وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی کی بے خوف متحرک رہنمائی ترقیاتی سکیموں کی تکمیل میں ہمارے لئے مینارۂ نور ثابت ہوئی ہے۔

ہریانہ کسانوں کی ریاست ہے۔ اِس کے 82 فی صد سے زائد لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت پر انحصار رکھتے ہیں۔ روایتی زرعی ٹکنالوجی کی جگہ زراعت کے جدید سائینسی طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ بیجوں کی نئی اقسام، ترضیعات کی سہولیت، کھاد، نہروں کا بہتر استعمال، جراثیم کش دوائیں، سائینسی آلات، یقینی آبپاشی اور جدید جانکاری کے طفیل زرعی شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ کسانوں کی انتہائی محنت نے کم اناج والی اِس ریاست کو فاضل اناج والی ریاست میں تبدیل کر دیا ہے

ہماری غذائی اجناس کی پیداوار 1966 کی 26 لاکھ ٹن سے بڑھ کر 85-1984 میں 70 لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔ ہم نے 85-1984 میں اناج کے مرکزی ذخیرے میں 30 لاکھ ٹن اناج دیا ہے۔

زراعت آبپاشی پر منحصر ہے۔ ذرائع آبپاشی کے بہتر استعمال اور پانی کے بہتر انتظام سے خشک علاقوں میں پانی پہنچ گیا ہے۔ بلندی پر واقع علاقوں میں لفٹ آبپاشی اور ناہموار علاقوں میں چھڑکاؤ کے ذریعے آبپاشی کی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں بہاؤ سسٹم سے آبپاشی ممکن نہیں ہے۔ پانی کو رسنے سے روکنے کے لئے عالمی بنک کی امداد سے وسیع پیمانے پر راجباہوں کو پختہ کیا جا رہا ہے۔ اب تک تین کروڑ 78 لاکھ مربع فٹ سے بھی زیادہ آبی راستوں کو پختہ کیا جا چکا ہے۔ جس سے 600 کیوسک پانی کی بچت ہوئی۔ تمام کوششوں کے نتیجہ میں زیر آبپاشی کل رقبہ 36 لاکھ ہیکٹر تک بڑھ گیا ہے۔ جبکہ 1966 میں یہ رقبہ صرف 17.36 لاکھ ہیکٹر تھا۔ کم بارش والے علاقوں میں "ڈرائی لینڈ فارمنگ" کو اپنایا گیا ہے۔ 15 اگست 1986 کو ستلج یمنا لنک نہر مکمل ہونے پر جب راوی بیاس کے پانی میں سے ہمیں اپنے حصے کا پانی ملنے لگے گا، تو زیر آبپاشی رقبے میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں بجلی اہم رول ادا کرتی ہے۔ ہم تھرمل اور آبی وسائل کو بروئے لاکر بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے چالو بجلی پراجیکٹوں میں 195 میگاواٹ کا فرید آباد تھرمل پاور پراجیکٹ، 650 میگاواٹ صلاحیت کا پانی پت تھرمل پاور پراجیکٹ اور مغربی یمنا نہر پر 64 میگاواٹ کا ہائیڈل الیکٹرک پراجیکٹ شامل ہیں۔ بجلی کی زیادہ پیداوار کے لئے یمنا نگر کے نزدیک 840 میگاواٹ کا تھرمل بجلی گھر قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔ ہماری ان انتھک کوششوں سے بجلی کی پیداواری صلاحیت 343 سے بڑھ کر 1445 میگاواٹ تک پہنچ گئی ہے۔

بیرونی ممالک میں مقیم ہندوستانیوں کو ہریانہ میں صنعتیں قائم کرنے کی ترغیب دینے کے لئے ریاستی سرکار نے کئی قدم اٹھائے ہیں۔ صنعتی امدادی گروپ (آئی۔اے۔جی) ملکی آجروں کو عموماً اور غیر ممالک میں آباد ہندوستانیوں کو خصوصاً "ون ونڈو کانٹیکٹ سروس" فراہم کراتا ہے۔ موجودانہ 100 فیصد برآمداتی اور اعلیٰ ٹکنیکی اکائیوں کے قیام پر خصوصی مراعات دی جاتی ہیں۔ مختلف قسموں کی اشیاء تیار کرنے والی 63 ہزار چھوٹی صنعتی اکائیاں ریاست کے لوگوں کی صنعتوں سے حد درجہ دلچسپی کی عکاسی کرتی ہیں۔ دیہی صنعتی سکیم کے تحت دیہی علاقوں میں قائم 21538 اکائیوں میں 58,000 سے زائد لوگ کام کرتے ہیں جن میں سے 60 فی صد سماج کے کمزور طبقوں سے ہیں۔ صنعتی اشیاء کی برآمدات سے ہماری سالانہ آمدنی 200 کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ جبکہ ریاست کے قیام کے وقت یہ صرف ساڑھے چار کروڑ روپے تھی۔

ہریانہ سٹیٹ الیکٹرانکس ڈیویلپمنٹ کارپوریشن (ہرٹرون) الیکٹرانک کی منظم ترقی کو مہمیز کر رہا ہے۔ تقریباً 500 الیکٹرانکس اور متعلقہ یونٹوں کا ایک الیکٹرانکس کمپلیکس گوڑگاؤں میں زیر تعمیر ہے۔ ساتویں منصوبے کے اختتام تک الیکٹرانکس اشیاء کی سالانہ پیداوار 600 کروڑ روپے تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔ حکومت ہند نے ضلع سطح پر کمپیوٹر سسٹم لاگو کرنے کے لئے ہریانہ کو منتخب کیا ہے۔

تعلیم کا فروغ صوبہ کی ترقی کا اساس ہے۔ ہریانہ عوام میں خصوصاً سماج کے نظر انداز اور کمزور طبقوں میں تعلیم کے فروغ اور اسے مقبول عام بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ اس مقصد کے لئے لڑکیوں، پچھڑے طبقوں اور درج فہرست ذاتوں کو مراعات دی جاتی ہیں۔ تعلیمی سہولیات میں توسیع سے ہریانہ میں خواندگی کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ریاست میں پرائمری سطح تک تعلیم مفت ہے۔ پرائمری، مڈل، ہائی، ہائر سیکنڈری اور کالج سطح کی تعلیمی سہولیات بالترتیب 2.20 کلومیٹر، 2.80 کلومیٹر، [illegible] کلومیٹر

تعمیر ملت

۸

کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ تین یونیورسٹیاں اعلیٰ تعلیم کی عوامی ضروریات پوری کر رہی ہیں۔

سماجی نابرابری کو دور کرنے کے لئے کمزور طبقوں کی بہبود ہمارا اہم مقصد ہے۔ اب تک لگ بھگ 4 لاکھ 35 ہزار ایکڑ فاضل اراضی کمزور طبقوں کے 41,627 افراد میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ تین لاکھ بے گھر افراد کو مکانوں کی تعمیر کے لئے 100-100 مربع گز کے پلاٹ دیئے گئے ہیں۔ ہریانہ ہاؤسنگ بورڈ نے اپنے مکانوں میں سے 75 فی صد سے بھی زیادہ مکان سماج کے اقتصادی طور پر کمزور طبقوں میں تقسیم کئے ہیں۔

انٹیگریٹیڈ چائلڈ ڈویلپمنٹ پروگرام کے تحت صوبے کے 36 بلاکوں میں بچوں، حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین اور 44 — 15 سال عمر کے زمرے میں آنے والی خواتین کو ایک مشترکہ خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ ان خدمات میں مقوی غذا، متعدی بیماریوں سے حفاظت، طبی جانچ، صلاح مشورہ اور سکول سے پہلے کی تعلیم شامل ہیں۔ ملازمت پیشہ خواتین کی سہولت کے لئے ضلعی صدر دفاتر میں ہوسٹل زیر تعمیر ہیں۔

درج فہرست ذاتوں کے معیارِ زندگی کو سدھارنے کے لئے سبھی 56 43 ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی گئی ہے۔ ہم نے 45,805 ہریجن گھروں کو رعائتی خرچ پر ایک ایک پوائنٹ سے بجلی کے کنیکشن دیئے ہیں۔ 4,100 گاؤں کی گلیوں کو بھی بجلی کی روشنی سے منور کر دیا گیا ہے۔

ہم طبی خدمات پر خاص توجہ دے رہے ہیں۔ ہسپتالوں اور دواخانوں میں توسیع کی جا رہی ہے تاکہ حفظانِ صحت کی سہولیات عام آدمی تک بآسانی پہنچائی جا سکیں۔ اب یہ سہولت 5 کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہے۔ ہم اب طبی خدمات پر 1966 کے فی کس ایک روپیہ 33 پیسے کے مقابلے میں 49 روپے 92 پیسے خرچ کر رہے ہیں۔

خاندانی بہبود کا پروگرام ہریانہ میں مقبول ہو رہا ہے۔ فیملی پلاننگ سے مستفید ہوتے ہوئے، اولاد پیدا کرنے کے اہل جوڑے اپنا کنبہ محدود رکھنے کی غرض سے مختلف طریقوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ سرکار انہیں فیملی پلاننگ اپنانے کی طرف راغب کرنے کے لئے مختلف مراعات دے رہی ہے۔ ہریانہ کو اس پروگرام میں کامیابی کے لئے 1982-83 میں دوئم مقام حاصل ہوا اور 1983-84 میں دوبارہ یہ فخر حاصل ہوا۔

پینے کا صاف پانی انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ ریاست کے دقت والے گاؤں کو نلوں کے ذریعہ پانی مہیا کرانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اب تک 3,526 دقت والے گاؤں کو پینے کے پانی کی سہولت مہیا کی جا چکی ہے — اور 1987 کے آخر تک سبھی 4,690 دقت والے گاؤں کو یہ سہولت مہیا کرائے جانے کی امید ہے۔

اشیائے ضروریہ کی تقسیم کے طریقِ کار کو مناسب قیمتوں کی دوکانیں کھول کر مؤثر بنایا جا رہا ہے۔ مناسب قیمتوں کی 6,035 دوکانیں صارفین کو روزمرہ ضرورت کی اشیاء مناسب شرح پر دستیاب کراتی ہیں۔

آسان، تیز اور آرام دہ سفر سے جدید ترقی کی رفتار تیز ہوئی ہے۔ ہریانہ اپنے سبھی گاؤں کو پکی سڑکوں سے جوڑنے والی ملک بھر میں پہلی ریاست ہے۔ ان سڑکوں کے ذریعے مسافروں اور سامان کو لانا لے جانا آسان ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے پلاننگ کمیشن نے ہریانہ روڈویز کو 1980-81، 1983-84 اور 1984-85 میں ملک کی افضل ترین ریاستی روڈویز تسلیم کیا ہے۔ 2,972 بسوں میں ہر روز 11 لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں اور یہ 8 لاکھ 51 ہزار کلومیٹر کی مسافت طے کرتی ہیں۔

جنگلات ایندھن، چارے اور عمارتی لکڑی کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ماحولیاتی توازن قائم رکھتے ہیں۔ عوام کی تائید اور سرگرم تعاون حاصل کرنے کے لئے فارم اور سماجی جنگل بانی پراجیکٹوں کو مقبول بنایا جا رہا ہے۔ 33 کروڑ روپے کی عالمی بنک کی امداد سے

سماجک جنگل بانی پراجیکٹ کے تحت ۶۷ ہزار ہیکٹر اراضی پر شجر کاری کا خیال ہے۔ ہریانہ کو شجر کاری پروگرام میں فی ہیکٹر کی بنیاد پر اوّل مقام حاصل ہے۔

ہریانہ نے سیاحت میں قابلِ قدر مقام حاصل کرلیا ہے۔ قومی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ قائم 30 سیاحتی مراکز، موٹل، خیمہ گاہیں، بار، ریستوران، شاپنگ سینٹر، باتھ کمپلیکس، کشتی رانی اور گولف کی سہولیات، پکنکرز ہائیڈز اور کانفرنس جیسی وسیع تر خدمات مہیا کرتے ہیں۔ اِن سیاحتی مقامات پر کم بجٹ والے سیاحوں کے لئے خیمہ گاہیں اور ہتھالی سسٹم ہے۔ کچھ مرکز ریاستی ثقافتی ورثہ پر روشنی ڈالنے کے لئے میلوں اور تیج جیسے تہوار منانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ ہریانہ ٹورزم برسوں سے ترقی کر رہا ہے۔ اور مسافروں اور بین الاقوامی ٹریول ایجنسیوں کی ترغیب سے مزید کامیابیوں کے حصول کی سمت گامزن ہے۔

نئے ہریانہ کی تعمیر بلاشبہ ایک عظیم کام ہے۔ آیئے! ہم کمزور طبقوں کی بہبود اور عوام کی خوشحالی کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے متحد ہوکر کام کریں۔......

حامدی کاشمیری

غزل

قدم اُٹھاؤ، یہ اِک رہگزار روشن ہے
ستارہ مثلِ اِک اِک نوکِ خار روشن ہے

یہیں کہیں ہے وہ مہتاب دفن، دیکھو تو
سیاہیوں میں نواحِ مزار روشن ہے

تمام وادیاں ڈوبیں خزاں کی ظلمت میں
کہیں کہیں کوئی برگِ چنار روشن ہے

بُجھائے چاند ستارے ہوائے تیرہ نے
لہُو کی دھار سرِ ریگ زار روشن ہے

بُجھی ہیں کھڑکیاں ساری، غروبِ مہ کے ساتھ
بس ایک دیدۂ خونابہ بار روشن ہے

دکھائی دیتا نہیں کچھ بھی وادئ جاں میں
فضا میں ایک سیہ آبشار روشن ہے

فاطمہ ترمزی

خودکُشی

"یہ اخبار آپ کا ہے کیا آج کا ہے؟
"ہاں جی آپ دیکھ لیں ——— ۳ نمبر والے بیڈ کی مریضہ نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

"ایک ۳۵ سالہ عورت نے گھریلو حالات اور ازدواجی تعلقات کی خرابی کی وجہ سے خودکشی کرلی۔" پہلی خبر

"ایک سرکاری ملازم نے اپنے دفتر کی پانچویں منزل سے چھلانگ لگادی وہ ذہنی طور پر بہت پریشان اور مالی مشکلات اور قرض کی زیادتی سے ہراساں تھا۔" دوسری خبر

"ایک دن میں چار عورتوں کو جہیز زیادہ نہ لانے کے جرم میں جلادیا گیا۔" تیسری خبر

اف توبہ جب اخبار اٹھاؤ یہی خبریں زیادہ ملتی ہیں۔ خودکشی قتل، اغوا۔ ڈاکہ زنی کی وارداتیں۔ وہ تو اسی لئے اخبار پڑھنے سے گھبرانے لگی تھی۔ صبح صبح طبیعت مکدر ہو جاتی ہے خوامخواہ ۔ کس قدر جرائم بڑھ گئے ہیں۔ یوں تو دنیا حادثات سے بھری پڑی ہے کچھ لوگ شہرت، دولت، حسن و جمال سے مالا مال ہو کر بھی ذہنی کرب میں مبتلا ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ اور بہت سے غریب تنگ دستی اور لاچاری سے عاجز آکر موت کے آنچل میں پناہ لے لیتے ہیں۔ کچھ جذباتیت کی شورش طوفاں اس حد تک بڑھتی ہے کہ وہ عقل خرد کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں اور غیر فطری موت کو گلے لگا لیتے ہیں ——— پھر ——— پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ زندگی بہت پیاری ہوتی ہے کس طرح مرجاتے ہیں لوگ؟ کہ مرنے کے بعد بھی کوئی اعتراض کرتا ہے کہ بزدل تھا۔ کوئی عبرت کی نگاہ سے دیکھ لرز جاتا اور زیادہ تر یہی کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ اونہہ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے ـــ کیسے کر لیتے ہیں خودکشی وہ اکثر سوچتی رہتی ـ

یہ تو ٹھیک ہے کہ زندگی میں پوری طرح خوش اور مطمئن کوئی نہیں نہ رہ سکا ہے نہ رہتا ہے۔ بڑے بڑے والیان ریاست ۔ کرسی کے مالک، انتہا ہے کہ تخت و تاج کے مالک بھی چین کی نیند نہیں سو سکتے ہیں بس یہ فرق ہے کہ ان کے پاس وسائل ہوتے ہیں، دولت ہوتی ہے اور ان کے ہر قسم کے درد کے مداوے ہو جاتے ہیں خواہ وہ عارضی ہی لیکن

...ت تو انسان کے لئے لاکھ بہانے ڈھونڈ لیتی ہے اور جب جس کا
...لت آجائے اسے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ یہی ایک چیز ہے
جہاں انسانی طاقتیں عاجز ہیں اور انسان اس پر قادر نہیں ہے۔

"ماتاجی اب تم کائی ہما ہے۔" کیرل کی آئی ہوئی نرس اپنی ٹوٹی
پھوٹی ہندی میں اسے مخاطب تھی۔ "ابی ڈاکٹر آئیں گا اب آپ
باتھ روم جاسکتا۔ جاؤ باتھ بناؤ اب تو پہلا سے اچھا لگتا ہے۔" اور
نرس دوسری بیڈ کی طرف چلی گئی۔

"بہن جی اب تو آپ کو آرام ہے؟ پہلے تو بہت خراب طبیعت
تھی" اُس نے ساتھ والے بیڈ کی مریضہ سے پوچھا جو اپنے گیلے بال
تولیہ سے خشک کر رہی تھی۔

"ہاں جی بہن جی اچھے تو ہیں پر اس بیماری نے ہمارا جیون
نشٹ کر دیا۔ اب یہ ہمارا تیسرا آپریشن ہے جو کل ہو رہا ہے، ہم تو
کہتے ہیں بہن جی بھگوان اسی میں ہماری چھٹی کر دیں۔ بھلا آپ
بتاؤ تین سال ہو گئے۔ گھر برباد، پتی اور بچے تتر بتر یہ کوئی جیون ہے
بھلا؟" وہ آنتوں کی ٹی بی کی مریضہ تھی۔

"اجی کچھ بھی ہو خداوند تعالیٰ نے جو دکھ نصیب میں لکھ
دیئے ہیں وہ تو پورے کرنے ہی پڑیں گے بہنا" ایک اور
مریضہ نے کراہتے ہوئے اپنے پلاسٹر چڑھے آدھے جسم کو جنبش
دی۔ وہ اپنی بیماری اور حالت سے سمجھوتہ کر رہی تھی۔

"اور اپنے گرو جی تو کہہ ہی گئے ہیں کہ نانک دکھیا سب سنسار"
ایک نوجوان مریضہ کنگھی کرتے ہوئے بولی جس کو آٹھ ماہ سے حرارت
اور ہلکی کھانسی تھی اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ اصل مرض کیا ہے، جو کبھی مسلسل
بولتی اور ہنستی یا پھر روتی رہتی تھی — اس نے تولیہ اور صابن دانی
اٹھائی اور باتھ روم چلی گئی۔

وارڈ میں مریض عورتیں اپنی بیماری سے نالاں اور زندگی
سے بیزار تھیں علاوہ صرف ایک مسز تھیوفلس کے جن کی ۶۵ سال
کی عمر تھی آنکھیں کسی وبائی بیماری سے ایک تو بالکل بیکار ہو گئی
تھی اور دوسری میں برائے نام بینائی تھی مسز تھیوفلس کے شوہر کا
انتقال کئی سال پہلے ہو چکا تھا جب ان کے بچے چھوٹے تھے۔ ایک
بیٹا دوسرے ملک میں جا بسا تھا۔ لڑکی کی شادی ہو گئی تھی وہ
دوسرے شہر میں رہتی جب موقع ملتا ماں کے پاس آکر کچھ دن رہ جاتی
مسز تھیوفلس نے شوہر کے مرنے کے بعد ایک نرسری اسکول
چلایا تھا جس سے ان کی گذر بسر بھی ہوتی اور وہ اپنے غم بھی بھولی
رہتیں۔ دور کے رشتے دار کے یہاں رہتی تھیں لیکن جب معذور
ہو گئیں اور ہلکا بخار کھانسی بھی رہنے لگی تو ان کے رشتے داروں نے
انھیں اس ٹی بی اسپتال میں داخل کر دیا کہ کہیں انھیں انفکشن نہ ہو جائے
بیٹا پیسے برابر بھیجتا مگر آنے کا محض وعدہ ہی رہتا — لیکن مسز
تھیوفلس کس مزاج اور ظرف کی عورت تھیں کہ اپنی اس زندگی
میں مگن تھیں۔ نہ کسی کا گلہ نہ شکایت نہ زندگی سے مایوسی اور بے
دلی۔ ہنسی مذاق کرتیں نرسوں سے وہ آوازوں سے متعارف
تھیں اور الگ الگ پہچان لیتی تھیں ایک نرس مس ملکانی کا نام
انھوں نے ملکہ رانی رکھا تھا۔ وہ ان سے بہت مانوس تھی۔ اور
ماما کر کے بے حد خیال کرتی تھی۔ اور اکثر وہ کسی طرف پر اپنی بے نور
آنکھیں جمائے کچھ گنگناتی رہتیں جن میں وہ نرسری کے گیت بھی ہوتے
جو وہ بچوں کو سکھایا کرتی تھیں۔ دو تین ڈاکٹر وارڈ میں آکر ترتیب
وار مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے۔

"کہیئے اب کیا حال ہے مسز قریشی؟" اُس کے ڈاکٹر نے
بہت خوش مزاجی سے پوچھا۔

"جی میں پہلے سے بہتر تو بہت ہوں لیکن — لیکن ایسا
لگتا ہے ڈاکٹر کہ جیسے — جیسے میرے جسم کا سارا کس بل —
دل کی ہر تمنا۔ جینے کی چاہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے — میں بہت
تھک گئی ہوں ڈاکٹر۔"

"نہیں نہیں آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ آپ کا ایکسرے
میں نے دیکھا بہت بہتر ہے اور باقی رپورٹیں بھی پہلے سے ٹھیک
ہیں آپ IMPROVE کر رہی ہیں۔ آپ چنتا نہ کریں نہیں آپ کو
اچھا ہونے میں اور ٹائم لگے گا ایک جونیئر ڈاکٹر نے کہا اور ڈاکٹر
اپنا فرائض منصبی ادا کر کے دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔

"فکر نہ کرو۔ آرام کرو۔ ذہنی سکون، بے فکری اور
یکسوئی تو ہمیشہ سے اس کی پہنچ سے دور بہت دور رہی ہے
معالج تو اپنے فلسفے اور ا... کے مطابق بات کرتے ہی ہیں

بیاذل ودماغ کوئی پیالہ ہے کہ الٹ دو اور ہر دکھ دور ہو جا۔
مگر فکر سے فائدہ کیا ہے گذرا ہوا کل تو گذر گیا لیکن دماغ کے
دروازے کیسے بند کر لئے جائیں احساس پر پہرے کیوں کر
بٹھائے جا سکتے ہیں۔ اور اب ــــ اب تو آرام کرنے کا
وقت قریب آ ہی گیا ہے۔ اس سے بہت چھپایا گیا مگر اس کو پتہ
چل ہی گیا کہ اس کو ٹی بی ہو گئی ہے اور دل بھی کمزور ہو چکا ہے
چلو سفر تمام ہونے کے آثار پیدا ہو گئے۔ سفر بھی بہت کڑا طے
کیا اس نے پچپن سال ــــ اور اس کے ذہن کے دریچوں سے
ماضی کے حالات اور زندگی نے جھانکنا شروع کر دیا۔

بہت فراغت کی زندگی نہ سہی مگر بابوجی کی پنشن سے
پہلے کوئی ایسی مفلسی بھی نہ تھی۔ نہ مہنگائی اتنے عروج پر تھی۔
لیکن ذہنی سکون اور عافیت کا احساس نہ تھا۔ چھوٹے بڑے چھ
بہن بھائی بیماری کی ماری ماں اور آزاد منش باپ کہ بس نوکری
اور باہر کی زندگی میں غلطاں پیچاں ــــ نہ جانے اللہ کی کیا
مصلحت ہوتی ہے کہ جو انسان کسی چیز کی طلب کرتا ہے وہ اس
سے محروم رہتا ہے اور جو اس سے بیزار رہتا ہے وہی چیز اسے
فراوانی سے دے دیتا ہے۔ اب اس کے اپنے خاندان میں
خالہ کو دیکھ لو کہ دونوں میاں بیوی کو بچوں سے عشق مگر
اولاد سے محروم تھیں چچی بی و چچا جان کو ایک ادھورے بچے کے بعد کسی
بچے کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور پھوپھی آمنہ کا پہلا اباڑشن ہوا
تو نہ جانے کیا ہوا کہ بچہ ہونا ناممکن قرار دے دیا گیا۔ اور یہ
سب دوسروں کے بچوں پر اپنی ممتا نچھاور کرتے رہتے۔

پھر بابوجی کی پنشن ہو گئی تو دن رات اور کٹھن ہو گئے
بابوجی اور اماں جی کے تنازعات اور بڑھ گئے اور بابوجی کا مزاج
بے روزگاری کے احساس سے اور تلخ اور سخت ہو گیا۔ اماں جی تو
سدا ہی کی بیمار تھیں اسی لئے نہ کسی کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام
ہو سکا نہ تربیت کا بس خودرو جھاڑیوں کی طرح وہ سب اپنی اپنی جگہ
پھیلتے بڑھتے رہے۔

اور ایک بار پھوپھی آمنہ نے آکر اپنی تنہائی کا ذکر بابوجی
سے بڑی شدت سے کیا کہ پھوپھا میاں تو اپنے بزنس کے لئے
زیادہ تر باہر رہتے ہیں اور وہ اتنے بڑے ڈھنڈار گھر میں
بولائی پھرتی ہیں نوکر چاکر بھلا رفیق تنہائی ہو سکتے ہیں۔ تو بابوجی
نے آمنہ پھوپھی کی واپسی پر چھمّو باجی کو ان کے ساتھ کر دیا۔
آخر پھوپھی آمنہ ان کی اکلوتی چہیتی بہن تھیں۔ جب خالہ اماں
کو معلوم ہوا کہ چھمّو باجی آمنہ پھوپھی کے ساتھ چلی گئیں تو انھیں
بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے خط لکھ مارا۔

" ہاں بھائی صاحب ٹھیک ہے آمنہ بیگم کے بھائی کی
اولاد تھی وہ زیادہ حقدار تھیں خالہ نگوڑی کا کیا بہن پرائی تو اولاد
بھی پرائی، ننھیال والوں کا تو بس دل کا تعلق ہوتا ہے حق کوئی
نہیں اگر ایک بچہ یا بچی میرے پاس آجاتی تو کوئی میں اس کی
دعوے دار تھوڑا ہی ہو جاتی۔ ارے ہاتھی پھرے گام گام جس کا
ہاتھی اس کا نام" اور یہ خط پڑھ کر بابوجی کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ
وہ خود جا کر شکیلہ آپا کو خالہ کے پاس چھوڑ آئے۔ اور اماں کو
بابوجی کی یہ خاطر داریاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔

" لو بھلا ہاتھ بٹانے والی سمجھ دار لڑکیاں تو ادھر ادھر
ہو گئیں اور یہ چنگا پوٹی میری بوٹیاں نوچنے کو رہ گئی۔"

" تو کیا کروں چورا ہے پر کھڑا کر کے نیلام کر دوں
کمبختوں کو؟" بابوجی بپھر اٹھتے اور پھر دو تین دن کیلئے گھر کی فضا میں
تناؤ اور گھٹن پیدا ہو جاتی۔ زندگی کا پنچھی اڑتا جاتا رہا۔ کہ ابّا پر
فالج کا اثر ہوا۔ اور وہ بالکل معذور ہو گئے تو چچا یونس نے سب کو
اپنے پاس بلا لیا۔ چچا کی حیثیت تو کچھ زیادہ اچھی نہ تھی مگر دل دونوں
میاں بیوی کا بہت بڑا تھا۔ بابوجی کو بڑا احساس تھا کہ ان کی
تھوڑی سی پنشن اور اتنے آدمیوں کی ذمہ داریاں لیکن ان حالات
کا نفسیاتی ردّعمل بابوجی پر یہ ہوا کہ وہ تمام گرم مزاجی تند خوئی بھول
کر راضی برضا رہنے لگے زندگی کی سانسیں گنتے رہے مگر اماں جی
پر اپنی بے گھری اور دوسروں کی دست نگر ہونے سے الٹا اثر ہوا
کہ وہ شکر گذاری اور احسان مندی کے بجائے نفسیاتی گتھیوں
میں الجھ کر احساس کمتری کے دام میں گرفتار ہو گئیں اور جو ــ جو
تعلقات پہلے بہتر تھے وہ ناخوشگوار ترین ہو گئے۔ اور جن کا اثر
بچوں پر پڑنا لازمی تھا۔

پھوپھا کی شادی پھوپھی آمنہ نے بہت دھوم دھام سے کی اور شکیلہ آپا خالہ اماں کی بیٹی تھیں ان کی خواہش تھی کہ کسی چیز میں وہ کم نہ رہ جائیں لیکن بظاہر خوش خرم یہ دونوں بہنیں اپنے دل پہ کسک لے کر رخصت ہوتیں کہ کاش ہم ایک جوڑے سے اپنے ماں باپ کے گھر سے جاتے۔

وہ وارڈ میں ہونے والی باتوں نرسوں کی آمد و رفت سے بے نیاز آنکھوں پر ہاتھ رکھے ماضی میں کھوئی ہوئی تھی کس قدر طویل تھا یہ یادوں کا سفر۔

پھر ابو جی اپنی معذوری اور محتاجی کی زندگی سے تھک کر ایک دن چپکے سے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ چچا چچی ایک سائبان کی طرح سب کو سمیٹے ہوئے تھے۔ اس کی عمر اب کافی ہو گئی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں حالات کے نشیب و فراز سے واقف ہو گئی تھی اس سے چھوٹا بھائی ہمیشہ کا نٹ کھٹ تھا وہ کسی کے قابو میں نہ آسکا۔ پھر جبلت اور فطرت کا فرق۔ وہ عورت کی طرح وقت کی چھری کے لئے خربوزہ کیوں بنتا۔ اس نے مشکل سے میٹرک پاس کیا اور پھر چچا نے اسے کسی بزنس میں لگا دیا۔ خود اس نے محنت سے پرائیویٹ دسویں کا امتحان دیا اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ نرس بنے مگر ہر تمنا کہاں پوری ہوتی ہے۔ چچا یونس نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اسے پبلک ہیلتھ سینٹر میں کام دلا دیا اور وہ خوش ہو گئی شاید اس کی زندگی کا سب سے سہنرو دور یہی تھا۔ جب وہ گاؤں گاؤں جا کر غریبوں کا دکھ سکھ سنتی تھی اور خدمت خلق کا موقع ملتا تھا۔ بھائی دوسرے شہر چلا گیا اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ اب سب کو اس کی شادی کی فکر تھی رشتہ ہی نہ آتا تھا بھلا نہ صورت نہ دولت تو اچھا رشتہ آتا کہاں سے اور پھر اس کا مزاج اور دریدہ دہنی سونے پر سہاگہ تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شادی کرے گی ہی نہیں لیکن اسی زمانے میں وقت نے ایک اور وار کیا چچی بی کے اکلوتے بھائی اور ان کی بیوی کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا اور ان کے بچوں کی ذمہ داری بھی انھیں پہ پڑی۔ بھلا جب وہ انہیں گلے لگائے تھیں تو ان کے بھلائی کو اولاد کا حق کیوں نہ ہوتا اور یوں مستقبل کا سوال

اسے بھی ہراساں کرتا۔ اس کا اپنا تو کوئی انتخاب تھا نہیں لہٰذا اس نے چچا یونس کے حکم اور پسند کے آگے سر جھکا دیا اور افضال جس کی شرافت، نرم مزاجی اور ہر بات پہ جی ہاں بہت اچھا کہنا سب کو متاثر کر گیا، اور وہ افضال سے وابستہ ہو گئی۔ اور ایک ایک کر کے ساری تہیں کھلتی گئیں۔
اطاعت گزاری اور سادہ لوحی کے لبادے میں لپٹی شخصیت نے بری طرح اس کی ہر صلاحیت، عزت نفس، خود داری خود اعتمادی اور لطیف جذبوں کا خون کر دیا۔ بھلا دور سے دیکھنے والوں کو کیا معلوم تھا کہ اس لوح سادہ پر کیسی کیسی مبہم عبارتیں کندہ تھیں بار بار ٹکراؤ ہوتے رنجش بدگمانیاں حائل ہوتیں سمجھوتے کی کوشش کرائی جاتی مگر جس عمارت کی پہلی اینٹ ٹیڑھی ہو اس کا کج کہاں جاتا ہے۔ کہاں جا سکتا ہے؟ وہ حالات کے سنبھلنے اور سمجھوتے کی امید موہوم لئے دلدل میں پھنستی گئی۔ بہنوں نے ــ خود چچا جانی نے بہت چاہا کہ وہ اس زندگی سے نکل آئے لیکن وہ اسی سراب کے حصول کے لئے آگے بڑھتی رہی اور اور بچوں کی بیڑیاں اسے جکڑتی گئیں۔ ان کے مستقبل کا سوال ان کی نفسیاتی اور جذباتی کیفیت کے تصور نے اسے پابہ جولاں کر لیا۔

اوّل تو اس کا اپنا کوئی خاص شوق یا ہابی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اکثر لوگ تو اسے پیدائشی بڑھیا کہتے۔ لیکن اتنی بنجر تو نہ تھی ذہن اور دماغ کی سرزمین کہ جس پہ کوئی کاشت سرسبز نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے ساتھی ــ جیون ساتھی مجازی خدا نے اس کے لئے ہر وہ دروازہ مقفل کر دیا تھا، ہر خواہش پر قدغن لگا دی تھی کہ جس سے ذرا سا بھی اس کی شخصیت یا اہمیت کا اظہار کا امکان تھا یہ نہ تھا کہ وہ تصور دار نہ تھی تھی اور ضدی تھی اور اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ سب کچھ کر سکتی تھی مگر مجبوری سے قاصر تھی کہ اس کا ہر عمل۔ ہر خیال ہر نظریہ یہاں تک دماغ کی سوچ بھی اپنے پتی دیوتا کے مطابق ہو۔ وہ کوئی

کپڑے کی گڑیا تو نہ تھی کہ جس کو ادھیڑ کر دوسری شکل دے سکتی ۔ وہ سب کچھ کرتی لیکن آمد اور آورد کے فرق کو نہ مٹا سکی اور یہی فرق اس کی بدنصیبی اور ناکامی کے پتھر کی لکیر بن گیا اس کا ہر عزیز اس سے نالاں اور شاکی تھا کہ وہ ان کی خیر خواہی اور محبت کو اس شخص اور اس زندگی پر ترجیح دیتی ہے جس نے اسے کچھ نہ دیا چچی بی اور اماں جی کے تعلقات اس کے ذہن میں تھے ۔ بڑا بھائی سب سے الگ دنیا بنائے تھا ۔ کسی کے ساتھ بھی اس کی گذر ممکن تھی ؟ اور پھر تین بچوں کی بھی تو ذمہ داری باپ کے پاس بچوں کو چھوڑے تو پھر اس کے جینے کا سہارا کیا رہے گا ؟ ابھی ایک آسرا تو ہے کہ جب وہ بالکل ہی اس زندگی سے عاجز ہو گئی تو اپنے گھر چلی جائے گی مگر جب وہاں بھی گذر نہ ہوئی تو پھر ۔ پھر وہ کہاں جائے گی جب تو وہ پہلے سے زیادہ بوجھ اور مصیبت بن جائے گی اور وہ دوسروں کے مشوروں کو ٹھکرا دیتی ۔ اور جس قدر اس کے شوہر کے ناروا مطالبے بڑھتے بدگمانیاں بڑھتیں اس کے دل کا ہر نرم گوشہ جھلس کر خاک سیاہ ہوتا گیا اور وہ اسی تانے بانے میں زندہ رہنے پر مجبور رہی کیوں ؟ کس لئے ؟ اور اس کیوں کا جواب وہ خود بھی نہ پا سکی جب مزاج کی ہم آہنگی نہیں جذبوں کی گہرائی نہیں ۔۔۔ اعتماد اتفاق و تعاون بھی خاطر خواہ نہیں خوش حالی بھی نہیں تو پھر کیا چیز تھی جو اسے اس زندگی سے جوڑے ہوئے تھی اور وقت ہر قدم پر ایک نئی آزمائش کر رہا تھا ۔ تو اسی کشاکش جذبات اور کشمکش زندگی نے اسے دوراہے پر لا کھڑا کیا یا تو اپنی شخصیت اور عزت نفس کی بقا یا بچوں کی مامتا سے دستبرداری ۔۔۔ تو آخر اس نے بھی اسی شورش و تلاطم سے گھبرا کر خودکشی کر لی ۔ خودکشی مگر کیسے وہ تو زندہ تھی فرائض زندگی سے نپٹ رہی تھی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی یہ کیسی خودکشی تھی ۔۔۔ لیکن اس نے خودکشی کر لی تھی ایسی خودکشی جس میں سانس کی ڈور باقی رہتی ہے جو اس

کام کرتے ہیں ۔ باقی ہر چیز حالات کے تقاضوں اور کسی حکمران کے تابع ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر گذر ناممکن ہوتا ہے اس میں احتجاج و بغاوت کی جرأت نہیں تھی اور اسی شرط اسی فیصلے سے اس کے بچوں کی پرورش اور تعلیم ہوتی رہی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے لیکن وہ اندر ہی اندر اس درجہ ٹوٹ اور بکھر چکی تھی کہ اس کی صحت اور جسم نے اسکا ساتھ چھوڑ دیا ۔ ہمت امید آسرا سب ختم ہو گیا ۔۔۔ اس کے ہمدرد کہتے چلو بس اب تمہاری کٹھن آزمائش کا دور ختم ہوا اور چین کے دن آئے ہیں ۔ ہاں چین کے دن آرہے ہیں دونوں بڑے لڑکے نوکر ہو گئے تھے لڑکی تعلیم پوری کر چکی تھی بس اب اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کا خیال ضرور کبھی کبھی آجاتا تھا لیکن کیا ضرور کہ وہ اس خوشی سے ہمکنار ہو کام تو کوئی بھی کسی کے مرنے سے نہیں رکتا ہو جائے گا جب خدا کا حکم ہو گا ۔ بس اب صرف ایک ارمان اور آرزو ضرور تھی کہ وہ بوجھ بن کر زندہ نہ رہے کسی سے اسے کچھ نہیں چاہئے اولاد سے بھی نہیں ۔ بس سب شاد و آباد رہیں یہی سب سے بڑی خوشی اور طمانیت کا باعث ہے ۔

وہ اب سکون و عافیت چاہتی ہے ۔۔۔ اب اس کی منزل قریب آرہی ہے جب آخر عمر میں کوئی روگ لگ جائیں تو کب جاتے ہیں ؟ ہاں وقت مقرر ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے مقررہ وقت پر آرام سے سو جائے گی ۔۔۔ اس کے بچے بھائی بہن سوگ منائیں گے ۔۔۔ باقی لوگ رسمی طور پر اظہار تاسف کریں لیکن ۔۔۔ لیکن اس کی خودکشی کی خبر کسی اخبار کے کالم ۔۔۔ کسی جریدے کے صفحے پر درج نہ ہو گی ۔

"امی جی کیا سو رہی ہیں ؟ اس کا چھوٹا بیٹا پیار سے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہا تھا ۔ وہ چونک اٹھی ۔۔۔ اچھا تو ملاقات کا وقت ہو گیا ۔ وارڈ میں ملنے والے آرہے تھے ۔ آوازوں کی گنگناہٹ تھی ایک مریضہ صحت یاب ہو کر گھر جا رہی تھی گھر والے بہت خوش تھے ۔ نرس کسی نئے مریض کو لا رہی تھی گلوکوز کا اسٹینڈ بھی ساتھ تھا دوسری نرس

بستر تیار کر رہی تھی۔

"امی جی آج میں نے آپ کے لئے مچھلی پکائی ہے دیکھئے کیسی ہے؟" اس کی بیٹی اس کا سر سہلا رہی تھی ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

"امی اب آپ کو اگلے ہفتے چھٹی مل جائے گی میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے اب آپ اچھی ہیں محض کمزوری ہے ابو اور بھائی جان شام کو آئیں گے۔" اس کے بیٹے نے اس کو تسلی دی۔

اس نے دوسری طرف نظر ڈالی مسز تھیوفلس حسب معمول دیوار کی اور کروٹ لئے گنگنا رہی تھیں۔

"امی ماموں جان کا خط آیا ہے۔" اس کے بیٹے افتخار نے بتایا۔

"کون کیا افتکھار آیا ہے" مسز تھیوفلس نے کروٹ بدلی۔

"یس ما ہاؤ آر یو"۔ افتخار نے آگے بڑھ کر مسز تھیوفلس کا ہاتھ پکڑ لیا — "ہم تو ٹھیک ہے تمہارا آواز ہمارے مائیکل مافک ہے۔ اس کا لیٹر آیا تھا Winter میں آنے کو لکھا ہے"۔ بچاری مسز تھیوفلس آسروں کی دنیا میں جئے جا رہی تھیں اسے لگا کہ اندھیرے میں کوئی کرن چمکی وہ بچوں سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ وارڈ میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ زندگی رواں دواں تھی۔

••

کشن ادولی

غزل

جب تک رہا وہ پردے میں، پردہ بنا رہا
لیکن کھلا تو راز سبھی نے سمجھ لیا

بیساکھیوں کا لے کے سہارا مرا وجود
دو دن میں سارے شہر کا چکر لگا گیا

ہر موڑ ہر گلی کو ضرورت تھی جس کی آج
وہ شخص شہر چھوڑ کے جانے کہاں گیا

صحرا کے در پہ راہیں سبھی رک کے رہ گئیں
ان کی حقیقتوں کا چلو راز تو کھلا

اس خوف سے کہ گرتے ہی مٹ جائے گا وجود
قطرہ لرز کے نوک پہ کانٹے کی رہ گیا

اچھا ہے اپنی مسخ عبارت یہ پڑھ لے آپ
چہرے کو ایک بار ذرا آئینہ دکھا

راہیں تو اور بھی ہیں گھٹن سے فرار کی
دروازہ بند اگر ہے تو دیوار پھاند جا

تمیمہ ریاض

کمار پاشی

تین نظمیں: آردھا نگنی کے لئے

(۱)

جی چاہتا ہے:
تری آنکھوں میں
پرچھائیں نہ دُکھ کی پاؤں میں

جی چاہتا ہے:
تری پلکوں پر
جھل مل تاروں کو سجاؤں میں

جی چاہتا ہے:
ہر روز تجھے
کوئی خوشی کی خبر سناؤں میں

(۲)

اِک رات ہو
گہری اور لمبی
اِک چاند ہو
ٹھنڈا اور میٹھا
کچھ تارے: جگ مگ کرتے
اپنے سر پر ہوں
اور ایسے میں
ہم دونوں
کہیں سفر پر ہوں

(۳)

جب تو
اپنی ماں کی ساڑی میں ہوتی ہے
بالکل
اپنی ماں جیسی لگتی ہے

جب جب
پپّی بھی
میکے میں
تیری ساڑی میں ہوتی ہے
بالکل تجھ جیسی لگتی ہے
جگیا سا بھی
بڑی ہو کر جب
پپّی کی ساڑی میں ہو گی
بالکل پپّی جیسی ہو گی

یعنی تیرے اِسی رُوپ کو
آگے آنے والے یُگ میں
جگیا سا زندہ رکھے گی
تجھے کبھی مرنے نہیں دے گی

ڈاکٹر جاوید وششٹ

محمّد قلی اور چشمِ فسوں ساز

ہندی اور سنسکرت کے شرنگار رس کویوں نے "نایئکا" کے رُوپ اور گُن کے ساتھ ساتھ اس کے "نکھ سکھ" (سراپا) کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ اردو شاعری میں لچھمی نراین شفیق کی مثنوی "تصویرِ جاناں" اور خواجہ میر اثر کی مثنوی "خواب وخیال" میں لے دے کر دو سراپے ملتے ہیں۔ اُردو میں اکثر وبیشتر مثنوی نگار شعراء، ہیروئن کے ملبوسات و زیورات کے ذکر کو ہی سراپا نگاری سمجھتے رہے ہیں۔ حالانکہ سنسکرت میں "نکھ" (ناخن)، "سکھ" (شکھا، چوٹی) یعنی نایئکا کے پانو کے ناخن سے لیکر چوٹی تک، انگ انگ کی مرقع نگاری کو ہی سراپا نگاری قرار دیا گیا ہے۔ گویا نایئکا کے برہنہ جسم اور اس کے مختلف اعضا کی تعریف کرنا ہی اس میں شامل ہے۔ سراپا نگاری میں ملبوسات و زیورات کا بالکل ذکر نہیں کیا جاتا۔ سنسکرت کے مشہور و معروف ڈراما نگار کالی داس نے پاربتی کا ایسا بھرپور سراپا پیش کیا ہے کہ ادبیات عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے اس سراپے کے خلاف قدامت پرستوں کے ایک گروہ نے فتوے صادر کیئے . . . .

. . . . اس سے بڑھ کر داد وتحسین کیا ہو سکتی ہے۔ مگر محمد قلی کا سراپا نگاری سے گریز حیرت انگیز ہی نہیں المناک بھی ہے۔

نایئکا کے حسین وجمیل پیکر میں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ مشہور ضرب المثل — "گوری کی آنکھوں میں اگر کاجل نہ ہو تو اس کا سارا سنگار پھیکا پڑ جاتا ہے۔" سے بھی چشم محبوب کی غیر معمولی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ اظہارِ جذب واحساس سے جہاں زبان قاصر ہو جاتی ہے، وہاں آنکھیں ہی اپنی "مون بھاشا" (زبان خاموش) میں سب کچھ کہہ دیتی ہیں جو زبان سے ادا نہیں ہو پاتا۔ ہندی اور سنسکرت ادب میں مروجہ "نو رسوں" کے اظہار کی صلاحیت جو آنکھوں کو حاصل ہے وہ بدن کے کسی دوسرے عضو میں نہیں۔ شرنگار رس کا اظہار آنکھیں اپنی مدھر ترچھی چتون سے کرتی ہیں۔ انگریزی کی رومانی شاعری میں بھی (DOWN CAST EYES) کا ذکر رنگا رنگ انداز سے کیا گیا ہے۔ "آب حیات" میں کسی پرانے کا استاد کا شعر درج ہے کہ ؎

نیچی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو، سیدھا تو کرلو تیر کو

خوبصورت آنکھ کا بڑا ہونا ضروری ہے۔ بڑی آنکھیں ہی حسین ہوتی ہیں۔ اور بڑی آنکھیں وہ مانی جاتی ہیں جو کانوں کو چھوتی ہوں۔ دنبالہ دار سرمہ اس لئے لگایا جاتا ہے کہ آنکھ بڑی نظر آئے۔ بڑی آنکھوں کا حیادار

ہونا بھی لازمی ہے۔ کیونکہ کاجل کی طرح حیا بھی آنکھ کا سنگار ہے۔ آنکھوں کے تین مخصوص رنگ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ "شویت" (سفید)، "شیام" (سیاہ) اور "رتنار" (سرخ)۔ شرنگار رس کے کویوں نے ان رنگوں کی بنیاد پر آنکھوں کو "تروینی" قرار دیا ہے۔ آنکھوں کے سفید رنگ کو "گنگا" سیاہ کو "جمنا" اور سرخ رنگ کو "سرسوتی" مانا ہے رس لین کا مشہور دوہا ہے ؎

امی ہلاہل مد بھرے، سیت سیام رتنار
جیت، مرت، جھک جھک پرت، جیہہ چتوت اکبار

گویا نائیکا کی آنکھوں میں آبِ حیات بھی ہے اور زہر ہلاہل بھی۔ جگر مراد آبادی کا شعر ہے ؎

جینا بھی آ گیا، مجھے مرنا بھی آ گیا،
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

جواہر لال چتر ویدی، متھرا نے اپنی تالیف "آنکھ اور کوی گن" میں آنکھوں سے متعلق بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ بڑی بڑی آنکھوں کو انھوں نے "دیرگھ نین" کے نام سے پکارا ہے۔ بانکی چتون (نظر) کا نام کویوں نے "کٹاکش" ([illegible]) رکھا ہے۔ اور اس کی یہ خوبی بیان کی ہے کہ کٹاکش کی دھار اتنی تیز ہوتی ہے کہ اگر اس کے مقام طلوع یعنی آنکھ سے انگلی چھو جائے تو اس کے کٹنے کا خوف لاحق رہتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، اگر اسے (کٹاکش) کوئی دیکھ بھی لے تو چوٹ لگ سکتی ہے یہ کٹاکش کی خصوصیت ہے "کٹاکش شر" (تیر نظر) اور "کُٹِل کٹاکش شر" (بانکا تیر نظر) کا جگہ جگہ ذکر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کویوں نے اسے کبھی تلوار، تیغ، چھری، کٹار اور کبھی بندوق تک کہا ہے۔ "مدبھری آنکھوں" کا بھی خوب گن گان کیا گیا ہے۔ آنکھ سے متعلق اس کے جزئیات تک کا بیان موجود ہے مثلاً تل (خال)، کوے (گوشۂ چشم)، برگان (بیرونی پلک کے کنارے کے بال) وغیرہ۔ تشبیہات بھی لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً آنکھوں کو "کُرنگ" (بادامی رنگ کا ہرن)، "ترنگ" (گھوڑا)، "متنگ" (ہاتھی)، "مین" (مچھلی)، "کھنجن" (سیاہ و سفید رنگ کی ایک شوخ چڑیا)، کمل، چکور، "کاگ" (کوا) اور "مدھو مکھی" (شہد کی مکھی) سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مرگ، ترنگ اور مین کی تشبیہیں آنکھوں کی شوخی کے لئے مستعمل ہیں۔ جن آنکھوں میں بھولپن کی جھلک ہوتی ہے، انھیں "آہو چشم"، اور جن میں شوخی اور چنچلتا کچھ سوا ہوتی ہے انھیں "ترنگ" اور جن میں شوخی اور بھی زیادہ ہوتی ہے، انھیں "مین"، اور اس سے کچھ کم "کھنجن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ کمل سی آنکھوں میں چنچلتا کے بجائے شگفتگی و لطافت و نزاکت کا رنگ زیادہ ہوتا ہے۔

ایک کوی نے حسینہ کی آنکھوں کو کامدیو کے گھوڑوں سے تشبیہ دی ہے۔ گویا کامدیو کو جس پر حملہ کرنا ہوتا ہے وہ انھیں گھوڑوں پر سوار ہو کر یلغار کرتا ہے۔ ان تشبیہات کے علاوہ کچھ عجیب تشبیہیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً کسی نے آنکھوں کو نواب، بادشاہ اور سپاہی سے تشبیہ دی ہے تو کسی نے انھیں "بزاز" اور "درزی" تک کہہ دیا ہے۔ کسی کوی نے، نہ معلوم کیوں، انھیں "دیوالیہ" بھی قرار دیا ہے۔ کسی نے آنکھوں کو "فرنگی"، تو کسی نے انھیں "مزدور" تک بنا دیا ہے۔ کسی نے انھیں ناٹیہ شالا (تھیٹر)، تو کسی نے "کامدیو کی کشتی" قرار دیا ہے۔ کچھ کویوں کو آنکھوں میں چودہ رتن (جواہرات) نظر آئے تو انھوں نے آنکھوں کو "رتن نین" ہی بنا ڈالا۔

کویوں نے آنکھوں کی مختلف کیفیتوں کا ذکر بھی بڑے مزے لے کر کیا ہے۔ سوداؔ کا مشہور شعر ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کویوں نے مختلف کیفیات کے مطابق آنکھوں کے نام گنائے ہیں مثلاً "ادھ کھلی آنکھیں"، میرؔ نے ان کی عکاسی اس طرح کی ہے ؎

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں،
ساری مستی شراب کی سی ہے

"السائی آنکھیں"، "الڑیتے لوچن" ([illegible])
(پیاری اور کجراری آنکھیں)، "مد گونہے لوچن" ([illegible])

(منوہر، سندر اور من بھاون آنکھیں)۔ بیچاری آنکھوں کو کہیں بوگنی (شعبتی) تو کہیں "دسوں اوتار" تک کہا گیا ہے۔ آنکھوں کے تعلق سے ہی کہیں آنسوؤں کی برسات تو کہیں امرت برکھا کے حسین مرقعے ملتے ہیں۔[1]

برہ کے دُکھ کوی نے آنکھوں کو زہریلا ناگ اور پلکوں کو "پٹارا" کہا ہے۔

وِش دھرے بھارے، ناگ کارے، نین کامنی کے
کاٹ چھپے جات، اپنے پلک پٹارے میں

یعنی کامنی کے نین زہریلے ناگ کی طرح ہیں جو ڈس کر "پلک پٹارے" میں چھپ جاتے ہیں۔

کہیں کہیں (تصور) من کو راجا، آنکھ کو رانی، بلکہ "من مانی پہلے رانی" کے رُوپ میں پیش کرتی ہے۔ یہاں سنیہہ (عشق) کا سُہاگ، لاج کا لہنگا، شیل (حیا) کی ساری، کرُنا (جذبۂ رحم) کی کنچلی (چولی)، "کلپنا کا کیل کنج" (گوشۂ تفریح)، واسناؤں (خواہشات) کا وشال بھون (ایوان عظیم)، سوندریہ (حسن) کا سنگھاسن (تخت) غرض عیش ونشاط کا جملہ ساز وسامان موجود ہے۔

عالم کوی آنکھوں کے بارے میں کہتا ہے

آنکھن میں پریت، رس ریت، سب آنکھن میں
آنکھن میں اچھر[2] لکھے ہیں سگھڑائی[3] کے
آنکھن میں کام اور کھٹائی[4] سب آنکھن میں
آنکھن میں سیل[5] بسے، سر سرنائی[6] کے
عالم سکوی کہے امرت ہے آنکھن میں
آنکھن میں جگ جوت دوی ہیں سہائی کے
کام کے تیچھن[7] سب لچھن ہیں آنکھن میں
آنکھن میں بھید ہیں بھلائی اور بُرائی کے

آنکھوں کے اس مایا جال (دام مجاز) میں جو ایک بار پھنس گیا، وہ پھر اس سے نجات نہ پا سکا۔ محمد قلی بھی اس طلسم چشم فسوں ساز میں ایسا گرفتار رہا کہ آخر دم تک اسے رہائی نہیں نصیب ہو سکی۔ محمد قلی کی پیاریوں کے بارے میں ہم تفصیل سے ان کے حسن وجمال کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ محمد قلی کی بارہ خاص پیاریوں میں چھ پیاریاں (ننھی، سانولی، کنولی، پیاری، چھبیلی، اور لالن) غیر معمولی حسین آنکھوں کی مالک تھیں ۔ اسی طرح دوسری اٹھارہ[18] پیاریوں میں نو پیاریاں (بلقیس زمانی، بہمنی ہندو، سندر، رنگیلی، نور کی مورت، نازنین، چنچل نین، فتنۂ دکن اور دکن کی پتلی) خوش چشم تھیں۔

پیاریوں کی سرتاج ننھی کی جھمکتی آنکھوں میں کاجل کا بھید، زیب دیتا ہے۔ اب "دوتن"، (سوکن، رقیب) کی آنکھوں کے منتر کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے ۔ ننھی کی ہنسی میں نیاپن ہے غمزے (کشاکش، چشم وابرو کے اشارے) میں نُدرت ہے۔ وہ جلوے کا راگ، گا گا کر معانی کو شراب پلاتی ہے۔ کم سن نازک ننھی اس قدر معصوم ہے کہ وہ رموزِ عشق سے نا آشنا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں کاجل جھمکتا ہے، مگر وہ ابھی ہوا کا رُخ نہیں پہچانتی ۔ ننھی جب خفا ہو جاتی ہے تو وہ "سوکا"، (خط سرمہ) سے غصہ وناز کی بات کرنے لگتی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے (غصّہ کی وجہ سے) جھاگ اُڑنے لگتے ہیں تو محمد قلی کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ننھی کسی طرح شاد کام ہو جائے، مگن اور مسرور دکھائی دے ۔

ترے نیناں کی جھمکن میں سہا دے بھید کاجل کا
لگے نا چاک دوتن کا نین کے منتراں سیتیں
نوی ہنسی، نوے غمزے، پیاری توے دکھاتی
جلوے کے راگ گا کر پھر پھر پلاتی منج کوں
نازک ننھی بالی محبّت میں سو، نا جانے ہنوز
لوجل کجل جھمکیں وے، بارے نہ پہچانے ہنوز
سوکا سوں کریں جو غصّہ و ناز کی بات
جب ہونٹاں تھے جھڑے پھوئی، جیو منگے اس کوں مگن

(۱ الکشر حرف) ۲ چترائی، سلیقہ ۳ جنس، شہوت ۴ حیا، شرم ۵ نیکی ۶ فوراً اُسی وقت)

ساتوی کی شوخ اور چنچل آنکھیں جب ناز کرتی ہیں تو محمد قلی کے روئیں روئیں میں ان کا اثر سرایت کر جاتا ہے۔ کہتا ہے ؎

نین چلبلائی سوں کرتی ہے ناز
ہمن روں روں بھیدیا ہے اس کا اثر

کنو کی پیاری بڑی نظر باز ہے۔ وہ آنکھیں لڑانے کے لئے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں گلابی رنگ کی ہیں جن میں سمندر موجیں مارتا ہے۔ اس کے رخسار سورج کی طرح ہیں، جن پر دانتوں کے نورتن اور مانک موتی جڑے ہیں۔ کنو کی آہو چشم ہے۔ اس لئے محمد قلی کو جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ؎

تم پیاری نظر بازی منجے تج سوں کھڑی ہے
نظر بازی کوں جج سوں نظر رکھ جب کھڑی ہے
گلابی نین میں بنری سمد پو ر موج مارے
سُرج سے گال پر دنت نورتن مانک جڑی ہے
کرو نگ تینی سہیلی توں میرے جیو کی پیاری
محمد قطب شہ سلطاں سوں مل مل ہت جڑی ہے

پیاری کی آنکھیں عشق کی ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ وہ اس ترازو میں عاشق کو تولتی ہے۔ اور بڑے شاطرانہ انداز سے عشق کا ایک ایک داؤ کھیلتی ہے۔ ؎

ترازو عشق جو کھی ہے، پیاری آنکھ انکھ سیتیں
عشق کے ڈاو یک یک کھیلتی ہے ڈاو لڈاواں سوں

چھبیلی نے "سُو کے (خط سرمہ) ڈوری" سے بندھے نین بہری (ایک شکاری پرندہ) کو چھوڑ دیا، تاکہ شوخ مرغ دل کو شکار کرے۔ ؎

نین بہری چھوڑی سو کے ڈوری سوں
کرے چنچل پنکھی دل کوں شکارا

لاکن پیاری کے "نین پھاندے" (پھندے) میں محمد قلی کا دل پھنس گیا ہے۔ وہ "جیو کا پیارا" اب بند کھولے۔ نہ کھولے اس کی مرضی۔ ؎

نین پھاندے میں دل رہیا ہے ہمارا
او بند کھولے نہ کھولے جیو کا پیارا

بلقیس زمانی کے "کھنجن نین"، کھنجن سے افضل ہیں ؎

کھنجن تیر کھنجن پہ کرتی بڑائی

بہمنی ہندو کے "رتن نین"، کو دیکھ کر محمد قلی کا دل جوش میں آجاتا ہے۔ ؎

نیناں کے لعل تھے دل پکڑیا ہے جوش میرا

سندر ناز نین کی آنکھیں ایک کرشمہ ہیں۔ اس کی جھلکتی آنکھیں کٹاری کی طرح جھلکتی ہیں ؎

کہے دیکھے کرشمہ کر وو سندر نازنیں منج کوں
تو اس نیناں کے جھلکارے، جھلکتے جوں کٹارے ہیں

نیتر بن سخن رنگیلی بڑی مٹھاس سے پیالہ پلاتی ہے۔ اور وہ اپنی آنکھوں میں رات کا خمار دکھاتی ہے۔ نئی نویلی، متوالی رنگیلی "نین نقلاں"، کے ساتھ جام شراب پلاتی ہے وہ "دھن" (محبوبہ) اپنے تن پر "نین خماری"، چڑھا کر کیسے بناتی ہے؟ ؎

مری میٹھ بولنی مٹھائی سوں پیالا پلاتی ہے
خماری رات کا اپنی نین میانے دکھاتی ہے
نوی متوالی مد پیالا پلاتی نین نقلاں سوں
نین خماری اپنے تن چڑا دھن کن بناتی ہے؟

"نور کی مورت" کی آنکھ کا کاجل گویا ماہی مراتب کا علم بلند کئے ہوئے ہے۔ ؎

کجل انکھ میں سو ماہی کے مراتب سوں علم پکڑے

"ناز نین"، کے چنچل نینوں کو دیکھ کر "چپل بجلی" کڑک اُٹھتی ہے۔ ؎

دیکھت چنچل نیناں چپل بجلی تو جاوے کڑکڑا

"چنچل نین" کے دو نین ابرو تلے اس طرح محو خواب ہیں جیسے مسجد کی محراب کے نیچے دو مست سو رہے ہیں۔ یہ کیسا عجیب منظر نظر کے سامنے ہے کہ دھوپ چاند پر پڑ رہی ہے یا آنکھوں پر نورانی چہرے کی چھوٹ؟

؎

دونین تج ابرو تلیں ہیں نار کیرے خواب میں
دو مست شوخی سوں سہتے مسجد کیرے محراب میں

یہ کیا عجب پڑتا نظر جو ڈوب پڑتی چاند پر
یا مکھ نورانی جوت بھر ہے نین کیرے شاب میں

"فتنۂ دکھن" دلوں کو گیسوئے تابدار میں اُلجھا لیتی ہے اور پھر "نین محراب" میں انھیں پتلی کی طرح نُڑکاتی ہے ؎

الجھائے جیوں کوں سکی، اپ چوٹی کیرے تاب میں
پتلی نمن نُڑکائے ہے دل اپ نین محراب میں

"دکن کی پتلی" تو مجسّم "نین پتلی" ہے۔ وہ ہمیشہ محمد قلی کو اپنی آنکھوں سے مست کر دیتی ہے۔

مع سدا منج مست کرتی ہے نین سیتیں نین پتلی
نین کے حوض میں پتلی نئے نئے انداز سے تیرتی ہے۔ مع

نین کے حوض میں پتلی نوی چالیاں سوں نرتی ہے

نظموں کے علاوہ محمد قلی کی غزلوں میں بھی حسین آنکھیں نئے نئے رُوپ اور بہروپ دکھاتی ہیں۔ مثلاً **"چشم دنبالہ دار"** (دیر گھر نین) اس کی آنکھوں کے دنبالے میرے پیچھے پڑے ہیں۔ اے خدا! عشق مشکل ہے تُو معانی کا بھرم رکھ لے! ؎

پڑے دنبال میں میرے سو اس نیناں کے دنبالے
خدایا! عشق مشکل ہے، بھرم رکھ تُو معانی کا

"مخمور آنکھیں، مستی چشم، ساغر چشم" روئیں روئیں میں تیری نین مستی چڑھ گئی ہے۔ اے عشق سے لبریز دل کی شراب پیو! ؎

تری نین مستی ہو روں روں چڑی
پرت مے بھریا دل کا لینا شراب

دھن نے جو شراب پی لی ہے تو اس کی پلکیں آپس میں مل گئی ہیں یعنی نشہ کے اثر سے آنکھیں بند ہیں۔ بیدار شوخ آنکھوں میں خواب کا طلوع ہو رہا ہے ؎

مد دھن جو پی لیے ہیں، پلکاں رہے ہیں مل مل
جاگے چنچل نین میں ہے خواب کا طلوع

تیری دونوں آنکھیں بدمست اور متوالی ہیں۔ تیرے دونوں رخسار حسین اور گلابی ہیں ؎

ترے دو نین ہیں بدمست متوال
ترے دو گال ہیں خوبی کے گلآل

تیری آنکھوں میں عجیب شوخی ہے کہ وہ کھنجن پرندے کی طرح ایک لمحہ کو بھی ایک جگہ نہیں رُکتیں ؎

عجب چنچلائی ہے تیری نین میں
کہ کھنجن نمن ایک تل کیں نہ ٹھارے

اے کجل نینی (کجراری آنکھوں والی) تجھے مستی زیب دیتی ہے کیونکہ تیری آنکھوں سے لعل، تارے ٹوٹتے ہیں یعنی آنکھوں میں نشے کے گلابی ڈورے ہیں ؎

کجل نینی تجے مستی سہاوے
کہ تج نیناں تھے ٹوٹتے لعل، تارے

سندر کے مست رخسار پر گلابی رنگ زیب دیتے ہیں۔ یاقوتی آنکھوں میں سرخ رنگ کا خمار دکھائی دیتا ہے ؎

سندر کے مست گال گلابی برن سُہیں
یاقوت نین، لال خماری لگی دسے

"چشم خوش خواب" نبیؐ کے صدقے میں قطب ہمیشہ عیش و عشرت سے رہو۔ ان کے نینوں میں پیار سے میرے سپنے سج جاتے ہیں۔ ؎

جم اچھو صدقے نبیؐ عشرت سوں قطب!
نیہہ سوں نیناں دکھاتے میرے خواب

"نین کی چوٹ"، کسی لوک کوی نے کہا ہے ؎

نین چھپائے نا چھپیں پٹ گھونگھٹ کی اوٹ
چتر نار اور سورما کریں لاکھ میں چوٹ

محمد قلی ساقی سے مخاطب ہے۔

تیری آنکھوں کی چوٹ نے مجھ پر حادثے توڑ

دیے۔ اے ساقی! مجھے جام شراب عطا کر تاکہ دل کے حوادث
دُور ہو جائیں۔" ؎

تیری نین کے چوٹاں منج پر کیے حوادث
ساقی دے منج پیالا، جاوے ہیا حوادث

"نین پتلی" نین کی پتلیاں یاد کے دریا میں غوطہ زن
ہیں۔ عشق کے شادیانے بجا! اور اپنے رخسار کا آئینہ مجھے دکھا!
؎

نین پتلیاں یاد کے دریا میں غوطے کھاتے ہیں
نیہہ کے طبلاں بجا! درپن دکھا موگاں تج

تیری آنکھوں کی پتلیوں کے مانند کوئی اوباش
نہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر عیار اور اوباش ہے ؎

نہیں تج نین پتلیاں سار اوباش
کیس تھے ایک ہے عیار اوباش

تیری نین پتلی میرے دل میں رقص کناں ہے۔ وہ ہمیشہ میری
منزلِ چشم میں رقصاں رہتی ہے ؎

ہوئی تج نین پتلی دل میں رقاص
سدا منج نین کی منزل میں رقاص

وہ بڑے چھند بند سے ہاؤ بھاؤ دکھاتی ہوئی، آتی ہے
اور اپنی آنکھوں سے ہمیں ساری رات جگاتی ہے ؎

چھنداں سیتیں آتی ہے بھاواں دکھاتی
نین سوں ہمن رات ساری جگاتی

"اشارۂ چشم (غمزہ)" تمہارے غمزوں سے
معانی حواس باختہ ہے۔ وہ خالص صوفی بندہ ہے، اس
سے رنجش نہ رکھو۔ ؎

معانی کوں تمن غمزیاں تھے نیں ہوش
نکچل صوفی بندا ہے، نا رکھو رنج

"بولتے نین" تمہاری آنکھیں صریحاً ہم سے
باتیں کرتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے سب کو مات
کر دیا ہے ؎ نین تمارے کرے ہیں ہمن سوں بات صریح
خدا کا شکر ہے کہ سب کوں کیا ہے مات صریح

"شوخیٔ چشم" آج میں نے تمہارے نینوں کی شوخی
میں نئی تلخی دیکھی ہے۔ سخنِ مژگاں سے میرا دل تلخ نہ کرو۔
؎

نیناں کی شوخی میں دیکھیا ہوں آج نوا تلخ
پلکاں کے بچن سوں نہ کرو میرا ہیا تلخ

تیری چنچل آنکھوں کی چمک دیکھ کر آسمان کی بجلیاں ہمیشہ
محظوظ ہوتی ہیں۔ ؎

چنچل تج نینا کی چمکار دیکھ
نت اسماں کیاں بجلیاں پایں حظ

"ابرو (بھنواں)" تیرے ابرو بڑے پیارے
ہیں۔ وہ چاند (ہلال) کی طرح ہیں۔ عشاق دید ہلال میں محو
ہیں ؎

پیاری بھنواں ہیں تیریاں جوں کہ چند
اسے دیکھنے میں ہیں عشاق بندا

آنکھیں، پتلیاں، پلکیں اور ابرو، گویا ایک ہی جگہ چار
اوباش جمع ہوگئے ہیں۔ ؎

انکھیاں، پتلیاں و پلکاں ہور بھنواں،
اچھے یک ٹھار میں دو چار اوباش

سائیں (محبوب) میری محفل میں رقص کناں ہیں۔ میں
طاقِ ابرو میں سجدہ گزار ہوں۔ ؎

بھنواں کی طاق میں سجدہ کروں بلکہ
ہوئے سائیں مری محفل میں رقاص

سائیں نے جہاں ناز سے پلکوں کے تیر مارے ہیں، وہاں
میرے سوا کوئی سینہ سپر نہ ہوا۔ ؎

پلکاں کے تیر مارے جہاں سائیں ناز سوں
منج باج سینہ کرنے ہدف کوئی دھیا نہیں

"نیندی آنکھیں" وہ "سودھن" (محبوبہ)
رات بھر اپنے پیا کے ساتھ جاگی ہے اس لئے اس پر سرخوشی
کا عالم طاری ہے۔ اس کا شباب، اس کے غمزے، اس کا سرمہ
اور اس کے نین سب سرخوش ہیں ؎

...وں رات جاگی ہے سو دستی ہے سو دھن سرخوش
...ن سرخوش، سین سرخوش، انجن سرخوش، نین سرخوش

اے دھن! مجھ سے مت چھپا، تو نے کہاں شراب پی، کہاں بیدار رہی؟ میں نے پہچان لیا ہے کیونکہ تیری آنکھوں نے "خماری" کا برقع اوڑھ رکھا ہے ؎

نکو منج تھے چھپا اے دھن! کہاں مے پی؟ کہاں جاگی؟
پچھانیا ہوں جو پہنا ہے خماری کا نین برقع

آنکھوں میں نیند کا خمار ہے۔ اس کے کنول سے چہرے کو اگر گلاب سے بھی دھویا جائے، تب بھی نیند کا خمار نہیں جا سکتا۔ ؎

نیند کی ہے خماری نیناں میں
او کنول مکھ دھو دیں گلاب کہاں

تیری آنکھوں میں عشق کی نیند سہاتی ہے۔ صراحی اور پیالہ تیری یاد سے بھر گیا ہے ؎

عشق نیند تج نین میانے سہے
صراحی پیالہ بھرا یاد سوں

"نرگس نین" تیرے لب کے نُقل سے مجھے شراب حلال ہے اور تیرے "نین نرگس" کے بغیر حرام ہے ؎

ترے لب نُقل سوں ہے مے منج حلال
ترے نین نرگس بناں ہے حرام

"بے خواب آنکھیں" خط سرمہ ساجن سے کہتا ہے! میری آنکھوں میں نیند کہاں؟ ؎

سُو کے دیکھو کنے ہیں ساجن کوں
ولے میرے نین کوں خواب کہاں

"گگن گلشن آنکھیں" اے قطب شہ! نبیؐ کے صدقے، آج یہ عجب "بھیداں" دیکھا کہ دھن کے نینوں کے چاروں طرف گگن گلشن کھلا ہوا ہے۔ ؎

نبی صدقے قطب شہ آج یو بھیداں عجب دیکھا
جو کھلیا دھن کے نیناں تے طرف چارو گگن گلشن

"نین بجلیاں" تیری آنکھوں کی بجلیوں سے سب سہیلیوں کی بجلیاں ماند پڑ گئیں۔ اے سُندر! تو سیج منج طُور کے نور کی طرح دکھائی دیتی ہے ؎

تج نین بجلیاں تھے بجلی سب سہیلیاں کی چھپی
سجلی دستی ہے سندر رجیوں طُور پہ کا نور توں

"نین پھانسے" سجن کے "نین پھانسے" (پھندے) مستی میں ڈھلے ہیں۔ اور اس پر مستزاد ناز و انداز کے نقش ؎

سجن کے نین پھانسے مستی کے ڈھالے
اس اوپر سُہے نقش چھند بند چالے!

"چھند بھرے نین"

؎ پیا کے نین میں بہوت چھند ہے
او دو زلف میں جیو کا آنند ہے

؎ چھنداں سینتیں آتی ہے بھاواں دکھاتی
نین سوں ہمن رات ساری جگاتی

"مرگ نین" اس کے نئے نویلے چہرے پر حسن کا پھُولبن سُہاتا ہے۔ نین "ہرن" اور اس کی زلف "دام" ہے ؎

نول مکھ سُہے حسن کا پھُولبن
نین، مرگ ہور زلف اس پھند ہے

تُو سکھیوں میں مرگ نینی (آہو چشم) چھبیلی ہے۔ اسی لیے تیرے ساجن تجھ سے الگ نہیں ہوتے ؎

سکیاں میں ہے توں مرگ نینی چھبیلی
سجن تو نہیں ہوتے تج تھے کنارے

"سارنگ نینی" (سارنگ، سانپ، مور، بادل، مور کی آواز) جب وہ گوری راگ گاتی ہے تو میں دیار حسن کو فتح کر لیتا ہوں۔ وہ "سارنگ نینی" ہر رنگ میں سو رنگ سے سُہاتی ہے ؎

کہ گوری راگ جو گاوے تو گوریاں کا ملک جیتوں
سو سارنگ نینی سب رنگ میں سو رنگاں سُوں سہاتی ہے

"لٹاریں" پیاری کے نین کٹاری سے ہیں ۔
دودھاری تلوار بھی ان کے آگے ہیچ ہے ؎

پیاری کے نیناں ہیں جیسے کٹار رے
نہ سم اس کے انگے کوئی ہیں دودھارے

"مموے نین" اقبال نے تو اپنے مولے کو شہباز سے لڑا دیا تھا مگر محمد قلی کی پیاری کے موے نین، بڑے بڑے شہباز خانوں کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ پیاری کی آنکھیں مموے کی طرح ہیں، جو ابرو کی ترازو میں (عاشق کو) بڑی ادا سے تولتی ہیں ؎

نین ہیں دو پیاری کے جیسے مموے
بھنواں کی ترازو سوں بھو چھند تولے

"کھنجن نین"، "سینوے نین" ؎

نین کوں کیاں ہیں دو کھنجن پیا کے
نین کوں کیاں چُلبُلاتے سینولے

"فسوں ساز آنکھیں" اے سکھی! تیری دونوں فسوں ساز آنکھوں میں عجیب جادو ہے کہ تیری آنکھوں کے سحر کو دیکھ کر ساری بھی بے ہوش ہوجاتے ؎

عجب کچ سحر دھرتے ہیں سکی تج نین ساحر دو
کہ تج نیناں کے سحراں دیکھ ہوئے ساری بے ہوش

محمد قلی کہیں کہیں ریختی کا انداز بھی اختیار کرلیتا ہے۔ اکتسابِ لذت کے لئے یہ اس کا خاص حربہ ہے۔ مثلاً ؎

ہمارا سجن خوش نظر باز ہے
تو اس دل میں سب عشق کا راز ہے

گویا خوش نظری رازِ عشق تلمیح سی ہے ۔

میں نے تیری آنکھوں سے پریم کی سب باتیں سُنیں، اب کیوں آنکھیں پھیرتی ہے؟ تو اپنی آنکھوں کو عشق کی چادر اُڑھا کر، راہِ عشق پر لگادے ؎

پریم کی باتاں سب سُنیا، اب کی پھراتی ہے نین؟
اپنی نین اس پنتھ لا، اوڑیا عشق کی چادری

تیرے نین کے حسن و شباب سے عشق کا چراغ روشن ہوگیا۔ سکھی ساتوں سُروں میں گا کر "آساوری" کی دُھن میں الاپتی ہے ۔ ؎

دیوا عشق روشن ہوا، تج نین کیرے شاب تھے
ساتو سُراں گا کر سکی آلاپتی آساوری

پیاری اپنے غمزے کی چادر اوڑھ کر، آنکھ کے اشارے سے بُلاتی ہے ؎

اپس غمزے کی چادر اوڑی پیاری
نین سیتی صاحب بُلاتی اہے ری

مذکورہ مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ محمد قلی کی "ہندوی روایت" میں "ایرانی یا فارسی رنگ" کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ تاہم جہاں تک اس کی پیاریوں کا تعلق ہے، ان کی آنکھوں میں ہندوی رنگ، رُوپ اور رس جھلکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محمد قلی خوبصورت آنکھوں کا رسیا تھا۔ ع ترے دو نین ہیں بدمست متوال

●

فاروق شفق

غزل

سکوں سے بیٹھ کے کچھ کام کرتے نیند بھر سوتے
اگر اپنے محلے میں بھی کچھ لکھے پڑھے ہوتے
پھلوں کو توڑتے، جھکتے، دعا دیتے، گزر جاتے
ہماری رہ گزر کے پیڑ میں بھی کاش پھل ہوتے
اُجالے کا ہمارے پاس اک چھوٹا سا ٹکڑا تھا
کہاں تک رات میں ڈوبی ہوئی تحریر کو دھوتے
ہرے بانسوں میں اکثر آگ لگ جاتی ہے دیکھا ہے
جہاں ایسی فضا ہو اس جگہ کیا چیز ہم بوتے
فرشتہ بن کے سب اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھے ہیں
مزہ آتا اگر ہم میں شفق کچھ آدمی ہوتے

ڈاکٹر رانا گنوری

غزل

نت نئے قالبوں میں ڈھلتے ہیں
نت نئے روپ وہ بدلتے ہیں
اس نے مجھ کو چنا جفا کے لئے
"لوگ اس بات پر بھی جلتے ہیں"
سادہ لوحی کہ ہم نہیں سمجھے
آستینوں میں سانپ پلتے ہیں
میری تقدیر، تیری زلفوں کے
خم خدا جانے کب نکلتے ہیں
نیک صحبت رہے گی اے رانا
چلئے کچھ دور ساتھ چلتے ہیں

ابراہیم یوسف

چپقلش

منظر: ——— ایک کمرہ جس میں ہر چیز بہت سلیقہ اور نفاست سے سجی ہوئی ہے۔ صبح کا وقت ہے ثروتی سنگھار میز کی طرف پیٹھ کئے کھڑی ہے۔ طاہر صوفے پر بیٹھا ہے معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں کسی بات پر بحث ہو رہی ہے اور ثروتی غصہ میں ہے۔ ثروتی ایک دو قدم آگے بڑھ کر غصہ سے۔

ثروتی: ——— طاہر۔ میں بجھے ہوئے سگار کی راکھ نہیں ہوں جسے تم چٹکی بجا کر جہاں چاہو جھٹک دو۔ میری بھی اپنی شخصیت ہے۔

طاہر: ——— تم میرے لئے صرف شخصیت ہی نہیں بلکہ پیاری اور محترم شخصیت ہو (کھڑے ہو کر اس کے پاس آتے ہوئے) تم بجھے ہوئے سگار کی راکھ نہیں ہو بلکہ وہ متبرک چنگاری ہو جس سے میں زندگی کی حرارت حاصل کرتا ہوں (کسی قدر الجھن سے) لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ صبح صبح اس طرح۔

ثروتی: ——— (بات کاٹ کر) تمہارے سلیمہ کے کیسے تعلقات ہیں۔

طاہر: ——— وہ میری سکریٹری ہے۔

ثروتی: ——— اور تمہاری داشتہ بھی جس سے اب تم نکاح کرنا چاہتے ہو۔

طاہر: ——— لاحول ولا قوۃ۔ (مسکرا کر) تو محترمہ ثروتی کی یہ بھی مفروضات کے تانے بانے سے گوندھی گئی ہے۔ ثروتی ڈیئر یہ میری بدبختی ہوگی اگر میں تمہارے اعتماد کی بے حرمتی کروں۔

ثروتی: ——— تو پھر سلیمہ اپنے شوہر سے طلاق کیوں لینا چاہتی ہے

طاہر: ——— میرے لئے نئی خبر ہے۔ ہوگی کوئی گھریلو چپقلش۔

ثروتی: ——— اور اس چپقلش کا سبب تم ہو۔

طاہر: ——— میں!

ثروتی: ——— جی ہاں آپ مسٹر طاہر۔ جب اس کا شوہر اسے تمہاری سکریٹری دیکھنا پسند نہیں کرتا تو اسے علیحدہ نہ کرنے پر تم کیوں مصر ہو (طاہر خاموش رہتا ہے ثروتی اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر) اب خاموش کیوں ہو۔ (طنزیہ) کوئی خوبصورت بہانہ نہیں تراش سکتے۔

طاہر: ——— مجھے کوئی بہانہ تراشنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (کچھ دیر رک کر) وہ میری کاروبار کی کمزوری ہے۔

ثروتی: ——— (طنزیہ) کاروبار کی کمزوری یا صرف کمزوری۔

طاہرہ:۔ ثروتی۔ میرے الفاظ کو غلط معنی دینے کی کوشش نہ کرو۔ صرف کمزوری بہت واہیات لفظ ہے۔

ثروتی:۔ اور اس واہیات لفظ کو تم نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔

طاہرہ:۔ نان سینس (کسی قدر بیزار ہو کر) ثروتی آج تمہارا خود اعتمادی متزلزل کیوں ہو رہی ہے۔ بخدا تم میری قسمت ہو۔

ثروتی:۔ (طنزیہ) اچھا

طاہرہ:۔ طنز نہ کرو ثروتی مجھے یقین ہے کہ جس دن میں نے تم سے بیوفائی کی میری قسمت مجھ سے روٹھ جائے گی۔

ثروتی:۔ (کسی قدر نرم پڑتے ہوئے) تو پھر جب وہ نوکری چھوڑنے کا کہتی ہے تو اس کی تنخواہ میں اضافہ کرکے کیوں روک لیتے ہو۔

طاہرہ:۔ (مسکرا کر) بے وفا شوہر کی نادان بیوی۔ کاروبار میں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس بہت کچھ سے وہ واقف ہے۔ اس کا منہ بند رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے۔

ثروتی:۔ تو گویا وہ تمہیں بلیک میل کر رہی ہے۔

طاہرہ:۔ نہیں بلکہ میں خود بلیک میل ہو رہا ہوں اس لئے کہ یہ ضروری ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے یہ پسند نہ ہوگا کہ سوسائٹی میں میرے متعلق کوئی اسکینڈل مشہور ہو۔

ثروتی:۔ تو کیا سلیمہ کو ہر جگہ ساتھ لئے پھرنے سے تمہاری نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے۔

طاہرہ:۔ سوسائٹی میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ثروتی:۔ تو پھر اس کے شوہر کو بھی کوئی نوکری دے دو۔

طاہرہ:۔ (ہنس کر) اپنی نگرانی کے لئے یا سلیمہ کی نگرانی کے لئے.....
ثروتی وہ ایک واہیات اور ناکارہ انسان ہے۔ آوارہ گرد۔
شاید تم نے اسے دیکھا نہیں ہے۔

ثروتی:۔ میں اس سے مل چکی ہوں۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا تھا۔

طاہرہ:۔ تعجب ہے کہ پھر بھی تم نے اسے نہیں سمجھا۔

ثروتی:۔ وہ صورت سے بھولا بھالا اور باتوں سے معصوم معلوم ہوا۔ وہ سلیمہ سے بہت محبت کرتا ہے۔

طاہرہ:۔ (ہنس کر) محترمہ ثروتی ہیں کو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

نوکر:۔ (کمرے میں آکر) صاحب طارق میاں تشریف لائے ہیں۔

طاہرہ:۔ اچھا (ثروتی کی طرف دیکھ کر) حضور اپنے دماغ میں یہ فرضی کھچڑی پکانا چھوڑ دیجیئے۔
(ہنستا ہوا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نوکر بھی جانے کے لئے مڑتا ہے)

ثروتی:۔ ارے حموشن تو (حمو مڑ کر دیکھتا ہے) مجھے ایک پیالی چائے دے جا اور اخبار آگئے ہوں تو لے آ۔

حمو:۔ بہت اچھا۔
(حمو کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ثروتی سنگھار میز کے پاس جا کر اپنی شکل دیکھتی ہے اور سر پر ہاتھ پھیر کر بال برابر کرتی ہے کچھ دیر بعد حمو اخبار لا کر میز پر رکھتا ہے۔ ثروتی میز کے پاس آتے ہوئے)

ثروتی:۔ چائے نہیں لایا۔

حمو:۔ لاتا ہوں سرکار۔

ثروتی:۔ طارق صاحب سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

حمو:۔ پتہ نہیں۔ شکار کا پھر کوئی پروگرام بن رہا ہو۔

ثروتی:۔ یہ نیا مرض لاحق ہو گیا ہے۔

حمو:۔ سرکار تو برابر ٹالتے رہتے ہیں وہ تو طارق صاحب اور سلیمہ بی۔
(خاموش ہو جاتا ہے۔ ثروتی اسے دیکھتی ہے، کچھ بولنا چاہتی ہے مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتی ہے ایک اخبار اٹھاتے ہوئے)

ثروتی:۔ تو جعفر صاحب کو جانتا ہے۔

حمو:۔ کون جعفر صاحب۔

ثروتی:۔ سلیمہ بی کے شوہر۔

حمو:۔ اچھا تو ان کا نام جعفر صاحب ہے لوگ تو انہیں خنجر صاحب کہتے ہیں۔ سرکار وہ مشاعرے میں ایسا اچھا گاتے ہیں کہ

سب لوگ واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔

ثرولی :۔ میں پوچھ رہی ہوں وہ کیسے آدمی ہیں۔

حمو :۔ مجھے کیا پتہ سرکار مگر مشاعرے میں گاتے اچھا ہیں۔

ثرولی :۔ چل جا چائے لے کر آ۔ مشاعرے میں گاتے اچھا ہیں۔ بیوقوف

(حمو کمرے میں چلا جاتا ہے ثرولی صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتی ہے تھوڑی دیر بعد حمو چائے لے کر آتا ہے اور ثرولی کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے)

حمو :۔ سرکار وہ خنجر صاحب آئے ہیں۔

ثرولی :۔ انہیں صاحب کے پاس پہنچا دے۔

حمو :۔ مگر وہ تو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ثرولی :۔ مجھ سے! مجھ سے کیا کام ہے۔ (سوچکر) اچھا انہیں یہیں لے آ۔ اور طارق صاحب کے لئے چائے دے آیا

حمو :۔ ابھی نہیں۔

ثرولی :۔ انہیں بھی چائے دے آنا۔

(حمو چلا جاتا ہے۔ ثرولی پھر آئینے کے پاس جا کر بال درست کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد حمو دروازے کا پردہ ہٹا کر)

حمو :۔ آیئے۔ تشریف لایئے۔

(جعفر کمرے میں آتا ہے اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ تھکا ہوا ہے ثرولی کو دیکھ کر ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتا ہے)

ثرولی :۔ آیئے خنجر صاحب۔ ابھی آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

جعفر :۔ نصیب نصیب کہ آپ نے یاد رکھا۔

ثرولی :۔ تشریف رکھیئے۔ ابھی حمو کہہ رہا تھا کہ آپ مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔

جعفر :۔ کون حمو؟

ثرولی :۔ یہی ہمارا نوکر۔

جعفر :۔ (اداسی سے) میں اس کا شکریہ ادا کروں گا۔

ثرولی :۔ لیکن اس میں اداسی کی کیا بات ہے۔

جعفر :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جی نہیں، میں اداس کہاں ہونے لگا اپنی تعریف سُن کر کون اداس ہوتا ہے۔

(حسرت سے) لوگ مجھے گلے باز شاعر کہتے ہیں اسے بھی میری گلے بازی پسند ہوگی (کسی قدر تلخ لہجے میں) آج کے نقاد کی طرح اس نے بھی کب میری روح کی تڑپ اور تنہائی کو محسوس کیا ہوگا۔

ثرولی :۔ لوگوں کی بدذوقی کو   میں کرنا چاہیئے۔ (جعفر کو دیکھ کر) لیکن آپ نے یہ حُلیہ کیا بنا رکھا ہے۔

جعفر :۔ (اپنے لباس پر نظر ڈال کر) میرے اس گندے لباس سے شاید آپ کا احساسِ جمال مجروح ہو رہا ہے۔

ثرولی :۔ نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔

جعفر :۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اپنا منحوس وجود لے کر چلا جاؤں گا۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ میں چند مہینے سے بیکار ہوں۔

ثرولی :۔ مگر سلیمہ تو۔

جعفر :۔ (بات کاٹ کر) محترمہ۔ میری انا کو اس طرح نہ للکاریئے کہ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو جائے۔ مجھ کو مر جانا عزتِ نفس کی قربانی سے بہتر ہے (ثرولی تو میق نظروں سے اسے دیکھتی ہے) آپ نے مسٹر طاہر سے میرا دکھ بیان کر دیا۔

ثرولی :۔ میں نے ابھی سرسری بات کی ہے مگر وہ۔

جعفر :۔ (لقمہ دے کر) میرے دُکھ کو نہ سمجھ سکے۔

ثرولی :۔ سمجھیں گے کیوں نہیں اور اگر نہیں سمجھیں گے تو سمجھایا جائیگا۔

جعفر :۔ اور اب تو سلیمہ نے عدالت میں علیحدگی کی درخواست بھی دے دی ہے۔

ثرولی :۔ درخواست دے دی ہے!

جعفر :۔ جی ہاں۔ (صوفے کی طرف دیکھ کر) اگر آپ اجازت دیں تو میں بیٹھ جاؤں۔ رات بھر سو نہ سکا (پھر اپنے لباس کی طرف دیکھ کر) مگر میرا لباس۔

ثرولی :۔ شرمندہ نہ کیجئے۔ تشریف رکھیئے۔ آپ نے ناشتہ کیا۔ (بلند آواز سے) حمو۔ ارے حمو۔

جعفر :۔ آپ تکلیف نہ کیجئے میں ناشتہ کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ (صوفے پر اس طرح بیٹھتا ہے جیسے اس کے گندہ ہو جانے کا خطرہ ہو)

ژولی:۔ آپ آرام سے تشریف رکھیئے۔

جعفر:۔ میں آرام سے ہوں۔

(ممو کمرے میں آتا ہے۔ ژولی اسے دیکھکر)

ژولی:۔ ناشتہ۔

جعفر:۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔

ژولی:۔ اچھا چائے تو پیجئے۔ (پیالی میں چائے نکالتے ہوئے ممو سے) جا، سلیمہ کو فون کر کہ وہ ابھی آکر مجھ سے ملیں۔

ممو:۔ صاحب پہلے ہی فون کر چکے ہیں وہ آتی ہی ہوں گی۔

ژولی:۔ اچھا۔ جب وہ آئیں تو پہلے میرے پاس لا۔

(ممو چلا جاتا ہے۔ ژولی چائے کی پیالی جعفر کو دیتی ہے جعفر پیالی لیکر کچھ دیر خلا میں دیکھتا رہتا ہے۔ پھر پیالی میز پر رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے)

جعفر:۔ مسز طاہر۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مجھے زندگی میں کچھ بھی تو نہیں ملا۔

ژولی:۔ آپ چائے تو پیجئے۔

جعفر:۔ (اپنی ہی دھن میں) نقاد مجھے نظرانداز کرتے ہیں۔ پیسہ مجھ سے روٹھا ہوا ہے۔ دل میں سلیمہ کی محبت ہے تو وہ اس کا احترام نہیں کرتی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں دکھوں کا انبار اپنے سینہ میں لئے زندہ ہوں، کاش مسٹر طاہر اسے محسوس کر سکتے۔

ژولی:۔ مگر طاہر تو قسمیں کھاتے ہیں کہ سلیمہ صرف ان کی سیکرٹری ہے۔

جعفر:۔ یہ مسٹر طاہر کی مزید خوش قسمتی ہے کہ آپ ان کی قسموں پر اعتبار کر لیتی ہیں۔ اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ سلیمہ میری قسموں پر بھی اعتبار نہیں کرتی (کچھ دیر خاموش رہ کر) اگر کبھی آپ کو فرصت ملے تو آپ ہی میرے دکھوں پر غور کر لینا۔ مسٹر طاہر سے تو کوئی امید نہیں (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) خدا حافظ۔

ژولی:۔ مگر سنیئے تو۔

(اسی وقت طاہر کمرے میں آتا ہے۔ طاہر کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ جعفر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ طاہر آگے بڑھتے ہوئے)

طاہر:۔ یہ کیوں آیا تھا۔

ژولی:۔ اپنا دکھ بیان کرنے۔ (کچھ دیر رُک کر) سلیمہ نے علیحدگی کے لئے عدالت میں درخواست دے دی ہے (طاہر خاموش رہتا ہے) کیا آپ سلیمہ کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ایک مرتبہ اور ٹھنڈے دل سے غور کرے۔

طاہر:۔ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا مجھے کیا حق ہے۔

ژولی:۔ رائے دینا دخل دینا نہیں ہوتا۔

طاہر:۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا وہ کس قدر نامعقول اور واہیات شخص ہے۔

ژولی:۔ مجھے تو اس میں کوئی واہیات پن اور نامعقولیت نظر نہیں آئی۔

طاہر:۔ یہ بڑھا ہوا شیو، اُلجھے اور بکھرے ہوئے بال اور گندہ لباس آپ کے نزدیک معقولیت ہے کوئی نفاست پسند عورت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

ژولی:۔ مگر وہ چھ مہینے سے بیکار ہے۔

طاہر:۔ اور جب باکار تھا تب۔ اس نے اپنی زندگی کو بیکاری کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں نے سفارش کر کے اسے ایک کمپنی میں رکھا دیا اُس نے وہاں کیا کیا۔

ژولی:۔ کیا کیا؟

طاہر:۔ دو مہینے کرسی پر بیٹھ کر اونگھتا رہا صرف کسی مسئلہ پر ایک نوٹ لکھا اور وہ بھی نظم میں۔

ژولی:۔ نظم میں!

طاہر:۔ جی ہاں نظم میں۔ اور سنیئے، میں نے کمپنی سے اڈوانس نکلوا کر معقول کپڑے دیئے معلوم ہے ان کپڑوں کا کیا کیا۔

ژولی:۔ بیچ کر کھا پی گیا ہوگا۔

طاہر:۔ جی نہیں یہ کہہ کر لوگوں میں تقسیم کر دیئے کہ مجھے اس لباس سے وحشت ہوتی ہے۔ کمپنی کا روپیہ مجھے ادا کرنا پڑا مگر یہ کھانا بھی نہیں کھاتا کہ وہ سلیمہ کی کمائی ہے۔

ژولی:۔ یہ چارج شیٹ آپ نے تیار کی ہے یا سلیمہ نے۔

طاہر:۔ سوال یہ نہیں کہ چارج شیٹ کس نے تیار کی ہے۔ سوال حقائق کا ہے مجھے اس واہیات شخص سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں۔

ژولی:۔ کیوں ہوگی آپ کی دلچسپی تو دونوں کی علیحدگی میں ہے۔

(طاہر کچھ دیر ژولی کو دیکھتا ہے پھر غمگین لہجے میں)

طاہر:۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آج صبح سے آپ کو کیا ہو گیا ہے جعفر اور سلیمہ کے درمیان آپ مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔

ژولی:۔ اس لئے کہ آپ کا رول مشکوک ہے۔

طاہر:۔ اگر آپ مجھے بددیانت سمجھنے پر مصر ہیں تو پھر آپ کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سلیمہ آپ لوگوں کے درمیان مسئلہ کیوں بن گئی ہے۔

ژولی:۔ ہم لوگوں کے درمیان؟

طاہر:۔ جی ہاں مسز طارق میکے تشریف لے گئیں ان کو یقین تھا کہ سلیمہ اور طارق کے تعلقات ہیں اس وقت طارق آپ ہی کے پاس آیا تھا۔

ژولی:۔ میرے پاس!

طاہر:۔ جی ہاں تاکہ آپ ان کی بیگم صاحبہ کو منا لائیں۔ میں نے کہا بھائی طارق ہماری شیرنی خود صبح سے دھاڑ رہی ہے اور دھاڑتی ہوئی شیرنی کو ہوش و حواس پر قابو نہیں رہتا۔

(ژولی خاموش ہو کر سوچنے لگتی ہے طاہر کچھ دیر کھڑا رہتا ہے پھر دروازے کی طرف جاتا ہے کہ سلیمہ کمرے میں آتی ہے اور طاہر کو جاتا ہوا دیکھ کر)

سلیمہ:۔ آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔

(طاہر کوئی جواب نہیں دیتا اور کمرے سے چلا جاتا ہے سلیمہ مڑ کر اسے دیکھنے لگتی ہے)

ژولی:۔ (طنزیہ) میں نے بھی آپ کو یاد فرمایا تھا۔

سلیمہ:۔ (مڑ کر ژولی کو دیکھ کر) آپ نے۔

ژولی:۔ جی ہاں۔

سلیمہ:۔ (آگے بڑھتے ہوئے) فرمایئے۔

ژولی:۔ تم مسٹر جعفر سے علیحدگی کیوں اختیار کرنا چاہتی ہو۔

سلیمہ:۔ (پہلے تو ژولی کو غور سے دیکھتی ہے پھر آہستہ سے) یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

ژولی:۔ نہیں یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں ہے اس سے کسی اور کا بھی گھر متاثر ہو سکتا ہے۔

سلیمہ:۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

ژولی:۔ تم سب کچھ سمجھتے ہوئے معصوم بننے کی کوشش کر رہی ہو۔ تمہارے اور طاہر کے کیسے تعلقات ہیں۔

سلیمہ:۔ وہ میرے باس ہیں۔

ژولی:۔ صرف باس یا کچھ اور بھی۔

سلیمہ:۔ (کچھ دیر اسی طرح خاموش رہتی ہے جیسے اپنے آپ پر قابو پا رہی ہو۔ پھر) مسز طاہر لیڈی سیکرٹری ہونے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باس کی داشتہ بھی ہو۔

ژولی:۔ ہاں ہونا تو یہی چاہئے مگر ایسا ہو نہیں رہا ہے۔

سلیمہ:۔ (کسی قدر لہجہ بدل کر) اگر آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو ایک دن آپ کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔

ژولی:۔ شرمندہ ہونا پڑے گا!

سلیمہ:۔ جی ہاں۔ اسلئے کہ مجھے مسٹر طاہر کی ذات میں اتنی بھی دلچسپی نہیں جتنی اب بھی جعفر کی ذات میں ہے۔

ژولی:۔ تو پھر تم مسٹر جعفر سے کیوں علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہو۔

سلیمہ:۔ میں نے عرض کیا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے (کچھ دیر رک کر) اور اگر آپ جاننا ہی چاہتی ہیں تو سنیئے وہ انتہائی غیر ذمہ دار اور غیر ضروری انانیت کا شکار ہے۔

ژولی:۔ وہ شاعر ہے اور ــ

سلیمہ:۔ (بات کاٹ کر) شاعر ہونا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہے کہ انسان غیر ذمہ دار ہو کر واہی تباہی مارا مارا پھرتا رہے آپ ہی کہیئے خود فرمایئے کہ کیا کوئی خوددار عورت یہ برداشت کر سکتی ہے کہ اسکی جائز دیانت کو برے معنوں میں کمائی کیا جائے۔

ژولی:۔ لیکن بحیثیت شاعر تمہیں اسے کچھ نہ کچھ رعایت تو دینا چاہیئے۔

سلیمہ:۔ شاعر کی حیثیت سے میں اسے پسند کرتی رہوں گی، مگر بحیثیت شوہر میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ (ژولی خاموش)

دیکھ سوچ) کیا اسی لئے آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔

شدولی :- سلیمہ میں چاہتی ہوں کہ ایک مرتبہ اور اپنے فیصلے پر غور کر لو کہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔

سلیمہ :- میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

طاہر :- (کمرے میں آتے ہوئے) مسز جعفر۔ (سلیمہ مڑ کر طاہر کو دیکھتی ہے۔ طاہر کچھ دیر خاموش رہ کر ایک کاغذ اسے دیتے ہوئے) مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمات سے محروم ہو رہا ہوں۔

سلیمہ :- (ایک اچٹتی سی نظر کاغذ پر ڈال کر) شکریہ۔ (مسکرا کر) آپ نے میری بڑی مشکل آسان کر دی۔

(طاہر حیرت سے سلیمہ کو دیکھتا ہے) ابھی چند منٹ پہلے میں نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

طاہر :- حسبِ قاعدہ آپ کو ایک مہینے کی مزید تنخواہ مِل جائے گی۔

سلیمہ :- وہ میرا حق ہے مجھے مِلنا ہی چاہیئے۔

طاہر :- طارق کی بیوی میکے چلی گئی ہے وہ اسے منانے جا رہا تھا اس لئے اب سب پروگرام منسوخ سمجھیئے۔

سلیمہ :- وہ بھی مسز طاہر کی طرح غلط فہمی میں مبتلا تھیں؟ (مسکرا کر) چلیئے اب دونوں بیگمات کو سکون مِل جائے گا۔

(دروازے کی طرف جاتی ہے۔ شدولی اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر)

شدولی :- مسز جعفر۔ (سلیمہ مڑ کر دیکھتی ہے) کیا آپ ایک مرتبہ اور اپنے فیصلے پر غور کریں گی۔ (سلیمہ کچھ دیر شدولی کا چہرہ اس طرح دیکھتی ہے جیسے اُسکے دِلی خیالات معلوم کرنا چاہتی ہو اور پھر خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ شدولی طاہر سے) آپ جعفر کو کوئی نوکری دے دیجئے تاکہ اس میں جو احساسِ کمتری ہے وہ ختم ہو جائے۔ شاید ان کا گھر تباہ ہونے سے بچ جائے۔

(طاہر خاموش رہتا ہے)

:- پردہ :-

اطہر زبیدی

غزل

دِل یہ کہتا ہے پسِ پردہ دِل آرا ہے کوئی
ہستیٔ قطرہ بتاتی ہے کہ دریا ہے کوئی

خود ثبوتِ بے گماں ہیں یہ نقوشِ رنگ رنگ
گو نظر آتا نہیں نقاشِ زیبا ہے کوئی

کاش ہو جاتی ہمیں دیدِ پسِ پردہ نصیب
پردۂ ہستی کے اندر جلوہ فرما ہے کوئی

اپنے اپنے کام میں مصروف ہے کُل کائنات
اِس سے ظاہر ہے یقیناً کار فرما ہے کوئی

سایۂ اِنساں بھی اطہرؔ اب نظر آتا نہیں
خلق میں انسانِ بے سایہ بھی گُذرا ہے کوئی

پروفیسر عنوان چشتی
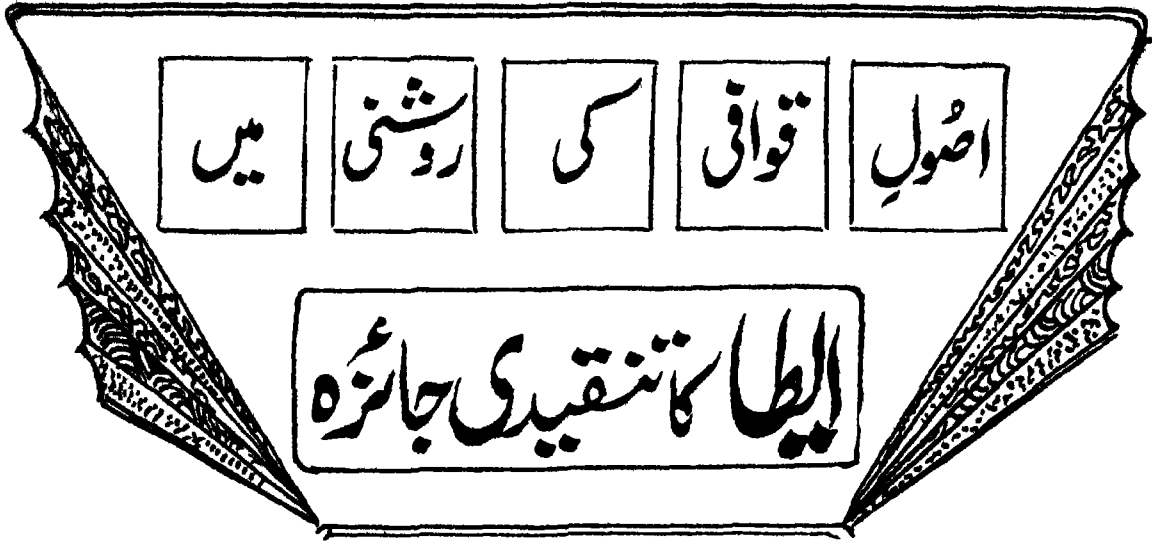
قافیہ شاعری کے لئے مفید ہے نہ مُضر۔ بلکہ اس کے حُسن و قبح کا انحصار شعری تجربے کی نوعیت اور تخلیقی قوت پر ہے۔ قافیہ شاعری کے لئے اُس وقت مُضر ہوتا ہے، جب یہ اظہارِ خیال کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اور شاعر کی توجہ معانی آفرینی اور خلّاقی سے ہٹا کر اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ ایسی حالت میں قوافی کی تلاش اور ترتیب روایت کی تقلید یا زیادہ سے زیادہ صوتی آہنگ کی ضرورت کے تحت ہوتی ہے۔ شاعری میں معانی خیزی کے لئے نہیں ہوتی۔ اسی لئے کمزور شاعروں کے یہاں قافیہ معانی آفرینی کا کام نہیں کرتا بلکہ محض شاعری کی آرائش کا کام کرتا ہے۔

مولانا حالی نے اسی مشکل کے پیشِ نظر لکھا تھا:۔

"شاعر در اصل کوئی خیال نہیں باندھتا — بلکہ
قافیہ جس خیال کو باندھنے کی اجازت دیتا ہے،
اُس کو باندھ لیتا ہے اور جس طرح صنائع بدائع
کی پابندی معنی کا خون کر دیتی ہے، اسی طرح بلکہ اس
سے کہیں بہت زیادہ قافیہ کی قید ادائے مطلب میں
خلل انداز ہوتی ہے۔"[۱]

یہ قافیہ پیمائی کا انداز ہے۔ لیکن قافیہ کا فنکارانہ استعمال ایک طرف شعر کی موسیقی میں اضافہ کرتا ہے، دوسری طرف اس کی معنویت کو بڑھا دیتا ہے۔ قافیے سے ایک خاص انداز کی جمالیاتی کیفیت ملتی ہے۔ اس جمالیاتی کیفیت کی بنیاد صوتی کیفیت یا اُس غنائیت پر ہوتی ہے، جو قافیے کے التزام اور تواتر سے پیدا ہوتی ہے۔ مقفّیٰ شاعری میں چونکہ قافیے یکے بعد دیگرے لگاتار آتے رہتے ہیں اور ایک غنائی زنجیر سی بنا لیتے ہیں۔ اس لئے اُس سے ذہن کو ایک خاص پس منظر فراہم ہوتا ہے جس پر معانی کی تصویر رقص کرتی ہے۔ جمالیاتی یا تخلیقی قافیے کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف قافیہ شعر میں معانی کے بہت سے رنگوں کو یکجا کرتا اور تجربات کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔ دوسری طرف قاری کے ذہن پر معانی کی تہوں کو کھولتا اور تخلیقی تجربے کی پیچیدگی کو واضح کرتا ہے۔ قافیے میں ایک مقناطیسی حُسن ہوتا ہے۔ جو تخلیقی عمل کے دوران خیال کی حد بندی کرتا، اور شعری تجربے کے عناصر کو شیرازہ بند کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر ضروری عناصر سے شعر کو پاک بھی کرتا ہے۔ قافیہ شعر کے داخلی اور خارجی عناصر میں وحدت پیدا کرتا ہے

[۱] مقدمۂ شعر و شاعری (مرتبہ وحید قریشی) ۱۹۵۳ مکتبہ جدید لاہور ص - ۱۲۸

اور شعری تجربے کے مختلف عناصر کو ایک شعری شکل میں سمونے اور اُس میں دلکشی پیدا کرنے میں خاص مدد دیتا ہے۔ بقول لیوس:

"شاعری میں الفاظ کی معنویت اور شعری جمالیات دونوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر یہ قدریں ایک دوسرے کے برعکس یا متضاد نہیں ہیں تو قافیہ اس حُسن کو بڑھا دیتا ہے جو موسیقی میں پنہاں ہوتا ہے۔"[1]

یہ کیفیت قافیہ آرائی سے نہیں بلکہ قافیے کے تخلیقی استعمال سے حاصل ہوتی ہے۔

قافیے کی خوبیوں اور خرابیوں کی بنیاد پر نقادوں کے کئی گروہ ہو گئے ہیں۔ بعض اس کو شعر کا لازمی جزو خیال کرتے ہیں۔ اور بعض اسکو غیر ضروری ہی نہیں شعر کے لئے مہلک تصور کرتے ہیں۔ ان دونوں رایوں میں شدت پسندی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگرچہ قافیہ شعر کا ضروری جز نہیں پھر بھی اتفاقی اور ضمنی عنصر ضرور ہے۔ دراصل یہ تینوں رائیں قافیہ کو شاعری کا خارجی عنصر تصور کرنے پر مبنی ہیں۔ اور شاعری کے تخلیقی عمل کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہیں دراصل قافیہ کا انحصار (شعر کی پوری لسانی ساخت کی طرح) شعری تجربے پر ہے۔ شعری تجربہ جتنا بھرپور، توانا اور نادر ہوتا ہے، اس کے بطن سے اُبھرنے والا قافیہ بھی اُتنا ہی معنی خیز، طاقت ور اور اچھوتا ہوتا ہے۔ جس کو تخلیقی یا جمالیاتی قافیہ کہا جا سکتا ہے۔ جمالیاتی قافیہ شعر کی آرائش کرتا ہے۔ اس میں غنائیت کا حسن پیدا کرتا ہے اور تلازمات کا جادو جگا کر معنویت کے عنصر کو بڑھاتا ہے۔

انگریزی میں قافیہ کا نظام لچک دار ہے۔ انگریزی میں قافیہ کا مدار اردو کی طرح حروف و حرکات پر نہیں ہے۔ بلکہ صوتی آہنگ پر ہے۔ انگریزی میں تاکیدوں کا جو نظام ہے اس کا اثر قافیہ پر بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے انگریزی میں یک جزو قافیہ یا مردانہ قافیہ اور دو جزو قافیہ یا زنانہ قافیہ ملتا ہے۔ انگریزی میں سماعی قافیوں کے علاوہ عینی یا بصری قوافی بھی ملتے ہیں۔ مثلاً LOVE کو MOVE کے ساتھ بطور قافیہ برتا جاتا ہے۔ دیکھنے میں یہ دونوں الفاظ ہم قافیہ معلوم ہوتے ہیں لیکن ان دونوں کا تلفظ یا آہنگ الگ الگ ہے۔ انگریزی میں قافیے کے دائرے میں لچک ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں نے خاصی آزادی سے کام لیا ہے۔ ولفرڈ اووِن جزوی قافیوں کا موجد ہے۔ وہ ان قافیوں کو "پیرا رائم" کا نام دیتا ہے۔ انگریزی میں نصف قافیہ بھی ہوتا ہے۔ جس میں جزوی قافیہ کے رُکن کے بعد ایک غیر تاکیدی رُکن آتا ہے۔ ان صورتوں کے علاوہ ہوپ کنس نے ایک مخصوص قسم کا "معلق قافیہ" بھی استعمال کیا ہے۔ انگریزی قوافی اور اُس کی صورتوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انگریزی میں قافیے کا نظام لچک دار اور وسیع ہے۔ اور اس میں اردو کی طرح سخت گیری نہیں ہے۔ انگریزی میں قافیہ انہیں آسانیوں کی وجہ سے کیفیات اور خیالات کا تابع ہوتا ہے۔ اور اس کی ترتیب مصرعوں کے اختصار اور طوالت پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ انگریزی میں قافیے کی ترتیب شاعری کی رنگا رنگی کو بڑھاتی ہے۔ اس طرح بولٹن کی یہ بات صحیح نظر آتی ہے کہ قافیے کے لئے نئے امکانات شاعری میں اُپج اور دلکشی بڑھاتے ہیں۔ اور روایت کو تازہ کرنے کے لئے بہت اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔"[2] اردو میں بھی اگر قافیے کو جمالیاتی اور صحیح انداز سے برتا جائے اور اس کا تعلق تخلیقی تجربے سے رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو شاعری اس کی برکتوں سے محروم رہے۔

اردو میں اصولِ قوافی فارسی اور عربی سے آئے ہیں۔ اس لئے عروضیوں نے قافیے کی تعریف میں انہیں باتوں کو دہرایا ہے، جو عربی و فارسی شعریات میں موجود ہیں۔ نجم الغنی نے لکھا ہے:۔

"قافیہ چند حروفِ معین کا نام ہے۔ جو مثنوی کے ہر مصرع کے آخر میں اور قطعہ و باقی اشعارِ غزل و قصیدہ کے مصرع ثانی کے آخر میں مکرر آتے ہیں۔"[3]

احسان دانش نے لکھا ہے:۔

"قافیہ شعر یا مصرع آخر کے چند حروف و حرکات کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور قافیہ چند حروف حرکات

---

[1] جون لیونگسٹن لیوس: کنونشن اینڈ ریوولٹ ان پوئٹری ۱۹۳۰ لندن ص ۱۷۲ [2] مارجوری بولٹن۔ دی اناٹومی آف پوئٹری۔ لندن ۱۹۶۸ ص ۶۲
[3] بحر الفصاحت ۱۹۲۶ لکھنؤ ص ۲۸۳۔

کے مجموعے کو کہتے ہیں۔[1]

یوسف انصاری نے زیادہ فصاحت سے یہ بات کہی ہے۔

"قافیہ اُن چند حروف و حرکات کے مجموعے کو کہتے ہیں، جو بصورتِ الفاظ مختلف المعنیٰ، بغیر استقلال، بہ تکرارِ حروف یا حرکات واقع ہوں۔"[2]

اِن تعریفوں کے تجزیے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) قافیہ کی بُنیاد حروف اور اُن کی حرکات پر ہے۔ اور یہ حروف اور حرکات خاص اصولوں کے پابند ہیں۔

(۲) حروف و حرکات کی پابندی کے ساتھ وُہ الفاظ جو بطور قوافی استعمال ہوں، اِن کا مختلف المعنیٰ ہونا ضروری ہے۔

(۳) وُہ الفاظ، جو بطور قوافی استعمال ہوں، حروف و حرکات کی پابندی اور مختلف المعنیٰ ہونے کے ساتھ بدلتے رہیں۔ یعنی اِن میں آہنگ کی یکساں ترتیب اور وحدت کے باوجود تنوع بھی ہو۔

اُردو میں قافیہ کے مندرجہ بالا سہ نما اصولوں کی روشنی میں ایک سائنسی نظام ملتا ہے۔ قافیے کے لئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ و معانی دونوں میں مختلف ہو۔ آہنگ کی ایک خاص حد تک مُتحد مگر معانی میں مختلف ہو اور الفاظ میں مُتحد مگر معانی میں مختلف ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر اُردو قافیہ کی بُنیاد واقعتاً حروف اور حرکات پر ہے۔ اِس لیے قافیہ اور اُس کے عیوب کا دار و مدار اسی اصول پر ہے۔ قافیے کو معانی سے اس طرح وابستہ کرنے سے خلطِ مبحث پیدا ہوتا ہے علمائے بلاغت نے حروفِ قافیہ کی تعداد ۹ لکھی ہے۔ چار حروف یعنی ردف، قید، تاسیس اور دخیل حرفِ روی سے پہلے آتے ہیں۔ اور ۴ یعنی وصل، خروج، مزید اور نائرہ حرفِ روی کے بعد آتے ہیں۔ حرفِ روی درمیان میں آتا ہے۔ اِس پر قافیہ کا دار و مدار ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو قافیہ نہیں ہو سکتا۔ نجم الغنی نے حرفِ روی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"لفظ کے اُس حرفِ آخر کو کہتے ہیں، جو مصرع یا بیت کے آخر میں واقع ہو۔ اور یہ حرف مکرر آتا ہو۔ اور قافیہ کی بنیاد اسی پر ہے۔ اور یہ حرف اکثر اصلی ہوتا ہے۔ کبھی حرفِ زائد کو حرفِ اصلی کے حکم میں کر لیتے ہیں۔"[3]

اِس تعریف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حرفِ روی ہر قافیہ میں باقی رہتا ہے۔ مثلاً گلشن اور دامن میں نون۔ اور یہ حرف ہر قافیہ میں دہرایا جاتا ہے۔ یعنی اس کی تکرار ہوتی ہے۔ یہ حرف اصلی بھی ہو سکتا ہے اور اضافی بھی۔ اوزان اور حرکات کے نقطۂ نظر سے قافیے کو مترادف، متدارک، متواتر، متراکب اور متکاوس کہتے ہیں۔ اُردو میں آخر الذکر نوعیت کے قوافی نہیں ہوتے۔ اِس مختصر سی تمہید کے بعد اُردو میں عیوبِ قوافی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ ایک طرف قافیے کی طرف سے عدم توجہی دُور ہو اور دُوسری طرف ایطا کو صحیح تناظر میں پیش کیا جا سکے۔

ایطا کو شائیگاں بھی کہتے ہیں۔

ایطا بمعنی پامال کرنا اور قافیہ کا مکرر لانا۔ شائیگاں بمعنی بے گار لینا۔

اصطلاح میں تکرارِ قافیہ لفظی متحد المعنیٰ کو ایطا کہتے ہیں۔ اِس تعریف میں دو باتیں نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ مطلع میں تکرارِ قافیہ لفظ کی سطح پر (یعنی حروف و حرکات کی حد تک) بعینہٖ ایک ہو۔ دُوسرے تکرارِ قافیہ معنوی سطح پر بعینہٖ ایک ہو تو ایطا ہے۔ مثلاً اگر مطلع میں کان دونوں طرح بطور قافیہ استعمال ہوتا ہے اور دونوں جگہ کان کے ایک ہی معنی ہیں تو ایطا ہے۔ یہ اصول مفرد قوافی پر صادق آتا ہے۔ اساتذہ عروض و بلاغت نے مرکب قوافی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اگر مطلع کے قوافی سے کلمۂ آخر متحد المعنیٰ یعنی مشترکہ علامت دور

---

[1] بحر العروض لاہور ص ۶۰

[2] امیر العروض ۱۹۳۰ لاہور ص ۴۷

[3] بحر الفصاحت لکھنؤ ۱۹۲۶ ص ۴۸۳

[illegible] باقی ماندہ حصے بامعنی ہوں اور ہم قافیہ نہ ہوں تو ایطا [illegible] اگر مطلع میں دردمند اور حاجت مند بطور قوافی استعمال [illegible] ہوں، تو اُن سے مند (مشترک علامت یا کلمۂ آخر المعنیٰ) کو [illegible] نے پر درد اور حاجت باقی رہتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ ہم قافیہ [illegible]۔ اس لئے ایطا ہے۔ اسی طرح دوستی اور دشمنی میں یائے معدری مشترک ہے۔ جس کو الگ کرنے سے دوست اور دشمن باقی بچتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ بامعنی ہیں اور ہم قافیہ بھی نہیں ہیں۔ اس لئے ایطا ہے اسی لئے خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے حرفِ روی کو بنیاد بنا کر ایطا کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"جب مطلع کے دونوں مصرعوں میں روی کا حرف
ایک ہی معنی رکھتا ہو کہ جس سے تکرارِ معنی ثابت
ہو تو ایسے لفظوں کا مطلع میں لانا جائز نہیں
اور اس عیب کا نام ایطا ہے۔" [1]

اس لئے مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ قافیے کی علامتِ مشترک یا اُس کے کلمۂ آخرِ متحد المعنیٰ کی تکرار کو ایطا کہتے ہیں۔ جب دونوں مصرعوں کے کلمۂ آخر کے ایک ہی معنی ہوں تو مطلع میں ایطا کا عیب وارد ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) اسپاں۔ مرداں دونوں میں الف نون جمع کا ہے۔ لہٰذا ایطا ہے
(۲) نگراں۔ جویاں دونوں میں الف نون فاعلی ہے لہٰذا ایطا ہے
(۳) سرہا۔ دستہا دونوں میں ہ۔ الف جمع کا ہے لہٰذا ایطا ہے
(۴) اسپے۔ مردے دونوں میں یائے نکرہ ہے لہٰذا ایطا ہے
(۵) سیمیں۔ آہنیں دونوں میں "یں" نسبتی ہے لہٰذا ایطا ہے
(۶) دوستاں۔ یاراں دونوں میں الف نون جمع کا ہے لہٰذا ایطا ہے
(۷) حادثات۔ کائنات دونوں میں الف ت جمع کے ہیں لہٰذا ایطا ہے

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قافیے میں کلمۂ آخر کی تکرار اگر ایک نوعیت کی ہو اور متحد المعنیٰ بھی ہو اور اس کو نکال لینے سے قافیوں کے باقی حصے بامعنی الفاظ کی صورت میں ہوں۔ اور ان میں حرفِ روی بھی باقی نہ ہو، یعنی وہ ہم قافیہ نہ ہوں تو ایطا ہے۔ ایطا کی شناخت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مشترکہ علامت کو نکالنے کے بعد قوافی کے باقی حصوں پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر دونوں بے معنی ہو جائیں یا اُن میں سے کم از کم ایک بے معنی رہ جائے تو ایطا نہیں ہے۔ مثلاً دُرستی اور زندگی میں علامتِ مشترک "ی" ہے۔ اس کو نکالنے پر دُرست اور زندگ باقی بچتا ہے۔ یعنی ایک (زندگ) بے معنی ہے۔ اس لئے ایطا نہیں۔ اسی طرح لگا اور پلا میں علامتِ مشترک الف ہے۔ اس کو نکال دینے سے لگ اور پل باقی بچتا ہے۔ جس میں کم از کم ایک لفظ (پل) بے معنی ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

ایطا کی قسمیں

ماہرینِ عروض و بلاغت نے ایطا کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے۔
(۱) ایطائے جلی اور (۲) ایطائے خفی۔

(۱) ایطائے جلی:۔ اگر کلمۂ آخر متحد المعنیٰ یا علامتِ مشترک بہ نوعیتِ واحد کی تکرار جلی اور نمایاں ہو تو ایطائے جلی ہے۔ مثلاً ستمگر اور آہن گر کے قوافی میں گر کلمۂ آخر متحد المعنیٰ یا مشترک علامت بہ نوعیتِ واحد بہت جلی یا نمایاں ہے۔ اس کو نکال دینے کے بعد ستم اور آہن باقی بچتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ بامعنی ہیں۔ دونوں باہم مقفیٰ نہیں۔ یعنی حرفِ روی باقی نہیں ہے۔ اس لئے ایطا ہے۔
شمس الرحمان فاروقی نے ایطائے جلی کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

"ایطائے جلی وہ ہے، جس میں قافیہ دو ٹکڑوں والے
لفظ سے بنا ہو۔ اور آخری ٹکڑا الگ کر دیں تو جو
بچا رہے، وہ ہم قافیہ نہ ہو۔ مثلاً بت گر اور ستم گر،
خواہاں اور خنداں، شبنم اور پُرنم وغیرہ" [2]

اس تعریف میں کلمۂ آخر متحد المعنیٰ یا علامتِ مشترک بہ نوعیتِ واحد

---

[1] شاعری کی تیسری کتاب بار اول گلشنِ ابراہیمی پریس لکھنؤ ص ۴۴
[2] درسِ بلاغت پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی ص ۱۲۶

کی تکرار کو آخری ٹکڑا سمجھا گیا ہے۔ لیکن مثالوں میں بُت گر اور ستم گر شبنم اور پُرنم کو شامل کرکے ایسی تعریف کی تائید کی گئی ہے — جو قدیم عروضی کر چکے ہیں۔ ایطائے جلی کی مثالیں یہ ہیں:-

دیا دِل اُس کو جسے اِس کا قدرداں دیکھا
اُسی کے ہو رہے جس کو مزاج داں دیکھا

(حفیظ جون پوری)

اِس شعر میں قوافی قدرداں اور مزاج داں ہیں۔ دونوں میں مشترک علامت یا آخری ٹکڑا داں ہے۔ اس کو نکالنے پر ایک لفظ قدر اور دوسرا مزاج بچتا ہے۔ دونوں ہم قافیہ نہیں۔ یعنی دونوں میں حرفِ روی مشترک نہیں۔ اس لئے ایطا ہے۔

اِسی طرح یہ شعر:- ؎

بیچے اُس سے کیوں کر دلِ عاشقاں
جسے خود ہو سودائے حُسنِ بُتاں

(حسرت موہانی)

اِس شعر میں مُرکب قوافی ہیں۔ عاشقاں (عاشق + اں) بُتاں (بُت + اں) الف نُون جمع کے ہیں۔ ان کو نکالنے پر عاشق اور بُت باقی رہتا ہے۔ دونوں الفاظ با معنی ہیں اور باہم مقفیٰ نہیں۔ اسلئے ایطا ہے۔ اسی طرح یہ شعر:- ؎

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بُت خانہ تھا
ہم سبھی مہماں تھے واں اک تو ہی صاحبِ خانہ تھا

(خواجہ میر درد)

اِس شعر میں خانہ دونوں قوافی میں کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک یا آخری ٹکڑا مشترک ہے۔ جس کو نکال دینے سے بُت اور صاحب باقی رہتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ با معنی ہیں۔ اور باہم مقفیٰ نہیں ہیں۔ اِس لئے ایطا ہے۔ یہاں یہ نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ بعض لوگ خانہ سے دونوں جگہ معانی الگ الگ تصور کرکے اِس کو ایطا سے باہر نکالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہاں دونوں جگہ خانہ بمعنی گھر ہے اِس لئے تکرارِ معنی کی زد میں نہیں آتا۔

مندرجہ ذیل اشعار میں ایطائے جلی ہے۔

سجا سجا کے رکھا جن کو آئینوں کی طرح
گرے نظر سے تو بکھرے ہیں کرچیوں کی طرح

(محسن احسان)

اپنی ہی شکل پہ ظالم نے بنایا ہے مجھے
یعنی صد رنگ علامت میں چھپایا ہے مجھے

(یعنی کی ے بھی ساقط ہے)

(شمس الرحمان فاروقی)

سایہ سُرخ پھولوں کا سنگِ دل نوازاں ہے
دِل پہ حادثہ گُزرے، دم بدم چراغاں ہے

(شمس الرحمان فاروقی)

تہوں میں دِل کے جہاں کوئی واردات ہُوئی
حیاتِ تازہ سے لبریز کائنات ہُوئی

(فراق)

کہتے ہیں میں سوتے سوتے چلتی ہُوں
ہنستا دیکھ کے لوگوں کو رو دیتی ہُوں

(کشور ناہید)

جاگتے میں لکڑی کی طرح سُلگتی ہُوں
اور سوتے میں چلتی ہوا سے لڑتی ہُوں

(کشور ناہید)

آنکھ کو ویرانیاں بخشیں تو آنکھیں کیوں نہ لیں
گھر سے نکلے تھے تو لُٹنے کی دُعائیں کیوں نہ لیں

(کشور ناہید)

یہ گُلچیں جو شاخیں جھکائے کھڑے ہیں
ہزاروں نشیمن گرائے کھڑے ہیں

(شاد عارفی)

ایطائے خفی:- اگر کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک بہ نوعیتِ واحد کی تکرار خفی ہو اور بظاہر غیر محسوس ہو تو ایطائے خفی ہے۔

(بقیہ ص ۱۸۴)

[illegible]

جناب حزین لاری

غزل

نہ آس ملنے کی کوئی، نہ غم بچھڑنے کا
سماں تو دیکھ ذرا شہرِ دل اُجڑنے کا!

وُہی جو اپنے تھے، پہچان بھی سکے نہ مجھے
تماشہ خُوب تھا بن بن کر مرے بگڑنے کا!

جنوں کہاں کا؟ لڑکپن کا کھیل تھا وہ شغل
اُجالی رات میں پرچھائیاں پکڑنے کا

معاملاتِ محبّت سپرد ہیں دِل کے
ہمیں دماغ کہاں مخمصے میں پڑنے کا

عدو بھی ان کے حلیفوں میں ہو گیا شامل
معاملہ تھا حزیں بھائیوں سے لڑنے کا

شان بھارتی

غزل

ہر لمحہ میرے ساتھ وُہ تنہائیوں میں تھا
جیسے کہ میری رُوح کی گہرائیوں میں تھا

جذبوں کی کچھ خطا نہ سماعت میں کوئی نقص
وُہ گیت مر چکا ہے جو شہنائیوں میں تھا

مُجھ تک تو آج تک نہ گئی آپ کی نظر
میں بھی حضُور آپ کے شیدائیوں میں تھا

مُدّت کے بعد پہنچے تو محسوس یہ ہُوا
شہروں کا عکس گاؤں کی پرچھائیوں میں تھا

یُوسف نہیں ہُوں شانؔ مگر واقعہ ہے یہ
حُسنِ سلوک ایسا مرے بھائیوں میں تھا

یعقوب یاور کوٹی

تناسخ

"پھر میں نے ایک بڑا تخت اور اس کو جو اس پر بیٹھا ہوا تھا دیکھا جس کے سامنے سے زمین اور آسمان بھاگ گئے اور انہیں جگہ نہ ملی.... پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا کیونکہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی۔"

(انجیل مقدس مکاشفہ ۲۰-۱۱/۲۱-۱)

"میں نے جب گھر چھوڑا تھا تو برسات ہو رہی تھی۔"

"اور جب میں گھر سے نکلا تو ساری دنیا میں آگ ہی آگ تھی۔"

"میرے گھر سے نکلتے وقت نہ آگ تھی نہ پانی۔ اگر کچھ ہوتا تو میرے پیٹ کے کام آ جاتا اور میں یہاں نظر نہ آتا۔ میرا چھوٹا لڑکا بھوک سے مر گیا۔ میری بیوی اس پیٹ کی آگ سے تنگ آ کر کسی کے ساتھ نکل گئی اور میں اپنے بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر گھر سے بھاگ نکلا۔"

"لیکن تمہارا بڑا لڑکا تو تمہارے ساتھ نہیں ہے؟"

"گھر سے نکلتے وقت تو وہ میرے ساتھ تھا کہیں چلا گیا ہوگا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔"

"مانا کہ عیب پوشی کارِ ثواب ہے لیکن شاید اب ہمیں گناہ اور ثواب میں الجھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے بڑے لڑکے کو بھول جاؤ آج کل اولادیں زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتیں۔ تم خوش نصیب تھے کہ وہ کچھ دور تک تمہیں چھوڑنے آ گیا۔ میں تو اسی کے گھر میں کسی کو تاپائی نہیں کر کے جا رہا ہوں۔"

"میں تو گھر سے نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے تو لوگوں نے میری مرضی کے بالکل برخلاف زبردستی گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاں یاد آیا شاید انہوں نے اس سے پہلے میری کھوپڑی پر کسی سخت چیز سے ضرب لگائی تھی۔ اس وقت میرا گھر جل رہا تھا..... کتنا خوبصورت گھر تھا میرا۔ اس میں ایک ڈرائنگ روم تھا جسے میری بیوی نے اپنی پسند سے سجایا تھا۔ خوبصورت باغیچہ تھا جس کے ننھے ننھے پیارے پیارے پودوں کو میں ہر صبح اپنے ہاتھوں سے پانی دیتا تھا..... مجھے یقین ہے کہ میرے گھر کو نذرِ آتش کرنے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے مجھے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ میں گھر سے نکلتے وقت اپنی بیٹی سے بھی نہیں مل سکا۔ ہاں قریب کے دوسرے کمرے سے میں نے اس کی چیخوں کی آواز ضرور سنی تھی۔"

"ہا ہا ہا، تو تمہارے ایک بیٹی بھی تھی؟"

"ہاں وہ بہت خوبصورت تھی لیکن کیا میں اب کبھی اسے دیکھ سکوں گا؟"

"چیخوں والی بات سے تو لگتا ہے کہ تم جلدی ہی اس سے ملو گے۔ لیکن جب ہم نے گھر چھوڑا تھا تو سماجی قدریں بہت تیزی سے بدل رہی تھیں اسلئے یقینی طور پر اس سلسلے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"ہمیں گھر چھوڑے کتنے دن ہو گئے؟"

"صدیاں گزر گئیں میرے بھائی۔"

"نہیں یار، مجھے تو لگتا ہے کہ ہم کل ہی گھر سے نکلے تھے۔"

"اور ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

"ہاں یہ تو شاید کوئی نہیں جانتا۔ شاید اس کا علم صرف خدا کو ہوگا۔"

"میری ماں کہا کرتی تھی کہ خدا عالم الغیب ہے۔"

"ارے چھوڑو یار۔ تم بھی کہاں کی بات لے بیٹھے۔ خدا کے عالم الغیب ہونے نہ ہونے سے ہماری مسافرت پہ کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔ ہمارے سامنے یہ لمبے راستے ہیں جنہیں ہم اپنے پیروں پہ چل کر ہی سر کر سکتے ہیں۔"

"پہلے جب ہم اتنا لمبا سفر کرتے تھے تو تھک جاتے تھے۔

"ہاں حیرت ہے آج تو ابھی تک ہمارے قدم تیز تیز اُٹھ رہے ہیں۔ خدا نے ہماری ہمت اور قوت میں اضافہ کر دیا ہے۔"

"پھر تو ہی دقیانوسی۔۔۔؟"

"تم چپ رہو۔۔۔۔ ہاں اب ہم میں تھکن کا احساس ختم ہو چکا ہے۔"

"کتنا پیارا احساس تھا یہ بھی۔"

"تمہیں افسوس ہو رہا ہے شاید؟"

"ہاں پہلے جب ہم تھک جاتے تھے تو کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر آرام کرتے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے تھے۔ کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی۔"

لیکن درخت کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرنے کے لئے تھکن کی قید نہیں ہے۔ ہم اب بھی بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں اور شاید بہتر طریقے سے اسلئے کہ ہم توانا اور تازہ دم ہیں۔"

"لیکن یہاں درخت تو نظر ہی نہیں آ رہے ہیں۔ ہم بیٹھیں گے کہاں؟"

"درخت؟ ارے مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمارے قدموں کے نیچے زمین بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر اس وقت ہم ہیں کہاں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔"

"پھر ہم کیا کریں؟"

"یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"کیسے؟"

"ارے بھائی یہ معمولی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہم جہاں قدم رکھ سکتے ہیں۔ وہاں بیٹھ بھی سکتے ہیں اور جہاں بیٹھ سکتے ہیں وہاں سو بھی سکتے ہیں، وہاں مستقل طور پر قیام بھی کر سکتے ہیں۔ شاید تم بھول گئے کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"میں واقعی بھول گیا تھا، ہاں یاد آیا۔ میں جہاں رہتا تھا وہاں ندیاں تھیں، پہاڑ تھے، لہلہاتے کھیت تھے، ہرے بھرے جنگل تھے۔ جنگل میں آگ تھی۔ آسمان میں آگ تھی۔ گھر میں آگ تھی، باہر آگ تھی۔۔۔۔۔"

"ارے بھائی کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کون سا نگر ہوا؟ آگ تھی۔۔۔ آگ تھی۔۔۔۔ آگ تھی؟ چھوڑو اب یہ کیوں سوچیں کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، کون ہمیں اب واپس جانا ہے۔"

"لیکن ہم آگے تو بڑھ ہی رہے ہیں، آگے بڑھنا اور پیچھے لوٹنا ایک ہی جیسی بات ہے۔ میرا بڑا لڑکا کہا کرتا تھا کہ جب ہم ایک ہی رُخ میں آگے بڑھتے جاتے ہیں تو ایک نہ ایک دن پھر اسی جگہ پہونچ جاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔"

"ہم پھر وہاں پہونچنا نہیں چاہتے۔ ایسا کرتے ہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم زاویے بدلتے رہیں گے۔"

"زاویے بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے خوف ہے کہ ہم کسی بھی رُخ پہ چلیں بالآخر وہیں پہونچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے اس لئے بہتر یہی ہے کہ منزل کی پرواہ کئے بغیر چلتے رہو۔ بس ہمارے قدم نہ رُکیں اس لئے کہ ہمارا متحرک رہنا ہی ہماری زندگی کی علامت ہے۔ ہم رُک جائیں گے تو لوگ ہمیں مرحوم تصوّر کر لیں گے۔"

"تو کیا ہم زندہ ہیں؟ ہم میں ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جس سے ہمیں زندہ سمجھا جا سکے۔ متحرک ہونا زندگی کی دلالت نہیں کرتا۔ بدروحیں بھی ہماری طرح متحرک ہوتی ہیں لیکن لوگ انہیں زندہ نہیں سمجھتے اور ان سے خوفزدہ بھی رہتے ہیں۔"

"یعنی ہم اگر پھر اسی جگہ پہونچ گئے جہاں سے چلے تھے تو ہمارا بھی یہی حشر ہوگا؟"

"اوّل تو لوگ ہمیں پہچانیں گے نہیں۔ اور اگر پہچان بھی لیں گے تو ان کے چہرے سفید ہوں گے۔ ان کی پیٹھ ہماری طرف ہوگی اور پاؤں ان کے سر پر ہونگے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوگی ہم بھی تو ان سے ڈر کر اسی طرح بھاگے تھے۔ اس طرح ہم ان سے انتقام لے سکیں گے۔"

"میرے بھائی کیا یہ اچھی بات نہ ہوگی کہ ہم ان لوگوں کو بھولنے کی کوشش کریں جو ہماری پریشانی اور تکلیف کا باعث بنے ہیں۔"

"اچھا کوئی یہ تو بتاؤ کہ ہم ہیں کہاں؟"

"یہ سامنے کچھ ہیولے سے نظر آ رہے ہیں۔ یہ بادل ہیں یا پہاڑ؟ یہ سمجھ آ جائے تو ہم اس جگہ کا تعین آسانی سے کر سکیں گے۔"

"بصارت انہیں پہاڑ کہہ رہی ہے لیکن لمس کا کہنا ہے کہ یہ بادل ہیں۔"

"یعنی ہماری آنکھوں اور ہاتھوں میں باہم اتفاق رائے نہیں ہے۔"

"یہ کتنا بڑا المیہ ہے؟"

"خدا خیر کرے، کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا دشمن میرے اندر ہی چھپا ہوا ہے جو وقتاً فوقتاً مجھے تاراج کرتا رہتا ہے۔"

"اب ہمارا اپنا وجود ہی ہمارے لئے مشکوک ہوتا جا رہا ہے۔"

"ہاں۔"

"کیا یہ سانحہ اس سے بڑا نہیں ہے جس سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔"

"ہاں۔"

"نہیں بھائی۔ خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے جو میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھے ہیں۔"

"تم نے کیا دیکھا ہے؟"

"میں وہ سب کچھ بیان کر کے دوبارہ اس کرب سے گزرنا نہیں چاہتا۔ بہتر ہوگا کہ ہم لوگ محتاط رہیں۔ ہم دوسری باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ مثلاً موسم کے....."

"ارے ہاں یہ کون سا موسم ہے؟"

"برسات جس میں خون برستا ہے۔"

"نہیں گرمی جس میں چاروں طرف آگ ہی آگ ہوتی ہے۔"

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ دراصل سردی کا موسم ہے۔"

"ہا... ہی سردی؟ تمہیں سردی لگ رہی ہے۔ اور میرے پسینہ نکل رہا ہے۔"

"بھائی یہ نہ سردی ہے نہ گرمی، یہ برسات ہے اور تمہارے چہرے پر پسینہ نہیں خون کی بوندیں ہیں۔"

"لیکن اس میں سے پسینے جیسی بو آ رہی ہے۔"

"ہاں ہاں، کبھی کبھی پسینے اور خون میں کوئی فرق نہیں رہتا۔"

"نہیں بھائی، یہ پانی ہے پانی، برسات کا پانی۔"

"ہاں ہو سکتا ہے، میرا بیٹا کہا کرتا تھا..... دراصل وہ بڑا ذہین تھا۔ خدا اسے خوش رکھے، ہاں تو اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ یہ جو بارش ہوتی ہے یہ سمندر کا پانی ہوتا ہے اور سمندر کا پانی کھارا ہوتا ہے لیکن بارش کا پانی میٹھا ہوتا ہے قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں..... ایک بار اس نے نہایت رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب ہماری ارتقا اپنا اثر

[illegible]

سمندر کے پانی پر چھوڑ دے گا اور پانی زہریلا ہو جائے گا، میں تو کہتا ہوں وہ دن آ گیا ہے اور تمہارے چہرے پر نہ پسینہ ہے نہ پانی نہ خون بلکہ یہی بدبودار زہریلا مادہ ہے۔"

"ہاں تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے کھجلی بھی ہو رہی ہے۔"

"کیا واقعی؟ کھجلی ہونا تو زندگی کی علامت ہے۔"

"یقیناً۔"

"یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ زندگی اور موت میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔ انسانی وجود ایک آئینہ ہے جس کے ایک طرف زندگی ہے اور دوسری طرف موت ہے۔"

"ذرا رکنا میرے پیر میں کانٹا چبھ گیا ہے۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو یار کانٹوں کا تصور ہمارے لئے خواب ہو چکا ہے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں میرے قدموں تلے شاید زمین بھی ہے۔ میں بڑی دیر سے سوچ رہا تھا کہ آخر یہ ہے کیا؟"

"تو شاید ہم پھر وہیں پہونچ گئے۔"

"کہاں؟"

"جہاں سے چلے تھے۔"

"ہا ہا ہا....." ●

بقیہ ایطا کا تنقیدی جائزہ صفحہ ۳۷ سے آگے

مثلاً، داناؔ اور بیناؔ میں الف علامتِ مشترک ہے مگر غیر محسوس اور خفی ہے۔ اس لئے ایطائے خفی ہے۔ اسی طرح یہ شعر:-

> معطر اُس کے نہانے سے بسکہ آب ہُوا
> حبابِ بحر یہ اک شیشۂ گلاب ہُوا
> (ناسخ)

اس مطلع میں اب دونوں جگہ ہے۔ یعنی ا+ ا+ ب = آب۔ اسی طرح گل + اب = گلاب۔ آب نکالنے پر الف (آ) اور گل باقی بچتے ہیں جو باہم متفق نہیں۔ اس مطلع میں کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک کی تکرار خفی یا غیر محسوس ہے اس لئے اس مطلع میں ایطائے خفی ہے۔

(باقی آئندہ)

[illegible] کی نوک پلک

ماہ ستمبر ۸۵ء کا شمارہ زیرِ نظر ہے۔ نشتر خانقاہی اور اور علقمہ شبلی کی غزلیں جو کہ ایک ہی صفحہ پر ہیں اچھی ہیں پسند آئیں۔ بیشر پٹیالوی کی غزل میں تصوف کا رنگ ہے۔ مجید انور کی کہانی "کالی بلی" دلچسپ ہے۔ عطیہ پروین کی کہانی جینا تو ہے اُسی کا" قومی یک جہتی کے لئے فعال ہے۔ شاہد پرویز کا افسانہ "تنہا آدمی" کچھ زیادہ طویل ہوتے ہوئے بھی ماضی کا حقیقی کرب لئے ہوئے ہے۔ ماہنامہ "تعمیرِ ہریانہ" اُردو ادب کے جریدوں میں اپنا ایک مقام بنا رہا ہے۔

قاصر مجیبی ——— کلکتہ

"تعمیرِ ہریانہ" (اگست ۸۵ء) کا شمارہ سامنے ہے۔ نظمیں بہت خوب ہیں۔ کرامت علی کرامت کی غزل بھی کافی پسند آئی۔ راج شرما کا افسانہ خلل ہے دماغ کا" اچھا ہے۔ ہاجرہ شکور کی کہانی "سنگ دل" آج کے دور کی عورت کی تصویر ہے جس کے پاؤں میں روایات کی بیڑیاں نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی مرضی کی مالک خود ہے۔ شگفتہ کا کردار متحرک ہے اور عزم و استقلال کا پیکر بھی۔

اقبال حسن آزاد ——— جمال پور

ستمبر ۸۵ء کا "تعمیرِ ہریانہ" موصول ہوا۔ اس بار افسانوں میں مجید انور کا افسانہ "کالی بلی" بے حد جاندار، دلچسپ اور تفریحی افسانہ ہے۔ محترمہ عطیہ پروین صاحبہ کا افسانہ جینا تو ہے اسی کا" اپنی مثال آپ ہے۔ صغرا خالہ کا کردار بیحد متاثر کرتا ہے۔

عبید اللہ چودھری ——— گورکھپور

کئی روز قبل دو شمارے بیک وقت موصول ہوئے۔ یہ شمارے اگست اور ستمبر ۸۵ء کے ہیں۔ بیک وقت دو شماروں کی دستیابی آپ کی اُردو دوستی کا مسلم ثبوت ہے۔ اگست کا شمارہ اگر ایک جانب ۱۵ اگست کا عکاس ہے تو دوسری جانب ہریانہ کی ترقی کی تصویر بھی۔ اسی شمارے میں یوسف ناظم کا مضمون "جوتے کے بارے میں" جو اپنی شگفتگی کی وجہ سے انشائیہ کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے، معلوماتی اور سبق آموز ہے۔ اور ہاجرہ شکور کی کہانی "سنگ دل" اسیم جیسے مردوں کی سنگ دلی کی سچی عکاسی ہے۔ ستمبر ماہ کے شمارے میں عطیہ پروین کی کہانی جینا تو ہے اسی کا" اور شاہد پرویز کی کہانی "تنہا آدمی" قابلِ ذکر ہیں۔

ضیا چکمینوی (بہار)

"تعمیرِ ہریانہ" کا ماہ اگست کا خوبصورت سا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اِن دنوں آپ کا جریدہ انتہائی تیز رفتاری سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ معیاری تخلیقات کا انتخاب خوب ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں جہاں مشاہیر اہلِ فن کے نام ہیں وہیں نئے لکھنے والے بھی ہیں۔ یہ اچھی بات ہے اور قابلِ ستائش تعاون ہے، نئے فنکاروں کے ساتھ ——— آزاد گلاٹی کی نظم سرزمینِ وطن کی شان میں خوب ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی تخلیق پسند آئی۔ افسانہ "خلل ہے دماغ کا" یقیناً اصلاحی ہے۔ رفیع حیدر انجم کا افسانہ بہت اچھے تاثر کا حامل ہے۔ اسکے علاوہ "آزادی کی آواز" قدم قدم کی راہ میں بہت معاون ہے ——— خدا کرے آپ کی کاوشیں جریدے کو مزید سنواریں اور نکھاریں۔ **آصف سلیم** ——— دھنباد

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او۔ ۱۸۹، ۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی۔ چنڈی گڑھ سے نومبر ۸۵ء کے لئے شائع کیا۔
طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس، یو۔ ٹی چنڈی گڑھ۔

Jayanti Devi Temple, Jind

A Haryanavi belle in a dancing pose

تعمیر
ہریانہ
ستمبر ۸۵ء
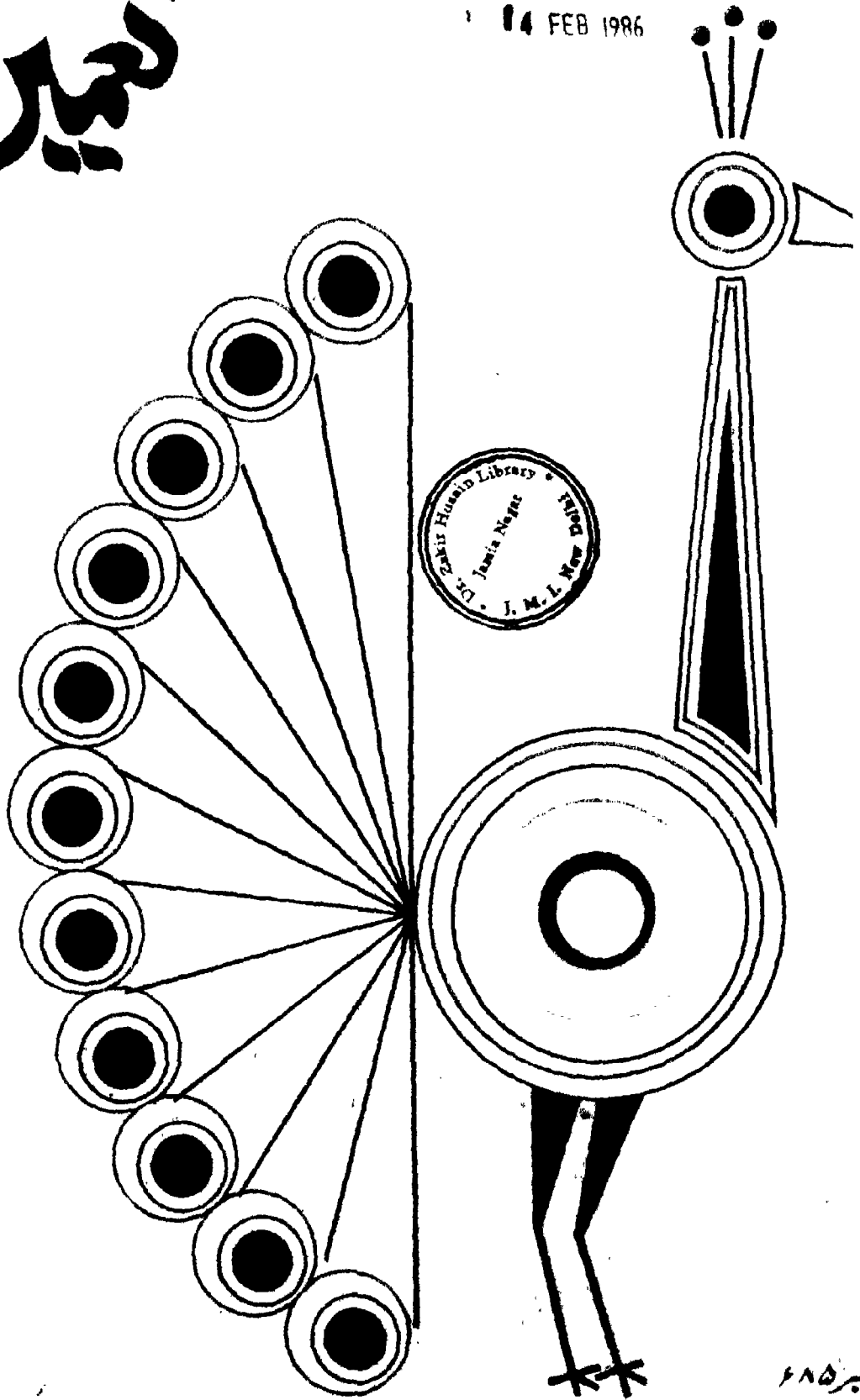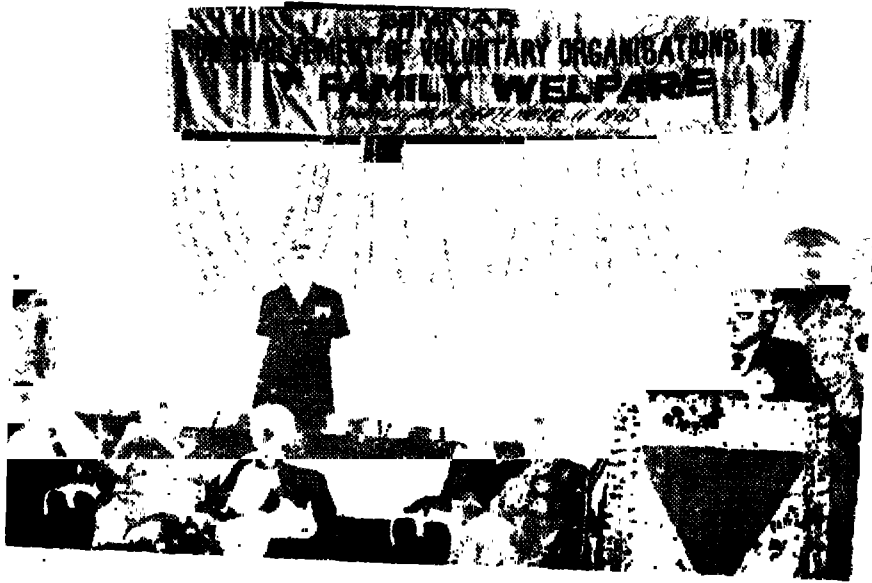
گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی، محکمہ صحت ہریانہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمینار "فیملی ویلفیئر پروگرام میں رضاکار تنظیموں کا حصّہ" کا اِفتتاح فرماتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال کورکشیتر میں آیور ویدک کالج اور ہسپتال کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔

آپ کا محبوب مصور ماہنامہ

دسمبر ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۱۲ | جلد نمبر ۱۳

مدیر اعلیٰ:
رنجیت الیسر

مدیر:
سلطان انجم

سرورق: مکیش سہگل

فی شمارہ ۵۰ پیسے
سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ
مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱
سیکٹر ۱۷سی، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

فہرست

سماج سیوا کے جذبے کی تعریف

گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی نے گذشتہ دنوں چنڈی گڑھ کے نزدیک چنڈی مندر میں ساکیت پریشد کی سالانہ جنرل میٹنگ سے خطاب کیا۔ صدارتی خطبے میں موصوف نے اچھے کاموں میں امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہنے والی رضا کار تنظیموں کی سماج سیوا کے جذبے کی سراہنا کی۔ گورنر موصوف نے معذور بچوں، مردوں اور خواتین کی خدمت میں مصروف ساکیت ہسپتال کے اسٹاف کو بھی مبارکباد دی اور رضا کار تنظیموں کو اپنے دائرۂ کار کو وسعت دینے، شہروں کی گندی بستیوں، دور دراز مقامات میں جانے کے لئے کہا تاکہ عوام میں جسمانی معذوروں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ بیدار کیا جا سکے۔

بعد میں انھوں نے ضرورت مندوں کو مصنوعی اعضاء، سامان، وہیل چیئر، اور کھیلوں میں جیتنے والوں و دیگر سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں میں انعامات تقسیم کئے۔

پرائمری تعلیم کو فروغ دیا جائے

گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی نے "یوم اساتذہ" کے موقع پر فرید آباد میں منعقدہ ریاستی سطح کی ایک تقریب میں فرمایا کہ ساتویں پنج سالہ منصوبے کے تحت ریاست میں ابتدائی تعلیم کے فروغ پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو بھی پرائمری سطح پر ہی فروغ دیا جائے گا۔ موصوف نے مزید فرمایا کہ سالِ رواں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے ریاستی سرکار ۷۵ لاکھ روپے صرف کرے گی۔ گورنر موصوف نے اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ پرائمری سطح پر بچوں کو اخلاقی، قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ اتحاد اور اچھے کردار کی تعلیم دیں۔ خود اساتذہ سیاست سے دور رہ کر قومی تعمیر میں بھرپور تعاون دیں۔

گورنر موصوف نے اساتذہ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو کھیل کود کی تربیت دینے کے لئے بھی کہا کیونکہ کھیل کے میدان میں نظم و ضبط، بھائی چارے، آپسی میل جول اور فرائض کی انجام دہی کی تعلیم ملتی ہے۔

عالی جناب برنی صاحب نے ۱۷ اساتذہ کو تعلیم کے میدان میں قابلِ ذکر کام کرنے کے لئے اسٹیٹ ایوارڈ، اور کھیلوں کے مختلف مقابلوں میں اول، دوم اور سوم مقام حاصل کرنے والوں کو انعامات سے نوازا۔ اسی موقع پر وزیرِ تعلیم ہریانہ جناب

جگدیش نیہرہ نے بتایا کہ ۶ سے ۱۴ سال کی عمر کے ۸۵ فی صد بچے اسکولوں میں داخل ہیں۔ چالو مالی سال میں لڑکیوں کے لئے ۵۰۰ پرائمری اسکول کھولے جائیں گے۔

سکاؤٹس اور گائیڈز کی چار روزہ ریلی کا افتتاح

گذشتہ دنوں گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی نے انبالہ میں ہریانہ اسٹیٹ بھارت سکاؤٹس اینڈ گائیڈز کی چار روزہ ریلی کا افتتاح فرمایا۔ یہ ریلی نوجوانوں کا بین الاقوامی سال منانے کے سلسلے میں کی گئی تھی۔ اس میں ریاست کے ۲۵۰۰ سے زیادہ سکاؤٹس اور گائیڈز نے حصہ لیا۔

گورنر موصوف نے اس موقع پر ہریانہ کے سکاؤٹس اور گائیڈز کی حصولیابیوں کی تعریف کی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ تحریک اور بھی پھلے پھولے گی۔ کیونکہ اس سے بچوں میں نظم وضبط، اتحاد، بھائی چارے اور اچھے کردار کی تشکیل جیسی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے بچوں میں عالمی اخوت اور رواداری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ آپ نے بچوں کو سکاؤٹس، گائیڈز یا این۔سی۔سی وغیرہ میں شامل ہونے کی بھی صلاح دی کہ یہ سب کامیابیوں کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

موصوف نے نائب صدر جمہوریہ ہند جناب ایم۔ ہدایت اللہ کی مثال دی، جنھوں نے ایک ایسے شخص کی، جسے شہد کی مکھیوں نے بری طرح کاٹ کھایا تھا، محض اس بنا پر جان بچائی تھی کہ انھیں ایک سکاؤٹ کی حیثیت سے اس کی تربیت ملی ہوئی تھی۔ گورنر ہریانہ نے آنجہانی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی اس خواہش کو بھی دہرایا کہ ہر بچہ ایسی سرگرمیوں یا تحریک میں ضرور شامل ہو۔ عالی جناب برنی صاحب نے آج کی ایک اہم ضرورت فرقہ وارانہ اتحاد د قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے ہریانہ کی بہتر کارکردگی کی تعریف کی۔ انھوں نے اس موقع پر سکاؤٹس، گائیڈز، کبز (CUBS) اور بلبلوں کی طرف سے پیش کیے گئے مختلف پروگراموں میں نہایت دلچسپی اور توجہ کا اظہار فرمایا۔

ہریانہ اسٹیٹ بھارت سکاؤٹس اینڈ گائیڈز کے اسٹیٹ چیف کمشنر جناب ایل۔ ایم جین نے گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی کو ہریانہ اسٹیٹ بھارت سکاؤٹس اینڈ گائیڈز ایسوسی ایشن کے "چیف پیٹرن" کے عہدے کا حلف دلایا۔

آخر میں ضلع انبالہ کی انتظامیہ، شہریوں اور ہریانہ اسٹیٹ بھارت سکاؤٹس اینڈ گائیڈز انبالہ کی طرف سے ڈپٹی کمشنر جناب دویک مہروترہ نے گورنر موصوف کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔

دیہی علاقوں میں ہیلتھ سینٹروں کیلئے ۲۲ کروڑ روپے

ہریانہ سرکار ریاست کے دیہی علاقوں میں مختلف میڈیکل اداروں کی عمارتیں بنانے پر ۲۲ کروڑ روپے خرچ کرے گی۔ یہ بات وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال نے گذشتہ دنوں ضلع حصار میں آگلانا کے مقام پر ۲۸ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوئے ایک کمیونٹی ہیلتھ سینٹر کے افتتاح کے بعد عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔

اس کمیونٹی ہیلتھ سینٹر میں علاقے کے عوام کے لئے ایک آؤٹ ڈور وارڈ، ۳۰ بستروں کا ان ڈور وارڈ، ایکس رے پلانٹ، جدید آلات سے لیس آپریشن تھیٹر، سرجری کے خصوصی معالج جیسی مختلف سہولیات میسر ہیں۔ یہاں اسٹاف کیلئے رہائشی مکان بھی ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے مزید فرمایا کہ اب ریاست کے ہر پانچ کلومیٹر کے دائرے میں ایک پرائمری ہیلتھ سینٹر موجود ہے۔ اس سے قبل ۱۰ کلومیٹر کے دائرے میں ہی ایسی سہولیات میسر تھیں۔ ہر ایک ہیلتھ سینٹر میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی مقرر کی گئی ہے۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ۵۰ نئے ہسپتال بنیں گے

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ہریانہ میں ۳۰ بستروں والے ۵۰ ہسپتال، جن میں ہر طرح کی جدید سہولتیں میسّر ہوں گی، تعمیر کئے جائیں گے اور ۱۰۱ دیہی ڈسپنسریوں کو پرائمری ہیلتھ سینٹروں میں بدل دیا جائے گا

یہ بات وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال نے حصار سے ۲۵ کلومیٹر دور موضع گاور (GAWAR) میں ایک پرائمری ہیلتھ سینٹر کے افتتاح کے وقت کہی۔ ۱۰ لاکھ روپے کی لاگت سے بنے اس ہیلتھ سینٹر میں ہر طرح کی جدید سہولتیں میسّر ہیں۔ اس میں آؤٹ، اور اِن ڈور، مریضوں کے بلاک، آپریشن تھیٹر کے علاوہ اسٹاف کے لئے رہائشی مکان بھی ہیں۔ موصوف نے مزید فرمایا کہ ایسے ۱۰ ہسپتال چالو مالی سال میں شروع ہو جائیں گے اور ۳۰،۰۰۰ دیہی آبادی کے لئے ایک ہسپتال ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ رضاکار تنظیموں کے تعاون سے ہریانہ میں اندھے پن پر قابو پانے کے قومی پروگرام پر تیزی سے عمل ہو رہا ہے۔ سالِ رواں کے گذشتہ آٹھ ماہ میں آنکھوں کی بیماریوں سے پریشان ۳۲،۰۰۰ لوگوں کا معائنہ کیا جا چکا ہے۔

اسی موقع پر وزیرِ صحت ہریانہ محترمہ کرتاری دیوی نے بتایا کہ خواتین کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے ہر پرائمری ہیلتھ سینٹر میں ایک لیڈی ڈاکٹر کی بھی تقرری کی گئی ہے۔ موصوفہ نے آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر قابو پانے کے لئے عوام سے اپنا کنبہ محدود رکھنے کی بھی اپیل کی۔

پرائمری تعلیم کو اولیت ملنی چاہیئے

وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال نے فرمایا کہ نظامِ تعلیم کو ازسرِ نو مرتب کرنا چاہیئے تاکہ آج کی جدید ٹیکنالوجی کے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ تکنیکی اور اخلاقی تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ موصوف چنڈی گڈھ میں منعقدہ اسٹیٹ ایجوکیشن کانفرنس میں تعلیم کی نئی قومی پالیسی پر اظہارِ خیال فرما رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ نصابِ تعلیم میں جدوجہدِ آزادی کے لئے ہمارے رہنماؤں کی قربانیوں کا ذکر لازماً شامل ہونا چاہیئے۔ پرائمری تعلیم کو اولیت دی جانی چاہیئے۔ تعلیم کی بنیادیں مضبوط ہوں تاکہ طلبا زندگی کے چیلنج کا سامنا کر سکیں۔ اسی طرح تکنیکی تعلیم پر بھی توجہ دینی چاہیئے کہ اس سے بے روزگاری کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

آپ نے سیاست دانوں کی طرف سے طلباء کو اپنا آلۂ کار بنانے کی مذمت کی اور کہا کہ اساتذہ تربیت یافتہ ہوں اور انھیں چاہیئے کہ وہ سیاست سے دور رہیں۔ ایک اچھا اُستاد ہی ایک عظیم طالبِ علم پیدا کر سکتا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو اسکول کی سطح پر فروغ دینا چاہیئے، ہم اسکولوں میں اس کا آغاز کر بھی چکے ہیں۔

خود روزگار اسکیم کے تحت ۴۶۰۰ بے روزگاروں کو قرضہ

ہریانہ میں چالو مالی سال کے دوران خود روزگار اسکیم کے تحت ۴۶۰۰ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو اپنی صنعت یا کاروبار شروع کرنے کے لئے قرضے دئے جائیں گے۔ ریاست میں یہ اسکیم نہایت کامیاب رہی ہے۔ اس اسکیم کے ابتدائی سال ۱۹۸۳ء۔۸۴ سے اب تک ۱۱،۶۴۱ آجروں کو ۱۹ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے بطور قرض دئے جا چکے ہیں۔

خود روزگار اسکیم کے تحت ۱۸ سے ۳۵ سال کی عمر کے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو قرض کی قم کی ۲۵ فیصد سبسڈی سمیت ۲۵ ہزار روپے تک کا قرضہ دیا جاتا ہے

۳۶۶۳ گاؤں میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی

حکومتِ ہریانہ دیہی عوام کیلئے پینے کے صاف پانی کی فراہمی کو ہمیشہ اولیت دیتی ہے۔ ریاست کے ۴۶۹۰ ایسے گاؤں میں سے، جہاں پانی ایک مسئلہ ہے، ۳۶۶۳ گاؤں میں نومبر ۱۹۸۵ء کے آخر تک نلوں کے ذریعے پینے کا صاف پانی پہنچایا جا چکا ہے۔ سالِ رواں کے آخر تک ۱۲۹۹ اور ایسے گاؤں تک پانی پہنچ جانے سے یہ تعداد ۴۹۶۲ ہو جائے گی۔ ۱۹۸۷ء کے آخر تک ایسے سبھی دیہات میں پینے کا صاف پانی میسّر ہوگا۔

(سُلطان انجم)

قمر جلال آبادی

وقت پڑنے پہ کبھی کام نہ آئے لوگو
کیا کہوں تم کو ذرا تم ہی بتاؤ لوگو

سب کے ساغر ہیں بھرے، جام ہے میرا خالی
تم سے کیا بات ہے ساقی کو بلاؤ لوگو

میرا غم چھین نہ لے جائے تمہاری خوشیاں
دور سے بات کرو پاس نہ آؤ لوگو

تم کو خود سے ہے محبت کسی دلبر سے نہیں
عشقِ بیکس کو تماشا نہ بناؤ لوگو

حسن کی قدر کرو حسن ہے خالق کا ہنر
تم عبادت کو کھلونا نہ بناؤ لوگو

غم تمہیں کھینچ کے لے جائے گا داتا کی طرف
غم کے سونے پہ ملمع نہ چڑھاؤ لوگو

فن نہیں دل کی صدائیں ہیں یہ اشعار قمرؔ
میری باتیں نہ سمجھ پاؤ گے جاؤ لوگو

سورج تنویر

کوئی مبتلا کبھی نہ مل سکا، ستم آشنا کبھی نہ مل سکا
یہ ہے دَورِ قحطِ بلا کشاں کوئی دل جلا کبھی نہ مل سکا

ترے جاں نثاروں کے ساتھ ہی گئیں سب جنوں کی روایتیں
یہاں سر فروش تو اب کہاں، کوئی سر پھرا کبھی نہ مل سکا

گو قریب منزلِ شوق تھی مگر آہ! عالمِ بے بسی
وہ ہجومِ ظلمتِ یاس تھا ہمیں راستا کبھی نہ مل سکا

پھرے دشت و کوہ و دمن میں بھی گئے خارزار و چمن میں بھی
کوئی ہم نشیں، کوئی ہمسفر، کوئی ہم نوا کبھی نہ مل سکا

تری ہمرہی کی تھی آرزو، رہی عمر بھر تری جستجو
کہیں رہگزارِ حیات میں ترا نقشِ پا کبھی نہ مل سکا

اظہار اثر

گناہ گار

راجیو نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر داخل ہوا۔ راجیو نے کہا۔

"اگلے امیدوار کو بھیجو۔"

چپراسی چلا گیا۔ دو منٹ بعد ہی چھریرے بدن کی پچیس چھبیس سال کی ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ راجیو نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ کھلتا ہوا رنگ تھا نقوش تیکھے تھے۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا دوسری امیدوار لڑکیوں کی طرح بھڑک دار نہیں تھا مجموعی طور پر وہ خوبصورت کہی جا سکتی تھی لیکن اس کے چہرے پر تازگی نہیں تھی۔ جس طرح کوئی پھول کچھ دیر دھوپ میں رکھا رہے تو کمہلانے لگتا ہے اسی طرح اس کے چہرے میں کمہلاہٹ پن تھا۔ راجیو نے کرسی کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

"بیٹھئے۔"

عورت بیٹھ گئی تو راجیو نے فائل میں اس کی درخواست پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

"آپ کا نام نشا ہے۔"

"جی ہاں ——" اس نے جواب دیا۔

"کوالی فیکیشن ایم اے۔ ٹائپ کی اسپیڈ سکسٹی۔ شارٹ ہینڈ کی اسپیڈ ہنڈرڈ۔"

عورت نے نروس انداز میں کہا ——" تو سر —— یہ سب جھوٹ ہے۔"

"جھوٹ ہے۔" راجیو حیرت سے بولا "لیکن آپ نے درخواست میں تو یہی لکھا ہے۔"

"جی ہاں ——" اس نے سر ہلا کر کہا "لیکن یہ سب غلط ہے۔ میں صرف بی۔ اے ہوں۔ ٹائپ کی اسپیڈ چالیس ہے اور شارٹ ہینڈ کی ساٹھ ہے۔ درخواست میں میں نے یہ باتیں غلط اس لئے لکھی تھیں تاکہ مجھے انٹرویو لیٹر الیشو ہو جائے اور میں آپ تک پہنچ جاؤں۔"

"سر میں اس جھوٹ کے لئے معافی نہیں مانگوں گی لیکن سچ بات یہ ہے کہ میرے لئے یہ نوکری بہت اہم ہے۔ ایک طرح سے یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں دو مہینوں سے دفتروں کے چکر کاٹ رہی ہوں اگر یہ نوکری بھی مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گی۔ میں خودکشی کر لوں گی سر۔ پلیز مجھ پر رحم کھایئے اور مجھے نوکر رکھ لیجئے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ نوکری ملنے کے بعد رات دن محنت کرکے اپنے آپ کو اس قابل بنا لوں گی کہ آپ کا سب کام سنبھال سکوں۔ میں بالکل بے سہارا اور بدنصیب عورت ہوں سر۔ بھگوان کے لئے مجھے مرنے سے بچا لیجئے۔ مجھے مرنے سے بچا لیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ کر سسک سسک کر رونے لگی۔

راجیو اس کو حیرت سے دیکھتا رہا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔ راجیو کو بھی زندگی کا بہت تجربہ نہیں تھا۔ ابھی چھ مہینے پہلے ہی وہ امریکہ سے بزنس منیجمنٹ کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ باپ کی موت کے بعد پہلی بار اس نے کاروبار سنبھالا تھا۔ نئے نئے آئیڈیاز اور بزنس چلانے کے نئے نئے طریقے سیکھ کر آیا تھا اس لئے دفتر کو اپنے ڈھنگ سے چلانے کے لئے اس نے بہت سی تبدیلیاں کی تھیں۔ کچھ پرانے لوگوں کو ہٹایا تھا۔ نئے لوگ ملازم رکھے تھے۔ اسی سلسلے میں اس نے اپنے لئے سکریٹری بھی نئی چننے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لئے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ ایک ہزار درخواستوں میں سے اس نے پچاس لڑکیوں کو انٹرویو کے لئے بلایا تھا۔ یہ عورت نشا بھی ان میں سے ایک تھی۔ اس سے پہلے جتنی لڑکیوں کے وہ انٹرویو لے چکا تھا وہ سب کی سب سکریٹری شپ کا کورس مکمل کئے ہوئے تھیں۔ ان میں کچھ کو دو دو تین تین سال کا تجربہ بھی تھا لیکن ابھی تک کوئی امیدوار اس کو متاثر نہ کر سکی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس عورت کی باتوں نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ اس نے محسوس کیا وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس میں بناوٹ نہیں۔ اس کے ہونٹوں سے نکلا ایک ایک لفظ اس کے دل کی آواز ہے۔ وہ تمام امیدواروں میں سب سے کمزور تھی پھر بھی راجیو نے دل ہی دل میں خود سے کہا

"یہ عورت واقعی ضرورت مند لگتی ہے۔ اور ضرورت مند لوگ محنتی اور ایماندار ہوتے ہیں۔"

لڑکی نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔ "سر میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں آپ نے مجھے یہ ملازمت دیدی تو پوری ایمانداری اور لگن سے کام کروں گی۔ آپ کا ہر حکم مانوں گی۔ آپ جو کہیں گے وہ کروں گی۔ میرے پاس کوئی سفارش نہیں میری کوالیفیکشن بھی اہم نہیں کچھ تجربہ بھی نہیں لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ دو تین مہینے میں ہی اپنی ساری کمیاں دور کر لوں گی۔"

راجیو نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اسی کو اپنی سکریٹری کی جگہ دے گا۔ اس نے جواب میں کہا۔

"آل رائٹ ـــ اب تم جاؤ۔ کل صبح سے ڈیوٹی پر آجانا۔"

"جی ـــ کیا کہا آپ نے۔" عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"وہی جو تم نے سنا۔ میں تمہاری سچائی سے متاثر ہو کر تمہیں ملازم رکھ رہا ہوں۔ اب جاؤ صبح سے دفتر آجانا۔"

جواب میں شکریہ ادا کرنے کی بجائے وہ عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ راجیو کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ عورت کے دل کا غبار نکل چکا ہے تو اس نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ پہلے باتھ روم میں جا کر اپنا منہ دھو لو۔ پھر باہر جانا۔ اور کل سے ڈیوٹی پر آجانا۔"

عورت شاید کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر الفاظ منہ سے نہ نکل سکے صرف ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ راجیو سمجھ گیا کہ وہ شکریہ اور احسان مندی کے لئے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن توقع کے خلاف نوکری مل جانے کی خوشی میں بوکھلا گئی ہے اس نے کہا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو لو اور چلی جاؤ۔ باہر کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

لڑکی نے ایسی نظروں سے اس کی جانب دیکھا جیسے شکاری نے زخمی ہرنی کو مارنے کی بجائے اس کے سامنے پانی رکھ دیا ہو اور باتھ روم میں چلی گئی۔ دو منٹ بعد ہی وہ منہ دھو کر باہر نکلی اور صرف نمستے کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

راجیو کا انتخاب غلط ثابت نہیں ہوا۔ نشا نے دو مہینے میں ہی ٹائپ میں اپنی اسپیڈ سکسٹی تک بڑھالی۔ شارٹ ہینڈ کی اسپیڈ بھی سو تک کر لی۔ اور دفتر کا سارا کام کسی تجربہ کار سکریٹری کی طرح کرنے لگی اور شام کو جب دفتر کی چھٹی ہوتی اور راجیو جانے

لگتا تو وہ عجیب سی نظروں سے اس کو دیکھ کر پوچھتی ۔

"سر میرے لئے کوئی اور کام ۔"

"بس اور کچھ نہیں ۔ ۔" راجیو جواب دیتا ۔ "اب تم بھی جاؤ ۔"

جب وہ چھٹی کے وقت یہ سوال پوچھتی تو راجیو کو یہ بات عجیب سی لگتی ۔ لیکن وہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتا کہ چونکہ اس نے آؤٹ آف دی وے اس کو نوکری دی ہے اس لئے وہ ضرورت سے زیادہ احسان مند ہے ۔

اسی طرح چھ مہینے گذر گئے ۔ راجیو نشا کے کام سے بالکل مطمئن تھا بلکہ اب اس پر اتنا بھروسہ کرنے لگا تھا کہ بہت سے ایسے اہم کام بھی اس کے سپرد کر دیتا جو اسے خود کرنے چاہئیں تھے ۔

پھر چھ ماہ بعد ایک دن عجیب واقعہ ہوا ۔

شاردا انٹرپرائزرز کے مالک چندر بھان سے ان کی فرم کا پرانا کاروبار تھا ۔ چندر بھان ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ۔ عیاش مزاج تھا ۔ لیکن کاروبار میں بہت تیز تھا ۔ اس کے ڈیڈی کے مرنے کے بعد وہ پہلی بار ایک بزنس کے سلسلے میں خود اس سے ملنے آیا ۔ اس کی فرم سے لاکھوں کا کاروبار ہوتا تھا اس لئے راجیو نے اٹھ کر استقبال کیا ۔ چندر بھان نے راجیو سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ۔

"مسٹر راجیو باہر والے کمرے میں یہ لڑکی کون بیٹھی ہے ؟"

"میری سکریٹری ہے ۔" راجیو نے جواب دیا ۔

"آپ کی سکریٹری ۔ اوہ نو ۔ میں یقین نہیں کر سکتا ۔"

"کیوں ۔ آپ یقین کیوں نہیں کر سکتے ۔"

"کیونکہ میں اس لڑکی کو ایک دوسری حیثیت سے جانتا ہوں ۔ اور اس کا آپ کے دفتر میں رہنا ٹھیک نہیں ۔ آپ بدنام ہو جائیں گے ۔"

"میرا خیال ہے آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہے ۔" راجیو بولا ۔ "مس نشا بہت شریف اور محنتی عورت ہے ۔"

"جی نہیں وہ شریف ہرگز نہیں ہے ۔ وہ تو کال گرل ہے ۔ لاٹوش روڈ پر مسز جیوتی کے فلیٹ پر رہتی ہے ۔ مسز جیوتی شہر کی مشہور کال گرلز سپلائر ہے ۔ خود میرے پاس یہ لڑکی دو بار کال گرل کی حیثیت سے آچکی ہے ۔"

راجیو نے ہنس کر کہا ۔ "پھر تو میں کہوں گا آپ کو ضرور غلط فہمی ہو رہی ہے ۔ مس نشا تو بہت شریف عورت ہے ۔ آپ کو شاید پہچاننے میں دھوکا ہوا ہے ۔"

"مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا ۔ آپ اس کو اندر بلائیے میں ابھی خود اس سے کہلوائے دیتا ہوں کہ وہ کال گرل ہے ۔"

راجیو نے کسی قدر خشک لہجہ میں کہا ۔ "مجھے اس معاملہ میں کسی ثبوت یا صفائی کی ضرورت نہیں لیکن آپ کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے میں مس نشا کو بلاتا ہوں ۔"

یہ کہہ کر اس نے خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا ۔ "مس نشا ذرا اندر آئیے ۔"

مگر دوسرے کمرے میں کرسی خالی تھی ۔ نشا کمرے میں نہیں تھی ۔ راجیو نے آگے بڑھ کر دروازہ پر بیٹھے چپراسی سے پوچھا ۔ "مس نشا کہاں گئیں ۔"

"پتہ نہیں سر ۔ ابھی ابھی اپنا پرس لے کر کچھ کہے بغیر چلی گئی ہیں ۔"

چندر بھان دروازہ میں کھڑا سن رہا تھا اس نے ہنس کر کہا ۔ "دیکھ لیا آپ نے ؟ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور شاید ہماری باتیں بھی سن لی تھیں اس لئے وہ خود ہی ڈر کر بھاگ گئی ۔ چور کے پاؤں تھوڑے ہی ہوتے ہیں اگر وہ شریف عورت ہوتی تو اس طرح اس کو بھاگنے کی کیا ضرورت تھی ۔"

راجیو چپ چاپ کھڑا رہ گیا ۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے ایک عورت کو سمجھنے میں اتنی بڑی غلطی کیسے کی ہے

دوسرے دن راجیو مسز جیوتی کے فلیٹ میں داخل ہوا ۔ وہ چندر بھان کا تعارفی اور سفارشی خط ساتھ لے گیا

مسز جیوتی اسے ڈرائنگ روم میں لائی۔ کمرے میں تین لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

ان میں سے ایک نشا تھی۔

راجیو کو دیکھتے ہی نشا کے منہ سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور وہ اٹھ کر اندرونی کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ راجیو کمرے میں موجود مسز جیوتی اور دوسری عورتوں کی پرواہ کئے بغیر تیز چلتا نشا کے پیچھے دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے میں ایک بستر تھا اور نشا بستر پر اوندھی پڑی تکئے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

راجیو کچھ دیر کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "نشا اٹھو اور مجھے بتاؤ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ کیوں مجھے دھوکا دیا۔"

نشا بستر سے اٹھی۔ آنسو بھری آنکھوں سے زخمی ہرنی کی طرح اسے دیکھا پھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر روتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کو دھوکا نہیں دیا سر۔ میں ابھاگن اور بے وقوف ہوں۔ ایک شریف گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ پڑوس میں ایک نوجوان آکر رہا اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں آکر ماں باپ کا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ یہاں آگئی ـــــ وہ دھوکے باز نکلا دو مہینے مجھ سے کھیل کر مجھے بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے بعد میں اپنے گھر کیا منہ لے کر جاتی۔ فاقوں سے تنگ آکر خودکشی کرنے والی تھی کہ جیوتی آنٹی سے میری ملاقات ہوگئی اور میں اس گناہ کی دلدل میں آپھنسی۔

میں اس جہنم سے نکلنا چاہتی تھی۔ اس لئے یہاں رہ کر کچھ وقت نکال کر میں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھنا شروع کر دیا۔ چپکے چپکے نوکری تلاش کرتی رہی مگر کہیں نوکری نہ ملی۔ کسی نے انٹرویو تک کے لئے نہیں بلایا۔ اسی مایوسی کے عالم میں آپ کا اشتہار نظر سے گذرا۔ اس بار قسمت نے ساتھ دیا اور آپ نے مجھے نوکر رکھ کر اس گناہ آلود زندگی سے نجات دلادی میں یہ گھر چھوڑ کر ایک بیوہ عورت کے ساتھ رہنے لگی۔ میں اچھا بننا چاہتی تھی سر۔

اس سماج کے ایک شریف آدمی نے مجھے گھر کی چار دیواری سے نکال کر اس دوزخ میں لا پھینکا تھا۔ غلطی میری ہی تھی یا میری ناسمجھی تھی میں اپنی اس بھول کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ شرافت کی زندگی گذارنا چاہتی تھی کہ پھر سماج کے ایک شریف شخص نے مجھے اس گناہ کی دلدل میں واپس آنے پر مجبور کر دیا سیٹھ چند ربھان نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے آپ کی باتیں سن لی تھیں۔ میں نے سوچا اس سے پہلے کہ آپ مجھے دھکے دے کر باہر پھینکوا دیں میں خود ہی چلی جاؤں۔ اس لئے میں پھر یہاں آگئی۔ میں نیک اور شریف بننا چاہتی تھی سر۔ لیکن پتہ چلا کہ یہ دنیا کسی کو گناہوں کی بھٹی میں جھونک تو سکتی ہے نکال نہیں سکتی۔ اور اگر کوئی نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو ٹھوکریں مار کر پھر اسی بھٹی میں جھونک دیتی ہے۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں سر۔ اور معافی چاہتی ہوں کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا۔" یہ کہہ کر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

راجیو کچھ دیر کھڑا خاموشی سے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر نشا کے دونوں بازو پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نشا رونے کی ضرورت نہیں۔ چلو دفتر چلو۔ یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں۔ اور دنیا میں سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تم ثابت کر چکی ہو کہ تم محنتی، شریف اور ایماندار ہو۔ ٹھوکر کھا کر تم سنبھل گئی ہو ورنہ کیوں چوری چوری ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ کر نوکری تلاش کرتیں۔ مجھے چند ربھان یا دوسرے لوگوں کی پرواہ نہیں۔"

ایک بار پھر نشا کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ک۔ ک۔ کیا کہا سر۔"

"وہی جو تم نے سنا" راجیو نے جواب دیا۔ "چلو دفتر میں

(باقی ص 17 پر)

ڈاکٹر نریش

ادب کی تخلیق میں ترقی پسندی کا عمل ایک مسلسل عمل ہے تاریخ کے ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اپنے معاشرے کے حالات سے اثر قبول کیا ہے اور اپنے ماحول کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ مگر یہ شدتِ احساس شاعر یا ادیب کے تخیل کو جب بے سمت منزلوں کے سفر پر لے نکلتی ہے تو اس کا احساس صرف ایک نقطے پر سمٹ آتا ہے اور وہ نقطہ ہے فرار۔ میں ان ادیبوں یا شاعروں کے کم حساس ہونے کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوں جن کی تمام تر ادبی صلاحیتیں طلسمی یا سطحی قسم کے ادب کی تخلیق میں صرف ہو کر رہ گئی تھیں۔ اگر وہ ادیب حساس طبع نہ ہے ہوتے تو شاید وہ ادب تخلیق ہی نہ کر پاتے۔ اپنے معاشرے کی گھٹن سے بیزار، اپنے ماحول کی پراگندگی سے بدظن، اپنے گردو پیش پھیلی ہوئی رجعت پسندی کے رجحانات سے اپنے معاشرے کو آزاد کرانے کی جب کوئی صورت ان کے سامنے نہ تھی تو وہ اپنے قاری کو بھلاوا دیکر فرار کی راہ پر لے نکلے تاکہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی، وہ ان آلام سے اس گھٹن سے، ماحول کی اس پراگندگی سے نجات تو حاصل کر سکے۔ اس عمل میں ایسے ادوار کے ادیب بھی اپنا فرض سرانجام دے رہے ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کا ادب معاشرے کو کوئی نئی سمت دیکر نئی منزلوں کی طرف گامزن کرنے کی صلاحیت سے تہی ہوتا ہے اس لئے نہ ان کا ادب ہی دیرپا ہو پاتا ہے اور نہ وہ اصلاحِ معاشرہ کی اپنی ذمہ داری سے سرخرو ہو پاتے ہیں۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل تقریباً ایسی ہی فضا موجود تھی جس میں تخلیق کار قاری کو بھلاوا تو دیتا تھا مگر اسے زندگی کا آئینہ دکھا کر اسکے خط و خال کی بدنمائی سے دوچار نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کے کئی اسباب بھی تھے ہمارا معاشرہ تعلیم کی روشنی سے محروم اور ذہنی طور پر شکست خوردہ معاشرہ تھا۔ غیر مساوی تقسیم زر سے پیدا ہوئی رجعت پسندی کو ہر دوسرے احساس پر سبقت حاصل تھی۔ ہمارے معاشرے کے شعور و لاشعور پر بعض ایسے اثرات بھی حاوی تھے جو رجعت پسندی کی اس سازش میں شریک تھے کہ عام آدمی کو دنیا کی بے ثباتی کا درس دیکر اس کی تمام تر توجہ عاقبت سنوارنے پر ہی مرکوز رکھی جائے تاکہ وہ اپنے ماحول کے گھنونے پن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمارے ملک میں آزادی کی پہلی جنگ لڑی جا رہی تھی تو ہمارا ادب مجموعی طور پر، تخیل کے پر پروانے کر ان دیکھے، انجانے پریوں کے دیس کی سیر و سیاحت میں مصروف تھا۔ اگرچہ اس دور کے شعرا اور ادبا کے یہاں بھی کہیں کہیں دبی زبان میں وہ ٹیس مل جاتی تھی جسے فنکار کا ایماندارانہ ردِ عمل کہا جا سکتا ہے لیکن اکثر تو یہ ٹیس علامتوں اور استعاروں کے بار تلے دب کے رہ گئی تھی اور جہاں کہیں علامتوں اور استعاروں سے کام نہیں لیا گیا تھا

وہاں یہ ٹیس نقار خانے میں گم ہونے والی طوطی کی آواز ہو گئی تھی یہی سبب ہے کہ ہمارے ملک کے عظیم شعرا سورداس ہوں یا تلسی داس، میرؔ ہوں یا غالبؔ، کسی کا کلام بھی اپنے معاشرے کا آئینہ بننے اور اسے آئینہ دکھانے کی صلاحیت سے عاری تھا مجھے ان شعرا کی عظمت سے انکار نہیں ہے لیکن میں اس تلخ حقیقت سے انحراف بھی نہیں کرنا چاہتا کہ "سور ساگر" جیسا ضخیم دیوان پڑھ کر یہ تک معلوم نہ ہو کہ اس کا مصنف تاریخ کے کس دور میں اسے تخلیق کر رہا ہے اور اس کے معاشرے کی کیا خوبیاں یا کیا خامیاں ہیں۔

ان اسباب میں سب سے اہم سبب ہے معاشرے کی خوابیدگی۔ معاشرے کو بیدار کرنے کی جو ذمہ داری ادیب اور شاعر کی ہوتی ہے۔ انفرادی احساس کے ذریعے اسے پورا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے ایک اجتماعی کوشش کی اور جب جب بھی ایسی کوئی اجتماعی کوشش ہوتی ہے ہم نے اسے تحریک کا نام دیا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستانی ادب میں کئی صدیاں بغیر کسی تحریک کے ہی نکل گئی تھیں اور باوجود اس کے کہ ہمارا معاشرہ کروٹیں بدلنے لگا تھا مگر ہمارا ادب اسے جھنجوڑنے یا جگانے میں معاون نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا جب اردو کے ادیبوں نے صف آرا ہو کر اجتماعی طور پر معاشرے کو بیدار کرنے کا فیصلہ کیا تو گویا ایوانِ ادب کے در و دیوار لرز اٹھے اور اس ایوان کے اندھیرے بند کمروں کو کھلی فضا، ٹھنڈی ہوا اور تازہ دھوپ کی حاجت محسوس ہوئی۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے پہلی مرتبہ، ترقی پسند تحریک کے توسط سے، ادب کا رشتہ عام آدمی سے جوڑنے کی بھرپور کوششیں شروع کیں تو اردو ادب مسحور کن وادیوں کے سفر کے بجائے دھرتی کی سوندھی خوشبو سے مہکنے لگا۔ ادبی دنیا میں یہ پہلا موقع تھا جب ادیبوں اور شاعروں نے زیر و زبر نظامِ معاشرہ پر صرف احتجاج کرنے کے بجائے نظامِ معاشرہ کو بدلنے کے عمل میں شرکت کی۔ اس عمل کے نتیجے میں تیز رفتاری سے اردو ادب کا کایا کلپ ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے سے پہلے ہمارے سیاسی اور سماجی مفکرین جو نئی سوچ جنم لے رہی تھی شعرا و ادبا نے اس سوچ کے دھارے کے لئے ایک راستہ متعین کیا اور ایک واضح مستقبل کی طرف اشارہ کیا جس کی طرف قدم بڑھانا ناممکنات میں شامل نہ تھا۔ چونکہ راستہ اور منزل دونوں واضح تھے اس لئے ایک پورا قافلہ اس پر گامزن ہو نکلا اور ترقی پسند تحریک کی بانگِ درا کے نیچے دوسری تمام آوازیں دب کر رہ گئیں۔ ترقی پسند ادب کی اس درجہ مقبولیت کا ایک بڑا سبب بھی یہی تھا کہ ہمارے معاشرے میں جو نئی سوچ معاشرے کی زبوں حالی کے ردِ عمل کے طور پر پنپ رہی تھی، اس میں عام آدمی شریک ہو چکا تھا اور وہ منتظر تھا کہ کوئی اسے صحیح راستہ دکھائے اور اس کے لئے منزلوں کی نشاندہی کرے۔ اردو ادب نے اس فریضے کو سرانجام دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تو عوام نے ان کی تخلیقات کو سر آنکھوں پر لیا اور ترقی پسند نظریات اردو ادب کا معراج بن گئے۔

ترقی پسند تحریک کے توسط سے اردو ادب نے دوسرا اہم کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ عام ہندوستانی قاری کو گلوب دکھا کر یہ بتایا کہ سمندر پار کی دنیا شہزادوں اور پریوں کی دنیا نہیں ہے بلکہ وہاں بھی انسان رہتے ہیں جو ہماری طرح کے ہی ہیں۔ روس کے عظیم انقلاب کی مثالیں دیکر اسے یہ بتایا گیا کہ تم نے جس نظامِ معاشرہ کو اپنا مقدر مان لیا ہے، اس نظام کو بدل ڈالنا مشکل نہیں ہے، صرف اس کے لئے اجتماعی ارادہ بنانے اور صحیح سمت میں سعی کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں غلامی، رجعت پرستی، غیر مساوی تقسیمِ زر اور زندگی کی محرومیوں کے خلاف جنگ کر رہے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے بارے میں جب اسے تفصیلات معلوم ہوئیں تو عام آدمی کو یہ یقین ہونے لگا کہ اگر وہ اس جہاد میں شامل ہوگا تو کامیابی یقینی ہے۔ غلامی اور محرومی کو پچھلے جنموں کے کرموں کا پھل ماننے والے عام ہندوستانی کے لئے یہ نئی سوچ خالص انقلابی سوچ تھی جس نے طبقاتی جنگ کے احساس کو جنم دیا تھا۔ غلامی اور محرومی کے خلاف جنگ کر رہے دیگر ممالک کے اپنے جیسے انسانوں کو برسرِ پیکار دیکھ کر اسے یہ احساس ہوا کہ اگر وہ

اس انقلاب کو لبیک کہے گا تو اس جہاد میں وہ تنہا نہیں ہوگا۔ انفرادی احساس اجتماعی ہوتے ہوتے عالم گیر ہو گیا اور عام آدمی یہ محسوس کرنے لگا کہ غلامی اور محرومی کی چکّی میں وہ تنہا ہی نہیں پس رہا ہے بلکہ دنیا کے کروڑوں انسان اس چکّی میں پس رہے ہیں۔ اس احساس کا ردِ عمل، قدرتی طور پر یہ ہوا کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس چکّی میں پسنے سے انکار کر دے اور اپنے لئے بہتر زندگی کی تلاش جاری کرے۔

چونکہ ادب نے پہلی بار نظامِ معاشرہ کو تبدیل کرنے کی انقلابی کوشش کی تھی، اس لئے رجعت پرست طاقتوں نے اسے ادب اور سیاست کے گڈمڈ ہوتے کا نام دیکر اس کی مخالفت بھی کی کیونکہ عام طور پر ادیب کو تماشبینی سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ تو لے سکتا تھا، اسکی خامیوں پر آہ و بکا بھی کر سکتا تھا مگر اسے یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ احتجاج کی سر کو اتنا اونچا کرلے کہ لوگ اسکی آواز سننے پر مجبور ہو جائیں۔ ادب کو جمالیاتی تسکین اور روحانی کیف و سرور کی حد بندیوں میں مقید رکھنے والے اس تغیر کو قبول بلکہ برداشت کرنے سے معذور تھے۔ مگر ان کی یہ سوچ قدامت پرستی اور طبقاتی خود غرضی پر مبنی تھی۔ جب جب بھی معاشرے کو کسی چیلنج کا سامنا کرنا پڑا ہے، ہمارے سیاسی اور سماجی رہنماؤں نے ادیبوں اور شاعروں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آگے آئیں اور اس شورش کو تمام کرنے میں اپنا فرض پہچانیں۔ ہر کڑے وقت میں ادیبوں اور شاعروں سے مدد طلب کرنے والے لوگوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ معاشرے کی تکمیلِ نو میں یا معاشرے کی قسمت لکھنے یا سنوارنے میں ادیبوں کو کب شامل کیا گیا ہے کہ وہ از خود اس چیلنج کو شدّتِ احساس کے ساتھ قبول کریں۔ مگر ادیب چونکہ بنیادی طور پر حسّاس ہوتا ہے اور چونکہ اس کا ایمان 'ادب برائے ادب' نہ ہو کر 'ادب برائے زندگی' ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنا فرض پہچاننے میں کوتاہی نہیں کرتا اور وقت کی آواز پر لبیک کہہ دیتا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ چیلنج ختم ہونے لگتا ہے، ادیب یا شاعر کی ضرورت بھی کم پڑنے لگتی ہے۔ محروم عوام کی صف میں سے وقتی طور پر آگے لائے گئے ادیب اور شاعر پھر لوٹ کر اسی عوامی صف میں چلے جاتے ہیں جہاں بھوک، افلاس اور محرومی پہلے ہی سے انکی منتظر ہوتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کی کامیابی اور اس درجہ مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے شاعر اور ادیب، معدودے چند ناموں کے استثنا کے ساتھ، اس طبقے سے متعلق تھے جو طبقہ بھوک، افلاس، غلامی اور محرومی کے اندھیروں میں زندگی گذار رہا تھا۔ آگ جب ان کے اپنے دروازے تک پہنچی اور انھیں یہ معلوم ہوا کہ اس آگ کو بجھایا بھی جا سکتا ہے تو وہ پوری تندہی کے ساتھ اسے بجھانے میں جٹ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تخلیقات میں وقت کی ہولناک سچائیاں گونج اٹھیں اور اردو ادب وہ آئینہ بن گیا جس میں ہم اپنے معاشرے کے تمام بدنما داغوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ کسی بھی مرض کا علاج اس کی تشخیص کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے سماجی امراض کی تشخیص کا کام سرانجام دیا تو عام قاری پر یہ مژدہ وا ہوا کہ بقول اکبر الہ آبادی۔؎

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیڑے پڑے کیوں
میں کہتا ہوں کہ تم پہلے سڑے کیوں

شاعر اور ادیب چونکہ اس طبقے کے لوگ تھے جس کے سڑنے کی وجہ سے اس کے جسم میں کیڑے پڑے تھے، اس لئے انھوں نے انسانی جسموں میں رینگتے ہوئے ان کیڑوں کی آواز کو بھی سنا اور ان کے رینگنے کو بھرپور شدّت کے ساتھ محسوس بھی کیا۔ تشخیص ان کی اپنی تھی اور علاج انہیں معلوم تھا۔ عوامی بیداری اور عوامی انقلاب کا علاج دیگر مقامات پر کامیاب ہو چکا تھا لہٰذا اپنے لئے اس علاج کا تعین کرنے میں کسی قسم کے پس و پیش کی گنجائش کم تھی۔ احساس کی شدّت، تفکر کی گہرائی، ایمانداری اور سچائی ہی وہ اوصاف ہیں جن سے اعلیٰ ادب تعمیر ہوتا ہے اور جو ادیب عارضی طور پر دوسروں کے دکھ درد کو اوڑھنے کے بجائے بذاتِ خود اس دکھ درد کی بھٹی میں تپ رہا ہوتا ہے، اس کی تخلیق کا کندن بن کر نکلنا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ اس فطری عمل نے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کو مقبولیت بھی عطا کی اور اسے کامیابی کی بلندیوں تک بھی پہنچایا۔

باوجود بعض نقادوں کے اس اعلان کے کہ ترقی پسند تحریک کے زوال پذیر ہونے پر جدید اردو ادب کا آغاز ہوا ہے، میں نہ تو یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ترقی پسند تحریک اپنے زوال کو پہنچ چکی ہے اور نہ یہ کہ جدید اردو ادب ترقی پسندی کی نفی کا نام ہے جیسا میں نے شروع میں عرض کیا کہ ترقی پسندی ایک عملِ مسلسل ہے اور مسلسل عمل تب تک اپنے اختتام کو نہیں پہنچتا جب تک اس کے قدم اس کی آخری منزل کو نہ چھولیں۔ آج بھی ہمارا معاشرہ ان مسائل سے نبرد آزما ہے جن کے خلاف جنگ کا اعلان ترقی پسند تحریک نے سن پینتیس چھتیس میں کیا تھا۔ معاشرہ کسی حد تک تبدیل ضرور ہوا ہے۔ عوامی بیداری اس جدوجہد کا بہت بڑا ماحصل ہے۔ اس بیداری کے طفیل بہت سے مسائل کے حل بھی تلاش کئے گئے ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سے تغیرات بھی رونما ہوئے ہیں۔ لیکن انسانی معاشرہ ایسا پیچیدہ معاشرہ ہے کہ اس کا کایا کلپ ہونے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ جدید اردو ادب بھی معاشرے کے ان مسائل کے تئیں خبردار اور ان کے حل کی تلاش میں فکرمند ہے۔ جدید اردو ادب میں بھی معاشرے کی صحتمند قدروں کے ٹوٹنے کا کرب شدید موجود ہے۔ جدید ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کے ہاں بھی محرومی، بھوک، افلاس اور ذہنی غلامی کے خلاف احتجاج کی سُر موجود ہے۔ اسلئے میں جدید اردو ادب کو ترقی پسند ادب کی توسیع کہنا بہتر سمجھتا ہوں۔ مسئلہ ہے تو صرف اپنی الگ شناخت اور جداگانہ پہچان تسلیم کرانے کا۔ چونکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا و ادبا کو عوامی مقبولیت نے ایسا قدآور بنا دیا ہے کہ ان کے قد کا ہونا ذرا مشکل معلوم ہونے لگا تھا، اس لئے بعض جدید اردو ادیبوں نے اپنا قد بڑھانے کے بجائے، بیان بازی کے ذریعے انہیں کے قد کو چھوٹا کرنا آسان سمجھا۔ وہ اپنی الگ شناخت کی اس سعی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس سے بحث نہیں ہے۔ انہوں نے بت شکنی کا جو شیوہ اختیار کیا تھا اس کے پس منظر میں ان کی بتوں کی مقبولیت سے سراسیمہ نفسیات ہی کارفرما تھی۔ بت پرستی اور بت شکنی، دونوں کا جنون سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ آپ اگر جنون کی حد تک مذہب پرست نہیں ہیں تو آپ بت پرست نہیں ہو سکتے اور اسی طرح اگر آپ کے اندر وحدانیت کا جذبہ جنوں کی حدوں کو نہیں چھو رہا ہے تو آپ بت شکن نہیں ہو سکتے۔ دونوں صورتوں میں شرط جنون کی ہے اور دونوں صورتوں میں جو نفسیات کارفرما ہے، وہ یہ کہ دونوں الگ الگ طور پر اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ جدید اردو ادب ترقی پسند ادب کی کتاب کا ایک باب بننے کے بجائے اس کتاب کا ضمیمہ بنتا جا رہا ہے۔ جدید اردو ادب کی تمام تر توجہ معاشرے سے ہٹکر فرد پر مرکوز ہو گئی ہے۔ فرد معاشرے کی نہایت اہم اکائی ہے لیکن کسی بھی معاشرے کی اصلاح کے لئے، بالخصوص ایسے معاشرے کی اصلاح کے لئے جہاں انسانوں کی تقسیم طبقوں میں ہو چکی ہو، فرد کے مسائل کا رونا رونے سے ہی نظامِ معاشرہ نہیں بدل سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس، اس سے فرد کا احساسِ شکست تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔ جداگانہ حیثیت کے منوانے کے متمنی ادیب یہ بھول جاتے ہیں کہ مشترکہ نشانہ نہ رہنے سے قافلہ بکھر جایا کرتا ہے۔ اس پر بھی اگرچہ قافلے کے سبھی افراد اپنی اپنی جگہ چل رہے ہوتے ہیں اور ہر فرد یہ محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنا فرضِ راہروی بخوبی سرانجام دے رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ قافلے سے بھٹک جانے کا غم اس کے سرورِ راہروی پر حاوی ہونے لگتا ہے اور وہ خود کو تنہا پا کر احساسِ شکست کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے پاس ایک واضح نشانہ رہا اور ترقی پسند ادیبوں کا قافلہ منظم رہا۔ اس لئے جس تیز رفتاری اور یقین و اعتماد کے ساتھ انہوں نے منزلیں سر کی ہیں، ان کا حصول بغیر صف آرائی اور بغیر تنظیم کے اگر ناممکن نہیں تو بہت دشوار ضرور تھا۔ انفرادی کوششوں کے خاطر خواہ نتائج سے مجھے انکار نہیں ہے اور اس سے میری مراد یہ بھی نہیں ہے کہ کسی تنظیم میں شامل ہوئے بغیر کوئی ادیب ادب تخلیق ہی نہ کرے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر کسی دور کے ادیب مجموعی طور پر ایک ہی کرب کو جی رہے ہوں تو ان کے لئے زیادہ موثر اور زیادہ کارگر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مل جل کر، ایک مشترکہ لائحۂ عمل مرتب کر لیں اور ادب کے لئے ان سمتوں کا تعین کر لیں جن

اطاعت (اپنے ضدی اور خودسر بچوں کی ہر خواہش پوری کر کے)
شرافت (ہوٹل کے خوبصورت چیچے چھوڑتے ہوئے)
سخاوت (رہبروں کو ٹپ دیتے ہوئے)۔
شجاعت (کسی نہ کسی طرح گھر کے چوہوں کا صفایا کر کے) اور بغاوت (بیگم عرف میڈم کی بات مات کر کے) سے کبھی جب یوم الدولہ کا دل نہیں بھرا تو زندگی کے بقیہ دن صحافت کے ساتھ (شرافت کے ساتھ تو ہر کوئی اپنے آخری دن گذار لیتا ہے) گذارنے کا اعلان کر دیا۔ اور عام طور پر اخبار کے اجرار کے ذرا پہلے کے ڈرامہ کا پہلا منظر بلکہ پس منظر ان کے پس دفتر یعنی مکان کے اندرونی حصہ میں کھیلا جا رہا تھا۔ جہاں ان کی بیگم رو رہی تھیں اور یوم الدولہ نغمہ سرا تھے۔ ؎

دے دے ہار دے ہار دے ہار دے دے ہمیں ہار دے

اور ان کی بیگم جو رو رو کر زرد ہو رہی تھیں صحافتِ شوہر کو سرد و زرد ہونے سے بچانے کے لئے آخر زیور دے کر ہچکیاں لیتی رہیں۔ یوں زیورِ زوجیت سے زیورِ طباعت کے مرحلہ تک اخبار پہنچ سکا۔ گویا ایثارِ زنانہ اخبارِ زمانہ کو زندگی بخشتا ہے۔ سچ ہے ہر بڑے کارنامہ کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہے تو صاحبو یوں ایک ایسے اخبار کا اجرار عمل میں آیا جس کے یوم الدولہ لاشریک حصہ دار و قصہ دار تھے۔ کتابت طباعت اور سجاوٹ اُن کے مصروف و مبارک ہاتھوں سے ہو رہی تھی۔ پھر اعلان کر دیا کہ وہ شہر کے سارے باشعور شہریوں کو (جن کی تعداد اُن کے رشتہ داروں اور دوستوں تک محدود تھی) ایک مکمل اخبار دیں گے۔

اُن کے مکان کا وہ حصہ جسے وہ دیوان خانہ کہنے اور ثابت کرنے پر مُصِر تھے، اخبار کا دفتر ثابت ہوا، وہاں ایک اونگھتی اور سہمی ہوئی میز جو شاید طوفانِ نوح سے بچا کر لائی گئی تھی اور ایک لڑکھڑاتی ہوئی تیموری کرسی رکھی ہوئی تھی۔ حاضرین، ناظرین، قارئین اور شارعین زمانہ کے لئے بلا لحاظِ ملّت اور مالی قلّت کے بورئے بچھا دیئے گئے تھے۔ یوم الدولہ اپنی مصروفیت کا تاثر دینے کے لئے اپنی تقدیر کی طرح سوتی ہوئی زلفوں کو پریشان کرتے اور ہاتھ میں سگریٹ لئے یوں بدحواس نظر آتے جیسے خصوصی ضمیمہ ترتیب

دے رہے ہوں۔

میز کی سیف میں تین چار بورڈ رکھ چھوڑے تھے جب کوئی اشتہار کے لئے آتا تو مینیجر برائے اشتہارات کا بورڈ میز پر سجاتے، جب کوئی غلطی سے اپنے گھر اخبار جاری کروانے کے لئے آتا تو جھٹ سرکیولیشن مینیجر کا بورڈ میز پر جاتے۔ بقیہ وقت مدیر اعلیٰ کا بورڈ میز پر ڈٹا رہتا۔ آیا رام گیا رام کی طرح یہاں آیا بورڈ گیا بورڈ کی سیاست تھی۔

کچھ سوچے سمجھے بغیر انھوں نے اپنے اخبار کا نام "زمانہ" رکھا۔ اور اب وہ "زمانہ" کو چھپوانے اور کھپانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ "زمانہ" ان کے لئے سچ مچ اوڑھنا بچھونا بن گیا ہے۔ (سچ مچ اخبار کے کتنے فائدے ہیں)۔

اشاعت کے پہلے دن سے ہی انھوں نے سرورق پر دائرہ میں سرخ نشان لگا کر ہمارے بیدار مغز قارئین کو زرِ سالانہ کے خطرہ سے قبل از وقت آگاہ کیا مگر اب وہ حضرت جگر مراد آبادی کی روح کا خیال کئے بغیر شان سے کہتے کہ "ہم زمانہ سے ہیں۔ زمانہ ہم سے نہیں!"

ان کی پوری کوشش ہوتی کہ اداریہ بلدی حدود (بلدی مسائل) سے تجاوز نہ کر جائے۔ سینما کے اشتہارات، طلاق نامے اور چٹخارے دار خبریں نمایاں شائع کرتے۔ "تنگیٔ داماں" کا سہارا لے کر اقوالِ زرّیں اور سدا بہار جوانی کے آزمودہ نسخوں کو پاس پاس شائع کرتے کہ یہ دونوں بوڑھوں اور ادھیڑوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔

ایک چوتھائی اخبار تو "چھپتے چھپتے" کالم کے تحت خالی رکھتے۔ جب ہم نے اس "تنگ دامنی" کی طرف اشارہ کیا تو کہنے لگے۔

"میاں تیسری جنگِ عظیم کسی وقت بھی چھڑ سکتی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کھلے کالم میں جنگ کی خبر فوراً شائع کر دوں اور دوسرے اخبارات پر سبقت لے جاؤں۔"

اوروں کے لئے اُن کا اخبار "زمانہ" ہو سکتا ہے لیکن ہمارے لئے تو وہ شبانہ تھا۔ رات کے کسی بھی حصہ میں گورکھا کی طرح دستک دے کر ہمیں جگاتے اور ہاتھوں میں اخبار تھما دیتے اور ہم اس "مڈنائٹ ٹائمز" سے رات کا بقیہ حصہ مچھروں کی بھنبھناہٹ، بیگم کی غراہٹ، اور بچوں کی بڑبڑاہٹ سے بچنے کے لئے "بطور ڈھال" استعمال کرتے۔

ایک دن روزِ روشن میں جب "زمانہ" ہمارے ہاتھوں میں آ گیا تو ہمیں یقین نہیں آیا۔ تاریخ دیکھی تو معلوم ہوا یہ تو دو روز پہلے کا ہے جو بوم الدولہ کے چھوٹے صاحبزادے کے عقیقہ کے باعث آج شائع ہو گیا۔

الغرض مکان یا محلہ کی کسی بھی تقریب، سرکاری وغیر سرکاری تعطیلات، عیدین، بارش، طوفان، کرفیو، مہینہ کی پہلی اتوار اور سال کے آخری چار شنبہ کو اخبار "زمانہ"، پابندی سے بند ہوتا۔ ریڈیو اور نیوز ایجنسیوں پر اُن کا ایمان آندھی طوفان زلزلہ اور بارش سے بھی متزلزل نہیں ہوتا۔ جس کا ثبوت ہمیں بارش کے ایک واقعہ سے ہوا۔ بارش ہو رہی تھی اور وہ کارٹون بنانے میں مصروف تھے۔ لاچار ہو کر اُن کی بوسیدہ چھت نے شانِ کریمی کے قطروں کو دفتر میں نچھاور کرنا شروع کر دیا۔ تو ہم نے کہا دیکھئے اخبار کے کاغذات بھی دفتر کا حال دیکھ کر قطرۂ انفعال سے نم ہو کر بارش کا پتہ دے رہے ہیں۔ سن کر کہا۔ ع

تر کاغذی پہ شیخ ہماری نہ جائیو۔

پھر جھٹ ریڈیو کھول کر خبروں سے تصدیق

ملی کہ واقعی شہر میں بارش ہو رہی ہے؟ اخبارات اور خود کو بارش سے بچانے کے لیئے چھتری کھول دی اور کہنے لگے۔ "میاں میں اور میرا اخبار کسی دوسرے کی چھتری کی پناہ میں نہیں ہے۔ بلکہ سیاسی اور سیاہی چھتری اپنی ہی ہے۔"

دنیا بھر کے اخبارات اپنے خصوصی نمبر چاہے کسی بھی موضوعات پر نکالتے ہوں۔ بوم الدولہ اپنے "زمانہ" کو زمانے بھر کے اخبارات سے اس معاملہ میں بھی ممتاز و منفرد رکھتے۔ جب ہم نے خصوصی نمبر کے موضوعات کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے۔

"میاں جس طرح سال کے بارہ مہینوں پر تین موسم مسلّط ہیں اُسی طرح اپنے قارئین پر بھی ان کی پسند کے مطابق سال بھر تین موضوعات جاری رہیں گے اور وہ تین موضوعات ہیں۔ فلمی خواتین، مسئلہ فلسطین اور کرکیٹر اظہر الدین، آئندہ سال کے تین موضوعات ہوں گے یوسف خان (دلیپ) اردو زبان اور ہمارے یہاں جن پر خوب چونا لگاکر آمدنی کر لوں گا۔"

خبروں کی سرخیاں باندھنے میں وہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جس میں اُن کی شرارت کو دخل رہتا تھا۔ جس کے باعث وہ پریشان بھی ہوا کرتے تھے۔ یہاں ان کی شوخی و شرارت کے ایک دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔

شہر میں شادی تھی۔ کرنل جوشی (جو گرم مزاج تھے) صنعت کار مہرہ صاحب کی لڑکی (جو فلسفہ میں ایم۔ اے اور خشک مزاج تھی) سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو رہے تھے۔ بوم الدین نے اس شادی کی سرخی یوں لگادی۔

"گرم جوشی اور سرد مہری کا دائمی ملاپ"

بس کچھ نہ پوچھیئے مہرہ اور جوشی دونوں زمانہ کو دکھانا ہے،" کہتے ہوئے دفترِ "زمانہ" پر ٹوٹ پڑے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اخبار زمانہ پندرہ دن بند رہا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ اشتہارات مل گئے اور یوں اخبار کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا۔

ایک دن دیکھا کہ دفترِ "زمانہ" پر دنیا بھر کے لوگ ٹوٹ پڑ رہے ہیں۔ وائے حیرت کہ کیا اب ایسے بھی دن دیکھنے نصیب ہوئے کہ اردو قاری اخبار خرید کر پڑھ رہے ہیں۔ اسی حیرت انگیز انقلاب کا سہرا صاحبِ "زمانہ" کے سر باندھنا ہی چاہتے تھے کہ اندر سے زنانہ آواز آئی۔ لپک کر اندر پہنچے تو دیکھا کہ ایک خوش پوش اور خوش شکل خاتون بوم الدولہ پر برس رہی ہے۔

بدقّت تمام ہم نے خاتون کو اُن کی بچی ہوئی گالیوں کے ساتھ رخصت کیا کہ کچھ تو گالیاں شوہر کے لیئے بچائے رکھتے پھر صاحبِ زمانہ سے عذابِ زنانہ کا قصّہ پوچھا۔ تو کہنے لگے۔

"میں کیا جانوں۔ وہ اخبار لینے آئیں اور آتے ہی برس پڑیں کہ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ آپ نے کیا سمجھ کر اشتہار چھاپا ہے۔"

"ہم نے اخبار دیکھا۔ گلشن اینڈ کمپنی کا اشتہار تھا کہ ہمارے پاس ہر قسم کا مال مناسب دام پہ ملتا ہے۔ پھر حسبِ روایت و شرارت بوم الدولہ نے اس اشتہار کی سُرخی یوں باندھی۔ ؏

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

معلوم ہوا کہ اُس خاتون کا نام گلشن ہے۔ اور یوں اخبارِ "زمانہ" ہفتہ عشرہ سے بند ہے۔

یوں تو ہماری زندگی میں خوشحالی اور مسّرت کا زمانہ آئے لیکن بوم الدولہ کے کاغذی پیرہن یعنی اُن کے "زمانہ" کے بغیر ہم اپنی زندگی میں کبھی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ خدا کرے یہ "زمانہ" بھی ہم سب کی زندگی میں جلد آجائے۔

تبسم بانو

اوم کرشن راحت

بارُود کی بُو

حسبِ معمول آج کی صبح بھی گزر گئی۔ میں نے ابھی تک سوائے برجو کے کسی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ میرے پوتے پوتیوں اور ان کے ہمجولیوں کے قہقہوں کی آوازیں البتہ میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ صبح جب برجو مجھے ناشتہ دے کر کمرے سے باہر نکلا تھا تو میرے بڑے بیٹے پر بودھ نے برجو سے پوچھا تھا "پتاجی کیسے ہیں؟" میں یہ تو نہ سن سکا تھا کہ اس کا برجو نے کیا جواب دیا تھا لیکن پربودھ کے یہ الفاظ میرے کانوں تک ضرور پہنچے تھے "اس وقت تو میں ذرا جلدی میں ہوں مجھے کچہری جانا ہے شام کو ضرور آکر پتاجی سے ملوں گا اور ہاں اپنی مالکن سے کہنا ذرا آکر پتاجی کا حال پوچھ جائے۔ کسی دوا کی ضرورت ہو تو وہ بھی منگوا دے" پھر وہ آواز شاید مدھم ہو گئی تھی یا مجھے نیند آگئی تھی۔

برجو کی مالکن دوپہر تک نہ آئی۔ اسے شاید کام کاج سے فرصت ہی نہیں ملی میں اپنے کمرے میں لیٹا لیٹا چھت کی کڑیاں گنتا رہا۔ میں انھیں روز گنتا ہوں۔ اسی کمرے میں جہاں میں پڑا ہوا ہوں کبھی ٹائیگر رہا کرتا تھا۔ میرے والد کو جہاں گورنر صاحب نے رائے صاحب کا خطاب دیا تھا وہاں کتے پالنے کا بھی مشورہ دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک بل ڈاگ بھی۔ جسے ہم ٹائیگر کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ بڑی حویلی جو پندرہ کمروں پر مشتمل ہے میرے دادا نے بنوائی تھی۔ میرے دادا کو اپنی اس حویلی پر اتنا ہی فخر تھا جتنا میرے پتاجی کو رائے صاحب ہونے پر۔ میرے دادا دن میں ایک بار ضرور اپنی پگڑی تھام کر اس ٹین کے مرغ کو دیکھتے جو حویلی کی اونچی چھت پر سمتوں کی نشان دہی کے لئے اپنی چونچ کھولے ہوا کے تھپیڑوں، بارش کی تیز بوچھاروں اور جلتی دوپہروں کی تپش کو برداشت کرتا آرہا تھا۔ میرے دادا کو یہ مرغ دیکھنے میں کیا مزا آتا تھا۔ میرے پتاجی بھی یہ نہیں بتا سکے تھے۔ آج نہ جانے کیوں میرا جی بھی اس ٹین کے مرغ کو دیکھنے کے لئے مچل اٹھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ میں اور اس مرغ میں کوئی فرق نہیں اگر کوئی فرق ہے تو بس اتنا کہ وہ چھت پر سے سارے شہر کو دیکھتا ہے اور میں کمرے میں پڑا ہوا سوائے کمرے کی چھت کی کڑیوں اور چار دیواری کے اور کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔

یہ پرشکوہ حویلی کبھی میرے دوستوں کے قہقہوں، میری بیوی کی ہنسی اور میرے بچوں کی کلکاریوں سے بھری رہتی تھی۔ قہقہے حویلی میں آج بھی گونجتے ہیں۔ بہوؤں کی ہنسی بھی بکھرتی ہے، بچے بھی اودھم مچاتے ہیں۔ لیکن پچھلے چار سال سے یہ سب آوازیں مجھ تک نہیں پہنچتیں۔ صرف میری کھانسی ہی کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر مجھ تک لوٹ آتی ہے۔

میرا جی اکثر چاہتا ہے کہ میں اوپر جا کر اپنے پریوار کے لوگوں میں بیٹھوں، ان کے نئے رہن سہن کو دیکھوں، ان کے بڑھتے ہوئے کاروبار کے بارے میں بات چیت کروں جو برجو کے کہنے کے مطابق دن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اپنے

پوتے پوتیوں سے ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھوں لیکن گھٹنوں کا درد اور اختلاجِ قلب اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتے۔

آج میں دوپہر کا کھانا کھا کر بیٹھا ہی تھا کہ میرے پوتے نے باہر سے آواز دی "دادا آپ سے کوئی ملنے آئی ہیں"۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس وقت کون مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ پچھلے دو سال سے کوئی دوست یا رشتہ دار مجھے ملنے نہیں آیا تھا۔ میں لیٹے لیٹے دروازے کی طرف تکنے لگا، تھوڑی دیر بعد ایک بڑھیا سفید ریشمی شلوار قمیض اور سفید دوپٹہ اوڑھے میرے کمرے میں داخل ہوئی اور "ویرا" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی، میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے گرم گرم آنسو میرے گالوں پر گرنے لگے۔ میں سوچ میں ڈوب گیا کہ وہ عورت کون ہو سکتی ہے جو ویرا۔ ویرا کہہ کر روئے جا رہی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں اسے تسلی دے پا رہا تھا نہ اسے اپنے سے علیحدہ کر سکتا تھا۔

"آپ کون ہیں بی بی"، میں نے اس کو تھپتھپا کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں۔ میں زینب ہوں"، اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کون زینب؟"، میری حیرانی ابھی تک بنی ہوئی تھی۔

"ویرا میں زینب ہوں چوہدری رحیم خاں کی بیٹی۔ تمہاری بہن" وہ میرے سینے سے ہٹتے ہوئے بولی۔

"اوہ زینی تو؟ میرے بوڑھے بازوؤں نے اسے بھینچ لیا۔ وہ میرے سینے سے لگ کر پھر سسکیاں لینے لگی اب میں بھی بلک بلک کر رو رہا تھا۔

زینب مجھے چار سال پہلے ملی ہوتی تو شاید میں اتنا جذباتی نہ ہوتا۔ آج مجھے بہت شدت سے اپنی تنہائی کا احساس ہوا جو میں پچھلے چار سال سے متواتر بھگت رہا تھا۔ زینب میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ سارا سارا دن ہم حویلی کے کمروں میں طوفان اٹھائے گھوما کرتے تھے۔ جب ہم تھک جاتے میری ماں اسے اپنے ساتھ لٹا لیتی اور میں مچل کر ماں کے دوسرے پہلو میں لیٹ جاتا اور پھر ماں ہمیں جل پریوں، نرم نرم بالوں والے خرگوشوں، نیلے نیلے پروں والے پرندوں کی کہانیاں سناتی۔ کہانیاں سنتے سنتے زینب جب سو جاتی تو تایا جی چھت پر سے ہی رحیم خاں کو آواز دیتے اور وہ اپنے بازو بڑھا کر منڈیر سے ہی زینب کو تھام لیتے اور اسے اس کی اپنی ماں کے ساتھ لٹا دیتے۔ پھر ایک دن زینب نے ہمارے یہاں آنا چھوڑ دیا۔ میں نے جب ماں سے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ بولیں "بیٹا زینب اب سیانی ہو گئی ہے"۔ میں نے فوراً کہا تھا "ماں میں بھی تو سیانا ہو گیا ہوں" یہ الفاظ یاد کر کے میں اب بھی ہنس پڑا۔

زینب اب اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی اور اس نے میرے سینے سے الگ ہوتے ہوئے کہا "ویرا یہ روتے روتے اچانک ہنسی کس بات پر آ گئی"، جب میں نے، وہ الفاظ دوہرائے تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اس نے ہمارے محلے کے چونی لال حلوائی لبھو رام فوٹو گرافر، نتھو مونگ پھلی والے، دیپے دودھیئے اور دوسرے کئی لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران میں بھی ان لوگوں کے بارے میں پوچھتا رہا جو سرحد پار جا بسے تھے۔ جیسے مولوی وحید، چوہدری مہر، فضلا نمبردار، علی محمد پتنگ ساز، حسنا للاری، جما قصائی، اس نے ان سب کے بارے میں کیا کہا میں نے اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ ہمیں ان شخصیتوں سے اب کیا غرض رہ گئی تھی ہم تو بس یادوں کے اس ہجوم میں اپنے بچپن کو آوازیں دیتے گھوم رہے تھے۔

ان باتوں سے فارغ ہو کر اس نے اپنی بھابی کے بارے میں پوچھا جسے وہ میری شادی سے پہلے میری ماں کے ساتھ خود دیکھنے گئی تھی اور جب میں نے اسے بتایا کہ وہ تیسرے بیٹے کو جنم دینے کے بعد چل بسی تھی تو زینب کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔ وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولی۔

" ویرا مجھے تو اب بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ لال لال چوڑا پہنے ابھی ابھی تمہارے ساتھ کار سے اتری ہے اور میں اور میری ماں کھڑکی کے پردے سے تم دونوں کو دیکھ رہی ہیں۔
اس کے بعد اس نے اپنے خاوند کے بارے میں بتایا جو سیالکوٹ میں ایک ریل حادثے میں چل بسا تھا۔ زینب نے یہ بھی بتایا کہ اس کے تین بیٹے ہیں۔ ایک ملٹری میں کرنل، دوسرا ٹی۔ وی کیمرہ مین اور تیسرا امیڈیکل کالج میں پروفیسر ہے۔

" اتفاق کی بات ہے زینب میرے بھی تین لڑکے ہیں ایک تو شاید تمہارے یہاں ہوتے ہی پیدا ہوا تھا وہ ایک اچھی خاصی فیکٹری کا مالک ہے، دوسرا انکم ٹیکس وکیل ہے اور تیسرا انجینئر۔ ان سب کی شادی ہو چکی ہے۔ ان کے بچوں کے بارے میں۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ ویسے خود ہی گھر کے جھمیلوں سے الگ ہو گیا ہوں۔"

میری بات سن کر زینب مسکرا دی اور میں سمجھ گیا کہ مجھے جھوٹ بولنے کا سلیقہ بالکل نہیں آتا۔

" بھیا مجھے اپنے گھر والوں سے نہیں ملواؤ گے" زینب اچانک بول اٹھی۔

" ارے میں تو بھول ہی گیا۔ چلو اوپر چلو"، میں نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا میرے گھٹنوں میں بالکل درد نہیں تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ آج کئی سالوں کے بعد میں گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور بغیر کسی تکلیف کے ہم نے چوبارے میں قدم رکھے تو بہوؤں کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ تاش کھیلتے پایا۔ میز پر نوٹ ہی نوٹ بکھرے پڑے تھے۔ میری ایک پوتی نیم عریاں لباس میں صوفے پر لیٹی انگریزی ناول پڑھ رہی تھی۔ کھڑکیوں پر خوبصورت پردے لٹک رہے تھے ایئر کنڈیشنر نے فضا کو معتدل بنا رکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر تمام لوگ چونکے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بہوؤں نے تاش میز پوش کے نیچے چھپا دی بکھرے نوٹوں پر اپنی ساڑی کے پلو ڈال دیئے۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ ساتھ کے کمرے میں ویڈیو پر کوئی انگریزی فلم چل رہی تھی جس میں بندوقیں چلنے کی آوازیں صاف صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے خموشی کو توڑتے ہوئے بڑی بہو سے کہا۔

" بہو یہ ہمارے مہمان آئے ہیں پاکستان سے۔ یہ زینب ہیں ہمارے پڑوس میں رہا کرتی تھیں۔"

بہوئیں اور ان کی سہیلیاں بے دلی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے پلوؤں میں احتیاط سے نوٹ سمیٹتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ بہوؤں نے جہاں میرے پیر چھوئے وہاں وہ اس بات پر حیران بھی تھیں کہ میں کیسے خود ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا تھا۔ میری پوتی کتاب ہاتھ میں تھامے ساتھ والے کمرے میں جہاں ویڈیو چل رہا تھا اپنے بھائیوں کو میرے اوپر پہنچنے کی اطلاع دینے دوڑی وہ گھبرائے ہوئے انداز سے کہہ رہی تھی "دادا اوپر آگئے ہیں ان کے ساتھ ایک اولڈ گرل فرینڈ بھی ہے"

یہ الفاظ میں نے بھی سنے زینب نے بھی۔ مجھے بہت برا لگا لیکن زینب ہنس کر بولی " بھیا ہمارے یہاں بھی اب ایسی ہی زبان استعمال ہوتی ہے۔ یہ جو سرحد ہے وہ تو انسانوں کے لئے ہے۔ ہوا پر تو کوئی پابندی نہیں۔ اُدھر کی ہوا اِدھر اور اِدھر کی ہوا اُدھر جانے میں دیر ہی کہاں لگتی ہے۔

چائے پینے کے بعد میں زینب کو حویلی دکھانے گیا۔ حویلی جو اس کی جانی پہچانی تھی۔ جہاں اس کا اور میرا بچپن گزرا تھا۔ وہاں کا کونا کونا ہماری ہنسی اور ہماری آوازوں سے اٹا پڑا تھا۔ ہر ایک کمرے سے بچپن کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ ہمیں اپنا بچپن کھیلتا ہوا ملا۔ بھولی بسری کہانیاں سہانی خوشبوئیں بن کر ہمارے ذہن سے ہو کر ہماری روح میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ جب حویلی کی چھت پہ جا کر زینب نے منڈیر سے

اپنے گھر کی چھت پر جھانکا تو میں نے چوہدری رحیم خاں کو اسی طرح اپنے بازو پھیلائے کھڑا پایا زینب کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جب ایک روز میں چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ ڈور کی چرخی چھوڑ کر ہمارا نوکر نیچے پتاجی کا حقّہ تازہ کرنے چلا گیا تھا۔ میری پتنگ کے پیچ کسی اور پتنگ سے لڑ گئے تھے۔ عین اسی وقت زینب اپنے گھر کی دیوار پھاند کر میری ماں سے ملنے نیچے جا رہی تھی میں نے کہا "زینب ذرا چرخی تھامنا"

"نا بھیّا نا مجھے بہت ضروری کام ہے"

اتنے میں میری پتنگ کٹ کر ہوا میں تیرنے لگی تھی اور غصے میں آ کر میں نے زینب کے گال پر ایک زور کا طمانچہ جڑ دیا تھا اور وہ چیختی چلاتی میری ماں کے پاس گئی تو ماں نے مجھے بہت پیٹا تھا اور پتاجی نے میرے رات کے کھانے کے لئے منع کر دیا تھا۔

پھر میری نظر ٹین کے اس مرغ پر اٹھ گئی تھی جو ہماری حویلی کی اونچی چھت پر سمتوں کے نشان کے اوپر چونچ کھولے چڑھتے اور ڈوبتے سورج کو اب بھی دیکھا کرتا ہے۔ مجھے ٹین کے مرغ کی طرف دیکھتے ہوئے زینب بولی "ویرا یہ ابھی زندہ ہے۔"

اور ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

پھر ہم حویلی کے نچلے حصّے میں آ گئے۔ یہ وہ ڈیوڑھی ہے نا جس میں اُن دنوں جھولا پڑا رہتا تھا۔ یہاں ہم ماں سے ساون کے گیت سیکھ سیکھ کر گایا کرتے تھے۔ آنگن میں انار کا پیڑ تھا۔ جب اُسے انار لگتے تو ہم اناروں کو پکنے ہی نہیں دیتے تھے۔ کھٹا میٹھا رس ایک دوسرے کے منہ میں چھوایا کرتے۔ اسی دالان میں ماں ہمیں کہانیاں سنایا کرتی تھی—— یہ کوٹھڑی؟

"ہاں ویرا۔ یہ وہی کوٹھڑی ہے نا۔ جہاں سن بیالیس میں تم اور میرا بڑا بھائی گلّو بارود بناتے پکڑے گئے تھے۔ تم تو کچھ دنوں بعد معافی مانگ کر اور رائے صاحب کے رسوخ سے گھر لوٹ آئے تھے لیکن گلّو معافی مانگنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ تین سال کی قید ہو گئی تھی اسے۔"

زینب کیا کہے جا رہی تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے نتھنوں میں اب بھی بارود کی بو گھسی جا رہی تھی۔ ۴۸ سال پہلے کی بو۔ اچانک بھاری بھرکم بوٹوں کی چاپ سن کر میں چونکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس کے سپاہیوں نے حویلی کو گھیر لیا تھا۔ اور دھڑ دھڑ کرتے پولیس کے کچھ سپاہی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں اور زینب ہکّا بکّا یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ آن کی آن میں پولیس والے میرے دو پوتوں اور ان کے دو دوستوں کو ہتھکڑی پہنائے نیچے لے آئے۔ دو تین گھنٹے حویلی کی تلاشی لی جاتی رہی —— میرے لڑکے بھی اپنا اپنا کام چھوڑ کر گھر لوٹ آئے تھے۔ بہوئیں رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ بچے سہمے سہمے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے میں اور زینب صحن میں دھرے مونڈھوں پر چپ چاپ بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے میرا بڑا لڑکا پولیس انسپکٹر سے کیا بات کر رہا تھا وہ تو مجھے سنائی نہیں دی البتہ انسپکٹر زور زور سے بول رہا تھا۔

"ہم مجبور ہیں لالہ جی۔ ہمیں جو رپورٹ ملی تھی۔ وہ سب کچھ آپ کے سامنے برآمد بھی ہو گیا ہے۔ یہ دیکھئے ویڈیو کیسٹ جسے ہم نے اس وقت قبضے میں لیا جب ٹی وی پر فلم دیکھی جا رہی تھی۔ اس میں سبھی وہ طریقے ہیں جس کی بنا پر آپ کے بیٹوں اور ان کے دوستوں نے بینک کو لوٹنے کا پروگرام بنایا تھا۔ دیکھئے کاغذات جن پر اس کا پلان، بینک کے محل وقوع کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ ملٹری کی وردیاں جو ان کی الماری سے برآمد ہوئی ہیں۔ یہ پستول۔ یہ ریوالور۔ ہلکے پھلکے بم جو انہوں نے خود اپنی حویلی کی کوٹھڑی میں تیار کئے۔ بموں کے خالی خول اور کوٹھڑی میں سے تو اب بھی بارود کی بو آ رہی ہے" انسپکٹر نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم نے تو انھیں کبھی تنگ نہیں رکھا۔ صاحب آپ جتنا سوچ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ تو وہ جیب خرچ لیتے ہیں" میرے لڑکے نے انسپکٹر کے آگے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے اوپر نظر دوڑائی حویلی کی چھت کے اوپر ٹین کا مرغ سمتوں کے نشان کے اوپر اپنی چونچ کھولے بدلتے ہوئے افق کو دیکھ رہا تھا۔

گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی "یوم اساتذہ" کے موقع پر فرید آباد میں منعقدہ ریاستی سطح کی ایک تقریب میں اساتذہ کو "سٹیٹ ایوارڈ" سے نوازتے ہوئے۔

وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال چھچھرولی میں "جنگلی جانوروں کے تحفظ کا ہفتہ" کے موقع پر منعقدہ نمائش دیکھتے ہوئے

گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی کو روکشیتر یونیورسٹی میں بیالوجی ڈپارٹمنٹ کی
عمارت کا افتتاح فرماتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال حصار میں ہریانہ سٹیٹ کوآپریٹو لینڈ ڈویلپمنٹ بنک
کے زیرِ اہتمام منعقدہ تقریب میں پنچوں اور سرپنچوں سے خطاب کرتے ہوئے۔

گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی حصار میں منعقدہ "یوتھ فیسٹیول" میں تقسیم انعامات کے موقع پر ہریانہ ایگری کلچر یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ایل۔ڈی کٹاریہ کو یادگاری تحفہ عطا کرتے ہوئے۔

وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال گورنمنٹ کالج اینڈ انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، آدم پور میں واٹر سپلائی سکیم کا افتتاح کرتے ہوئے۔
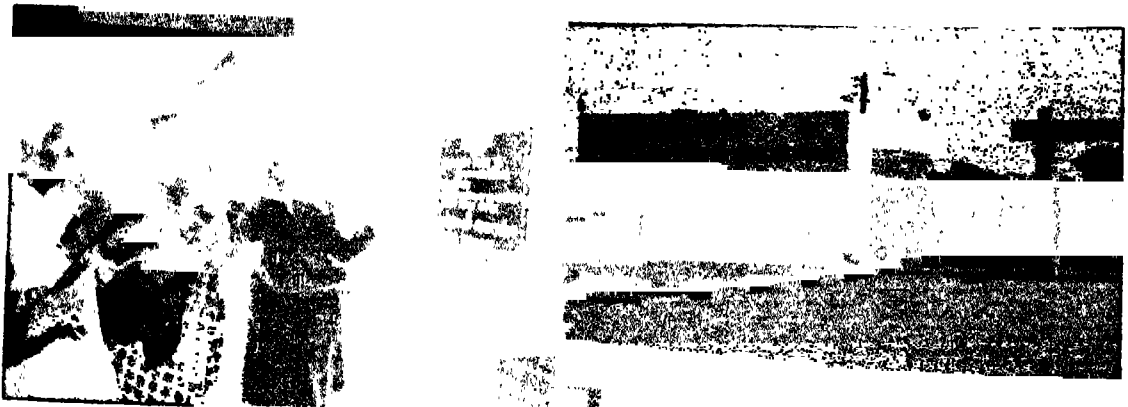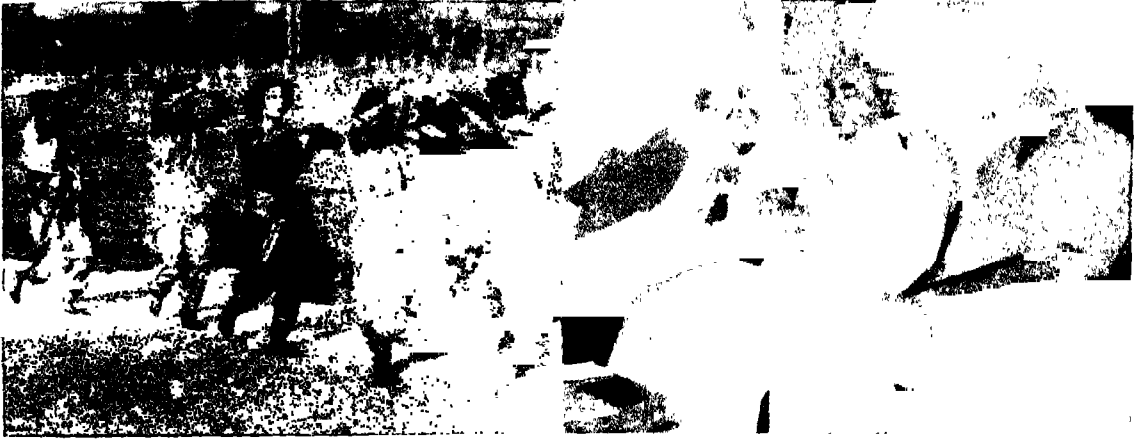
وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھجن لال حصار میں منعقدہ "نارتھ زون انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹی ول"
کے موقع پر کلچرل پروگرام دیکھتے ہوئے۔

"گروپ ڈانس" کی ایک جھلک۔

انجم عرفانی

غزل

کوئی تاویل نہ پردہ نہ بہانا جانا
اُس کے کوچے میں مرا کھُل کے ہے آنا جانا

اور وہ ہوں گے جو سرگوشیاں کرتے ہوں گے
حرفِ حق ہم نے سرِدار سنانا جانا

موسمِ ہجر کے ہوتے گئے دونوں عادی
اُن کا آنا نہ ہوا، ہم نے نہ جانا جانا

زندگی روٹھی، کبھی موت، کبھی وہ روٹھے
روٹھنے والوں کو ہم نے نہ منانا جانا

ہم نے اک عمر سے انجم سرِ دہلیزِ چشم
شام ہوتے ہی دیئے روز جلانا جانا

پرکاش ناتھ پرویز

مُحبّت میرا مذہب ہے، مُحبّت میرا ایماں ہے
مُحبّت کے لیے ہستی مری احساں ہی احساں ہے

مری آنکھوں نے تجھ کو آج تک دیکھا نہیں پھر بھی
ترا حُسنِ سراپا میری ہستی سے نُمایاں ہے

چمن میں پھُول بھی ہیں، پتیاں بھی اور غُنچے بھی
مجھے جس سے مُحبّت ہے وُہ اک سروِ خراماں ہے

یہی ہے کُفر کی دُنیا، یہی ایمان کی دُنیا
مُحبّت جس کو کہتے ہیں جہانِ کُفر و ایماں ہے

تمنّا دولتِ دُنیا کی ہو پیدا تو پھر کیوں مجھ کو؟
مرا سرمایۂ ہستی مری غزلوں کا دیواں ہے

دوسری اور آخری قسط

پروفیسر عنوان چشتی

اصولِ قوافی کی روشنی میں

ایطا کا تنقیدی جائزہ

ایطائے جلی اور ایطائے خفی کی تقسیم میں ایک ہی اصول کارفرما ہے۔ یعنی کلمۂ متحد المعنی کی تکرار خفی ہو یا علامتِ مشترک سے غیر محسوس ہو تو ایطائے خفی ہے اور جلی نیز نمایاں ہو تو ایطائے جلی ہے۔ اس یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایطا کی تقسیم کی بنیاد عیب کی مقدار پر ہے۔

ایطائے خفی کو عروضیوں کا ایک حلقہ عیب نہیں مانتا۔ اس سلسلہ میں یاس یگانہ چنگیزی کے خیالات سے حرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے لکھا ہے۔

"اردو میں (الف۔ واؤ۔ یا) میں سے تنہا کوئی حرف زوائد کے واقع ہو، اور معنی واحد بھی رکھتا ہو اور اُس کے نکال ڈالنے سے حرفِ روی بھی قائم نہ ہو سکے تو بھی ایسے الفاظ کو باہم قافیہ ٹھہرانا کمترین کے نزدیک جائز ہے۔ جیسے سُنا اور کہا، چلو اور اٹھو، چیلی اور کٹی کے قافیے میرے نزدیک معیوب نہیں ہیں۔ کیونکہ زوائد میں فقط ایک حرف ہے اور اس وجہ سے قبح زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔ ہاں اگر زوائد ایک حرف سے زیادہ ہوں تو معیوب ہے۔ جیسے چلنا اور جانا یہاں دو حرف (نا) زوائد میں ہیں۔ لہٰذا زوائد میں ایک حرف تک کی اجازت قابل اعتراض نہیں ہے۔"[1]

یگانہ نے جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کی دلیل بے حد کمزور ہے۔ یعنی زوائد میں ایک حرف ہو اور تکرار ناگوار نہ ہو تو اس کو جائز سمجھ لینا چاہیئے۔ انھوں نے اپنے نظریہ کی بنیاد اصول سے زیادہ ذوق کے مسئلہ پر رکھی ہے۔ جو اس بنیادی اصول کی نفی کرتی ہے، جو ایطا کے لئے سنگِ بنیاد ہے۔ یعنی کلمۂ آخر متحد المعنی اور علامتِ مشترک کے اصول کے خلاف ہے۔ یگانہ کی رائے سے حرفِ روی کے اصول کی نفی بھی ہوتی ہے۔ جو قافیہ کی اساس ہے۔ اس لئے یگانہ اور ان کے ہم نواؤں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے روایتی اور مروج ایطائے خفی کی تعریف سے الگ ہو کر اس سوال پر نئے

---

[1] چراغِ سخن مطبع گلشنِ ابراہیمی ص ۸۹

انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔

" ایطائے خفی اُس وقت واقع ہوتا ہے۔
جب لفظاً تو دونوں اصلی اور صحیح
ہوں۔ لیکن اُن کے آخری تین حروف
یا دو حروف اس طرح مشترک ہوں
کہ تکرار کی قید کا دھوکا ہو۔ مثلاً
آسان اور انسان، ارمان اور حرمان۔[1]

اس تعریف میں ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اور اس میں حرف روی کے ماقبل حروف کی تکرار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیاد یہ ہے کہ قافیے کے الفاظ تو اصلی ہیں۔ ترکیبی یا دو ٹکڑے والے نہیں ہیں۔ یعنی ان کا کلمۂ آخر متحد المعنی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ روی سے پہلے دو حروف اس طرح مشترک ہیں کہ اُن پر تکرار کی قید کا دھوکا ہوتا ہے۔ محض تکرار کی قید کے تشابہ کی وجہ سے ایسی صورتوں کو ایطائے خفی کہا ہے۔ اس طرح کے قوافی کی مندرجہ ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) یک حرفی تکرارِ ماقبلِ روی:

مثلاً ایمن اور دامن، گلشن اور جوشن

خاک میں مل کے بھی میں اس کو نہ دشمن سمجھا
گردشِ چرخ کو میں گردشِ دامن سمجھا

(نامعلوم)

اس مطلع میں روی (ن) سے پہلے ہر دو جانب میم ہے۔ یک حرفی تکرار ہے جس سے تکرار کی قید کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ شعر

سب پوچھتے ہیں بیٹھ رہا نامہ بر کہاں
اپنی خبر نہیں، مجھے اس کی خبر کہاں

(جوش ملسیانی)

نامہ بر اور خبر میں روی رے سے قبل بے موجود ہے۔

(۲) دو حرفی تکرارِ ماقبلِ روی:

مثلاً پشیماں اور مہماں یا ارمان اور حرمان۔

جس جگہ جاتے ہو، آتے ہو پشیماں ہوکر
تم کو جانا نہیں آتا۔ ابھی مہماں ہوکر

(داغ دہلوی)

اس مطلع میں ن غنہ حرفِ روی اور الف حرفِ تاسیس ہے۔ اس سے قبل دونوں جگہ میم حرفِ مشترک ہے۔ جس پہ تکرار کی قید کا گمان ہوتا ہے۔ اس میں دو حرف یعنی م اور الف مشترک ہیں۔

(۳) سہ حرفی تکرارِ ماقبلِ روی:

مثلاً ارمان اور حرمان یا انسان اور آسان

حیرت بدل گئی ہے نہ حرماں بدل گیا
اک شاعرِ عظیم کا ارماں بدل گیا

(خود ساختہ)

اس مطلع میں حرف روی (نون غنہ) سے قبل رے۔ میم۔ الف مشترک ہیں۔ اگرچہ الفاظ اصلی اور صحیح ہیں۔ مرکب نہیں ہیں۔ مگر ان تینوں حروف کے اشتراک پہ تکرار کی قید کا گمان ہوتا ہے اس لئے معیوب ہے۔ اس قسم کے قوافی کو جوش ملسیانی، نوح ناروی، ابر احسنی وغیرہ نے معیوب قرار دیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس عیب کا کوئی نام تجویز نہیں کیا ہے۔ میری رائے میں اس عیب کو ایطائے خفی کا نام دیا جائے اور ایطائے خفی کے زمرے میں اِن تمام صورتوں کو رکھا جائے، جن کا ذکر سطورِ بالا میں ایطائے خفی کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں یہی صورتِ حال ہے ؎

---

[1] درسِ بلاغت۔ ص ۱۲۶

(الف) حرفِ ما قبل روی کا اشتراک

سکوں ملا ہے مگر اضطراب جیسا ہے
ترے بدن کا فسوں بھی شراب جیسا ہے
جاگ اٹھے سائے، بجھا شمع اندھیرا کر لے
رنگِ تنہائی کو کچھ اور بھی گہرا کر لے

(ممتاز راشد)

تیغ اٹھائی تو کوئی داد کے قابل نہ ملا
سب ہی قاتل تھے مگر اپنا مقابل نہ ملا

(شہاب جعفری)

کمر تمنا و تیر تھا کمان بن کے مٹ گیا
زبرِ زمیں کا ورن آسمان بن کے مٹ گیا

(شمس الرحمان فاروقی)

عیاں رہے بھی ترا حسن اور عیاں نہ رہے
حجاب وہ کہ کوئی پردہ درمیاں نہ رہے

(فراق)

کعبۂ دل میں ہیں نشاں، کچھ فنِ آزری کے بھی
بارگہِ الٰہ میں جلوے ہیں کافری کے بھی

(فراق)

(ب) علامتِ مشترک کی تکرارِ خفی

پہچان کے اپنی سب امکان مٹاتی جا
تو ایک پہیلی ہے ہر بھید چھپاتی جا

(ممتاز راشد)

دل پہ وفا کا بوجھ اٹھاتے رہے ہیں ہم
اپنا ہر امتیاز مٹاتے رہے ہیں ہم

(شہاب جعفری)

شاخِ مژگانِ محبت پہ سجا لے مجھ کو
برگِ آوارہ ہوں، صرصر سے بچا لے مجھ کو

(محسن احسان)

سیاہیوں سے لگاؤ کے سلسلے نہ گئے
دیئے جلاتے رہے اور دل بجھے نہ گئے
(محسن احسان)

غزل کے ساتھ اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات
نوائے میر سناؤ، بڑی اداس ہے رات

(فراق)

سوز و سازِ دلی کو بھول گئی
زندگی عاشقی کو بھول گئی

(فراق)

طلب کی پیاس کو پھولوں میں بانٹ دیتا تھا
وہ خواب میں بھی مرے لب پہ اوس رکھتا تھا

(کشور ناہید)

استثنائی صورتیں

(۱) ایطا کی جو تعریف دی گئی ہے، اُس کا اعلان کرنے اور امکانات کا تجزیہ کرنے سے بعض استثنائی صورتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ چونکہ تکرارِ قافیہ لفظی اور معنوی کو ایطا کہا گیا ہے۔ اس کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ اگر تکرارِ قافیہ لفظی یا معنوی سطح پر ایک نہ ہو تو ایطا نہیں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مطلع میں لفظی سطح پہ تکرارِ قافیہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اُس لفظِ واحد کے معانی دونوں جگہ الگ الگ ہوں۔ مثلاً اگر مطلع میں کان (بمعنی معدنیات کا ذخیرۂ زیرِ زمیں) اور کان (بمعنی گوشں) استعمال ہو تو ایطا نہیں ہے۔ مثلاً

دل کی بستی عجیب بستی ہے
روز اجڑتی ہے روز بستی ہے

(نامعلوم)

اس شعر میں دونوں جگہ قافیہ کے مقام پر لفظ بستی آیا ہے۔ مگر دونوں جگہ معانی الگ الگ ہیں۔ مصرع اولیٰ میں بستی بمعنی شہر اور مصرع ثانی میں بستی بمعنی آباد ہونا ہیں۔ ایطا کی تعریف کی روشنی میں بظاہر یہ صورتِ حال صحیح نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مثال اور دیکھیے ؎

اڑتی ہے قلندر کی دُعا صورتِ باز[1]
اس وقت بھلا بابِ اثر کیوں نہ ہو باز[2]
مومن کوئی ہو سکتا نہیں سفلہ[3] باز
ناری کبھی الحاد سے آتا نہیں باز[4]

(علامہ سحر عشق آبادی)

اس رُباعی میں چاروں مصرعوں میں بطورِ قافیہ ایک لفظ باز استعمال ہوا ہے۔ لیکن چاروں جگہ اُس کے معانی جُداگانہ ہیں۔

بعض عروضی اس نقطہء نظر یا ایطا کی اس استثنائی صورت سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ

(الف) قافیہ کا دارومدار حروف وحرکات پر ہے۔ معانیات پر نہیں ہے۔ اس لئے قافیے کے تجزیے اور ایطا کی تشخیص میں محض تکرارِ قافیہء لفظی کو بنیاد بنانا چاہیئے واقعہ یہ ہے کہ قافیہ کی بنیاد حرفِ روی پر ہے۔ اگر حرفِ روی نہ ہو تو قافیہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ایطا کی تشخیص میں قافیہ کی بنیادوں سے انحراف نہیں کرنا چاہیئے واقعہ یہ ہے کہ ایطا کی بحث بے معنی ہے۔

(ب) ایک رائے یہ بھی ہے حرفِ روی سے پہلے دونوں طرف حرفِ مشترک کا آنا معیوب ہے۔ اس صورتِ حال کا مفصل تجزیہ ایطائے خفی کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔ یہ دونوں دلیلیں بہت وزن دار معلوم ہوتی ہیں اس لئے داغ اور امیر کے اہم تلامذہ نے اس قسم کے قوافی کو معیوب قرار دیا ہے۔ میری رائے میں اس کو استثنائی صورتوں سے نکال کر ایطا قرار دینا چاہیئے۔

(۲) ایطا کی تشریحی تعریف میں واضح کیا گیا ہے کہ کلمہء آخر متحد المعنی یا مرکب الفاظ کا آخری ٹکڑا یا علامتِ مشترک بہ نوعیتِ واحد کے نکال دینے پر اگر دونوں الفاظ با معنی بچتے ہوں اور باہم مقفیٰ نہ ہوں تو ایطا ہے۔ اس تعریف کے مضمرات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(الف) اگر کلمہء آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک کو نکال دینے سے دونوں الفاظ با معنی بچتے ہوں مگر باہم مقفیٰ ہوں تو ایطا نہیں ہے مثلاً کہنا اور رہنا میں نا علامتِ مشترک ہے، اس کو نکال دینے پر کہ اور رہ دو با معنی مگر باہم مقفیٰ الفاظ باقی بچتے ہیں۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

(ب) اگر کلمہء آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک کو نکال دینے کے بعد ایک لفظ بے معنی اور دوسرا با معنی باقی بچے، خواہ دونوں باہم مقفیٰ نہ ہوں تو ایطا نہیں ہے۔ مثلاً دوستی اور زندگی۔ دونوں میں مشترک علامت "ی" ہے اس کو نکال دینے پر دوست اور زندگ باقی بچتا ہے۔ جن میں ایک با معنی اور دوسرا بے معنی ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

زمیں بدلی فلک بدلا مذاقِ زندگی بدلا
تمدّن کے قدیم اقدار بدلے، آدمی بدلا

زندگی اور آدمی کی یے کی نوعیت الگ الگ ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔ ایک اور شعر پڑھیے جس میں ایطا نہیں ہے۔

ہم سخن پر دروں سے ڈرتے ہیں
ورنہ کھوٹے کھروں سے ڈرتے ہیں

(شاد عارفی)

(ج) اگر کلمہء آخر متحد المعنی یا مشترک علامت کو نکال دینے پر دونوں الفاظ بے معنی رہ جاتے ہوں خواہ مقفیٰ ہوں نہ ہوں تو ایطا نہیں ہے۔ مثلاً لنگا اور پلا۔ اس میں علامتِ مشترک الف ہے لنگ اور پل باقی بچتے ہیں۔ دونوں بے معنی ہیں۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

اپنا جلوہ جو دکھایا نہ دکھایا ہوتا
شربتِ دید پلایا نہ پلایا ہوتا

(خود ساختہ)

(۳) ایطا عام طور پر اُن مرکب یا دو ٹکڑوں والے

---

[1] شکاری پرندہ [2] کھلے (کھلنا) [3] کھیلنے والا (کھلاڑی) [4] رکنا

قوافی میں ہوتا ہے، جن میں مشترک علامت کی نوعیت یکساں
ہوتی ہے۔ یا یہ الفاظ اردو کے ہوتے ہیں یا فارسی و عربی کے
ہوتے ہیں۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا
جا سکتا ہے کہ

(الف) اگر کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک
بہ نوعیتِ واحد نہ ہو تو ایطا نہیں ہے۔ مثلاً آدمی اور
دوستی۔ دونوں میں ی علامتِ مشترک ہے، مگر اس ی کی
نوعیت یکساں نہیں ہے۔ آدمی (آدم + ی) میں ی یائے
نسبتی ہے اور دوستی (دوست + ی) کی ی یائے مصدری ہے۔
ی کو نکالنے پر آدم اور دوست باقی بچتے ہیں۔ یہ دونوں
الفاظ بامعنی ہیں اور باہم متفق بھی نہیں ہیں۔ چونکہ دونوں
میں ی کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔
اسی طرح اگر قوافی میں ایک "ی" مصدری دوسری نسبتی،
ایک مصدری اور دوسری فاعلی، ایک نسبتی اور دوسری فاعلی
یعنی ان کی نوعیت یکساں نہ ہو بلکہ الگ الگ ہو تو ایسے
قوافی میں ایطا نہیں ہوتا۔ مثلاً

کہتا ہوں بلندی کو پستی، پستی کو بلندی کہتا ہوں
جب الٹی گنگا بہتی ہے، میں الٹی سیدھی کہتا ہوں

(رشاد عارفی)

(ب) اگر دونوں قوافی اردو کے ہوں یا دونوں عربی
و فارسی کے ہوں تو ایطا وارد ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں
مشترک علامت کی نوعیت بھی واحد ہو جاتی ہے، یا کم از کم
الفاظ ایک ہی ٹکسال کے ہوتے ہیں۔ اگر قوافی میں ایک لفظ
ہندی/اردو کا اور دوسرا عربی و فارسی کا ہو تو ایطا نہیں
ہوتا۔ سرکشی اور لگی۔ ان دونوں قوافی میں ایک فارسی کا
اور دوسرا اردو کا ہے۔ ی نکالنے پر سرکش اور لگ باقی
بچتے ہیں۔ ان میں ایطا نہیں ہے۔

وہ پھول جس نے گزرتی بہار دیکھی ہے
ہمارے ساتھ کچھ ایسی ہی بدنصیبی ہے

(رشاد عارفی)

"دیکھی" اردو اور "بدنصیبی" فارسی ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

(ج) اگر کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک حرفِ
روی ہے۔ تو مطلع کے قوافی میں ایک روی اصلی اور
دوسرا حرفِ روی اضافی ہو تو ایطا نہیں ہوتا۔ مثلاً سنا
اور جا قوافی۔ سنا میں الف روی اضافی اور جا کا الف
اصلی ہے اسی طرح بےخودی اور بندگی میں اور خودسری نیز
کلی میں بالترتیب یائے اضافی اور اصلی ہے۔ اس لئے ایطا
نہیں ہے۔

کب خس و خاشاک میں بجلی چھپی رہتی نہیں
ورنہ ہر شاخِ نشیمن کیوں ہری رہتی نہیں

(رشاد عارفی)

چھپی (چھپ + ی) میں ی اضافی اور ہری میں ی اصلی
ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

(د) اگر کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک
میں ایک جگہ الف اصلی ہو اور دوسرے قافیہ میں وصلی ہو
تو ایطا نہیں ہے۔ مثلاً پایا اور بنایا میں ایطا نہیں ہے۔

مائل دید کسی گل کا جو پایا مجھ کو
شکلِ نرگس، ہمہ تن چشم بنایا مجھ کو

(نا معلوم)

پایا اور بنایا میں یا علامتِ مشترک ہے۔ بنایا کا الف
تعدیہ ہے (بنا متعدی فعل ہے) جو الگ کیا جا سکتا ہے۔
لیکن پایا، الف جدا نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی نوعیت
جداگانہ ہے اس لئے ایطا نہیں ہے۔

(ہ) اگر کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک
میں دونوں قوافی میں حرفِ روی امر ہو یا دونوں میں
حرفِ روی ماضی ہو تو ایطا وارد ہوگا۔ اگر مطلع کے ایک
قافیہ میں حرفِ روی امر اور دوسرے میں ماضی ہو تو
ایطا نہ ہوگا۔ مثلاً

میں نے کہا ہاتھ مت لگا مجھ کو
اس نے اک داغِ دل دیا مجھ کو

اس شعر میں لگا امر ہے اور دیا ماضی متعدی ہے۔ اس میں
تکرار معنی نہیں ہے۔ یعنی علامتِ مشترک الف کی نوعیت

واحد یا یکساں نہیں ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

(و) اگر کلمۂ آخر متحد المعنی یا علامتِ مشترک ایسے قوافی میں ہے، جن میں روی اضافی ہو اور روی اضافی بنانے کے لئے ایک یا کئی حرف بڑھائے گئے ہوں تو اگر وہ ایک ہی قسم کے ہوں تو ایطا ہے۔ اگر ان کی نوعیت الگ الگ ہے تو ایطا نہیں ہے۔ مثلاً ایران اور حیبان میں الف نون جمع کا ہے، نوعیت ایک ہے۔ اس لئے ایطا ہے۔ لیکن آدمی اور دوستی کی یے بالترتیب نسبتی اور مصدری ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔ مثلاً

وہی روشن بتانِ کو بہ کو سے دوستی کی ہے
کٹی ہوتی پتنگ جو بھی لوٹ لے، اُسی کی ہے
(شاد عارفی)

دوستی اور اُسی کی یے کی نوعیت الگ الگ ہے۔ اس لئے ایطا نہیں ہے۔

اس تجزیے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ

(۱) ہیئت کے دوسرے عناصر کی طرح قافیہ بھی جمالیاتی تجربے کا خارجی یا لسانی اظہار ہوتا ہے۔ اس سے شعر میں حسن غنائیت اور معنویت کا اضافہ ہوتا ہے۔

(۲) انگریزی میں قوافی کی بنیاد صوتیات پر ہے۔ اور نظام قوافی زیادہ لچک دار ہے۔ اردو میں قافیہ کا انحصار حروف وحرکات پر ہے۔ اس لئے اردو میں نظامِ قوافی سائنٹفک ہے۔

(۳) ایطا قافیہ کا ایک خاص عیب ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایطائے جلی اور ایطائے خفی۔ لیکن اس میں استثنائی صورتیں بھی ملتی ہیں۔

اس تجزیے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ بعض شعراء قافیہ کے اصول سے لاعلمی کی بنا پر یا جان بوجھ کر انحراف کرتے ہیں جس سے ہیئت کا حسن مجروح ہوتا ہے۔ غزل کی جمالیات میں زبان کی صحت، قواعد کی پابندی اور اصولِ بحر و قوافی کا التزام ضروری ہے۔ جب تک اردو میں قافیہ کا چلن باقی ہے۔ اس وقت تک ایطا جیسے عیب سے اجتناب کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر کے۔ کے۔ رشی

غزل

کتنے گذرے کتنے باقی ہیں انھیں ہرگز نہ گن
بے نیازانہ گذارو زندگی کے چار دن

بانٹئے خوشیاں اگر خوشیاں مقدر میں ملیں
کیا خبر کب وقت لے کروٹ تو یہ سب جائیں چھن

ایک کونپل پھوٹتی یا پھر چٹکتی اک کلی
فصلِ گُل ہی تو ہے آخر اُس کی کم عُمری کا سِن

دل کی محفل میں یہ بے کھٹکے چلا آیا ہے کون
کون ہو سکتا ہے اتنا بے تکلف تیرے بن

یوں بجز اُس کے رشی کس کو تھی تابِ یک نفس
یاد ہی سے اُس کی کٹ جاتے ہیں اپنے رات دن

ھر ایک خبر بذاتِ خود ایک افسانہ یا افسانچہ کی تمام خصوصیات اور خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ہم یہاں خبروں کی جس کہانی کا ذکر کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ خبر کیسے بنی یا اُسے کس طرح حاصل کیا گیا۔ کئی خبریں تو آسانی سے مِلتی نہیں اور ملتی بھی ہیں، لیکن اُن کا شمار اکثر روزمرہ کی یا غیر اہم خبروں میں ہوتا ہے۔ یہاں ہم ایسی خبروں کی کہانی بیان کر رہے ہیں جو سنسنی خیز اور تہلکہ مچا دینے والی ہوتی ہیں۔ یا تاریخ کا رُخ ہی پلٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ لیکن ایسی خبروں کو حاصل کرنے کے لئے نامہ نگاروں کو جو تگ و دُو کرنی پڑتی ہے اُس میں وہی صحافی یا جرنلسٹ کامیاب ہوگا جو محنت سے جی نہیں چُراتا اور جب اُسے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ یا وسیلہ دکھائی نہیں دیتا تو وہ اپنی عقلِ سلیم اور خود اعتمادی سے کام لیتا ہے۔ یہاں ہم ایسی (۲) خبروں کو حاصل کرنے کی روئداد بیان کریں گے۔ جو اپنے نفسِ مضمون اور پس منظر کے لحاظ سے تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں خبروں کو سب سے پہلے حاصل کرنے اور شائع کرنے کی کوششوں میں اپنے ہمعصر رفقاءِ کار میں سب سے آگے دو ایسے پریس رپورٹر رہے جو صحافت کے کام میں والہانہ لگن اور ناقابلِ تسخیر عزم لے کر چلے تھے۔

یہ خبریں تھیں۔ (۱) امریکہ سے یعنی آج سے ۲۳ برس پہلے ۱۹۶۳ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ (U.S.A) کے صدر مسٹر کینیڈی کا قتل۔ دوسری خبر کا تعلق تھا ہمارے ہی دیش ہندوستان سے۔ جب ۱۹۳۱ء میں گاندھی اروِن سمجھوتہ ہوا تھا۔

ان دونوں خبروں کو سب سے پہلے حاصل کرنیوالے اخبار نویسوں کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ جب انھوں نے محسوس کیا کہ حالات غیر معمولی طور پر اُلجھے ہوئے ہیں اور خبر حاصل کرنے کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں تو اُنھوں نے تمام پُرانے اور روایتی طریقہ ہائے کار کو خیرباد کہہ کر اپنی سوجھ بوجھ اور فیصلہ کرنے کی قوّت سے کام لیا اور خود اعتمادی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

امریکی صدر جان ایف کینیڈی کے قتل (۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء) کی خبر کو ہی لیجئے۔ اُس زمانے میں یہ سب سے بڑی سنسنی خیز خبروں میں مانی گئی۔ قابلِ غور یہ امر ہے کہ جب یہ المناک سانحہ ہوا تو اس کی تمام تفاصیل اکٹھی کر لینے کے لئے نامہ نگاروں کو کوئی بھی سہولت میسّر نہیں تھی۔ برعکس اس کے قدم قدم پر اُنھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی کہ کوئی بھی سرکاری ترجمان اختیار اور ذمّہ داری کے ساتھ کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ کینیڈی صاحب کو اس وقت قاتلانہ حملہ کا نشانہ بنایا گیا جب، اُن کی کار دوسری

گاڑیوں کے ایک جلوس میں ایک جسم غیظ سے گھری ہوئی روزِ روشن
میں چلی جارہی تھی۔ جیسے ہی گولی چلی، چاروں طرف بھگدڑ
مچ گئی اور سارے انتظام درہم برہم ہو گئے۔ ان حالات
میں سرکاری یا غیر سرکاری ذرائع میں سے کوئی بھی اپنے
اوپر یہ ذمہ داری لینے کو تیار نہیں تھا کہ اخبار نویسوں کو
بتائے کہ قاتلانہ حملہ کے بعد صدر کینیڈی کی حالت کیسی ہے۔

سب سے پہلے اخبار نیویارک ٹائمز کے رپورٹر ٹم
وِکر (TIM WICKER) نے یہ خبر دنیا کو دی کہ
صدر کینیڈی گولی لگنے کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے۔ وکر صاحب
صدر کینیڈی کے ساتھ دورہ کر رہی پریس پارٹی کے ایک
رکن تھے۔ خوف، افراتفری اور ہیجان انگیز ماحول میں کام
کرتے ہوئے وکر صاحب نے یہ خبر کیسے حاصل کی یہ بھی ایک
دلچسپ کہانی ہے۔

کاروں کے جلوس میں جس گاڑی میں پریس کے
نمائندے سفر کر رہے تھے وہ صدر کینیڈی کی کار کے پیچھے
دس نمبر پر تھی۔ اس لئے یہ لوگ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ جلوس
کے اگلے حصہ میں کیا ہو رہا ہے۔ اچانک صدر محترم کی موٹر
جلوس سے الگ ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ کسی اور طرف بھاگتی
دیکھی گئی۔ جلوس میں کچھ بدانتظامی سی پھیل گئی۔ تاہم پریس
والوں نے اس واقعہ پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ جہاں
صدر کینیڈی کو پہنچنا تھا وہ جگہ اس مقام سے دور نہیں
تھی۔ چند ہی لمحوں میں پریس پارٹی وہاں پہنچ گئی جہاں
کسی تقریب میں صدر کینیڈی کے شامل ہونے کا پروگرام تھا۔
وہاں جا کر نامہ نگاروں کو پتہ چلا کہ کینیڈی صاحب پر
گولی چلائی گئی ہے۔ سینکڑوں کی حاضری میں جو لوگ
صدر محترم کے استقبال کے لئے ایک مشہور ہوٹل میں
جمع تھے یہی چرچا کر رہے تھے کہ قاتلانہ حملہ کرنے والے
کون لوگ ہیں اور یہ کہ صدر ممدوح کی حالت کیسی ہے
اور کیا ان کی زندگی بچ جائے گی۔ وکر صاحب رقمطراز
ہیں۔

میں نے دیکھا ایک خاتون صحافی حواس باختہ
چلا رہی تھی کہ صدر کینیڈی کو نازک حالت میں ہسپتال
لے جایا گیا ہے۔ اس مرحلہ پر میں نے نامہ نگاری کے
فن میں ایک نئی بات سیکھی۔ اور وہ یہ کہ اخبار
نویس کو اپنی عقلِ سلیم پر وشواس کرتے ہوئے
جو ترغیب اس کے دل و دماغ کو حاصل ہو اس پر
عمل کرنا چاہیئے، خاص کر ان حالات میں جب اُسے
کوئی دوسرا راستہ نہ دکھائی دے۔ یہ بات نہیں کہ
اس سے پہلے مجھے اس حقیقت کا مطلقاً احساس نہیں
تھا، کم و بیش میں اس نکتہ کے وزن و اہمیت کو تسلیم کرتا
تھا۔ لیکن اس خاص موقع پر یہ راز میرے ذہن میں بالکل
صاف ہو گیا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ محض انتظار کرنے
میں تاکہ کوئی اور تدبیر سامنے آئے وقت ضائع ہو جاتا
ہے اور خبر اخبار نویس لے اُڑتے ہیں اور اس کا
مطلب ہے رقیبوں سے مات کھانا کیونکہ صحافت میں
بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح پیشہ ورانہ مقابلہ
بہت بے رحمی سے ہوتا ہے۔ پریذیڈنٹ کینیڈی کے
پریس سکریٹری نے جرنلسٹوں سے صرف اتنا ہی کہا
تھا کہ صدر ممدوح کی حالت تشویشناک ہے۔ سرکاری
محکمہ اطلاعات کے اس افسر کی سراسیمگی اور گھبرائے
ہوئے لب و لہجہ سے ظاہر تھا کہ وہ بہت ہی زبردست
دباؤ کے نیچے کام کر رہے ہیں۔

ٹم وِکر (TIM WICKER) نے یہ بھی
دیکھا تھا کہ جب کینیڈی صاحب کی گاڑی ہسپتال کی
ڈیوڑھی میں پہنچی تو یہی دکھائی دیتا تھا کہ ان کی روح
قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ ٹم وِکر لکھتے ہیں
"میں نے اپنی اندرونی آواز پر اعتبار کرنا ہی
مناسب سمجھا۔ میں نے سرکاری ایجنسی کی طرف سے دی
گئی خبر سے کچھ آگے لکھنے اور سوچنے کا فیصلہ کیا۔ اس
وقت کسی بھی پریس رپورٹر کے لئے ممکن نہیں تھا کہ

ہر سنی سنائی خبر کی جانچ پڑتال شروع کرے۔ ہم تو یہی
کر سکتے تھے کہ دیکھیں ہم تک جو خبر پہنچی ہے۔ اس کا
ماخذ کہاں تک قابلِ اعتبار ہے۔ عام لوگوں میں کس طرح
کی چرچا چل رہی ہے۔ جب کسی بھی مسئلہ پر دو یا اس
سے زیادہ زاویہ ہائے نگاہ سے بحث ہو رہی ہو تو اُس
میں سکڑوسس حقیقت کیا ہے اور کہاں چھپی ہوتی ہے،
ان باتوں کا فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہوتا ہے اور
قدرتی بات ہے اس فیصلہ کی یا اس کے نتائج کی ذمہ داری
بھی ہماری ہوتی ہے۔ چنانچہ سٹم ورکر بغیر کسی سرکاری
اعلان کا انتظار کئے سب سے پہلے پریذیڈنٹ کینیڈی
کی وفات کی خبر بھیجنے کے لئے تار گھر پہنچ گئے۔ اس
بھاگ دوڑ میں وہ اپنے ساتھ والی پنسل اور نوٹ بک
بھی کہیں گرا بیٹھے۔ تاہم تار گھر والوں سے کاغذ اور
قلم مانگ کر انھوں نے اس خبر کو پھر سے لکھا اور بذریعہ
تار اپنے اخبار کو بھیج دیا۔

اس سلسلہ میں ہم ایک دوسری خبر کا ذکر کر رہے
ہیں۔ یہ خبر آج سے ۴۵ برس پہلے یعنی ۱۹۳۱ء کی ہے جب
گاندھی ارون سمجھوتہ ہوا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی
کی تحریک کے بعد لارڈ ارون (اس زمانہ میں ہندوستان
کے وائسرائے) اور گاندھی جی کے درمیان طویل گفت و
شنید کے بعد جو فیصلہ ہوا اُسے تاریخ میں گاندھی ارون
سمجھوتہ کا نام دیا گیا ہے اس سمجھوتہ کی خبر کو سب سے
پہلے حاصل کرنے میں ایک کہنہ مشق اور ممتاز اخبار
نویس لالہ درگا داس (جو مشہور انگریزی اخبار
روزانہ ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر بھی رہے) نے
دوسرے ہندوستانی اور غیر ملکی صحافیوں کے مقابلہ
میں جو کامیابی حاصل کی اس کی روئداد بھی از خود نو وارد
صحافیوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

گاندھی ارون سمجھوتہ کی خبر پر نہ صرف ہندوستانی
بلکہ دوسرے ملکوں کے اخباروں کی بھی نظریں لگی ہوئی
تھیں۔ اس لئے ہندوستانی اور غیر ملکی نامہ نگاروں
میں ایک لحاظ سے مقابلہ چل رہا تھا کہ سب سے پہلے
اس خبر کو کون حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ دن تھے جب
نامہ نگاروں کو خبریں اکٹھی کرنے کے لئے باقاعدہ
سہولیتیں دینے کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا،
کیونکہ پبلک ریلیشنز یا محکمہ تعلقات عامہ کی جو
شکل آج کل ہم دیکھتے ہیں ان دنوں کسی کے تصور
میں بھی نہیں تھی۔ ہر ایک نامہ نگار کو خود ہی اپنے
لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ یا ذریعہ تلاش کرنا پڑتا تھا
لالہ درگا داس نے اس خبر کو کیسے دبوچا یہ بھی ایک
دلچسپ کہانی ہے اور اس لئے بھی قابلِ غور ہے کیونکہ
یہ ایک حقیقی اور سچا افسانہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ خبر کو اکٹھی کرنے کے لئے دن اور رات یعنی ہر وقت
ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ مطلوبہ خبر
اچانک اور غیر متوقع وقت اور مقام پر کہیں نہ کہیں
سے ٹپک پڑتی ہے۔ لالہ درگا داس اُن دنوں میں اے
پی۔آئی (API) (ایسوسی ایٹیڈ پریس) نیوز
ایجنسی (آج کل اس کا نام پریس ٹرسٹ آف انڈیا
PTI ہے) میں کام کرتے تھے۔ آپ کی ڈیوٹی
وائسریگل لاج (آج کل کا راشٹرپتی بھون) پر لگی ہوئی
تھی۔ آپ کے دو ساتھی سر اُوشا ناتھ سین اور اے۔
ایس آئینگر (A.S. AYENGAR) بالترتیب
ڈاکٹر انصاری اور سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کی
جائے رہائش پر تعینات تھے۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی
پر مہاتما گاندھی کا قیام تھا اور سر تیج بہادر سپرو
اور مسٹر جیکر انگریزی سرکار اور مہاتما گاندھی کے
بیچ بات چیت کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ لالہ درگا داس
اور ان کے دو ساتھی جو رپورٹیں اپنی نیوز ایجنسی کے
دفتر میں بھیجتے انکو اے پی آئی (API) کے چیف
ایڈیٹر کے سی رائے ترتیب دیکر آخری شکل دیتے تھے

اور پھر خبر ریلیز ہوتی تھی - لالہ درگاداس لکھتے ہیں:

بات چیت کے پہلے دو تین دن تو بڑی گہما گہمی رہی۔ لیکن جیسے ہی یہ سلسلہ کچھ لمبا ہوتا چلا گیا تو قدرتی طور پر لوگوں کی دلچسپی اس خبر میں کم ہوگئی - رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی تھی کہ ہم گھنٹوں وائسریگل لاج میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا، لیکن ہاتھ پلّے کچھ بھی نہ پڑتا - لالہ درگا داس نے ہمت نہ ہاری - اُنھوں نے گاندھی جی اور وائسرائے کی ملاقاتوں سے تعلق رکھنے والی دلچسپ جھلکیاں (

اپنی نیوز ایجنسی کی طرف سے پریس میں ریلیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں لالہ درگاداس کو غیر ملکی پریس رپورٹروں پر واضح فوقیت حاصل تھی کیونکہ آپ ہندی میں وائسریگل لاج کے ملازمین) اور خدمت گاروں کے ساتھ بات چیت کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کی ڈیوٹی وائسرائے اور گاندھی جی کی ملاقات والے کمرے پر ہوتی تھی گاندھی جی اور وائسرائے آپس میں کس طرح ملتے تھے، سلام دعا کرتے تھے، ماحول میں کشیدگی ہوتی تھی یا دوستی۔ تناؤ تھا یا گرمجوشی، آپ اپنے ذرائع سے ان سب باتوں کا پتہ لے کر خبر بناتے تھے کہ لارڈ اِروِن کا رویّہ کیسا ہے۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ ہے یا پشیمانی - یا اُن کی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ ملاقات کے دوران دونوں اکابرین نے کئی بار آپس میں ہنسی مذاق بھی کیا۔ وائسرائے کے سامنے ہی میرا بہن نے گاندھی جی کے لیے اُن کا سادہ اور مختصر سا کھانا پروسا - وغیرہ وغیرہ - لالہ درگاداس کی طرف سے بھیجی گئی اس طرح کی چھوٹی چھوٹی لیکن دلچسپ جھلکیاں اخباروں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ غیر ملکی جرنلسٹ آپ کا لوہا مان گئے - کیونکہ گھنٹوں تک وائسریگل لاج کے برآمدوں میں بیکار گھومنا، یا چپڑاسیوں اور خدمت گاروں سے سر کھپانا اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس طرح کئی دن بیت گئے - اور پھر واقعہ یوں ہوا - ان دنوں لالہ درگاداس بہت تھکے ہوئے تھے اور وہ دن بھر کھانا بھی نہیں کھا سکے تھے - اچانک اُن کی ملاقات وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک ممبر سے ہوگئی۔ اُس نے صرف انھیں اتنا ہی اشارہ دیا کہ کچھ دیر کے بعد انھیں وہ خبر مل جائے گی جس کی تلاش میں آپ کو اتنے دن پریشان ہونا پڑا۔ یہ بات سُن کر لالہ درگاداس فوراً وہاں پہنچے جہاں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی میٹنگ ہونے والی تھی - یکے بعد دیگرے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی آپہنچے - میٹنگ شروع ہوئی اور تین گھنٹے تک ہوتی رہی۔ یہ وقت بھی انتظار میں گزر گیا۔ میٹنگ کے خاتمہ پر سب ممبران اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر چل دیئے لالہ درگاداس بھی بھوک اور تھکاوٹ سے پریشان ہو رہے تھے اور اپنے گھر جانے کو تیار ہی ہوئے تھے کہ رات کے دس بجے کے قریب گاندھی جی کی کار وائسرائے کے خاص دفتر کے سامنے رُکی - اور مہاتما جی اور وائسرائے کی بات چیت پھر سے شروع ہوگئی - لالہ درگاداس کے الفاظ میں "انتظار کی گھڑیاں پھر شروع ہوگئیں - وائسریگل لاج کا وسیع اور عریض صحن بالکل خاموش اور سنسان تھا۔ آدھی رات کی خاموشی میں انگریزی سنتریوں کے بھاری بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی تھی - میں نے دیکھا کہ گاندھی جی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے ہیں اور وائسرائے صاحب اُنھیں سہارا دیتے ہوئے ہیں اور دونوں اکابر مسکرا رہے تھے - میں نے یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ لگایا کہ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ضرور ہوگیا ہے - جب لارڈ اروِن نے گاندھی جی کو شب بخیر کہا تو میں فوراً ہی کار کی دوسری طرف سے مہاتما جی کے پاس جا پہنچا اور ہمت کرکے میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا -

"باپو جی - سمجھوتے کے بارے میں آپ کوئی بیان پریس کے لئے دینا پسند کریں گے؟" رات کے اندھیرے میں شاید مجھے گاندھی جی نے پہچانا نہیں - یا شاید مجھے بھی وائسریگل لاج کے اسٹاف کا آدمی سمجھا - انھوں نے یہی کہا "وائسرائے کے سکریٹری سے بات کیجئے" یہ مہاتما گاندھی کو نمسکار کرکے میں وائسرائے جہاں اُنھیں الوداع کہنے کے لئے کھڑے تھے وہاں چلا گیا - وہ بھی

اپنے دفتر کے راستہ میں ہی تھے۔ مجھے اتنی رات گئے وہاں کھڑا دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوئے اور پھر کچھ ناراض بھی۔ لیکن میں نے خود اعتمادی سے کام لیا اور اُن سے سوال کیا "جنابِ والا سمجھوتہ کے بارے میں اخباروں کے لئے سرکاری بیان کیا آپ آج رات شائع کرنے کا حکم دیں گے۔" اس پر پہلے تو اُن کی تیوری سی چڑھ گئی۔ پھر وہ مسکرائے۔ اور بولے "آپ کو سرکاری اعلان تو کل ہی ملے گا۔"

دوسرے اخبار نویس تو بہت پہلے سے میدان چھوڑ چکے تھے۔ اور رات کی نیند کا لطف لے رہے تھے۔ لیکن لالہ درگا داس تو ڈیوٹی پر تھے اس طرح انھوں نے میدان سر کر لیا۔ سرکاری اعلان شائع ہونے کے قبل ہی مطلوبہ خبر اُن کے قبضہ میں تھی۔ آپ نے فوراً ہی تار گھر کا رُخ اختیار کیا۔ وہاں سے لنڈن (REUTER) کو یہ فلیش (کسی اہم اور غیر متوقع خبر کو منظر عام پر لانے کے لئے پہلا مختصر اور برق رفتار اشارہ) بھیجا کہ لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں یہ خبر لنڈن، نیو یارک۔ اور دوسرے اخباری مراکز میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد سرکاری اعلان آیا۔ لیکن خصوصی خبر حاصل کرنے کی سعادت، عزت اور ناموری لالہ درگا داس کی ہی قسمت میں تھی۔

ہیرانند سوز

کُرّۂ ارض کہ تھا
سب کے لئے جائے اماں
اس کی زرخیز زمیں
اس کے دریاؤں میں بہتا ہوا شیریں پانی
دور تک پھیلے ہوئے اس کے فلک بوس پہاڑ
اُن پہاڑوں کی بلندی سے اُترتے بادل
اور دامن میں ثمردار درختوں کے گھنیرے جنگل
وقف تھے خدمتِ انساں کے لئے
کھیت تھے۔ گھر تھے۔ مویشی تھے۔ چراگاہیں تھیں
مل ہی جاتا تھا ضرورت کے مطابق سب کو
ملکیت کیا ہے کسی نے کبھی سوچا ہی نہ تھا
جانے کب جاگ اُٹھا ذہن میں قبضے کا خیال
جانے کب بن گئے دھرتی پہ حدوں کے نقشے
جانے کب کس نے تسلط کی لکیریں کھینچیں
نوکِ شمشیر نے کب مُلک ابھارے اس میں
آج جب ساری زمیں پہلے ہی
اپنے چہرے کی خراشوں پہ ہے فریاد کناں
ہوسِ ملک! یہاں اور لکیریں مت کھینچ
امنِ عالم کو تعصب کی اذیت سے بچا
نسلِ انساں کو محبت کا امیں رہنے دے

افضال ملک
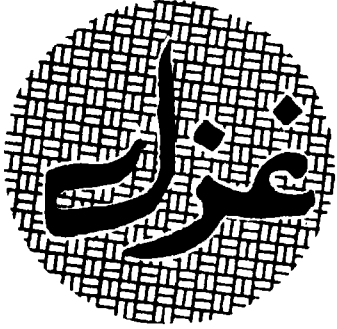
یوں پرانے دوستوں میں جنگ کروائی گئی
ایک ہی لمحے میں برسوں کی شناسائی گئی

دید کی حسرت مٹی، دل کی شکیبائی گئی
"میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی"

عشق کی خوشبو حدوں میں قید کرتا بھی تو کون؟
اس زمیں سے آسماں تک اپنی رسوائی گئی

میں اناالحق کہہ رہا ہوں زہر سے محروم ہوں
اہلِ حق کی وہ رہ و رسمِ پذیرائی گئی

میں اکیلا تھا مگر پھر بھی اکیلا پن نہ تھا
کہ جہاں پہنچا مرے ہمراہ تنہائی گئی

تیمور دریافہ

سعد کاوش

ساز کے تاروں سے نکلا ہوا نغمہ لکھوں
یا تجھے حسن کا بہتا ہوا دریا لکھوں

یہ الگ بات ہے سقراط نہیں ہوں لیکن
تیرے ہر لفظ کو اک زہر کا پیالا لکھوں

مجھ سے بڑھ کر مرے اوصاف سے واقف ہے کون
کیوں نہ پھر آپ ہی میں اپنا قصیدا لکھوں

تجھ سے ہے میرا وجود اور تجھی سے ہے نمود
زندگی تو ہی بتا اور تجھے کیا لکھوں

تیرا کاوش ہوں مجھے بخش دے یارب توفیق
شہر کو شہر تو صحرا کو میں صحرا لکھوں

محسن خاں

میں چلم لے کر رسوئی گھر کی طرف جا رہا تھا کہ بھوجی نے لرزتی ہوئی آواز سے مجھے پکارا "منگلو چاچا!"

میں سیدھا بھوجی کی طرف چل دیا۔ بھوجی کراہتی ہوئی بمشکل اٹھیں اور تکیہ ہٹا کر ہولے ہولے کچھ تلاش کرنے لگیں۔ اس وقت بھوجی کی بانہیں کھل گئی تھیں۔ پیلی پیلی موم جیسی بانہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کسی نے ان کے جسم سے خون نچوڑ کر ہلدی مل دی ہو۔ بانہوں کی طرح ان کا چہرہ بھی سُتا ہوا تھا۔ آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں اور پیشانی کسی پرانی قبر کا کتبہ معلوم ہو رہی تھی۔ بھوجی نے تکیہ ہٹا کر ایک لفافہ نکالا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میری طرف بڑھاتے ہوئے نحیف آواز میں بولیں "چاچا! اس لفافے پر ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دیجئے گا اور اگر وقت ملے تو دوا بھی لیتے آیئے گا۔"

بھوجی کے دوسرے ہاتھ میں ایک بے رنگ کاغذ لرز رہا تھا۔ ایک کاغذ — جس پر کتنی ہی راتوں کی نیند رقم تھی اور نہ جانے کتنے لمحوں کا سکون لکھا تھا۔ اس بے جان کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی تحریریں کتنی بے معنی لگتی ہیں لیکن جب ان کے معنی کھلتے ہیں تو زندگی کا سمندر ایک دم شانت ہو جاتا ہے اور کبھی شدت سے مچل اٹھتا ہے۔ میں جب بھی اس کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھتا ہوں میرا اندر درد سے بھر جاتا ہے اور میں دیر تک جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔

میں نے کاغذ کے ٹکڑے کو لفافے کے ساتھ بنڈی کی جیب میں رکھ لیا اور رسوئی گھر کی طرف چل دیا۔

رسوئی گھر پہنچ کر جب میں چلم میں آگ بھرنے لگا تو اچانک مجھے محسوس ہوا — یہ بابوجی کی چلم نہیں، بھوجی کی زندگی ہے۔ جلتی سلگتی زندگی۔ بھوجی جب سے اس گھر میں آئی ہیں ان کی معصوم زندگی اذیت ناک حادثوں اور بپھرے طوفانوں کی نذر ہو گئی ہے۔ ان کے ماتا پتا نے کتنے ارمانوں سے اپنی اکلوتی اور چہیتی بیٹی کو اپنے سے جدا کیا ہوگا مگر انھیں کیا معلوم کہ انھوں نے اپنی بیٹی کو سسرال نہیں نرک بھیجا ہے جہاں وہ ہر روز ایک نئی آگ میں جھونکی جاتی ہے۔ بھوجی ایک غریب باپ کی خوددار بیٹی ہیں۔ انھوں نے اس آگ میں جلتے ہوئے بھی اُف نہیں کی۔ انھوں نے خود کو بہت خاموشی کے ساتھ سسرال والوں کی جلائی ہوئی آگ میں جلنے دیا ہے۔ پہلے زمانے میں جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا تھا تو اس کی لاش کے ساتھ بیوی بھی جل جایا کرتی تھی ایسی عورت کو ستی کہا جاتا تھا مگر بھوجی کے شوہر زندہ ہیں اور وہ انھیں کی جلائی ہوئی آگ میں

جل رہی ہیں۔۔ وہ روز جلتی ہیں اور روز ستی ہوتی ہیں۔ کتنی عظیم ہیں بھوجی۔ مگر ان کی اس عظمت سے کون واقف ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ بھوجی ہر روز بہت خاموشی کے ساتھ ستی ہوتی ہیں۔

سُنیل بابو دہلی میں رہتے ہیں۔ وہ کسی کمپنی میں افسر ہیں۔ ان کے پاس کیا نہیں ہے۔ اپنا محل جیسا مکان، خاصی تنخواہ، بینک بیلنس۔ مگر یہ سب جسم کی آسائش کے لئے ہے رُوح کی آسائش کے لئے تو کچھ بھی نہیں ہے ان کے پاس۔ سُنیل بابو، جو بظاہر ایک مکمل انسان نظر آتے ہیں اندر سے کتنے اُدھورے اور مختلف ہیں۔ ایک اسکوٹر کی ہوس نے انھیں کس قدر بدل دیا ہے۔ جب کوئی انسان اپنے اندر ہوس کا ناگ پال لیتا ہے تو یہ ناگ اسے بہت خاموشی کے ساتھ زہر آلود کرتا رہتا ہے اور توانا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن انسان خود ناگ کا روپ دھارن کر لیتا ہے، ایک ایسے ناگ کا روپ جو اپنے اطراف کے تمام لوگوں کو زہر آلود کر دیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ہر شخص ناگ بن جاتا ہے اور پورا معاشرہ زہر آلود ہو جاتا ہے۔ سُنیل بابو بھی اسی معاشرے کے انتہائی خوفناک اور خبیث فرد ہیں۔ کم سے کم میری نظر میں سُنیل بابو اب وہ پہلے سے سُنیل بابو نہیں رہے۔ پہلے وہ مجھے اپنے بیٹے سمان لگتے تھے۔ جب وہ دہلی سے آتے تھے تو مجھے توانائی کا احساس ہوتا تھا مگر اب وہ اپنے ساتھ عجیب سی مایوسی اور افسردگی لاتے ہیں۔ مجھے اپنی قوت زائل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جب سُنیل بابو بھوجی کے دل پہ پیر رکھتے ہوئے بے نیازی کے ساتھ ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں تو بھوجی کی زار زار حالت اور اشک بار آنکھیں دیکھ کر میری آنکھوں میں خون کے آنسو بھر آتے ہیں۔ کتنا فرق محسوس کرنے لگا ہوں کل اور آج میں۔ کل میں سُنیل بابو سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ اُن کی غیر موجودگی میں خلا سا احساس ہوتا تھا۔ گھر سُونا سُونا لگتا تھا۔ کبھی کبھی سُنیل بابو تھک کر لیٹ جاتے تھے تو میں دیر تک ان کا سر دباتا رہتا تھا۔ مگر اب سُنیل بابو جس قدر بھی نڈھال اور تھکے ہوئے ہوں میں ان کے قریب نہیں جاتا جب تک کہ وہ خود نہیں بُلاتے۔

اب مجھے ان سے نفرت کے لئے ایک آڑ مل گئی ہے۔ وہی آڑ جس کے سبب میرے اندر ان کے لئے نفرت کا یہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس دن وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ "منگلو چاچا! اب تم مجھ سے زیادہ محبت نہیں کرتے؟" تو میں نے بڑی صفائی سے خود کو بچا لیا تھا۔ میں نے جواب میں کہا تھا "محبت کا سارا حق تو بھوجی نے چھین لیا ہے۔ مجھ سے" میرے اس جواب نے سُنیل بابو کے ہونٹوں میں قفل ڈال دیا تھا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا جیسے میں نے انھیں کوئی انتہائی کڑوی چیز کھلا دی ہو۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے۔ سنیل بابو کا گریبان پکڑ کر بھوجی کا حق مانگوں مگر یہ کیونکر ممکن ہے۔ میں ان کا نمک خوار، غلام۔ ان کی زندگی کے اتنے اہم مسئلے میں کیسے مخل ہو سکتا ہوں۔

اب تو بھوجی کی زندگی ایسے موڑ پہ آ گئی ہے جہاں انسانوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ بالکل تنہا ہیں جیسے کوئی کسی قافلے سے چھوٹ کر بیابان جنگل میں رہ جاتے۔ سُنیل بابو نے سب رشتے توڑ دیئے۔ محبت اور انسانیت کے تمام رشتے۔ اب وہ بھوجی سے بات بھی نہیں کرتے۔ ان کی قربت سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اکثر جب کبھی بھوجی ان کے سامنے آ جاتی ہیں تو سنیل بابو راستہ بدل کر آگے بڑھ جاتے ہیں جیسے وہ ان کی پتنی نہیں کوئی جنگلی بلّی ہوں اور سنیل بابو ایک توہم پرست انسان۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوتا بلکہ سنیل بابو کی آنکھوں سے تیر برسنے لگتے ہیں اور بھوجی ان کی نظروں کے زہر آلود تیروں سے گھائل ہو کر احساس کے لہو میں ڈوب جاتی ہیں۔ وہ جلدی سے آ کر بستر پہ گر جاتی ہیں اور چپکے چپکے گھلنے لگتی ہیں۔ ان کا سفید بستر جو بستر مرگ ہے۔

بھوجی کو ٹی بی ہو گئی ہے۔ ہاں ٹی بی۔ یہ بات بھوجی بھی بخوبی جانتی ہیں کیونکہ انھیں بار بار بتایا اور احساس دلایا گیا ہے۔ جب پہلی بار انھیں کھانسی کا دورہ پڑا اور ان کے حلق سے خون آیا تھا تبھی مالکن نے ڈنکے کی چوب پہ اعلان کر دیا تھا کہ بھوجی کو ٹی بی ہو گئی ہے اور پھر اس احساس نے بھوجی کو دن بہ دن کمزور اور لاغر کر دیا تھا۔ مگر اس کمزوری اور احساس

نیبو مربانہ

کی شدید آگ میں جلتے ہوئے بھی بہوجی کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی تندہی اور لگن کے ساتھ گھر کے کام کاج کرتی تھیں لیکن ادھر ایک ماہ سے وہ اس قدر ناتواں ہو گئی ہیں کہ کام کرتے کرتے ایک دم چکرا کر بستر کی طرف بھاگتی ہیں کہ یہی ان کی بنیاہ گاہ ہے اور یہی ان کے ارمانوں کا مدفن۔

اب بہوجی کی راتیں بہت ہیبت ناک اور ڈراؤنی ہو گئی ہیں۔ شام ہوتے ہی ان کے بستر میں کانٹے اُگ آتے ہیں اور تمام رات ان کے کمرے سے کھانسنے اور کراہنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ آج بھی مجھے بہوجی کی نیند کا سامان کرنا ہے۔ پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ بہوجی کس مرض کی دوا منگاتی ہیں لیکن جب اس دن میں نے دوا فروش سے پوچھا کہ یہ کس مرض کی دوا ہے تو اس نے بتایا کہ یہ نیند کی دوا ہے۔ اس دن مجھے کتنا دکھ ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا ساری گولیاں حلق میں اتار لوں اور ہمیشہ کیلئے......

مگر میرے اس اقدام سے بہوجی کی زندگی میں کون سی تبدیلی آجاتی۔ وہ اسی طرح حالات کی آگ میں جلتی رہتیں۔ اسی طرح خون تھوکتیں۔ رات گئے تک کھانستیں اور کراہتیں۔ ان کا ایک معمولی سا خدمت گذار بھی جاتا رہتا۔ میں بہوجی کی زیادہ خدمت تو نہیں کر پاتا، بس ان کے لئے نیند کی گولیاں لے آتا ہوں اور کبھی کبھی ان کے خط پوسٹ کر دیتا ہوں۔ جب ناؤ چھوٹ جاتی ہے تو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

اس دن بابوجی کے نام سُنیل بابو کا خط آیا تھا۔ بابوجی مالکن کو خط سنا رہے تھے۔ خط کے آخر میں سُنیل بابو نے بہوجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"اب ٹی بی کس اسٹیج پر ہے؟" اُف! میں تڑپ اٹھا تھا۔ سُنیل بابو کے اس جملے میں کتنا زہر تھا۔ کتنی نفرت تھی بہوجی کیلئے۔ اگر بہوجی یہ جملہ سُن لیتیں تو کتنا دکھ ہوتا انھیں۔ ان کے احساس کا سمندر کس شدت سے موجزن ہو اٹھتا۔ مگر نہیں، یہ تو ان کے تئیں ایک معمولی سی بات ہوتی۔ ان کے احساس کو کتنی ہی بار نفرتوں کی آگ دکھائی گئی ہے اور انھوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ سب کچھ برداشت کیا ہے۔ میں نے جواب میں بہوجی کی آنکھوں میں نفرت کا کوئی جذبہ نہیں پایا۔ وہ موم کی طرح گھل رہی ہیں۔ کسی آواز اور احتجاج کے بغیر۔

"منگلو! او منگلو؟" بابوجی نے بھاری آواز سے مجھے پکارا۔ میں چلم لے کر تیز تیز قدموں سے بابوجی کی طرف چل دیا۔

"اتنی دیر کہاں لگا دی؟" بابوجی نے میری بنڈی کی جیب میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بس ——— راکھ میں انگارے تلاش کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اور یہ لفافہ کیسا ہے؟" انھوں نے میری جیب میں رکھے ہوئے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بہوجی نے خط دیا ہے پوسٹ کرنے کو۔" میں نے بادلِ نخواستہ بتایا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا چھپاتا تو کہاں جاتا۔

"لاؤ۔ لاؤ۔ دیکھوں تو ذرا۔" انھوں نے نیتوری چڑھا کر لفافہ مانگا۔ میں یہ بھی نہ کر سکا کہ لفافہ انھیں نہ دیتا۔ کانپتا ہوا ہاتھ ان کی طرف بڑھ گیا۔

مالکن اس وقت برآمدے میں بیٹھی کپڑے سی رہی تھیں انھیں بھی علم ہو گیا جلدی سے اٹھیں اور قریب آکر بابوجی سے مخاطب ہوئیں "ہاں ذرا ایک بار اس کا پتر پڑھ کر بھی تو دیکھو کہ ڈائن چپکے چپکے اپنے کنجوس باپ کو کیا لکھتی رہتی ہے۔"

"میں کسی کا پتر نہیں پڑھا کرتا۔" بابوجی نے بُردباری کے ساتھ کہا اور خط کے ٹکڑے کر کے میری طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے "آئندہ تم اس نامراد کے کمرے میں قدم نہیں رکھو گے سمجھے۔"

اور خط کے ٹکڑے چلم میں ڈال کر لمبے لمبے کش لینے لگے۔ چلم سے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا یہ خط کے ٹکڑے نہیں بہوجی کی زندگی ہے جسے آگ کی نذر کر دیا گیا ہے۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بہت خاموشی کے ساتھ۔

تیمور بانی

اکتوبر ۸۵ء کی کہانیوں میں "سرو کے پیڑ" اور "کوئی ایک اپنا" نے متاثر کیا ان میں عصری مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مصوّر سبزواری کی نظم "پریہ درشنی" بھی بے حد پسند آئی انھوں نے اندراجی کو اپنے مخصوص انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ڈاکٹر مظفر حنفی کا مقالہ ظریفانہ شاعری آزاد ہندوستان میں، معلوماتی اور کارآمد ہے۔ **تسکین زیدی — کانپور**

اکتوبر ۸۵ء کا رسالہ انتہائی دیدہ زیب، مفید اور معیاری ہے۔ سرورق پر مہاتما گاندھی کی تصویر قارئین اور ناظرین دونوں کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرلیتی ہے۔ اور ڈاکٹر رزاق اثر صاحب کی نظم "مہاتما گاندھی" تو خوب ہے۔ خاص طور سے کرتار سنگھ دگل کا "شمع"، اور عشرت امیر کا "کوئی ایک اپنا" معیاری افسانے کہے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ، صغیر افراہیم کی تخلیقات بھی معیاری ہیں۔ مہدی صاحب کی غزل کا یہ شعر پسند آیا۔

آدمی ہوں میں خطا مجھ سے بھی ہو سکتی ہے
ڈھونڈھتے کیوں ہو صفت مجھ میں فرشتوں والی

ڈاکٹر ایس تشکیل احمد — ڈہری اون سون

اکتوبر ۱۹۸۵ء کے تعمیر میں صالحہ عابد حسین کی کہانی "ان چاہی لعنت"، پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ واقعی بزرگوں کے قول کے مطابق انسانیت ہی سب سے بڑا دھرم اور سب سے عظیم مذہب ہے۔ ایک اجنبی، بیمار اور قریب المرگ لڑکی کے لئے ایک دوسری لڑکی کا ایثار جو خود بھی اُس کے لئے اجنبی ہے۔ اس بات کی سچی غمازی کرتا ہے کہ جس کے اندر انسانیت نہیں وہ شخص درندوں سے بھی بدتر ہے۔ تمام تخلیقات معیاری ہیں۔ اس ہوش رُبا گرانی کے دور میں جبکہ چھوٹے چھوٹے جرائد و رسائل نے اپنی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے "تعمیر ہریانہ" محض پانچ روپے سالانہ کی حقیر رقم میں قارئین کے لئے اعلیٰ ادب پیش کرتا ہے اس بات پہ انگشت بدنداں ہوں۔

فراق جلال پوری فیض

اکتوبر ۸۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کا مضمون "ظریفانہ شاعری آزاد ہندوستان میں"، شائع ہوا ہے۔ جو بہت خوب ہے مگر ڈاکٹر صاحب موصوف سے ایک چوک ہوگئی ہے انھوں نے گورکھپور کے مزاحیہ شعراء میں گرگٹ گورکھپوری کا انتخاب کیا ہے ہنسی آئی کہ معتبر لوگوں میں ان کا نام کیسے آگیا یہاں کے مزاحیہ شعراء میں بے باک جوگی اور شاطر گورکھپوری جانے مانے جاتے ہیں۔ جو اعلیٰ درجے کی مزاحیہ شاعری پیش کرتے ہیں۔ بے باک جوگی ایک عرصے تک "قومی آواز" میں منظوم مزاحیہ کالم بھی لکھتے رہے ہیں اور ان کی مزاحیہ شاعری کا ایک مجموعہ "تازیانہ" کے نام سے شائع ہوکر اردو اکیڈمی سے انعام پاچکا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے بے باک جوگی جیسے تسلیم شدہ مزاحیہ شاعر کو یکسر نظرانداز کیا آخر کیوں؟ **عبدالحق امام — مرزا پور**

"تعمیر ہریانہ"، اتنا صاف ستھرا، پُرکشش و معیاری ہے کہ مطالعہ کے بعد بے اختیار دل سے تعریف نکلتی ہے میں نے اس کی تعریف کی ہے۔ دلچسپ افسانوں، نظموں و غزلوں کے ساتھ معلوماتی مضامین کا سلسلہ گویا بادۂ ناب دو آتشہ ہے۔

عفت موہانی — حیدرآباد

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمۂ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او۔ ۸۹، ۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی۔ چنڈی گڑھ سے دسمبر ۸۵ء کے لئے شائع کیا۔ طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ ٹی چنڈی گڑھ۔

جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ کنج پورہ (کرنال) میں لیگل ایڈ کیمپ" کا افتتاح فرماتے ہوئے۔

جناب بھجن لال وزیر اعلیٰ ہریانہ کورو کشیتر میں "ریلوے اوور برج" کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔

Regd. No. NW/CH—15

Photo : B.M. Chopra